الیسانڈر کوپرین

یاقوتی کنگن

الیکسانڈر کوپرین

یاقوتی کنگن

کہانیوں کا مجموعہ

دارالاشاعت ترقی
ماسکو

ترجمہ : خدیجہ عظیم

Александр Куприн

ГРАНАТОВЫЙ БРАСЛЕТ

Повести и рассказы

На языке урду

سوویت یونین میں شائع شدہ

K $\frac{70301-326}{014(01)-78}$ 666—77

فہرست

صفحہ

تلاش کرنے والا

(بطور پیش لفظ)

غالباً کسی فن کار کو محقق کا رتبہ دینا اس کے لئے سب سے بڑا خراج عقیدت ہے اور انقلاب سے قبل کے حقیقت پسند ادیبوں میں یہ ارفع خطاب الیکساندر ایوانووچ کوپرین سے زیادہ اور کسی کے لئے موزوں نہیں ہوگا۔ ان کے یہاں نہ تو کوئی من گڑھے پلاٹ ہیں اور نہ کوئی غیرفطری موضوع اور اس کے ساتھ ہی اعلی اور پاکیزہ فن کاری پائی جاتی ہے۔ یہاں ایک اور اعلی اعزازی لفظ کی ضرورت نظر آتی ہے یعنی وہ استاد فن ہیں۔

ان کی ہر تصنیف تقریباً مقالے کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس کو نظم بھی کہا جا سکتا ہے۔ ''اولیسیا''، ''یاقوتی کنگن''، بے مثال ''لیستریگونی'' اور ''زمرد''، سرکس کی کہانیوں اور بالآخر ان کی کہانی ''دوئل'' — غرض جو کچھ بھی لیجئے کوپرین کے یہاں ایک طرف تو حقیقت نظر آتی ہے اور دوسری طرف اعلی شعریت۔ اگر سائنسی محقق کو کم از کم لازمی طور پر ایماندار ہونا چاہئے

تو فن کار محقق کو پرجوش اور حتیٰ کہ جانبدار بھی ہونا چاہئے۔

ہاں، ایمانداری تو سب سے پہلے آتی ہے۔ نباتات کا محقق کسی انجانے پھول کا پتہ لگاتا ہے، جس میں پانچ پنکھڑیاں ہوتی ہیں، وہ یہ نہیں لکھتا کہ اس میں چھ پنکھڑیاں ہیں۔ ماہر نباتات کا ایسا خیال ہی بے ہودہ اور فضول ہوتا۔ لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ صدیوں کے دوران ایسے فن کے محقق گذرے ہیں جن میں ادیب بھی تھے، جنھوں نے سفید کو سیاہ اور سیاہ کو سفید کہا ہے۔

کوپرین بلور کی طرح شفاف ایماندار محقق تھے۔ بدبودار اور سڑے ناسوروں سے لیکر انسانی روح کی رفعتوں تک ان کی سرگرمیوں کا میدان ہے جہاں نہ تو شیرینی ہے اور نہ تلخی، نہ تو تاریک گوشے ہیں اور نہ روشن جگہیں۔ فن کار کے لئے صرف جوش اور شوق کی آگ ضروری تھی۔ انھوں نے خود بہت سے انسانی پیشوں کا تجربہ کیا۔ زندگی سے پیار کرنے والا کوپرین سب کچھ جانتے تھے اور اسی نے ان کے موضوعات کو وہ خوشکن برجستگی عطا کی جسے ہم ان کی تصانیف میں محسوس کرتے ہیں۔

''میں آوارہ گرد ہوں اور مجھے زندگی سے پرشوق محبت ہے۔ میں خرادی اور کمپوزیٹر رہا ہوں، طرح طرح کی تمباکو کی کھیتی کرکے اس کو

فروخت کیا ہے، بحیرۂازوف پر جہازی بھٹی جھونکنےوالا اور بحیرۂاسود پر ماہی گیر رہا... دریائے دنیپر پر تربوز اور اینٹیں لادنے کا کام کرتا تھا، سرکسوں کے ساتھ گھوما اور ایکٹر رہا — اب سب کچھ تو مجھے یاد نہیں رہا۔ بہرحال یہ کبھی غربت و احتیاج کی وجہ سے نہیں ہوا۔ بس ، زندگی کا بےپناہ شوق اور بے تابانہ تجسس تھا... میں چاہتا تھا کہ میں کچھ دن کے لئے گھوڑا، کوئی پیڑ پودا یا مچھلی ہو جاؤں یا پھر عورت ہوکر بچہ جننے کا تجربہ حاصل کروں۔ میں زندگی کی گہرائیوں میں رسنا بسنا اور دنیا کو ہر اس شخص کی نگاہوں سے دیکھنا چاہتا تھا جس سے میری ملاقات ہوتی تھی۔ ،،
اس طرح کوپرین اپنے ایک ہیرو کے ذریعہ کہتے ہیں۔

پھر بھی کوئی یہ نہیں کہےگا کہ کوپرین عام طور پر زندگی کی تحقیقات کرنےوالے تھے اور جہاں تک ان کا دست‌رس پہنچا وہ سب کچھ حاصل کرکے اس کو تحریر میں لائے۔ وہ انسان میں انسانیت کے متلاشی تھے اور حقائق میں جو کچھ کریہہ تھا اس کی کھوج کرتے تھے تاکہ اس پر انسانیت دھاوا بول سکے۔ کوپرین نے اس سنگ دل اور بے رحم عفریت کو پیش کیا جو لوگوں کو اپاھج بناتا ہے اور ان کو چبا لیتا ہے، جس کو سیاسی زبان میں سرمایہ‌داری کہتے ہیں اور جس کو فن کار نے ابلیس کے خط و خال عطا کئے ہیں۔

ادیب نے زندگی اور لوگوں میں جلی حروف سے لکھے جانےوالی محبت تلاش کی اور انھیں لوگوں پر اپنی کہانیوں اور ناولوں کی بنیاد رکھی، خواہ وہ ساحلی کیفے میں آنےوالے ہوں (''گمبرنس،،) یا چھوٹا سرکاری افسر ژیلتکوف (''یاقوتی کنگن،،) ۔ لیکن لوگوں میں رذالت اور تکبر اور بورژوا معاشرے کے اخلاقی عیوب دیکھ کر وہ نفرت بھی کر سکتے تھے اور سخت دل بھی بن سکتے تھے ۔ کوپرین تیز معاشرتی اور اعلی منصفانہ جذبات کے حامل تھے ۔ وہ معاشرتی مینار کی اسیرانہ بلندیوں کے لئے دلکشی نہیں رکھتے تھے بلکہ وسیع جمہوری بنیادوں کی طرف مائل تھے ۔

ہمارے شعور میں اگر کسی مصنف کا نام یخ کا احساس پیدا کرتا ھے خواہ وہ کتنا ھی خیرہ کن کیوں نہ ھو، تو دوسرا نفسیاتی باریکیوں کی بیماری میں مبتلا معلوم ھوتا ھے اور تیسرا طنز سے بھر پور نظر آتا ھے ۔ لیکن کوپرین گرم‌جوشی، نیکی اور درخشندگی کا نمونہ ھیں ۔ ان کی تصانیف میں ھم زمین ھی پر ایسے لوگوں کے درمیان رھتے ھیں جو ھمارے لئے قابل فہم اور ھم سے قریب ھیں اور جو ھم میں ھمدردی یا ناپسندیدگی کے جذبات پیدا کرتے ھیں ۔

اکتوبر انقلاب کے زمانے میں کوپرین اعلی درجے کے ادیب کی منزل تک پہنچ چکے تھے ۔ اور جب ھم ان کا نام ان دوسرے عظیم اور مشہور

ادیبوں کی صف میں رکھتے ھیں تو ان کا نام ماند نہیں پڑتا۔ تالستائی، چیخوف ، گورکی، کوپرین، کورولینکو ایک ھی جھرمٹ کے ستارے ھیں...

کوپرین کی زندگی اور تخلیق کی راہ دشوار اور پیچیدہ تھی۔ اس کے بارے میں جو کتابیں لکھی گئی ھیں ان میں ایسی باتیں پڑھی جا سکتی ھیں: وہ انقلابی واقعات کے اصلی خیال اور عوام الناس کے تاریخی رول کو نہیں سمجھتے تھے اور اکثر ان کو ''ھیجانی،، اور ''تباہ کن،، جذبات کی حیثیت سے پیش کرتے تھے۔ لیکن اس سلسلے میں کوپرین کے لئے ترک وطن کا دور زبردست اور ناگزیر المیہ بن گیا۔ وہ ان ادیبوں کی قطار میں نہیں آتے تھے جن کو نقش برآب جیسی زندگی چاھئے۔ کوپرین کو تو ٹھوس زمین اور وہ بھی وطن کی سرزمین کی ضرورت تھی۔ زمین سے اکھاڑا ھوا پودا اپنے ساتھ جنم بھومی کے بھی چند ٹکڑے لے جاتا ھے۔ یہی چند ٹکڑے جو باقی رہ گئے تھے ترک وطن کے دوران جہاں تک ممکن ھوا الیکساندر ایوانووچ کوپرین کی تخلیقی صلاحیتوں کی پرورش کرتے رھے۔ لیکن پودا تو قوت‌ور اور بڑا تھا، اس کو نہ صرف ٹکڑے بلکہ سیاہ مٹی کی پوری تہہ درکار تھی۔ نتیجہ یہ ھوا کہ پودا سوکھ کر مرگیا۔ خود کوپرین نے کہا: ''ایسے لوگ بھی ھیں جو یا تو بیوقوفی سے یا بدحواسی میں یہ یقین دلاتے ھیں کہ بغیر وطن کے بھی جینا ممکن

ہے ۔ لیکن معاف کیجئے گا یہ اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے ۔ آدمی جتنا ہی زیادہ باجوہر ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ اس کے لئے وطن کے بغیر جینا مشکل ہوتا ہے ۔“

اور کوپرین بہت باجوہر تھے ۔

پیرس کے مضافات میں واقع سان ژینیویف دے بوآ کے روسی قبرستان میں ان کو جگہ دی گئی ۔ ہم اس جگہ کو سفیدوں کے سایہ‌دار اداس راستوں پر گھوم گھوم کر تلاش کرتے رہے لیکن کوپرین کا لوح‌مزار کہیں نظر نہ آیا ۔ ان کی مٹی کو وطن کی سرزمین میں چین کی نیند نصیب ہوئی ۔ اور ان کا نام اور ان کی کتابیں اپنے وطن کے عظیم ادب میں زندہ ہیں ۔

و ۔ سولوؤخین

یہ مضمون ۶ ستمبر ۱۹۷۰ء کو الیکساندر کوپرین کی صدسالہ سالگرہ کے موقع پر اخبار ”پراودا“ میں شائع ہو چکا ہے ۔

مولنی

۱

مل کے سائرن کی طویل چیخ نے کام کے دن کی شروعات کا اعلان کیا، ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ موٹی اور بھرائی ہوئی آواز دھرتی کے پیٹ سے نکل کر زمین پر پھیل رہی ہو۔ برکھارت تھی اور اگست کے مہینے کی دھندلی دھندلی صبح نے اس میں اداسی اور نحوست کی چاشنی بھر رکھی تھی۔

بھونپو بجا تو انجنیر بوبروف چائے پی رہا تھا۔ پچھلے چند دن سے اندرئی ایلیچ کی بےخوابی کی شکایت پہلے سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ وہ پلنگ پر لیٹتا تو سر بھاری ہوتا اور ہر منٹ اسے دھکا سا لگتا اور وہ چونک جاتا۔ بہرحال ، آرام کی نیند تو نہ آتی مگر کسی نہ کسی طرح آنکھ لگ جاتی۔ لیکن صبح کی روشنی پھیلنے سے بہت پہلے نیند اچٹ جاتی، اس کا بند بند ٹوٹتا اور مزاج انتہائی چڑچڑا ہو جاتا۔

ظاہر ہے اس کی وجہ تھی ذہنی اور جسمانی تھکن اور مارفیا کے انجکشن لینے کی لت۔ پچھلے چند

دن سے وہ اس عادت کو ختم کرنے کے لئے جدوجہد کر رہا تھا۔

اس وقت وہ کھڑکی کے قریب بیٹھا چائے کے گھونٹ چڑھا رہا تھا۔ چائے بڑی بےمزہ اور بے جان معلوم ہو رہی تھی۔ بارش کی بوندوں کے لہرئیے کھڑکی کے شیشوں سے پھسل کر جوھڑ کے پانی میں ہلکورے پیدا کر رہے تھے۔ کھڑکی کے باھر چوکور تلیا تھی جس کے چاروں طرف گٹھے ہوئے اور ننگے تنوں اور روپہلی و سبز پتیوں والے لرزاں بید کی گوٹ لگی ہوئی تھی۔ ہوا کے جھونکوں سے تلیا کی سطح پر چھوٹی چھوٹی لہریں تڑپنے لگتیں اور بید کی پتیاں روپہلا روپ دھار لیتیں۔ بارش کی روندی اور مرجھائی ہوئی گھاس بڑے بےجان طریقے سے زمین کی طرف جھکی پڑ رہی تھی۔ پڑوس‌والا گاؤں، افق تک پھیلے ہوئے ناھموار جنگل اور زرد اور سیاہ دھبوں والے کھیت دھندلے اور بھورے بھورے سے نظر آ رہے تھے جیسے ان پر کہر چھایا ہوا ہو۔

بوبروف ٹوپی‌دار برساتی میں باھر نکلا تو سات بج رہے تھے۔ نازک طبیعت والوں کی طرح اس پر بھی صبح کو بڑی اداسی طاری ہو جاتی تھی۔ بدن میں کمزوری سی محسوس ہوتی، آنکھوں کو جیسے کوئی زور سے دباتا اور ان میں دبا دبا سا درد ہونے لگتا اور منہ کا مزہ کڑوا ہو جاتا۔ لیکن سب سے زیادہ تکلیف‌دہ چیز تھی، وہ اندرونی الجھن

جو پچھلے دنوں سے اسے محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے زندہ‌دل ساتھی زندگی کو عام اور عملی نظر سے دیکھتے تھے۔ اگر انھیں پتہ چل جاتا کہ اس کی اس روحانی اذیت کا سبب کیا ھے تو شاید وہ سب اس کی حالت پر ھنسنے لگتے، اور کسی صورت میں بھی اس کا نقطۂ‌نظر نہ سمجھ پاتے۔ اسے مل کے کام سے دلی نفرت تھی۔ اس کے یہ خوفناک جذبات روزبروز زیادہ شدید ھوتے چلے گئے۔

اس کا ذھنی رجحان، عادتیں اور پسند کچھ ایسی تھی کہ وہ اپنی زندگی پروفیسری، کاشتکاری یا اونچے دفتری کاموں کی نذر کر دیتا تو بہتر رھتا۔ انجنیری سے اس کے دل کو اطمینان نہ ھوتا۔ اس کی اماں اصرار نہ کرتیں تو وہ تعلیم کے تیسرے سال ھی میں کالج چھوڑ دیتا۔

اس کی نازک نسوانی فطرت حقیقت کے بوجھ تلے دبی جا رھی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ زندہ‌درگور ھو گیا ھے۔ بعض دفعہ چھوٹے سے چھوٹا قصہ اس کے لئے مسلسل اور شدید الجھن کا سبب بن جاتا حالانکہ اس پر دوسروں کی نظر بھی نہیں پڑتی تھی۔

دیکھنے سننے میں بوبروف سیدھا سادھا اور خاموش طبیعت آدمی تھا۔ اس کا قد چھوٹا اور جسم دبلا تھا لیکن اس کی رگوں میں ایک اضطرابی اور بے قرار قوت دوڑ رھی تھی۔ اس کے چہرے کی سب سے اھم چیز تھی، اونچی سی سفید شاندار

پیشانی ۔ اس کی پھیلی پھیلی پتلیاں اتنی بڑی تھیں کہ بھوری آنکھیں سیاہ معلوم ہوتی تھیں، جھاڑ جھنکاڑ قسم کی ناھموار بھویں جڑی تھیں جس کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں سختی اور جوگ اور تیاگ کی ہلکی سی جھلک پیدا ہو گئی تھی ۔ اس کے ہونٹ ہلکے سے ناھموار اور پتلے تھے مگر ان میں بےرحمی کا رنگ نہیں تھا ۔ دھن کا دایاں کونا بائیں کونے سے ذرا سا اونچا تھا ۔ اس کی بھوری مونچھیں اور داڑھی چھوٹی اور چھدری تھیں، جانو وہ کوئی کم‌عمر لڑکا ہو ۔ اس کے سیدھے سادھے چہرے کا سارا حسن اس کی مسکراھٹ میں پنہاں تھا ۔ وہ مسکراتا تو اس کی آنکھوں سے خوشی اور محبت جھلکنے لگتی اور چہرہ بڑا دلکش ہو جاتا ۔

آدھے میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ پہاڑی پر چڑھنے لگا ۔ بیس مربع میل میں پھیلی ہوئی مل کا وسیع و عریض سلسلہ نیچے پھیلا ہوا تھا ۔ مل کیا تھی، سرخ اینٹوں کا اچھا خاصہ شہر کا شہر آباد تھا جس میں جابجا دھوئیں میں اٹی ہوئی بلند چمنیاں ابھری ہوئی تھیں، ان چمنیوں سے گندھک اور پگھلے ہوئے لوھے کا دھواں اٹھتا رھتا اور مسلسل شور کی وجہ سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی ۔ چار بھٹیوں کی دیوپیکر چمنیاں اس پورے منظر پر چھائی ہوئی تھیں، ان کے قریب گرم ھوا کو گردش کرانےوالے آٹھ مینار سربلند تھے، ان دیوھیکل آھنی

میناروں کے اوپر گول گول گنبد بنے ہوئے تھے۔ بھٹیوں کے قریب مرمت کا سیکشن، لوہا ڈھالنے کا سیکشن، دھلائی سیکشن، سکھائی سیکشن، انجنوں والا حصہ، پٹریاں بنانے والا شعبہ، کھلی بھٹی اور لوہا پگھلانے کی بھٹی وغیرہ پھیلی ہوئی تھیں۔

مل کا علاقہ فطرت کے بنائے ہوئے تین انتہائی وسیع و عریض چبوتروں کی شکل میں نیچا ہوتا چلا گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی گاڑیاں ادھر سے ادھر دوڑ رہی تھیں، سب سے نیچی سطح پر پہنچنے کے بعد ان کی ایک جھلک نظر آتی اور پھر وہ تیز سیٹیاں بجاتی ہوئی سرنگوں میں غائب ہو جاتیں، چند سیکنڈ کے بعد سفید بھاپ میں لپٹی ہوئی نکلتیں اور پلوں کے اوپر کھڑکھڑاتی ہوئی آخر اس طرح دوڑنے لگتیں جیسے ہوا میں تیر رہی ہوں۔ یہ گاڑیاں کسی بھٹی میں کچی دھات یا کوئلہ پہنچانے کا مزمن انجام دیتی تھیں۔

ان چبوتروں سے ذرا سا آگے پانچویں اور چھٹی بھٹی کی جائے تعمیر پر تو ایسا ہنگامہ تھا کہ انسان دیکھ کر بدحواس ہو جائے۔ لگتا تھا کوئی انتہائی خوفناک زلزلہ آیا اور رنگ برنگے چھوٹے بڑے شکستہ پتھروں، ریت کے ٹیلوں، فرش کے ٹائلوں، لوہے کی چادروں اور عمارتی لکڑی کا انبار لگاتا چلا گیا۔ دور سے دیکھو تو لگتا کہ یہ سب سامان بلا کسی مقصد اور تناسب کے محض اتفاق سے یہاں ڈھیر

ہو گیا ہے، سینکڑوں ٹھیلے اور ہزاروں آدمی مصروف پیکار نظر آتے، جیسے ان گنت دیمکیں اپنے مٹی کے گھروندے سے چمٹی ہوئی ہوں۔ چونے کی سفید کڑوی گرد ہوا میں دھند کی طرح معلق رہتی تھی۔

ذرا اور آگے بڑھ کر افق کے بالکل قریب ایک لمبی سی سال گاڑی کے گرد ان گنت مزدور گاڑی سے سال اتارنے میں مصروف نظر آتے۔ گاڑی کے ڈبوں سے ملحق تختوں سے اینٹوں کا ایک بیکراں چشمہ پھسلتا رہتا تھا۔ لوہے کی چادریں شور مچاتی ہوئی گرتی رہتیں اور باریک باریک تختے ہوا میں تھرتھراتے نظر آتے۔ خالی گاڑیاں ریل کی طرف بڑھتی اور لبالب بھری ہوئی گاڑیوں کی زنجیر سی آگے کھسکتی رہتی۔ ہزاروں آوازیں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر ایک مسلسل اور طویل ہنگامے کو جنم دے رہی تھیں، فضا میں معماروں کی چھینیوں کی تیز آواز گونجتی، جوڑ لگانے والے اوزار بڑے پرشور دھماکوں کے ساتھ بائیلر کے جوڑوں پر گرتے، بھاپ سے چلنے والے ہتوڑے کھڑکھڑاتے، نالیوں میں پوری طاقت سے بھاپ سنسناتی اور سیٹیاں سی بجاتی رہتی اور کبھی کبھی کہیں دور، زمین کے اندر زلزلہ خیز دھماکوں کی گھٹی گھٹی سی چیخیں گونج اٹھتیں۔

غرض کہ کچھ ایسا نظارہ تھا کہ آدمی اس میں کھو کے رہ جائے۔ بیک وقت اس سے متاثر بھی

ہو اور مرعوب و خوفزدہ بھی — انسانی ہاتھ ایک دیوہیکل، جدید اور پیچیدہ مشین کی طرح بڑے زوروشور سے کام میں مصروف تھے۔ ہزاروں انسان خطۂ زمین کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے انجنیر ، معمار، مستری، بڑھئی، فٹر ، کھدائی کرنےوالے، جوڑ بٹھانےوالے اور لوہار یہاں جمع ہو گئے تھے تاکہ ان کی محنت اور طاقت اور عقل و فراست جہدبقا کے آہنی قانون کی نذر ہو سکے، تاکہ صنعتی ترقی کی راہ میں ایک قدم اور آگے بڑھایا جا سکے۔

اس دن بوبروف کی طبیعت بہت بیزار تھی۔ سال میں تین چار دفعہ اس پر عجیب قسم کی اداسی طاری ہوتی اور مزاج چڑچڑا ہو جاتا۔ عام طور پر یہ کیفیت خزاں کی ابرآلود صبحوں یا جاڑے کی برف پوش اور بھیگی بھیگی سی شاموں میں ہوتی تھی۔ اسے ہر چیز بےجان اور بےرنگ نظر آنے لگتی، انسانوں کے چہرے بےرنگ، بدشکل اور بیمار سے معلوم ہوتے اور ان کے الفاظ کہیں دور سے آتے ہوئے محسوس ہوتے اور اس کی بیزاری اور بھی بڑھ جاتی۔ خاص کر آج جب ریل مل کا چکر کاٹتے ہوئے وہ ان زرد رو مزدوروں کے پاس سے گزرا جن کے چہروں پر کوئلے کا غازہ لگا ہوا تھا۔ یہ چہرے آگ میں تپ کر بالکل خشک پڑ گئے تھے۔ اس وقت اس کی چڑچڑاہٹ اپنے عروج پر تھی۔ تپتے ہوئے لوہے کے سفید ڈھیر مزدوروں کے جسموں کو چھید

رہے تھے، خزاں کی سرد ہوائیں دروازے سے اندر آکر سوئی کی طرح چبھ رہی تھیں اور ایسے میں وہ اپنا خون پسینہ بہاکر محنت کر رہے تھے، بوبروف نے یہ سب دیکھا اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ خود ان جسمانی اذیتوں کا شکار ہے۔ اسے اپنی خوش پوشی، اپنے نفیس لباس اور تین ہزار روبل سالانہ کی آمدنی پر شرم آنے لگی۔

۲

وہ ویلڈنگ کی ایک بھٹی کے قریب کھڑا کام کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ بھٹی کا دھکتا ہوا منہ غار کی طرح کھلتا اور ہر لمحے وہ تپتے ہوئے سفید لوہے کے سو سو پونڈ کے ٹکڑے نگل جاتا۔ یہ لوہا چند سیکنڈ پہلے شعلہ گوں بھٹی سے نکلتا تھا۔ پاؤ گھنٹے بعد یہ لوہا درجنوں مشینوں اور خوفناک ہنگامے سے گزرنے کے بعد کھاتا شاپ کے دوسرے کونے تک پہنچتے پہنچتے پٹ پٹا کر لمبی لمبی چمکدار پٹڑیوں کا روپ دھار لیتا۔

پیچھے سے کسی نے بوبروف کا شانہ چھوا۔ وہ جھنجھلا کر پلٹا تو اسے اپنا ایک رفیق کار سویژیفسکی نظر آیا۔

اس شخص کا جسم عام طور پر ذرا سا آگے کو جھکا رہتا جیسے وہ چپکے سے کھسکنے

کی کوشش کر رہا ہو یا تعظیماً کسی کے آگے جھک رہا ہو۔ اس کے ہاتھ ٹھنڈے اور بھیگے بھیگے سے تھے اور وہ انھیں ہمیشہ ملتا رہتا اور اندر ہی اندر کھی کھی کرتا رہتا۔ بوبروف کو اس کی یہ حرکتیں سخت ناپسند تھیں۔ یہ شخص بڑا خوشامدی، کینہ پرور اور خود نما تھا۔ مل کی ہر افواہ کی اطلاع سب سے پہلے اسے ہوتی تھی۔ وہ انتہائی مزے لے لے کر یہ باتیں خاص طور پر ان لوگوں کو سناتا تھا جنھیں اس سے سب سے زیادہ پریشانی اور الجھن ہو سکتی تھی۔ بات کرتے ہوئے وہ نہایت اعصابی حرکتیں کرتا اور اپنے ہم کلام کے شانوں، ہاتھوں یا بٹنوں پر ہاتھ مارتا رہتا۔

''مدتوں سے آپ کی صورت نظر نہیں آئی، یارا!،، سویڑیفسکی بوبروف کے ہاتھ سے لپٹا ہوا کھی کھی کر رہا تھا۔ ''کتابیں پڑھی جا رہی ہیں کیا؟،،

''آداب عرض،، بوبروف نے ہاتھ کھینچ کر ھچکچاتے ہوئے کہا۔ ''میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔،،

''زینینکو کے ہاں بھی سب کو آپ کی کمی محسوس ہو رہی ہے،، سویڑیفسکی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''وہاں کبھی جاتے کیوں نہیں، آخر؟ کل ہی کی تو بات ہے ڈائرکٹر بھی وہاں موجود تھے۔ وہ بھی آپ کو پوچھ رہے تھے۔ بھٹیوں

کے کام کی کچھ بات نکل آئی تو انھوں نے آپ کی بڑی تعریفیں کیں۔"

"زہے نصیب"، بوبروف طنزاً جھکا۔

"نہیں، سچ بڑی تعریفیں کیں! کہنے لگے کہ بورڈ کی نظر میں آپ بہت ھی اھل انجنیر ھیں۔ ان کا کہنا ھے کہ آپ چاھیں تو بہت ترقی کر سکتے ھیں، کہنے لگے کہ آپ کے جیسے تجربہ کار آدمی کے ھوتے ھوئے کسی فرانسیسی سے مل کا نقشہ بنوانے کی کیا ضرورت تھی بھلا۔ مگر..."

"اب کوئی چبھتی ھوئی بات کہے گا کمبخت"، بوبروف نے سوچا۔

"مگر کہنے لگے افسوس تو یہ ھے کہ بوبروف سب سے الگ تھلگ رہتے ھیں، اس قدر گم سم رہتے ھیں کہ سمجھ میں نہیں آتا آدمی بات کرے تو کیسے کرے۔ ارے ھاں! لیجئیے میں آپ کو سب سے اھم خبر سنانا تو بھول ھی گیا۔ کھڑا ادھر ادھر کی باتیں کر رھا ھوں۔ ڈائرکٹر چاھتے ھیں کہ کل بارہ بجے کی گاڑی کے وقت ھم سب اسٹیشن پر موجود رھیں۔"

"کیا پھر کسی سے ملنے جانا ھے؟"

"اور کیا، بوجھیئے کس سے؟"

سویژیفسکی کے چہرے سے چالاکی اور فاتحانہ شان ٹپکنے لگی اور وہ خوش ھوکر ھاتھ ملنے لگا،

وہ بے حد خوش تھا کیونکہ وہ اپنے خیال میں انتہائی پھڑکتی ہوئی خبر سنانےوالا تھا۔

''نہیں بھئی، مجھے نہیں معلوم ،، بوبروف نے کہا۔ ''اور پھر میں پہیلیاں بوجھنے میں یوں بھی کورا ہوں۔ ،،

''ارے، نہیں یار کوشش تو کریئے، چلو یونہی کسی کا نام لے ڈالئے۔ ،،

بوبروف نے کوئی جواب نہیں دیا، ایسا بن گیا جیسے بھاپ کے کرین کے کام کی نگرانی کر رہا ہو۔ یہ دیکھ کر سویژیفسکی اور بھی زیادہ پھسل پڑا۔

''نہیں بتا سکتے، ارے آپ ہرگز نہیں بتا سکتے، خیر میں آپ کو زیادہ دیر شش‌وپنج میں نہیں رکھوں‌گا۔ ارے بھئی کواشنین بہ نفس نفیس آ رہے ہیں۔ ،،

اس نے کچھ ایسے غلامانہ اور خوشامدانہ انداز میں یہ نام لیا کہ بوبروف کو کراہیت سی ہونے لگی۔

''تو اس میں کیا خاص بات ہے؟،، اندرئی ایلیچ نے یونہی پوچھا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ ارے، بھئی، ڈائرکٹروں کے بورڈ میں اپنی من مانی کرتا ہے وہ، ہر شخص اس کی بات کو آیت و حدیث سمجھتا ہے، جناب۔ اس دفعہ تعمیری کام کی رفتار تیز کرنے کا کام بورڈ نے اس کے سپرد کیا ہے۔ میرا مطلب ہے

اس نے خود یہ کام اپنے ذمے لیا ھے۔ آپ کیا جانیں، اس کے آتے ھی کیسی قیامت آئیگی۔ پچھلے سال میرے خیال میں آپ کے آنے سے پہلے اس نے مل کا معائنہ کیا تھا۔ ھاں تو اس وقت مینیجر کو اور چار انجنیروں کو نکال باھر کیا کمبخت نے۔ آپ کی بھٹی کب تک گرم ھوگی؟''

''بس تیار ھی سمجھو۔''

''وہ مارا۔ تب تو ھم کواشنین کی موجودگی میں سنگ بنیاد رکھ سکیں گے۔ اور اس کے تیار ھونے کا جشن منا سکیں گے۔ ان سے ملے ھیں کبھی؟''

''نہیں، میں نہیں ملا، ھاں نام ضرور سنا ھے۔''

''مجھے تو یہ فخر حاصل ھو چکا ھے۔ سچ کہتا ھوں ان کا سا دوسرا آدمی نظر نہیں آتا۔ پیٹرسبرگ میں انھیں کون نہیں جانتا۔ پہلی بات تو یہ کہ موٹا اس قدر ھے کہ توند پر ھاتھ نہیں باندھ سکتا، آپ کو چاھے یقین نہ ھو۔ بخدا اس کی تو گاڑی تک مخصوص ھے۔ دائیں طرف سے پوری کھل جاتی ھے۔ اور قطب کی لاٹ جتنا لمبا ھے میرا یار۔ لال بال اور گرجدار آواز۔ مگر کس قدر چالاک ھے کمبخت! اف خدا! ھر ایک جائنٹ اسٹاک کمپنی کے بورڈ میں موجود ھے۔ ھر سال دو لاکھ روپے تو صرف سات میٹنگوں میں شرکت کرنے کے عوض ھی مل جاتے ھیں۔ کبھی کسی عام جلسے میں کوئی چیز پیش کرنی ھو تو اس

سے بڑھ کے کوئی نہیں ہے۔ سالانہ رپورٹ انتہائی مشتبہ بھی ہو تو کچھ اس انداز میں پیش کرے گا کہ حصے دار سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ سمجھ لے گا اور الٹا بورڈ کا شکریہ ادا کرنے لگے گا۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ اسے پتہ بھی نہیں چلتا کہ وہ کہہ کیا رہا ہے مگر بڑے یقین کے ساتھ اپنی بات پیش کر دیتا ہے۔ کل تو آپ اسے بات کرتے سنیں گے۔ دیکھ لیجئے گا، آپ کو لگے گا کہ اس نے زندگی بھر لوہے کی بھٹیوں سے سر مارا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی واقفیت ان کے بارے میں بس اتنی ہی ہے جتنی میری سنسکرت کے بارے میں ہے۔ ''

''ترا۔ لا۔ لا۔ لا،، بوبروف منہ پھیر کر بظاہر بڑی لاپروائی سے بےسرئے انداز میں الاپنے لگا۔

''ارے ایک مثال دیتا ہوں آپ کو۔ جانتے ہیں پیٹرسبرگ میں وہ کس طرح حمام میں بالکل ننگا نظر آتا ہے۔ کمبخت کچھ اس ڈھب سے حمام میں بیٹھ جاتا ہے کہ اس کے لال لال بال پانی کے اوپر چمکتے رہتے ہیں۔ ہاں تو وہ حمام میں بیٹھا ہے اور اس کا ذاتی مشیر بڑی تعظیم کے ساتھ جھک کر اس کے سامنے رپورٹ پیش کرتا ہے۔ ارے بلا کا پیٹو ہے، وہ اپنے کھانے کا انتخاب خود کرتا ہے۔ اچھے ریستوران کی سب سے اہم چیز کواشنین کی محبوب غذا ہے اور عورت کے بارے میں تو کیا بتاؤں، ارے

بھائی تین سال پہلے ایک بڑا مضحکہ‌خیز واقعہ ہوا تھا...،، سویڑیفسکی نے بوبروف کو کھسکتے دیکھا تو جھٹ اس کا بٹن پکڑ لیا۔

''ٹھہریئے تو،، اس نے منت بھری آواز میں سرگوشی کی۔ ''بڑا دلچسپ قصہ ہے! بس چند جملوں میں سنا دوں‌گا۔ ہاں تو ہوا یہ کہ تقریباً تین سال پہلے موسم خزاں میں ایک غریب نوجوان پیٹرسبرگ آیا۔ کوئی کلرک‌ولرک تھا۔ اس کا نام اس وقت یاد نہیں آ رہا ہے، کوئی ایسا ورثہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا بچارا جس کے سلسلے میں بہت دن سے جھگڑا چلا آ رہا تھا۔ وہ روز صبح کو مختلف دفتروں کے چکر لگاتا اور پھر سرما باغ کے کسی بنچ پر بیٹھ کر پندرہ بیس منٹ سستا لیتا۔ ہاں، تو چار پانچ دن تک اس کا یہی شغل رہا، وہ جب بھی باغ میں آتا وہاں اسے لال بالوں‌والا ایک بےحد موٹا شخص چہل قدمی کرتا نظر آتا۔ آخر ان دونوں میں بات چیت ہونے لگی۔ لال سروالا دراصل کواشنین تھا۔ اسے نوجوان کے حالات معلوم ہوئے تو اس سے اسے ہمدردی سی پیدا ہو گئی۔ لیکن اس نے نوجوان کو اپنا نام نہیں بتایا۔ اور پھر، ایک دن لال سر نے نوجوان سے کہا: 'بھائی کیا تم ایک نوجوان عورت سے اس شرط پر شادی کر لوگے کہ شادی کے فوراً بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس سے جدا ہو جاؤ؟، ان دنوں نوجوان کو

فاقوں کی نوبت آ رهی تهی - 'بس جی، اس نے کہا کہ 'میں تیار هوں البتہ یہ تو بتائیے کہ مجھے کتنا روپیہ ملے گا، شرط یہ ہے کہ روپیہ پیشگی هاتھ میں آنا چاهئے' - بهئی بات یہ ہے کہ نوجوان کوئی کل کا بچہ تو تها نہیں تجربہ کار آدمی تها - هاں تو، ان میں سمجھوتہ هو گیا - هفتے بهر بعد لال سر نے نوجوان کو بڑهیا کوٹ پہنوایا اور صبح سویرے شہر سے باهر کے کسی دیہاتی گرجا میں لے گیا - گرجا میں مجمع نہ تها - دلہن پہلے هی موجود تهی، اس کا چہرہ گهونگٹ میں چهپا هوا تها مگر ایک نظر دیکھنے سے هی اندازہ هو جاتا تها کہ وہ نوجوان اور خوبصورت ہے - شادی کی رسم شروع هو گئی - مگر پهر نوجوان نے دیکھا کہ اس کی دلہن بڑی اداس اور دکهی سی نظر آ رهی ہے - اس نے دلہن سے سرگوشی کی: 'کیا تم اپنی مرضی کے خلاف یہاں آئی هو؟' ، تو لڑکی نے جواب دیا کہ 'معلوم هوتا ہے تم بهی اسی طرح آئے هو-!' تو بهئی اس طرح انهیں سب کچھ معلوم هو گیا - پتہ یہ چلا کہ خود لڑکی کی ماں نے اسے اس شادی پر مجبور کیا تها - بهئی بات یہ ہے کہ ماں کے دل نے اسے مجبور کیا اور وہ اپنی لڑکی کا هاتھ براہ‌راست کواشنین کے هاتھ میں نہ دے سکی - هاں تو هوا یہ کہ تهوڑی دیر وہ اسی طرح بات چیت کرتے رہے - اور آخر نوجوان نے دلہن سے کہا

کہ 'بھئی، کیا خیال ہے، ایک چال چلیں؟'، اس نے کہا 'ہم دونوں جوان ہیں، کون جانے اسی طرح ہماری قسمت سنور جائے۔'، سو، انھوں نے طے کیا کہ 'کواشنین کو یہیں کھڑا چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔'، لڑکی بہت تیز اور دلیر تھی۔ فوراً تیار ہوگئی۔ 'اچھا یہی سہی'۔ چنانچہ شادی کی رسم ادا ہو چکی تو سب لوگ گرجا سے باہر نکلے۔ کواشنین کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ نوجوان پہلے ہی اس سے روپیہ وصول کر چکا تھا، ابھی ڈھیروں روپیہ تھا، اس قسم کی چیزوں کے لئے تو کواشنین قارون کا خزانہ بھی لٹا دے۔ ہاں تو کواشنین نئے دلہا دلہن کے پاس آیا اور انتہائی مضحکہ‌خیز انداز میں انھیں مبارکباد دینے لگا۔ انھوں نے بڑی سعادت مندی سے اس کی بات سنی، شکریہ ادا کیا اور اسے اپنا محسن کہا۔ اور دیکھتے دیکھتے لپک کر گاڑی میں سوار ہو گئے۔ کواشنین چلایا: 'ارے بھئی یہ کیا حرکت ہے؟ کہاں جا رہے ہو تم لوگ؟'، اور انھوں نے جواب دیا: 'اسٹیشن جا رہے ہیں بھئی، تاکہ ماہ غسل منانے کے لئے جلدازجلد روانہ ہو سکیں۔ کوچوان، گاڑی بڑھاؤ!'، دولہا دلہن نے حکم دیا اور وہ چلے گئے اور کواشنین کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ یہی نہیں، بلکہ ایک موقع پر... ارے؟ اندرئی ایلیچ، آپ تو چل دئیے؟،، سویژیفسکی نے بوبروف کو ہیٹ ٹھیک کرتے اور

کوٹ کے بٹن لگاتے دیکھا تو جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''معاف کرنا، میرے پاس وقت نہیں ہے،، بوبروف نے بےرخی سے جواب دیا۔ ''اور یہ کہانی تو میرا خیال ہے میں پہلے بھی کہیں سن یا پڑھ چکا ہوں۔ خدا حافظ۔،،

اس نے سویژیفسکی کی طرف سے پیٹھ موڑی اور تیزی سے شاپ سے نکل گیا۔ سویژیفسکی اس کا رویہ دیکھ کر آپے سے باھر ھو رھا تھا۔

۳

مل سے آنے کے بعد بوبروف جلدی جلدی کچھ کھا پی کر برساتی میں آیا اور کوچوان میتروفان کو حکم دیا کہ میرا سرنگ ڈان گھوڑا فیروے تیار کر دو۔ میتروفان اس وقت انگریزی زین کی پیٹیوں سے دست و گریبان تھا۔ فیروے پیٹ پھلاتا، گردن میں کئی کئی چک‌پھیریاں دیتا، اور میتروفان کے قمیص کی آستین کھینچنے لگتا۔ میتروفان کی آواز غیرفطری حد تک بھاری تھی۔ وہ خفگی سے گھوڑے کو ڈانٹتا: ''ابے فیروے، چپ چاپ کھڑا رہ!،، اور ھانپتے ہوئے کہتا: '' ذرا دیکھو تو سہی اسے۔،،

فیروے درمیانی قد، چوڑے چکلے سینے، لمبے دھڑ اور جھکے ہوئے پتلے سرین کا گھوڑا تھا۔ اس کی لمبی لمبی ٹانگیں جھبری تھیں اور سم اور ٹخنے مضبوط جن پر وہ بڑی شان سے کھڑا تھا۔ شاید پرکھنےوالی نظریں اس کی لمبی گردن کے خم اور باہر نکلے ہوئے کنٹھ کو پسند نہ کرتیں، لیکن بوبروف کا کہنا تھا کہ ڈان نسل کے گھوڑوں کے یہ مخصوص نقوش فیروے کے حسن کو اسی طرح چار چاند لگاتے ہیں جس طرح چھوٹی چھوٹی ٹانگوں والے کتے کی مڑی ہوئی ٹانگیں اور شکاری کتے کے لمبے لمبے کان اس کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ مل بھر میں ایک گھوڑا بھی ایسا نہیں ہے جو فیروے کے مقابلے میں ٹھیر سکے۔

روس کے تمام ذمہ‌دار کوچوانوں کی طرح سیتروفان بھی گھوڑوں کے ساتھ سختی سے پیش آنے کو اپنا فرض سمجھتا تھا۔ نہ کبھی خود پیار سے گھوڑے کو تھپتھپایا، نہ اسے اظہار خصوصیت کرنے دیتا، ہمیشہ اسے ”قیدی“، ”قاتل“، ”سردار“ اور حد ہے کہ ”حرامی“ کے نام سے پکارتا تھا۔ پھر بھی دل ہی دل میں اسے فیروے بہت پسند تھا۔ اس کی محبت اور لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ وہ ہمیشہ فیروے کی دیکھ بھال سویلو اور سیلر سے زیادہ اچھی طرح کرواتا اور ان دونوں گھوڑوں سے زیادہ

جتی دلواتا تھا۔ یہ دونوں گھوڑے بھی مل کے تھے اور بوبروف کے استعمال میں تھے۔

''میتروفان، گھوڑے کو پانی دے دیا تھا؟''

میتروفان نے فوراً جواب نہیں دیا۔ ٹھسے کا کوچوان ہونے کے ناتے اس کی بات چیت میں بڑا وقار اور رکھ رکھاؤ تھا۔

''جی ہاں اندرئی ایلیچ، دے دیا تھا۔ ابے اچھلنا بند کر شیطان!'' وہ گھوڑے پر چیخا۔ ''میں بتاتا ہوں تجھے اچھلنا! زین کی تڑپ ہے، اس قدر بےتاب ہے، صاحب۔''

بوبروف نے فیروسے کے قریب آکر بائیں ہاتھ میں لگام تھامی ہی تھی کہ وہی روزانہ والی حرکت ہوئی۔ فیروسے بڑی دیر سے بڑی بڑی غصیلی آنکھیں گھما گھما کر دیکھ رہا تھا، بوبروف اس کی طرف بڑھ رہا تھا، اچانک وہ بھڑکا اور ہونٹ چبانے اور گردن موڑ موڑکر پچھلی ٹانگوں سے گرد کے مرغولے اڑانے لگا۔ بوبروف اس کے قریب کھڑا ایک ٹانگ پر کود کود کر رکاب میں پاؤں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''لگام چھوڑو، میتروفان!'' آخر وہ رکاب میں پاؤں رکھ کر چلایا، اور دیکھتے دیکھتے زین پر جم گیا۔

فیروسے نے اپنے آقا کی مہمیز کو محسوس کیا اور فوراً راضی بہ رضا ہو گیا۔ وہ کئی دفعہ ہنہنایا،

سر ہلا ہلا کر چال بدلی ، پھاٹک سے نکلا اور لمبے لمبے قدم بڑھا کر جھومتا ہوا چل پڑا۔

سبک رفتار گھوڑے کی سواری، کان میں سیٹیاں بجاتی ہوئی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں اور خزاں کی بھیگی بھیگی زمین کی خوشبو نے پلک جھپکتے میں بوبروف کے اعصابی تناؤ کو ڈھیلا کر دیا۔ یوں بھی زینینکو کے ہاں جاتے ہوئے ہر دفعہ نئے سرے سے اس کے دل میں ہل چل سی مچ جاتی اور مسرت کا بڑا خوشگوار احساس ہوتا۔

زینینکو کے ماں باپ کے ہاں پانچ بیٹیاں تھیں۔ باپ مل کے گودام کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ وہ دیکھنے میں بڑا کاہل اور نیک طبیعت دیوسا معلوم ہوتا لیکن اصل میں فریبی اور رکھ رکھاؤوالا آدمی تھا۔ اور ہمیشہ ہر چیز میں آگے آگے رہتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو لوگوں کے منہ پر صاف بات کہنے کے بہانے حکام کی بڑے بھدلے پن مگر کامیابی سے چاپلوسی کرتے ہیں، بڑی بےغیرتی سے رفیقان کار کے بارے میں خبررسانی کرتے ہیں اور بڑے ظالمانہ انداز میں ماتحتوں کے سر پر ڈنڈا بجاتے ہیں۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی بات پر گھنٹوں بحث کرتا، بیٹھی ہوئی آواز میں خوب چیختا، اور دوسروں کی رائے اور اعتراضات سننے سے انکار کر دیتا۔ وہ لذیذ کھانے کا بےحد شوقین تھا اور یوکرین کے بھجن گیتوں پر جان دیتا تھا مگر یہ گیت وہ ہمیشہ

۲۰

بڑی بےسری آواز میں گاتا تھا۔ اس کی بیوی چھوٹے قد کی بیمار صورت اور با مروت عورت تھی اور اس کی چھوٹی چھوٹی بھوری آنکھیں بڑے احمقانہ طریقے سے ناک سے چپکی ہوئی تھیں۔ شوہر اس بات سے بےخبر تھا کہ وہ بیوی کے اشاروں پر ناچتا ہے۔

بیٹیوں کے نام ماکا، بیتا، شورا، نینا اور کاسیا تھے۔

ہر بیٹی کا ایک خاص کردار تھا۔ ماکا، جس کے چہرے کو ایک رخ سے دیکھو تو بالکل مچھلی کا سا لگتا تھا، وہ بڑی فرشتہ خصلت بتائی جاتی تھی۔ ''ہماری ماکا تو مجسم خاکساری ہے،، — ٹہلتے گھومتے وقت یا چائے پارٹی کے دوران میں وہ اپنی بہنوں کی خاطر اپنی ہستی کو مٹا دیتی تو اس کے ماں باپ کے منہ سے بے اختیار یہ جملہ نکل جاتا تھا (وہ تیس سے اوپر ہو چکی تھی)۔

بیتا بہت ہوشیار مانی جاتی تھی۔ وہ عینک لگاتی تھی اور سنتے ہیں کہ ایک زمانے میں تو اس نے عورتوں کے کسی مدرسے میں داخل ہونے کا ارادہ بھی کیا تھا۔ بیتا ہل کے بوڑھے گھوڑوں کی طرح ایک طرف کو سر ڈھلکائے رہتی اور بہت مٹک مٹک کر چلتی تھی۔ وہ ہر نئے مہمان کی تواضع ان الفاظ سے کرتی کہ عورتیں مردوں سے زیادہ ایماندار اور کہیں بہتر ہوتی ہیں، کبھی کبھی وہ بڑی سادگی اور کھلنڈرے پن سے کہتی

تھی ''اف کس قدر چالاک ہو تو ــ اچھا بتاؤ میرے کردار کا انداز لگا سکتے ہو؟،، کبھی کبھی بات چیت کا رخ کسی مخصوص گھریلو موضوع کی طرف مڑ جاتا، اور کچھ ایسے مسائل پر غور ہونے لگتا کہ ''لیرمنتوف زیادہ عظیم ھے یا پوشکن؟،، یا ''فطرت انسان کو زیادہ رحمدل بنا دیتی ھے یا نہیں؟،، ایسے موقعوں پر بیتا کو فوجی ھاتھی کی طرح آگے کردیا جاتا تھا۔

تیسری بیٹی شورا کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ باری باری ہر کنوارے انجنیر کے ساتھ تاش کھیلتی۔ لیکن جب اسے پتہ چلتا کہ اس کا ساتھی عنقریب شادی رچا رہا ھے، تو وہ غصے اور کوفت کو دبا کر نیا ساتھی تلاش کر لیتی۔ کھیل کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے پرلطف مذاق اور ہوش‌ربا شرارتیں تو خیر چلتی ھی رھتیں ، اس کے ساتھی کو ''ذلیل،، کا خطاب ملتا اور اس کے ھاتھ پر تاش کے پتوں کی مار پڑتی۔

نینا گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ لاڈوں میں بگڑی ہوئی مگر بڑی پیاری۔ وہ سب بہنوں سے مختلف تھی۔ اور سب بہنوں کے جسم بھاری اور چہرے بدصورت تھے۔ نینا کے کومل اور نازک بدن، شاھانہ ھاتھوں، سنولائے ہوئے حسین چہرے، دلربا تلوں، ننھے ننھے گلابی کانوں اور گھنے و گھنگھریالے بالوں کا راز تو مادام زینینکو ھی بتا سکتی تھیں۔

2—1348

ماں باپ کو اس سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں، چنانچہ وہ اس کی ہر خواہش پوری کرتے تھے۔ اسے ہر بات کی آزادی تھی۔ چاہے دل بھر کے مٹھائیاں کھائے، چاہے بڑے دلکش انداز میں غرا کر بات کرے، یہی نہیں، اس کا لباس بھی سب بہنوں سے بہتر ہوتا تھا۔

سب سے چھوٹی بہن، کاسیا ابھی چودہ سے کچھ ہی اوپر تھی۔ لیکن اس انوکھی بچی کے سر اور شانے ابھی سے اپنی ماں سے نکلتے ہوئے تھے۔ اس کی اٹھان کا یہ عالم تھا کہ اس نے ابھی سے بڑی بہنوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ مل کے نوجوانوں کی نظریں مدتوں سے اس کے جسم کی گرمی سے سرشار ہو رہی تھیں۔ یہ نوجوان نجانے کب سے نسوانی حلقہ سے کٹے ہوئے تھے، کیونکہ مل شہر سے بہت دور تھی۔ کاسیا بڑی چوکس تھی، وہ ان کی نگاہوں اور چھیڑ چھاڑ کا جواب نہایت سادگی اور بےحجابی سے دیتی تھی۔

خاندان کی دلربائیوں کی یہ تقسیم مل میں ہر شخص کو معلوم تھی۔ ایک مسخرے نے تو ایک دفعہ یہاں تک کہہ دیا کہ آدمی یا تو زینینکو کی پانچوں بیٹیوں سے شادی کرے یا ایک سے بھی نہ کرے۔ عملی تعلیم کے لئے آئے ہوئے طالب علم اور انجنیر زینینکو کے گھر کو ہوٹل سمجھتے اور صبح سے شام تک اس کے چکر لگاتے رہتے۔ ڈٹ کے

کھاتے، اس سے بھی زیادہ ڈٹ کے پیتے، لیکن شادی بیاہ کے جال میں پھنسنے سے صاف بچ نکلتے۔

بوبروف زینینکو کے خاندان میں خاصا غیر مقبول تھا۔ مادام زینینکو بڑی فرسودہ خیال تھیں، وہ ہر چیز کو سخت مگر خوشگوار قصباتی آداب محفل کے پیمانے میں تولنے کی قائل تھیں، ان کے غیر شائستہ مذاق پر بوبروف کا رویہ کچھ ایسا تھا جو انھیں بہت بار گزرتا تھا۔ جب کبھی بوبروف کی طبیعت زوروں پر ہوتی تو ایسے طنز آمیز جملے استعمال کرتا کہ سننے والوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں اور جب کبھی تھکا ہوا اور پریشان ہوتا تو سری سری شام منہ کو گوند لگائے رکھتا اور لوگ سمجھتے کہ وہ بہت گھنا اور مغرور ہے اور خاموش طنز کر رہا ہے۔ یہی نہیں، مصیبت یہ تھی کہ ایسے میں لوگ سمجھتے تھے کہ وہ "رسالوں کے لئے کہانیاں لکھ رہا ہے اور ان کہانیوں کے کردار جمع کر رہا ہے۔"

بوبروف خوب جانتا تھا کہ کھانے کی میز پر ان کی بے توجہی اور مادام زینینکو کے کندھے جھٹکانے کا مطلب کیا ہے پھر بھی وہ مستقل مزاجی سے ان کے ہاں آتا رہا۔ اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ اسے نینا سے محبت ہے یا نہیں۔ کبھی کبھی وہ تین چار دن ان کے ہاں نہ جا سکتا تو نینا کے خیال سے اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو

جاتی اور اس پر میٹھی میٹھی افسردگی چھا جاتی۔ اس کی نگاہوں میں نینا کا باوقار اور نازک سراپا ابھرتا اور پلکوں کی اوٹ سے مسکراتی ہوئی بھیگی بھیگی آنکھیں یاد آجاتیں، نینا کے جسم سے اٹھتی ہوئی بھینی بھینی مہک کا خیال آتا، اور بے اختیار سفیدے کی نوخیز کلیوں کی خوشبو یاد آجاتی۔

دوسری طرف زینینکو کے ہاں مسلسل تین شامیں گزارنا بھی غضب تھا۔ وہ ان کی صحبت اور باتوں سے بیزار ہو جاتا تھا، ہمیشہ وہی مخصوص ماحول اور وہی بندھی ٹکی باتیں، ان کے چہروں کے غیرفطری اور عامیانہ رنگ دیکھ کر اس کا دل گھبرانے لگتا۔ ''نوجوان خواتین،، اور ان سے ''عشق،، کرنے والے ''عاشقوں،، کے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مخصوص سطحی تعلقات قائم ہو گئے تھے (زینینکو کے خاندان میں ہمیشہ یہی الفاظ استعمال ہوتے تھے)۔ دونوں فریق ظاہر کرتے کہ وہ دوسرے فریق سے بگڑے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد کوئی نہ کوئی عاشق مذاقاً اپنی نوجوان خاتون کی کوئی چیز چھپا لیتا اور قسمیں کھاتا کہ اب کبھی واپس نہیں کرے گا۔ نوجوان خواتین سر جوڑ کر کھسر پھسر کرتیں، اس مسخرے کو ''ذلیل،، کا خطاب دیتیں، اور انتہائی سمع خراش آواز میں کھی کھی کرنے لگتیں۔ اس قسم کے ڈرامے روزانہ دکھائے جاتے اور روزانہ وہی بند ھے ٹکے جملے اور اشارے

کنائے ہوتے اور وہی مخصوص جملے دوہرائے جاتے۔ بوبروف زینینکو کے یہاں سے واپس لوٹتا تو اس کے سر میں سخت درد ہوتا اور ان قصباتی آداب محفل کی وجہ سے اس کے اعصاب میں ایک عجیب تناؤ سا ہو جاتا۔

مختصر یہ کہ کبھی بوبروف کو نینا کے نرم و گرم ہاتھوں کا بے چین لمس یاد آتا اور اس کا دل نینا کے لئے تڑپ اٹھتا اور کبھی اس کے خاندان کی بے رنگی، تصنع اور بناوٹ کی وجہ سے اسے کراھیت سی ہونے لگتی۔ وہ خوب جانتا تھا کہ نینا کے بے ہودہ نازو ادا اور روحانی تہی دستی، ان کی شادی شدہ زندگی کو جہنم بنا دے گی، وہ یہ بھی جانتا تھا کہ نینا اور اس کے خاندان کے سوچنے سمجھنے کا ڈھنگ مختلف ھے پھر بھی نجانے کتنے لمحے ایسے آئے جب اس کا دل نینا سے شادی کی درخواست کرنے کو بے قرار ہوا۔ لیکن وہ آج تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا اس لئے ہر دفعہ دل پر قابو پا لیتا تھا۔

اور اب وہ شپیتوفکا کے یہاں جا رہا تھا اور خوب جانتا تھا کہ کس سوال پر وہ لوگ کیا کہیں گے، وہ تصور ھی تصور میں ان کے چہروں کا رنگ شک دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ نوجوان خواتین ہمیشہ گبرو جوانوں کی منتظر رہتی ھیں، جیسے ھی وہ برآمدے سے کسی کو آتے دیکھیں گی،

ان میں بحث شروع ہو جائیگی کہ آنےوالا کون ہے۔ اور جب وہ قریب پہنچ جائیگا تو وہ بہن خوشی سے اچھل پڑےگی، جس کا اندازہ صحیح تھا۔ وہ تالیاں بجا بجاکر اور زبان نکال نکال کر کہےگی: ''بولو، اب بولو؟ میرا اندازہ ٹھیک تھا، نا؟،، وہ یہ کہہ‌کر آننا افاناسئیونا کے پاس بھاگےگی: ''بوبروف آ رہا ہے ماما، سب سے پہلے میں نے بتایا تھا ماما!،، اس کی ماں، آہستہ آہستہ چائے کی پیالیاں خشک کرتے کرتے، فوراً نینا سے کچھ اس طرح کہےگی جیسے وہ بیٹی کو کوئی بڑی انوکھی اور غیر متوقع بات بتا رہی ہو: ''نینا جانتی ہو بوبروف آ رہا ہے،،۔ آخر میں بوبروف کو داخل ہوتے دیکھ کر وہ سب کی سب بہت زور زور سے اظہار تعجب کریں‌گی۔

٤

فیروے لگام جھٹکتا اور زور زور سے سانس لیتا ہوا دوڑتا رہا۔ سامنے شپیتوفکا کی جاگیر نظر آرہی تھی۔ پھولوں کی جھاڑیوں اور ببول کے سرسبز جھنڈوں سے اس کی سفید دیواروں اور سرخ چھت کی ہلکی سی جھلک نظر آرہی تھی۔ نیچے، سرسبز کناروں سے گھرا ہوا ننھا سا تالاب دور ہی سے صاف نظر آ رہا تھا۔

گھر کی سیڑھیوں پر کوئی عورت کھڑی تھی۔
بوبروف نے نینا کے چمکدار پیلے بلاؤز کو دور ہی سے پہچان لیا، اس کے سنولائے ہوئے رنگ پر یہ بلاؤز کتنا کھلتا تھا۔ اس نے فوراً لگام کھینچی، پاؤں رکابوں میں پھنسائے اور سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔
"پھر اپنے لاڈلے پر سوار ہو گئے؟ اف مجھے تو اس وحشی درندے کی صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں ہے!"، من موجی نینا لاڈوں میں بگڑے ہوئے بچوں کی طرح بگڑکر چلائی۔ وہ ایک عرصے سے بوبروف کے محبوب گھوڑے کا مذاق اڑاتی اور اسے چڑایا کرتی تھی۔ زینینکو کے یہاں ہمیشہ کسی نہ کسی بات پر کسی نہ کسی کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔
بوبروف نے لگام مل کے کوچوان کے ھاتھ میں تھما دی جو دوڑتا ہوا وہاں پہنچا تھا۔ گھوڑے کی مضبوط گردن پسینے سے سیاہ ہو رہی تھی۔ بوبروف نے گھوڑے کی گردن سہلائی اور نینا کے پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ آننا افاناسئیونا سماوار کے پاس اکیلی بیٹھی تھیں، انھوں نے بوبروف کی آمد پر نہایت مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔
"آؤ، اندرئی ایلیچ!"، وہ تھرتھراتی ہوئی آواز میں چلائیں۔ "چلو خیر تم آئے تو سہی!"
بوبروف نے انھیں سلام کیا اور انھوں نے بوبروف کے ھونٹوں سے ھاتھ چپکا دیا اور جھنجھنائی ہوئی

آواز میں اس سے پوچھا: ''چائے پیوگے یا دودھ، سیب؟ کہو کیا چاہئے؟،،

''Merci*، آننا افاناسئیونا۔،،

«Merci oui, ou merci non? **»

اس قسم کے فرانسیسی الفاظ زینینکو کے خاندان میں بہت مقبول تھے۔ بوبروف نے کہا کہ میں کچھ نہیں کھاؤں گا۔

''اچھا تو پھر برآمدے میں جاؤ،، مادام زینینکو نے نہایت کھلے دل سے اسے اجازت دے دی۔ ''لڑکے لڑکیاں فورفیٹ یا نجانے کیا کھیل رہے ہیں۔،،

وہ برآمدے میں پہنچا تو چاروں نوجوان خواتین نے ہم‌آواز ہوکر بالکل اپنی ماں کی طرح جھنجھناتی ہوئی آواز اور ماں کے لہجے میں کہا: ''آؤ، آؤ! اندرئی ایلیچ! تمھیں دیکھے تو صدیاں بیت گئیں! کہو کیا کھاؤگے، چائے پیوگے؟ بھئی دودھ، سیب کچھ تو کھاؤ؟ نہیں بھئی ایسا صاف انکار تو نہ کرو! کچھ تو کھا ہی لو؟ اچھا، خیر اگر نہیں کھاتے تو پھر آؤ ہمارے ساتھ کھیلو۔،،

وہ لوگ ''خواتین کے سو روبل،، ، ''رائیں،، اور ایک اور کھیل کھیلتے رہے جیسے توتلی کاسیا

---

* شکریہ۔ (فرانسیسی)

** شکریہ — مہربانی یا شکریہ — نہیں؟ (فرانسیسی)

”برتنوں کا کھیل،، کہتی تھی۔ مہمانوں میں تین طالب علم بھی تھے، تینوں مستقل سینہ پھلائے، ایک پاؤں آگے بڑھائے اور فراک کوٹ کی پچھلی جیب میں ہاتھ ڈالے ہوئے نہایت ڈرامائی حرکتیں کر رہے تھے۔ مستری ملر بھی وہاں موجود تھا، یہ حضرت اپنے حسن، حماقت اور انتہائی بھاری آواز کے لئے مشہور تھے۔ ان کے علاوہ خاکستری لباس والا ایک کم سخن شخص اور تھا جس کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔

کھیل بے مزہ چل رہا تھا۔ مردوں نے بڑی اونچائی اور بڑی بیزاری سے اپنا فورفیٹ ادا کیا اور نوجوان خواتین نے اپنا فرض ادا کرنے سے بالکل ھی انکار کر دیا۔ وہ پانچوں آپس میں کھسر پھسر اور بڑے بناوٹی انداز میں کھی کھی کرتی رھیں۔

شام کا دھندلکا پھیلنے لگا۔ قریب کے دیہاتی مکانوں کی چھتوں کے پیچھے سے بڑا سا سرخ چاند ابھر آیا۔

”اندر آ جاؤ، بچو!،، کھانے کے کمرے سے آننا افاناسئیونا کی آواز آئی۔ ”ملر سے کہو کچھ گاکے سنائے!،،

لمحے بھر بعد کمروں میں نوجوان خواتین کی آوازیں گونجنے لگیں۔

''ارے اماں بڑا لطف رہا،، وہ اپنی ماں کے گرد چہچہا رہی تھیں۔ ''اتنا ہنسے اتنا ہنسے کہ حد نہیں!،،

نینا اور بوبروف برآمدے میں رہ گئے۔ نینا زینے کے قریب کٹھرے پر بیٹھی بائیں بازو سے ایک ستون کو جھٹکے دے رہی تھی اور بڑی بے ساختگی اور وقار سے اس پر جھکی ہوئی تھی۔ بوبروف اس کے قدموں کے قریب باغ میں پڑے ہوئے ایک نیچے سے بنچ پر بیٹھ گیا۔ اس نے منہ اٹھا کر نینا کے چہرے کی طرف دیکھا تو اسے اس کے حلق اور ٹھوڑی کے نازک خط نظر آئے۔

''اندرئی ایلیچ، بھئی کوئی دلچسپ بات سناؤ،، اس نے بے تابی سے حکم دیا۔

''حد ہے، سمجھ میں نہیں آ رہا کیا سناؤں،، اس نے جواب دیا۔ ''بھئی یوں حکم پر بات کرنا تو مشکل ہے، خیر کوشش کرتا ہوں، شاید مختلف موضوعات پر کچھ گھسی پٹی باتیں یاد آ جائیں۔،،

''افوہ کتنے بدمذاق آدمی ہو،، وہ تڑپی۔ ''آخر کبھی تمھاری طبیعت زوروں پر ہوتی ہی نہیں؟،،

''مگر تم خاموشی سے اس قدر خوفزدہ کیوں ہو؟ بات چیت مدھم پڑی نہیں کہ تم پہلو بدلنے لگیں۔ زبان خاموشی میں بات کرنا اتنا برا ہے کیا؟،،

''تو پھر آؤ، آج کی شام خاموش رہیں،، نینا نے چہک کر اسے چھیڑا۔

”ہاں آؤ، دیکھو : آسمان کیسا صاف ہے، چاند ایک بڑا سا سرخ تھال معلوم ہو رہا ہے۔ باغ میں کس بلاکی خاموشی ہے۔ آخر اور کیا چاہئے ہمیں؟“

”اف یہ بےجان اور اجاڑ و احمقانہ آسمان اور اس پر ٹنگا ہوا یہ بے جان اور اجاڑ چاند کس قدر احمقانہ لگ رہے ہیں“ نینا نے گویا کسی کتاب کا اقتباس پیش کیا۔ ”ارے ہاں تم نے سنا زینا ماکووا کی منگنی پروتوپوپوف سے ہو گئی؟ تو آخر شادی ہو ہی رہی ہے! بھئی میری سمجھ میں تو آیا نہیں یہ پروتوپوپوف“ اس نے شانے جھٹکے۔ ”زینا نے ایک چھوڑ تین دفعہ انکار کیا، لیکن اس نے کسی طرح پیچھا نہ چھوڑا۔ چوتھی دفعہ پھر درخواست ٹھونک دی، خیر خود ہی بھگتےگا۔ کون جانے زینا شوہر کی عزت کرنے لگے مگر بھئی، محبت تو وہ کبھی کر نہیں سکتی!“

یہ سنتے ہی بوبروف کا دم گھٹنے لگا۔ زینینکو کے گھروالوں کی اتھلی اور قصباتی ذہنیت دیکھ کر اور گھسی پٹی کہاوتیں سن کر اسے ہمیشہ الجھن ہوتی تھی۔ یہ کہاوتیں عام طور پر کچھ اس قسم کی ہوتی تھیں ”فلاں اس سے محبت کرتی ہے مگر اس کی عزت نہیں کر سکتی“ یا ”وہ اس کی عزت تو کرتی ہے مگر ظاہر ہے محبت نہیں کر سکتی“۔ ان کے خیال میں اس طرح وہ عورت ومرد کے پیچیدہ سے پیچیدہ تعلقات کو بیان

کر سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ دو محاورے اور تھے — ''سیاہ بالوں‌والا،، اور ''بھورے بالوں‌والا،،۔ ہاں تو اور یہ دو محاورے کسی بھی شخص کی اخلاقی، ذہنی اور جسمانی خصوصیات بیان کرنے کے لئے کافی تھے۔

بوبروف کے دل میں ایک مبہم سی خواہش نے سر اٹھایا اور وہ اپنے غصے کو مزید ہوا دینے کے لئے بےتاب ہو گیا۔ اس نے پوچھا: ''اور یہ پروتوپوپوف کس ڈھنگ کا آدمی ہے؟،،

''پروتوپوپوف؟،، نینا لمحے بھر کچھ سوچتی رہی۔ ''وہ — ذرا لمبا سا ہے اور بال بھورے ہیں۔،،

''بس یا اور کچھ؟،،

''ارے تو اور کیا پوچھنا چاہتے ہو؟ ہاں وہ داروغۂ چنگی ہے۔،،

''بس؟ کمال ہے، نینا گریگورئیونا۔ کسی کے کردار پر روشنی ڈالنے کے لئے تمہارے خیال میں صرف اتنا کافی ہے کہ اس کے بال بھورے ہیں اور وہ چنگی کا داروغہ ہے۔ ذرا سوچو تو سہی زندگی میں کیسے کیسے دلچسپ، سمجھ دار اور صاحب ہنر لوگ نظر آتے ہیں۔ کیا وہ ''بھورے بالوں والے داروغۂ چنگی،، سے زیادہ کچھ نہیں ہوتے؟ ذرا دیکھو، کسانوں کے بچے کتنے جوش سے زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں، کبھی سوچو ان کی رائے کتنی مناسب ہوتی ہے۔ اور تم، تم سمجھدار اور حساس

لڑکی ہو، لیکن کبھی بھول کر بھی کسی چیز، کسی بات میں کوئی دلچسپی نہیں لیتیں، تمھارے لئے اونچی سوسائٹی کے درجن بھر گھسے پٹے محاوروں کا ذخیرہ بہت ہے۔ ہمیشہ وہی بندھی ٹکی باتیں۔ اگر بات‌چیت کے دوران میں کسی نے چاند کا ذکر کیا تو تم کہوگی: 'اف کس قدر بےجان اور اجاڑ ہے یہ چاند۔' اگر میں کبھی تمھیں کوئی غیر معمولی واقعہ سناؤں‌گا تو میں خوب جانتا ہوں تم فوراً کہوگی 'بالکل نئی داستان ہے، لیکن اس میں خاص بات کیا ہے۔' ہمیشہ یہی بندھی ٹکی باتیں ہوتی ہیں، ہمیشہ۔ یقین مانو انوکھی اور نرالی چیزیں ہی دنیا میں ... "

"معاف کیجئیے مجھے لکچر پلانے کی تکلیف نہ کیجئیے،" نینا نے ترکی بہ ترکی کہا۔

وہ خاموش ہو گیا۔ اس کی طبیعت مکدر ہو رہی تھی، پانچ سات منٹ دونوں بے حس و حرکت اور خاموش بیٹھے رہے۔ اچانک فضا میں کوئی راگ گونج اٹھا اور ڈرائنگ روم سے انھیں ملر کے گانے کی آواز آئی، اس کی آواز میں کچھ کمی ضرور تھی مگر بڑی پراثر تھی جہاں رقص‌وسرود سب سے زیادہ تیز، سب سے زیادہ جنون‌خیز تھا۔

رقص وسرود کے گہوارے میں
دیکھا وہاں تمھیں اس نظارے میں۔

بجھا بجھا کچھ اداس چہرہ
چاند گھرا تھا زرد ہالے میں۔

دیکھتے دیکھتے بوبروف کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا، اب اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے نینا کو ناحق کچوکے لگائے۔ ''اس ننھے سے سیدھے سادے دماغ والی لڑکی سے میں اس قدر سنجیدگی اور دلیری کی امید کیوں کروں؟،، اس نے سوچا۔ ''وہ تو ننھی سی چڑیا ہے، دماغ میں کوئی خیال آیا نہیں کہ وہ چہک اٹھی۔ کون جانے یہ چہچہاہٹ، عورتوں کی آزادی اور ہنروں اور کلاؤں کی تعریف اور انحطاط کے بارے میں اونچی اونچی باتوں سے بہتر ہو؟،،

''نینا گریگورئیونا، خدا کے لئے خفا نہ ہو،، اس نے زیرلب کہا ''میں بےسوچے سمجھے نجانے کیا کیا بک گیا۔ ،،

نینا نے جواب نہیں دیا، وہ بیٹھی ہوئی کہیں دور ابھرتے ہوئے چاند کو تکتی رہی۔ بوبروف نے اندھیرے میں نینا کا ہاتھ ڈھونڈ کر بڑی محبت سے دبایا۔

''نینا گریگورئیونا ، خدا کے لئے،، اس نے سرگوشی کی۔

اچانک وہ بوبروف کی طرف تیزی سے پلٹی اور بہت اضطراب کے ساتھ اس کا ہاتھ دبایا۔

''اف تم کتنے بدمزاج ہوا!'' اس نے محبت بھرا شکوہ کیا۔ ''تم خوب جانتے ہو میں تم سے کبھی خفا نہیں ہو سکتی، جبھی تم ہمیشہ مجھے دکھ دیتے ہو!''

نینا نے اس کا ہاتھ جھٹکے سے پیچھے ہٹایا، تڑپ کر اس کی گرفت سے نکلی اور برآمدے سے ہوتی ہوئی گھر میں بھاگ گئی۔ اس وقت بوبروف کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

ملر بڑے جذبات اور اداسی کے ساتھ گا رہا تھا:

خیالوں کی دنیا میں بھٹکتا رہا،
نہیں جانتا پیار ہے مجھ کو تجھسے؟
پر کہتا ہے دل، پیار کرتا رہوں گا۔

''پر کہتا ہے دل، پیار کرتا رہوں گا!'' بوبروف نے گہرا سانس لیا اور دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر بڑی بےقراری سے زیرلب دوہرایا۔

''یہ سادی اور بیکراں مسرت پہلو میں موجود ہو تو پھر مجھے کیا پڑی ہے کہ کسی انجانی اور عظیم مسرت کے خوابوں کے پیچھے جان دیتا پھروں؟'' اس نے جذباتی ہو کر سوچا۔ ''اتنی محبت کرنے والی، اتنی دلکش ، اتنی اچھی اور اتنا خیال کرنے والی عورت اور بیوی مل جائے تو اور پھر کیا چاہئے؟ آخر میں عورت سے چاہتا کیا ہوں؟

هم پریشان حال غریب اور مضطرب انسان اس کے لئے تیار نہیں ھیں کہ زندگی کی خوشیوں کو ان کے حقیقی روپ میں اپنا لیں، ھم تو بس یہ چاھتے ھیں کہ ھماری حریصانہ خواھشیں خود ھمارے اور دوسروں کے ھر جذبے اور ھر ارادے پر اثرانداز ھوں۔ یہ خاموش رات، محبوبہ کا یہ قرب، اس کی سیدھی سادی دلکش باتیں، لمحے بھر کو غصے کی ایک لہر اور پھر یوں اچانک محبت سے ھاتھ دبانا۔ اف خدا! کیا یہ ھی باتیں زندگی کو خوشگوار بنانے کو کافی نہیں ھیں؟ ''

وہ شاداں شاداں ڈرائنگ روم میں داخل ھوا۔ اس کی اور نینا کی نظریں چار ھوئیں۔ اور ان نگاھوں میں اسے اپنے خیالات کا محبت بھرا جواب مل گیا۔ ''وہ مجھ سے شادی کرلےگی،'' اس نے بڑے سکون اور خوشی کے ساتھ دل ھی دل میں کہا۔

کواشنین کے بارے میں باتیں ھو رھی تھیں۔ آننا افاناسئیونا نے کہا کہ وہ بھی کل اپنی ''ننھی بچیوں'' کو اسٹیشن لے جائےگی۔ اس کی اعتماد بھری تیز آواز کمرے کی فضا پر چھا گئی۔

''کیا عجیب ھے کہ واسیلی تیرینتیوچ ھمارے ھاں بھی آئیں۔ بہرحال لیزا بیلوکونسکایا نے مہینے بھر پہلے ھی مجھے اس سفر کی اطلاع دے دی تھی۔ لیزا میری چچیری بہن کے شوھر کی بھانجی ھے۔''

''یہ وھی بیلوکونسکایا ھے کیا جس کے بھائی

کی شادی شہزادی مخوویتسکایا سے ہوئی ہے؟،،
زینینکو نے حسب‌معمول بڑے انکسار سے پوچھا۔
''ہاں،، آننا افاناسئیونا نے آسمان کی بلندیوں سے جواب دیا۔ ''دادی کی طرف سے استرےموخوف سے بھی دور کی رشتےداری ہے۔ ائے استرےموخوف کو تو جانتے ہی ہو تم، ہاں تو لیزا نے مجھے لکھا تھا کہ کسی پارٹی میں وہ واسیلی تیرینتیوچ سے ملی، اور اس نے محترم واسیلی سے کہا کہ اگر کبھی مل کی طرف جانے کا اتفاق ہو تو زینینکو کے ہاں ضرور جانا۔،،
''آننا، ہم ان کے شایان‌شان خیرمقدم بھی کر سکیں‌گے بھلا؟،، زینینکو نے گھبرا کر پوچھا۔
''ائے لو تم بھی عجیب باتیں کرتے ہو! اپنی بساط بھر سب کچھ کریں‌گے۔ مگر بھئی انہیں مرعوب کرنے کا بھلا کیا سوال، کوئی مذاق نہیں ہے۔ ان کی سالانہ آمدنی تین لاکھ روبل ہے۔،،
''اف میرے خدا! تین لاکھ!،، زینینکو نے آہ بھری۔ ''سوچ کر کپکپی چھٹ جاتی ہے۔،،
''تین لاکھ!،، نینا آہ بھرکر بولی۔
''تین لاکھ!،، باقی خواتین نے سر میں سر ملاکر بڑی پرجوش آواز میں کہا۔
''ہاں، اور سنا ہے وہ سب کا سب لٹا دیتا ہے، ایک ایک پائی،، آننا افاناسئیونا نے کہا۔ اور پھر جیسے بیٹیوں کے ایک ان‌کہے خیال کے جواب

میں بولی : ''شادی شدہ ہے۔ لیکن کہتے ہیں اس کی ازدواجی زندگی ناکام رہی۔ کوئی کردار ہی نہیں ہے اس کی بیوی کا، ائے کوئی خصوصیت نہیں ہے نگوڑی میں۔ بھئی سچی بات ہے بیوی کو شوہر کے کاروباری کاموں میں ہاتھ بٹانا چاہئے۔''

''تین لاکھ!'' نینا نے دوبارہ کہا، جیسے خواب کے عالم میں کہہ رہی ہو۔ ''اتنے روپے سے آدمی کیا نہیں کر سکتا؟''

آننا افاناسئیونا نے نینا کے گھنے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

''اگر ایسا شوہر مل جائے تو میری بچی کی تقدیر ہی پلٹ جائے کیوں بیٹا؟''

تین لاکھ کی سالانہ آمدنی نے محفل کا رنگ ہی بدل دیا۔ کروڑپتیوں کی زندگی کے نقشے کھینچے گئے، ان کے رنگارنگ کھانوں، شاندار گھوڑوں، رقص و سرود کی محفلوں، اور ان کے لامحدود اخراجات کے بارے میں طرح طرح کے قصے سنائے گئے۔ ہر شخص کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی تھی اور چہرے دمک رہے تھے۔

بوبروف پر اوس پڑ گئی۔ اس کے دل میں درد کی کسک سی ہونے لگی۔ اس نے خاموشی سے ہیٹ اٹھایا اور چپکے سے برساتی میں نکل آیا۔ اس وقت بھلا کس کو اتنا ہوش تھا کہ اس کی طرف دھیان دیتا۔

بوبروف گھوڑے پر سوار گھر کی طرف چلا جا رہا تھا۔ اسے نینا کی بھیگی بھیگی اور خواب آلود آنکھیں یاد آئیں اور ایک اضطراب کے عالم میں زیر لب اس کا یہ کہنا یاد آیا: ''تین لاکھ!''، اچانک اسے سویژیفسکی کا سنایا ہوا وہ قصہ یاد آنے لگا جس کے سنانے پر آج صبح وہ اتنا مضر تھا۔

''یہ بھی بک سکتی ہے''، اس نے دانت پیس کر سوچا اور وحشت کے عالم میں فیروے کی گردن پر ہنٹر برسانے لگا۔

۵

مکان کے قریب پہنچنے پر بوبروف کو کھڑکی میں روشنی نظر آئی۔ اس نے پسینے میں شرابور گھوڑے کی لگام کھینچتے ہوئے سوچا کہ ''میری غیرموجودگی میں ڈاکٹر آ گیا ہوگا، اور اس وقت میرے انتظار میں صوفے پر لیٹا ہوگا۔''، صرف ایک ڈاکٹر گولڈبرگ ایسا تھا جس کی موجودگی سے اسے کوفت اور الجھن محسوس نہ ہوتی۔

اسے خوشحال و نیک دل یہودی، ڈاکٹر گولڈبرگ دل سے پسند تھا۔ کتنی گوناگوں تھی اس کی ذہانت، شباب کا کیسا جوش، کیسی دلکشی تھی اس میں۔ خیالی بحث مباحثے کے لئے کتنی بزرگانا لگن تھی اس کے دل میں۔ بوبروف جو کوئی مسئلہ چھیڑتا،

ڈاکٹر گولڈبرگ ہمیشہ اسی دلچسپی اور جوش سے اس کے ہر نقطۂ نظر کی مخالفت کیا کرتا۔ ان کے بحث‌ومباحثے سے صرف ایک نتیجہ نکلتا تھا یعنی ان کے لامتناہی دلائیل کی ٹکر لیکن انھیں ایک دوسرے کی کمی کھلنے لگتی چنانچہ وہ تقریباً روز ایک دوسرے سے ملتے تھے۔

بوبروف کا خیال ٹھیک ہی تھا۔ ڈاکٹر صوفے کی پشت پر پاؤں جمائے لیٹا تھا۔ اور نزدیک بین آنکھوں سے چپکائے کتاب پڑھنے میں مشغول تھا۔ بوبروف نے ایک ہی نظر میں پہچان لیا — میوس کی ”ہینڈبک اف میٹالرجی“ تھی۔ وہ مسکرایا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ ڈاکٹر کو جو کچھ مل جائے وہ اسی انہماک سے پڑھتا ہے اور ہمیشہ کہیں سے بیچ سے کتاب شروع کر دیتا ہے۔

”جانتے ہو تمہاری غیرموجودگی سے فائدہ اٹھا کر چائے پی ڈالی“، ڈاکٹر نے کتاب دور رکھ دی اور عینک کے اوپر سے بوبروف کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہوں تو کہو اندرئی ایلیچ، کیا حال ہے؟ اف میرے خدا، مزاج کا پارہ چڑھا ہوا ہے! کیا قصہ کیا ہے؟ خوش آئیند دکھوں کا کوئی نیا طوفان اٹھ رہا ہے کیا؟“

”ڈاکٹر، زندگی کس قدر بےرنگ ہے“، بوبروف نے بیزاری سے کہا۔

”کیوں، میرے دوست، کیا ہوا؟“

''اف ڈاکٹر، میں خود بھی نہیں جانتا کہ بات کیا ہے، بس عجیب حال ہے، ہاں کہو تمہارے اسپتال کا کیا رنگ ہے؟''

''اسپتال ٹھیک ہے۔ آج آپریشن کا ایک بےحد دلچسپ کیس کیا ہے۔ واقعی ہنسی کی ہنسی، دکھ کا دکھ۔ ہوا یہ کہ آج صبح مسالسک کا ایک معمار میرے پاس آیا۔ یہ مسالسک والے سب کے سب ہٹے کٹے ہوتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ 'کیا بات ہے؟' تو بولا 'ڈاکٹر میں اپنی ٹیم کے لئے روٹی کاٹ رہا تھا، میری انگلی میں ذرا سا زخم آ گیا، کسی طرح خون نہیں تھمتا'۔ میں نے اس کی انگلی دیکھی، زخم ہلکا تھا، گھبرانے کی کوئی بات نہیں تھی مگر ذرا پک سی گئی تھی انگلی۔ میں نے اپنے مددگار سے کہا کہ اس کی مرہم پٹی کر دو۔ لیکن وہ مرہم پٹی کے بعد بھی بیٹھا رہا تو میں نے کہا 'کہو اب کیا بات ہے۔ مرہم پٹی ہو گئی، اب تم جا سکتے ہو۔' بولا 'وہ تو ٹھیک ہے، شکریہ۔ مگر ڈاکٹر بات یہ ہے کہ میرا سر پھٹ گیا ہے۔ سوچتا ہوں شاید تمہارے پاس اس کی بھی کوئی دوا نکل آئے'۔ 'سر کیسے پھٹ گیا؟ کوئی پتھر وغیرہ کھا لیا تھا کیا؟' وہ خوشی کے مارے اچھل پڑا، ہنس کر بولا: 'ہاں ڈاکٹر، اس سے انکار تو نہیں کر سکتا۔ کہنے لگا: 'چند دن پہلے ہم ایک مذہبی تہوار مناتے تھے۔ شاید نجات دہندہ کا دن تھا۔

کوئی تین دن ہوئے ہوں گے — تو جی وہاں ہم نے بالٹی بھر وادکا چڑھا لی۔ اور پھر آپس میں دھما چوکڑی شروع ہو گئی۔ تم تو ڈاکٹر جانتے ہی ہو لڑائی جھگڑے میں کیا ہوتا ہے کیوں؟ بس جی میری چندیا پر چھینی سے اچھی خاصی دراڑ پڑ گئی... اس نے میری کچھ مرمت کر دی... شروع میں تو کچھ ایسا برا نہیں رہا، درد وغیرہ کچھ نہیں ہوا۔ مگر اب درد سے سر پھٹا جا رہا ہے۔ ، سو میں نے اس کی 'چندیا، کا معائنہ کیا اور دیکھ کر بوکھلا گیا۔ ذرا سوچو اس کی کھوپڑی ٹوٹ کر اس میں پیسہ برابر چھید ہو گیا تھا۔ ٹوٹی ہوئی ہڈی کے ٹکڑے اس کے بھیجے میں پیوست تھے۔ اس وقت اسپتال میں بے ہوش پڑا ہے۔ واقعی میں کہتا ہوں لاجواب لوگ ہیں۔ ایک طرف بالکل بچے ہیں اور دوسری طرف انتہائی جیالے سورما۔ سچ کہتا ہوں صابر روسی کسان کے سوا اور کوئی یہ برداشت نہیں کر سکتا ہے کہ اس کی کھوپڑی کی اس طرح 'مرمت، کی جائے۔ اور کوئی ہوتا تو وہیں اس کی روح پرواز کر جاتی۔ اور پھر سادگی اور بزلہ سنجی ملاحظہ ہو! 'تم تو جانتے ہی ہو لڑائی جھگڑے میں کیا ہوتا ہے۔، اف خدا!،،

بوبروف کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ وہ اونچے اونچے جوتوں پر سائیں سائیں چابک رسید کرتا

ہوا کھویا کھویا سا ڈاکٹر کی باتیں سن رہا تھا۔ زینینکو کے ہاں اس کی روح پر ایسی تلخی چھائی تھی کہ اب تک اس کا اثر باقی تھا۔

ڈاکٹر لمحے بھر کو رکا۔ اس نے دیکھا کہ بوبروف اس وقت باتیں کرنے کے موڈ میں نہیں ہے تو بڑی ہمدردی سے بولا: ''اندرئی ایلیچ، میرے خیال میں رات کو ایک دو چمچہ برومائیڈ کھا کر سونے کی کوشش کرو۔ اس وقت تمھاری ذہنی کیفیت ایسی ہے کہ برومائیڈ سے بہت فائدہ ہوگا۔ بھئی نقصان تو بہرحال نہیں ہوگا۔''

وہ دونوں اسی کمرے میں لیٹ گئے۔ بوبروف نے پلنگ پر قبضہ جمایا اور ڈاکٹر وہیں صوفے پر ڈٹا رہا۔ دونوں لیٹے تھے لیکن نیند ایک کو بھی نہ آئی۔ گولڈبرگ بڑی دیر تک بوبروف کو کروٹیں بدلتے اور کراہتے سنتا رہا، آخر اس نے کہا:

''کیا بات ہے، دوست؟ کچھ بتاؤ تو کیا پریشانی ہے؟ بتاتے کیوں نہیں کہ تمھارے ذہن پر کیا بوجھ ہے؟ تم جانتے ہو میں اجنبی نہیں ہوں کہ محض تجسس کی خاطر کرید کر رہا ہوں۔''

ان سیدھے سادے الفاظ نے بوبروف کے دل پر بہت اثر کیا۔ بوبروف اور ڈاکٹر کی بڑی دوستی تھی لیکن دونوں نے کبھی اشارتاً بھی ایسے جذبات کو الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا تھا۔ دونوں بہت حساس طبیعت تھے اور دونوں ہی اعتراف کا

خیال آتے ہی شرم سے کانپ اٹھتے تھے۔ آخر ڈاکٹر نے بوبروف کی محبت سے مجبور ہوکر اور اندھیرے کی آڑ لیکر دل کھولنے میں پہل کی۔

"کیا بتاؤں اوسپ اوسپووچ، ہر چیز ذہن پر ایک بوجھ بن جاتی ہے، چھوٹی سے چھوٹی بات سے کراھیت آنے لگتی ہے"، بوبروف نے آہستہ سے کہا۔ "ایک تو اس خیال سے کوفت ہوتی ہے کہ مجھے اس پورے کاروبار سے نفرت ہے پھر بھی مل میں کام کر رہا ہوں اور اتنا ڈھیر سا روپیہ کما رہا ہوں۔ میں خود کو ایماندار آدمی سمجھتا ہوں، اس لئے بار بار دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ 'میں کیا کر رہا ہوں؟ میرے کام سے کسے فائدہ ہو رہا ہے؟'، اب مجھے چیزیں بہت صاف نظر آنے لگی ہیں، دن بہ دن یہ حقیقت واضح ہوتی جا رہی ہے کہ میری کوششوں کی بدولت سینکڑوں فرانسیسی سرمایہ‌داروں اور درجنوں روسی منافع‌خور اژدھوں کی تجوریاں بھر جائیں‌گی۔ تمھیں بتاؤ میں نے جس کام کی تیاری میں زندگی کے بہترین سال گنوائے ہیں اس کا اور کیا مقصد ہے؟"

"یہ تو عجیب مضحکہ خیز بات ہے، اندرئی ایلیچ"، ڈاکٹر نے اندھیرے میں بوبروف کی طرف منہ کرتے ہوئے احتجاج کیا۔ "تم چاہتے ہو کہ بورژوا لوگ کسی انسانیت کا اظہار کریں۔ دوست، جس دن سے دنیا قائم ہوئی ہے

اس دن سے دنیا پر قانون شکنی کا راج ہے۔ اس کے برعکس نہ کبھی ہوا نہ ہوگا۔ اصل بات یہ ہے کہ تمھیں ان لٹیروں کی پروا نہیں ہے کیونکہ تم ان سے بلند ہو۔ کہو اس خیال سے تمھیں فخر محسوس نہیں ہوتا، تمھاری تسلی نہیں ہوتی کہ تم بقول شخصے بڑی بہادری سے ''ارتقا کی گاڑی،، آگے بڑھا رہے ہو؟ ارے یار مارو گولی۔ جہازراں کمپنیوں کے حصے خرید لو، ایک سے ایک منافع ہوگا، لیکن اس کا یہ مطلب کہاں سے ہوگیا کہ ہم فلٹن کو انسانیت کا محسن کہنا چھوڑ دیں؟،،

''ڈاکٹر پیارے!،، بوبروف کو الجھن ہونے لگی۔ ''تم نے آج زینینکو کے ہاں قدم بھی نہیں رکھا، پھر بھی نجانے کیوں ان کا فلسفہ زندگی بیان کر رہے ہو۔ خیر تمھاری دلیلوں کو غلط ثابت کرنے کے لئے مجھے جواب تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی، میں تو خود تمھارے محبوب نظریے سے تمھاری بات کاٹوں گا۔،،

''کیسا نظریہ؟ میرا محبوب نظریہ کیسا؟ یاد نہیں۔ واقعی دوست، مجھے یاد نہیں آ رہا۔ مجھے تو یاد نہیں آتا ایسا کوئی نظریہ۔،،

''یاد نہیں آتا! اور یہاں اسی صوفے پر بیٹھ کر، منہ سے جھاگ نکال نکال کر کون چیخا تھا کہ ہم انجنیر اور موجد اپنی ایجادات سے سوسائٹی کے دل کی دھڑکن کو بےجا حد تک تیز کر دیتے

ھیں؟ زندگی کا مقابلہ اس جانور کی حالت سے کس نے کیا تھا جو آکسیجن کے مرتبان میں بند ھو؟ مجھے خوب یاد ھے کہ تم نے انسانیت کے ان محسنوں کو بیسویں صدی کے بیٹوں — اعصاب زدوں، پاگلوں اور نڈھال اور بےجان انسانوں کے نام دئے تھے۔ تم نے انھیں خودکشی کے الزام سے نوازا تھا۔ تم نے کہا تھا کہ ٹیلیفون، تار اور اسی میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑنے والی ریلوں نے فاصلوں کو کم سے کم کر دیا ھے بلکہ ایک طرح ختم کر دیا ھے۔ تم نے کہا تھا کہ آج وقت کی قیمت اتنی بڑھ گئی ھے کہ بہت جلد انسان رات کو بھی دن میں بدل دےگا تاکہ دن دگنا ھو جائے۔ جس قسم کی گفت و شنید میں پہلے مہینے لگ جاتے تھے، اب وہ پانچ منٹ میں ختم ھو جاتی ھے، لیکن آج یہ طوفانی رفتار بھی ھمارے لئے کم ھے۔ وہ زمانہ دور نہیں ھے جب ھزاروں لاکھوں میل کے فاصلے کے باوجود ھم تار کی مدد سے ایک دوسرے کو دیکھ سکیں‌گے! لیکن آج سے پچاس سال پہلے اگر ھمارے آباواجداد کو دیہات سے صوبائی مرکز تک جانا ھوتا تھا تو وہ گرجا میں عبادت کرتے اور مہینوں پہلے نکل کھڑے ھوتے، ارے، اتنے عرصے میں تو آج قطبین کی مہم سر ھو جائے۔ لیکن آج دیوھیکل مشینوں کی گھڑگھڑاھٹ نے اور اس تابڑتوڑ دوڑ نے ھماری آنکھوں کو چکاچوند کر دیا ھے،

ہم بے تحاشہ بھاگے چلے جا رہے ہیں، ہمارے اعصاب تنے ہوئے ہیں، ہمارا مذاق بگڑ گیا ہے اور ہمیں نئی نئی بیماریاں لگ گئی ہیں۔ بس یہ باتیں یاد ہیں، ڈاکٹر؟ یہ سب تم نے، مفید ارتقا کے علمبردار نے کہا تھا۔''

ڈاکٹر بہت دیر سے احتجاج کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ بوبروف کے لمحہ بھر رکنے سے فائدہ اٹھا کر فوراً بولا:

''ہاں، دوست، میں نے یہ سب کہا تھا''، اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو میں آج بھی کہتا ہوں۔ لیکن بھئی، ہمیں حالات کا عادی بننا پڑے گا۔ ورنہ ہم زندہ کیسے رہ سکتے ہیں؟ بھئی، ایسے چھوٹے موٹے اڑنگے تو ہر پیشے میں ہوتے ہیں۔ ہم ڈاکٹروں ہی کو لے لو۔ تم سمجھتے ہو ہمارے ذہن میں شبہے پیدا ہی نہیں ہوتے، ہماری راہ میں مشکلات نہیں ہیں؟ ارے بھئی، ہم تو سرجری کے سوا کسی بات پر یقین ہی نہیں کر سکتے۔ نئی نئی علامتیں اور نئے نئے علاج تو سوچ لیتے ہیں، لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ جہاں تک خون کے اجزا، دل کی دھڑکن، نسل وغیرہ کا تعلق ہے، تو ہزاروں میں سے کوئی دو انسان بھی ایک سے نہیں ہوتے۔ ہم واحد ٹھیک راستے سے، جڑی بوٹیوں اور ویدوں کی دواؤں سے دور ہٹ گئے ہیں، عطاروں کی دواؤں میں کوکین، ایٹروپین، فیناسےٹین اور اسی

قسم کی دوسری چیزیں بھر دی ھیں۔ لیکن ھم یہ بھول جاتے ھیں کہ اگر کسی مریض کو صرف پانی دیا جائے لیکن پورے خلوص سے یقین دلایا جائے کہ یہ دوا بڑی اچھی ھے تو وہ ضرور اچھا ھو جائےگا۔ بھئی، سو میں سے نوے کیس ایسے ھوتے ھیں جن میں ھمیں سب سے زیادہ مدد اعتماد سے ملتی ھے، اور یہ اعتماد پیشہور مرشدانہ خود اعتمادی کی وجہ سے مریض کے دل میں پیدا ھوتا ھے۔ تم یقین کرو نہ کرو، لیکن یہ واقعہ ھے کہ ایک دفعہ ایک سمجھدار، ایماندار اور بڑے عمدہ ڈاکٹر نے مجھ سے کہا کہ شکاری اپنے بیمار کتوں کا علاج ایسی معقولیت سے کرتے ھیں کہ ھم انسانوں کا بھی نہیں کرتے۔ وہ صرف پسا ھوا گندھک استعمال کرتے ھیں۔ اس سے کچھ ایسا نقصان بھی نہیں ھوتا، اور کبھی کبھی تو واقعی فائدہ ھو جاتا ھے۔ دیکھا دوست، کتنی اچھی تصویر کھینچی ھے، بھرحال ھم بھی، اپنی بساط بھر سبھی کچھ کرتے ھیں۔ اس کے سوا اور کریں بھی کیا، بھئی، زندگی میں ھم سب کو کوئی نہ کوئی سمجھوتہ کرنا ھی پڑتا ھے۔ بعض دفعہ جہاں اور کوئی دوا کارگر نہیں ھوئی وھاں ھمارا علم غیب کام کر جاتا ھے، اور ھمارے دکھی ساتھی کے دکھ میں ایک طرح کمی آجاتی ھے۔ میں تو

کہتا ہوں اس کے لئے بھی خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ ،،

’’سمجھوتے کی بات کر رہے ہو؟،، بوبروف نے افسردگی سے پوچھا۔ ’’اور آج تم نے مسالسک کے معمار کے سر سے کھپچیاں نکالی ہیں۔ کیوں غلط کہہ رہا ہوں کیا؟،،

’’آوہ دوست، ایک آدھ مرمت شدہ کھوپڑی سے کیا فرق پڑ جاتا ہے؟ لیکن ذرا سوچو تم کتنے پیٹ بھر رہے ہو، کتنے لوگوں کو کام دے رہے ہو۔ ایلووائسکی نے اپنی تاریخ میں کہا ہے کہ ’’قحط کے زمانے میں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے زار بورس نے پبلک عمارتوں کی تعمیر کا کام شروع کرا دیا،، یا اسی قسم کی کوئی اور چیز چالو کرا دی۔ اب ذرا سوچو تم کس قدر بھلائی ... ،،

ڈاکٹر کے آخری الفاظ نے بوبروف کو جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ تیزی سے اٹھ بیٹھا، اس کا ننگا پاؤں ایک طرف لٹکا ہوا جھول رہا تھا۔

’’بھلائی؟،، وہ جنون کے عالم میں چیخا۔ ’’تم مجھ سے بھلائی کی بات کر رہے ہو؟ اگر تم واقعی یہ جاننا چاہتے ہو کہ برا کیا ہے اور بھلا کیا ہے تو آؤ میں تمھیں چند اعداد و شمار بتاؤں۔ ،، اس نے نہایت نپی‌تلی اور تیز آواز میں کہنا شروع کیا گویا منبر پر تقریر کر رہا ہو۔ ’’کون نہیں جانتا کہ حادثوں اور کمر توڑنے والی محنت

کا تو ذکر ہی کیا، کانوں، دھات کے کارخانوں یا بڑے بڑے کارخانوں تک میں کام کرنے سے محنت کشوں کی ایک چوتھائی زندگی کم ہو جاتی ہے۔ تم ڈاکٹر ہو، تم تو مجھ سے بہتر طرح سمجھتے ہو کہ آج کتنے مزدور آتشک اور شراب نوشی کا شکار ہیں، اور کتنے مزدور ان منحوس چالوں اور کچی جھونپڑیوں اور ان بھیانک حالات میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ ٹھیرو ڈاکٹر — اعتراض کرنے سے پہلے ذرا یہ سوچنے کی کوشش کرو کہ تم نے فیکٹریوں میں چالیس یا پینتالیس کی عمر کے کتنے مزدور دیکھے ہیں۔ مجھے تو آج تک کوئی ملا نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مزدور زندگی کے ہر سال میں سے تین مہینے اپنے مالک کو دے دیتا ہے، ہر مہینے کا ایک ہفتہ یا یوں سمجھ لو کہ ہر روز چھ گھنٹے اس کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ اور اب آگے سنو۔ ہماری چھ بھٹیوں کے لئے تیس ہزار کے قریب لوگ درکار ہیں — میرے خیال میں زار بورس نے تو خواب میں بھی اتنی بڑی تعداد نہ دیکھی ہوگی۔ تیس ہزار آدمی، جو سب ملا کر روزانہ اپنی قیمتی زندگی کے ۱۸ ہزار گھنٹے بھٹی میں جھونکا کریں گے، یعنی کہ سات ہزار پانچ سو دن یا — کیوں بھئی کتنے سال بنتے ہیں؟،،

”تقریباً بیس سال،، ڈاکٹر نے کچھ رک کر کہا۔

”روزانہ تقریباً بیس سال!،، بوبروف نے کہا۔

''کام کے دو دن ایک آدمی کو نگل جاتے ھیں۔ لعنت ھے ایسے کام پر! تمھیں بائبل کے اساریائی اور سوابائی یاد ھیں جنھوں نے اپنے خدا کو انسان کی قربانی دی تھی؟ لیکن میں تو کہتا ھوں اگر وہ سنگ دل مولخ اور داگون میرے دئیے ھوئے اعداد و شمار دیکھیں تو شرم اور کوفت کے مارے ان کے سر نہ اٹھ سکیں۔''

یہ عجیب و غریب اعداد و شمار ابھی ابھی بوبروف کے دماغ میں آئے تھے۔ بہت جلد متاثر ھو جانےوالے دوسرے لوگوں کی طرح بوبروف کو بھی بحث کے زور میں بہت دور کی سوجھتی تھی۔ بھرحال یہ انوکھے اعداد و شمار سن کر وہ اور ڈاکٹر دونوں حیران رہ گئے۔

''مارو گولی، تم نے تو مجھے الجھن میں ڈال دیا،'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''کون جانے یہ اعدادوشمار غلط ھی ھوں۔''

''اور اس کے متعلق کچھ سنا ھے تم نے؟'' بوبروف نے اور بھی زیادہ یقین سے کہنا شروع کیا۔ ''اعداد و شمار کی اس فہرست کے متعلق جس کو سامنے رکھ کر ھم صحیح صحیح اندازہ لگا سکتے ھیں کہ تمھاری اس لعنتی گاڑی کے ھر اگلے قدم، بھوسا اڑانےوالے ھر معمولی پنکھے، بوائی کی ھر مشین اور ھر ھر ریل مل کی قیمت کتنے انسانوں کے خون سے ادا ھوتی ھے؟ خوب ھے تمھاری یہ

4*

تہذیب جس کے پھل ہیں اعدادوشمار جہاں مشینیں عدد کا کام کرتی ہیں اور انسان صفر کے برابر ہے!،،

''بھئی، تم بات تو سنو، دوست،، ڈاکٹر بوبروف کے جوش پر حیران رہ گیا۔ ''تم چاہتے ہو ہم پھر اسی دقیانوسی طریقۂ کار کو اپنا لیں؟ بھئی، تم تصویر کا صرف تاریک رخ کیوں دیکھتے ہو؟ تمھارے ان اعدادوشمار کے باوجود مل کی بدولت ہمیں ایک اسکول مل گیا ہے، مل‌والوں نے گرجا بنوایا ہے، ایک معقول اسپتال کھولا ہے، اور مزدوروں کے لئے ایسی سوسائٹی قائم کی ہے جو انھیں کم سود پر قرض دیتی ہے۔،،

بوبروف پلنگ سے کود کر ننگے پاؤں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔

''تمھارے یہ اسکول اور اسپتال بکواس ہیں! یہ سب ہتکنڈے تم جیسوں کو رجھانے اور عام لوگوں کی رائے پر اثر ڈالنے کے لئے ہیں۔ ان چیزوں کے بارے میں میری رائے صاف صاف سننا چاہتے ہو تو سنو۔ جانتے ہو اختتام کسے کہتے ہیں؟،،

''اختتام؟ گھوڑوں اور گھوڑ دوڑ کی کوئی اصطلاح ہوگی؟،،

''ہاں، آخری حد سے سو قدم پہلے کے فاصلے کو اختتام کہتے ہیں۔ گھوڑا اس وقت آخری کوشش میں انتہائی تیز بھاگتا ہے — اس کی رفتار

کو تیز سے تیز تر کرنے کے لئے اسے ہنٹر مارمار کر لہولہان کر دیا جاتا ہے۔ اور پھر دوڑ ختم ہونے کے بعد وہ مر بھی جائے تو کسی کو پروا نہیں ہوتی۔ ہمارا حال بھی ان گھوڑوں جیسا ہی ہے۔ گھوڑے کے آخری قدم حاصل کرنے کے بعد، ہماری کمر ٹوٹ جائے، اور بےجان ٹانگیں جواب دے دیں تو لوگوں کی بلا سے! تمھارے ان اسکولوں اور اسپتالوں کی انسان کے لئے وہی حیثیت ہے جو دوڑ جیت کر دم توڑتے ہوئے کسی گھوڑے کے لئے ہوگی۔ کبھی لوہا پگھلتے یا رول ہوتے دیکھا ہے تم نے ؟ کبھی دیکھا ہوگا تو تمھیں اندازہ ہوگا کہ یہ کام انتہائی مضبوط اعصاب اور فولادی عضلات والے تیزوچست انسان کو بھی جھنجھوڑ کے رکھ دیتا ہے۔ تمھیں معلوم ہونا چاہئے ڈاکٹر کہ ان میں سے ہر شخص روزانہ کئی کئی دفعہ موت کے منہ سے نکلتا ہے، میں تو کہتا ہوں وہ محض اس وجہ سے بچ جاتے ہیں کہ انھیں اپنے اوپر غیرمعمولی قابو ہوتا ہے، جانتے ہو اس جان جوکھوں کے کام کا معاوضہ مزدور کو کیا ملتا ہے؟،،

”بہرحال مل ہے تو مزدور کو کام ملنے کا امکان تو ہے،، گولڈبرگ بضد رہا۔

”بکواس نہ کرو، ڈاکٹر!،، بوبروف کھڑکی کے پتھر پر بیٹھتے ہوئے چیخ اٹھا۔ ”تم خوب جانتے ہو کہ مزدور کا انحصار بازار کی مانگ پر، اسٹاک

کی گڑبڑ پر اور طرح طرح کی چار سو بیسیوں پر ھے اور یہ کیفیت آج ھمیشہ سے بھی زیادہ ھے۔ ھر بڑا کارخانہ چالو ھونے سے پہلے تین چار منزلوں سے گزرتا ھے۔ جانتے ھو ھماری کمپنی کس طرح شروع ھوئی؟ بھئی، شروع میں تو بیوپاریوں کے ایک چھوٹے سے گروہ نے کچھ روپیہ لگایا تھا اور کاروبار کا منصوبہ بہت چھوٹے پیمانے پر بنا تھا، لیکن اس سے پہلے کہ مالک کو کچھ تھاہ ملے انجنیروں، ڈائرکٹروں اور ٹھیکے داروں کے گروہ کے گروہ نے تمام روپیہ ھضم کر لیا۔ بڑی بڑی عمارتیں کھڑی ھو گئیں، مگر یہ عمارتیں اندر سے کسی کام کی نہیں تھیں۔ چنانچہ انھیں ڈائنامیٹ سے اڑانا پڑا۔ اور جب سارا سامان اور ملبہ کوڑیوں کے مول بک گیا تب پتہ چلا کہ اس گروہ نے جان بوجھ کر اس طرح کام کیا تھا، کیونکہ انھیں ایک زیادہ مضبوط اور جمی جمائی کمپنی کی طرف سے اس کام کے لئے روپیہ ملتا تھا۔ آج کاروبار بہت بڑے پیمانے پر شروع ھوا ھے لیکن میں خوب جانتا ھوں کہ پہلی ناکامی کی وجہ سے آٹھ سو مزدوروں کو دو ماہ کی تنخواہ سے ھاتھ دھونا پڑے۔ تو یہ ھے تمھارے محفوظ روزگار کی حقیقت! بھئی، حصوں میں کمی ھی سے اجرت گر جاتی ھے۔ بھئی، یہ تو تم جانتے ھوگے کہ یہ حصے کم زیادہ کیسے ھوتے ھیں۔ اس کے لئے پیٹرسبرگ جانا پڑتا ھے۔ وھاں جاکر

کسی دلال کے کان میں کھسرپھسر کرو ۔ اس سے کہو تین لاکھ روبل کے حصے بیچنا چاہتے ہو ۔ اس سے یہ بھی کہو کہ بات باہر نہ جانے پائے، اور اگر وہ منہ بند رکھے تو دلالی کے عوض اسے معقول رقم دو ۔ پھر چند اور دلالوں کے کان میں بھی یہی بات ڈالو اور دیکھو، حصوں میں فوراً درجنوں روبل کی کمی آ جائیگی۔ بات بالکل راز میں رہی تو حصوں کی قیمت بہت جلد گر جائےگی۔ واقعی کس قدر محفوظ ہے یہ روزگار!،،

بوبروف نے دھڑ سے کھڑکی کھول دی ۔ کمرے میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا ۔

''دیکھو، ڈاکٹر!،، بوبروف مل کی طرف اشارہ کرکے چیخا ۔

گولڈبرگ کہنیوں کے سہارے اٹھا اور باہر رات کی تاریکی میں جھانکنے لگا ۔ دور دور تک پھیلی ہوئی اتھاہ تاریکی میں چونے کے پتھر کے دھکتے ہوئے سرخ ڈھیر چمک رہے تھے ۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان کی سطح سے گندھک کے سبز شعلے بھڑک اٹھتے ۔ مل میں چونے کے پتھر کے بڑے بڑے تودے بھڑک رہے تھے ۔ خون جیسی سرخ روشنی جھلملا جھلملا کر تاریکی میں چھپی ہوئی دیوھیکل چمنیوں کی نازک بلندیوں کو اجاگر کر رہی تھی ۔ ان چمنیوں کے نچلے حصے زمین سے اٹھتی ہوئی بھوری دھند میں لپٹے ہوئے تھے ۔ یہ دیو دھوئیں کے گھنے

گھنے بادل اگلتے اور وہ مشرق کی طرف اڑتے ہوئے ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتے۔ ان بادلوں سے کہیں کہیں گندے اور بھورے رنگ کے روئی کے گالے سے جھانکنے لگتے تھے۔ دھوئیں کا رخ بدلنے والی لمبی پتلی چمنیوں کے اوپر جلتی ہوئی گیس کی چمکدار چھڑیں تھرتھرا رہی تھیں، اس وجہ سے یہ چمنیاں بہت بڑی بڑی دیوھیکل ٹارچوں جیسی لگنے لگیں۔ پر پھیلے ہوئے دھوئیں کے بادلوں پر گیس کے شعلوں کے ڈراؤنے اور منحوس سائے تھرک رہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد سگنل کے ھتوڑے کی تیز دھمک پر کسی بھٹی کا ڈھکن گرتا، شعلے اور سیاھی کے بادل تڑپتے ہوئے بھٹی کے منہ سے نکلتے اور سنسناتے ہوئے آسمان کی طرف بلند ہو جاتے جیسے کہیں دور طوفان چنگھاڑ رہا ہو۔ اور پھر پلک جھپکتے ایک شعلہ سا کوندتا اور پل بھر کے لئے پوری مل روشن ہو جاتی اور بھٹی کے تپتے ہوئے سیاہ اور گول چولھوں کی قطار کسی عظیم‌الشان آھنی قلعے کے میناروں کا روپ دھار لیتی۔ کوئلے کی بھٹیوں کی قطار بڑی ترتیب کے ساتھ پھیلی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی ان میں سے کسی بھٹی میں پتھر کا کوئیلہ دھکتا اور بھٹی بڑی سی سرخ آنکھ کی طرح چمکنے لگتی۔ بجلی کی نیلی اور بے‌جان روشنی تپتے ہوئے سرخ لوہے کی چمک میں مدغم

ہو گئی تھی - لوہے کی کھڑکھڑاہٹ اور جھنجھناہٹ مستقل گونج رہی تھی -

بوبروف کے تنبیائے ہوئے چہرے کا رنگ مل کی روشنی کے عکس میں بڑا منحوس لگ رہا تھا - اس کی آنکھوں میں تیز سرخ روشنی سے پتلیاں چمک رہی تھیں اور پیشانی پر بڑی بےترتیبی سے بال بکھرے ہوئے تھے - اس کی چیختی ہوئی آواز میں بڑا غصہ تھا -

"یہ ہے — مولخ، جسے انسان کا تڑپتا ہوا خون چاہئے!" وہ اپنا منحنی سا بازو کھڑکی سے نکال کر چلایا - "واقعی یہی ہے ترقی، مشینی محنت اور تہذیبی ارتقا - لیکن خدا کے لئے ذرا سوچو بیس سال! ہر روز انسانی زندگی کے بیس سال! کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں انسان کا قاتل ہوں!"

"اف میرے خدا، یہ تو بالکل پاگل ہو گیا ہے" ڈاکٹر یہ سوچ کر کانپ اٹھا - وہ بوبروف کی الجھن اور پریشانی کم کرنے کی کوشش کررہا تھا -

"ارے یار اندرئی ایلیچ، چھوڑو بھی، ایسی احمقانہ باتوں پر سر کھپانے سے کیا فائدہ! باہر اس قدر کہر ہے اور تم نے کھڑکی کھول دی - جاؤ اب سو رہو، ہاں دیکھو تھوڑی سی برومائیڈ کھا لو سمجھے!"

''واقعی بڑا خبطی ہے،، اس نے سوچا، اس کے دل میں محبت کا جذبہ بھی تھا اور خوف بھی سر اٹھا رہا تھا۔

بوبروف کے جذبات نے اسے اس قدر نڈھال کر دیا تھا کہ اس نے زیادہ زور آزمائی نہ کی۔ لیکن پلنگ پر لیٹتے ہی وہ نہایت اعصابی ہیجان کے عالم میں پھوٹ کر رونے لگا۔ ڈاکٹر بڑی دیر تک اس کے پاس بیٹھا اس کا سر سہلاتا رہا، جیسے وہ بچہ ہو۔ وہ بوبروف کو تسلی دینے کے لئے نجانے کیا کیا بولتا رہا۔

٦

اگلے دن ایوان کووہ اسٹیشن پر واسیلی تیرینتیوچ کواشنین کا بڑا شاندار سواگت ہوا۔ گیارہ بجے سے مل کا پورا انتظامیہ حلقہ وہاں موجود تھا۔ ہر شخص گھبرایا ہوا تھا۔ مینیجر سرگئی والیریانووچ شیلکوونیکوف سلسر کے گلاس چڑھا رہا تھا۔ ہر لمحے وہ گھڑی نکالتا اور سوئی پر نظر ڈالے بغیر نہایت میکانیکی طریقے سے جیب میں رکھ لیتا۔ اس کی یہ بےخیالی اس کی پریشانی اور گھبراہٹ کی چغلی کھا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس کا چہرہ اس خوبصورت، سجیلے اور خوداعتماد شخص کا چہرہ تھا جو آداب محفل سے خوب واقف

ہو ۔ گنتی کے چند آدمی اس راز سے واقف تھے کہ تعمیری پروجیکٹ کا یہ مینیجر بس نام کا مینیجر ہے۔ اصل مینیجر تو اندرئی‌آس تھا ۔ اس بلجیائی انجنیر کے آباواجداد کا شجرہ پولینڈ اور سویڈن دونوں جگہ کے لوگوں سے ملتا تھا ۔ کسی ناواقف آدمی کو اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ مل میں اس کے رول کی کیا اہمیت ہے ۔ ایک دروازہ دونوں مینیجروں کے کمروں کو ملاتا تھا ۔ اور شیلکوونیکوف کی اتنی مجال نہیں تھی کہ وہ پنسل کے ان نشانوں سے صلاح لئے بغیر کوئی فیصلہ کردے جو اندرئی‌آس کاغذ کے کونے پر لگا دیتا تھا ۔ فوری معاملات میں جہاں صلاح مشورے کا امکان نہ ہو وہاں وہ بالکل گھبرا جاتا ۔ اور بظاہر بڑی بےپروائی سے صاحب معاملہ سے کہتا :

''معاف کرنا، اس وقت تو میں کسی طرح بھی تمھیں وقت نہیں دے سکتا — بےحد مشغول ہوں! مہربانی سے تم مسٹر اندرئی‌آس کے پاس چلے جاؤ، وہ بعد میں یہ معاملہ میرے پاس بھیج دیں گے...''

اندرئی‌آس نے بورڈ کی بڑی خدمت کی تھی ۔ اصلی کمپنی کو تباہ کرنے کا عیارانہ منصوبہ اس کامیابی سے اسی نے سوچا تھا ۔ اس نے اس سازش کو کامیاب بنانے کی نہایت مستقل مزاجی سے اندر اندر کوشش جاری رکھی ۔ اس کے بنائے ہوئے نقشوں کی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں بلا کی سادگی اور

یکسانیت ہوتی تھی۔ کان کنی کے سلسلے میں تو وہ لاجواب سمجھا جاتا تھا۔ وہ یورپ کی کئی زبانیں جانتا تھا اور اپنے خاص مضمون کے علاوہ اور بہت سے مضامین کے بارے میں بھی اس کی واقفیت کافی اچھی تھی — انجنیروں میں یہ بات ذرا کم ہی نظر آتی ہے۔

اسٹیشن پر کھڑے ہوئے لوگوں میں بندر کی صورت والا دبلا پتلا اندرئی‌آس وہ واحد انسان تھا جس کا مخصوص ٹھس‌پن آج بھی اپنی جگہ موجود تھا۔ وہ سب سے آخر میں اسٹیشن پہنچا اور پلیٹ‌فارم پر آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ اس کی کلائیاں کہنی تک ڈھیلی ڈھالی بور سی پتلون کی جیبوں میں ٹھسی ہوئی تھیں۔ وہ حسب‌معمول سگار چبا رہا تھا۔ اس کی ہلکی بھوری آنکھیں، تھکے ماندے اور پھولے ہوئے پپوٹوں سے حسب‌معمول بڑی بےپروائی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں اور سائنس‌داں کے ذہن رسا اور جاں‌فروشی کی بلا خیز قوت ارادی کی غمازی کر رہی تھیں۔

زینینکو کا خاندان وہاں پہنچا تو کسی کو بھی تعجب نہیں ہوا۔ نجانے کیوں، لوگ انہیں مدت سے مل کی زندگی کا ایک حصہ سمجھنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اسٹیشن کے سرد اور اداس ہال میں نوجوان خواتین کی بناوٹی چہل اور مصنوعی ہنسی بکھر گئی۔ نوجوان انجنیروں نے انتظار سے تنگ

آ کر انھیں گھیر لیا۔ نوجوان خواتین نے حسب معمول فوراً مدافعتی محاذ سنبھالا اور چاروں طرف اپنی دلکش مگر بےجان سادگی بکھیرنے لگیں۔ ٹھگنی سی اداس آننا افاناسئیونا اپنی ہلڑباز بیٹیوں کے درمیان ایسی لگتی تھی جیسے چوزوں میں مرغی۔

بوبروف گذشتہ رات کے دورے کے بعد تھکا تھکا اور بیمار سا ہال کے ایک کونے میں تنہا بیٹھا سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ زینینکو کا خاندان داخل ہوا، اور زور زور سے بولتا چھکتا ایک گول میز کے گرد بیٹھ گیا۔ اس کے دل میں دو متضاد اور مبہم سے جذبے ابھرنے لگے۔ ایک طرف تو خاندان نے وہاں آ کر جس حماقت کا ثبوت دیا تھا، اس پر شرمندگی کا احساس تھا، ہاں دوسروں کے لئے دلی شرمندگی کا احساس مگر دوسری طرف نینا کو دیکھ کر اس کے دل کی کلی کھل اٹھی تھی۔ نینا بھاگتی ہوئی آئی تھی اس لئے گلاب کی طرح دھک رہی تھی، اور آنکھوں میں خوشی اور گھبراہٹ کی وجہ سے غیرمعمولی چمک پیدا ہو گئی تھی۔ وہ بہت حسین لباس میں ملبوس تھی اور حسب معمول اس کے حسن تصور سے بھی زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ اچانک اس کی بیمار اور تھکی ہوئی روح نرم‌ونازک اور بھینی بھینی محبت کے لئے تڑپ اٹھی اور اس کے دل میں عورت کے سکون بخش بوسے کی بےپناہ خواہش انگڑائیاں لینے لگی۔

وہ نینا کے پاس پہنچنے کے لئے موقع کی تاک میں تھا۔ لیکن نینا تو دنیاومافیہا سے بےخبر کان کنی کے دو طالب علموں کے ساتھ چہک رہی تھی۔ وہ دونوں اسے خوش کرنے اور ہنسانے کے لئے ایک دوسرے سے بازی لے جانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ اور وہ ہنس رہی تھی۔ آج تو وہ ہمیشہ سے زیادہ خوش، ہمیشہ سے زیادہ عشوہ گر نظر آ رہی تھی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے سفید دانت چمک رہے تھے۔ دو تین دفعہ اس کی نظریں بوبروف کی نظروں سے ٹکرائیں۔ اور بوبروف کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی بھویں ذرا سی تن گئی ہوں، اسے لگا کہ ان نگاہوں میں خفگی تو نہیں تھی لیکن ایک خاموش سوال ضرور پنہاں تھا۔

پلیٹ فارم پر گھنٹی کی گونج نے اعلان کیا کہ ریل پچھلے اسٹیشن سے روانہ ہو چکی ہے۔ انجنیروں میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اچانک ان کے چہرے سنجیدہ ہو گئے اور ان سے گھبراہٹ ٹپکنے لگی، ہاتھ آخری دفعہ ان کے فراک کوٹوں کے بٹنوں، ان کی ٹائیوں اور ٹوپیوں پر دوڑنے لگے اور ان کی نگاہیں گھنٹی کی طرف اٹھ گئیں۔ بوبروف کونے میں بیٹھا طنزیہ مسکراہٹ سے ان بیس بائیس انسانوں کو دیکھتا رہا جن کے دل و دماغ پر ایک ہی سراسیم خیال چھایا ہوا تھا۔ بہت جلد ہال میں کوئی نہ رہا۔

بوبروف باہر پلیٹ‌فارم پر نکل گیا۔ نوجوان خواتین کے عاشق انھیں چھوڑ کر جا چکے تھے اور وہ بڑی بےچارگی کے ساتھ دروازے کے برابر آننا افاناسئیونا کے گرد جمع تھیں، نینا مڑ کر بوبروف کو دیکھنے لگی جو بہت دیر سے ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھی جیسے سمجھ گئی ہو کہ بوبروف تنہائی میں اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔

''سلام علیکم، ارے اتنے زرد کیوں ہو رہے ہو؟ طبیعت تو اچھی ہے نا؟'' اس نے پوچھا اور بڑے جوش اور نرمی سے بوبروف کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ بڑی پرخلوص اور پیار بھری نظروں سے اس کی آنکھوں کو دیکھ رہی تھی۔ ''کل شام تم اتنی جلدی کیوں چلے آئے، اور وہ بھی ملے بغیر؟ خفا تھے کیا؟''

''ہاں، نہیں'' بوبروف نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''نہیں، مجھے خفا ہونے کا کیا حق ہے بھلا۔ کیوں؟''

''میرے خیال میں تو ہر شخص کو خفا ہونے کا حق ہے، خاص طور پر اس شخص کو جو جانتا ہو کہ لوگوں کے دل میں اس کی رائے کی بڑی قدر ہے۔ کیوں، ہے نا؟''

''کیونکہ — دیکھو نا، نینا گریگورئیونا'' بوبروف نے کہا۔ اچانک اس کے دل میں انتہائی ہمت اور جرات پیدا ہو گئی۔ ''کل رات میں اور تم برآمدے

میں بیٹھے تھے — یاد ہے؟ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ تم نے مجھے زندگی کے چند لاجواب لمحے بخشے ہیں۔ اور تب میں سمجھ گیا کہ اگر تم چاہو تو میں دنیا کا سب سے زیادہ خوش نصیب آدمی بن سکتا ہوں۔ آخر مجھے ڈر کس بات کا ہے، آخر میں کیوں ہچکچاؤں؟ تم جانتی ہو، تمھیں ضرور اندازہ ہوگا، بہت دن سے اندازہ ہوگا کہ میں...،،

وہ بات ختم نہیں کر سکا، اچانک اس کی ہمت جواب دے گئی۔

''کیا اندازہ ہوگا؟ کیا کہنا چاہتے تھے تم؟،، نینا نے بظاہر بڑی بےپروائی سے پوچھا۔ لیکن ہزار کوشش پر بھی اس کی آواز تھرتھرا گئی اور نظریں جھک گئیں۔

وہ جانتی تھی کہ یہ اقرار محبت ہے، اس خیال سے ہر نوجوان لڑکی کے دل میں ایک سرکش مگر لطیف سی لہر دوڑ جاتی ہے، چاہے وہ خود ان جذبات میں شریک ہو یا نہ ہو۔ اس کے رخساروں پر ہلکی سی زردی چھا گئی۔

''ابھی نہیں۔ پھر کبھی،، بوبروف ہکلایا۔ ''پھر کسی دن بتاؤں گا۔ نہیں نہیں، خدا کے لئے اس وقت نہیں،، وہ منت کرنے لگا۔

''اچھا، خیر، مگر یہ تو بتاؤ تم خفا کیوں تھے؟،،

''کیونکہ ان چند لمحات کے بعد میں کھانے کے کمرے میں داخل ہوا تو بہت ہی — اف، کس طرح بتاؤں؟ — بہت ہی وجد کے عالم میں تھا مگر اندر پہنچا تو...''

''تو کواشنین کی آمدنی کا ذکر سن کر تمھیں دھکا سا لگا، کیوں یہی بات تھی نا؟'' نینا نے ایک عجیب فطری تیزی سے اس کا جملہ پورا کر دیا تھا۔ یہ فطری تیزی کبھی کبھی انتہائی محدود ذہنیت کی عورتوں کو بھی میسر آ جاتی ہے۔ ''کیوں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟'' وہ بوبروف کے ٹھیک سامنے کھڑی ہو گئی۔ اور ایک دفعہ پھر اسے اپنی گہری اور پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ ''صاف صاف کہو، دوست سے دل کی بات چھپانا گناہ ہے۔''

تین چار مہینے پہلے، ایک دفعہ بہت سے لوگ کشتی کی سیر کو نکلے۔ اس شام موسم گرما کی گرم رات کے حسن سے مسحور ہو کر نینا نے کہا کہ وہ آخری سانس تک بوبروف کی دوست رہے گی۔ بوبروف نے پورے خلوص سے یہ پیش کش قبول کی اور ہفتے بھر تک اسے دوست کے نام سے پکارتا رہا۔ وہ بھی بوبروف کو دوست کہتی رہی۔ کبھی کبھی وہ اپنے مخصوص تھکے تھکے اور معنی خیز انداز میں آہستہ سے 'میرا دوست' کہتی تو یہ دو بول بوبروف کے دل کی گہرائیوں میں اترتے چلے

جاتے۔ اس وقت اسے یہ مذاق یاد آ گیا اور اس نے ٹھنڈا سانس لے کر جواب دیا۔

''اچھا، میرے دوست، ہے تو یہ بہت مشکل، لیکن میں تمھیں سب کچھ بتا دوں گا۔ تمھیں دیکھ کر میرے دل میں دو انتہائی مختلف جذبات پیدا ہوتے ہیں اور مجھ پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ہم باتیں کرتے ہیں تو بعض لمحے ایسے آتے ہیں جب اچانک تمھارا صرف ایک لفظ، ایک اشارہ یا تمھاری ایک نگاہ مجھے سرشار کر دیتی ہے! اف، لیکن میں ان جذبات، ان احساسات کو لفظوں میں کیسے بیان کروں؟ تمھیں اس کا اندازہ ہوا تھا کبھی؟''

''ہاں''، اس نے زیرلب کہا۔ اس کی پلکوں میں ہلکی سی شرارت آمیز تھرتھراھٹ ہوئی اور اس نے نظریں جھکا لیں۔

''اور پھر اچانک تم قصباتی قسم کی دوشیزہ بن جاتی ہو جس کے پاس گھسے پٹے محاوروں اور نپے تلے جملوں کا ایک مخصوص ذخیرہ ہوتا ہے اور جس کے انداز میں بڑی بناوٹ ہوتی ہے۔ میری صاف گوئی پر خفا نہ ہونا، نینا۔ یہ چیز میرے لئے اتنی تکلیف دہ نہ ہوتی تو میں کبھی زبان نہ کھولتا۔''

''اس کا بھی اندازہ ہے مجھے۔''

''ہوں، تو یہ بات ہے۔ میں ہمیشہ سے جانتا ہوں کہ تمھارا دل بہت محبت بھرا، بہت حساس

ہے۔ لیکن تم ہمیشہ ایسی کیوں نہیں رہتیں جیسی اس لمحے نظر آ رہی ہو؟،،

وہ پھر مڑی اور اس کے ٹھیک سامنے کھڑے ہوکر آہستہ سے ہاتھ ہلایا جیسے بوبروف کا ہاتھ چھونا چاہتی ہو۔ اس وقت وہ پلیٹ‌فارم کے ویران سرے پر ٹہل رہے تھے۔

،،تم نے کبھی مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کی، اندرئی ایلیچ،، اس نے شکوہ کیا۔ ،،تم بڑے جذباتی اور بےصبر ہو، تم میری خوبیوں کو بےحد بڑھا چڑھاکر دیکھتے ہو مگر دوسری طرف میری کمزوریوں کو نظرانداز بھی کرنے کو تیار نہیں ہو۔ تم خود ھی سوچو میں کس ماحول میں رہتی ہوں۔ پھر بھلا اس سے مختلف ہوتی بھی تو کیسے؟ اگر میں اس سے مختلف ہوتی تو کتنا مضحکہ‌خیز معلوم ہوتا — ہمارے خاندان کا سارا نظام ھی تتربتر ہو جاتا۔ میں بہت کمزور، بہت حقیر انسان ہوں، مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ ماحول سے ٹکر لے سکوں، اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکوں۔ جہاں اور سب جاتے ھیں وھیں میں چلی جاتی ہوں، جس طرح اور سب چیزوں کو دیکھتے اور پرکھتے ھیں اسی طرح میں بھی دیکھ اور پرکھ لیتی ہوں۔ تم سمجھتے ہوگے کہ مجھے اپنے عامیانہ پن کا احساس ھی نہیں ہے۔ لیکن دوسروں کے ساتھ مجھے اس کا اتنا احساس، اتنا دکھ نہیں ہوتا

جتنا تمھاری موجودگی میں ھوتا ھے۔ تمھاری موجودگی میں تو میں حواس کھو بیٹھتی ھوں کیونکہ —،، وہ ھکلائی۔ ’’اوہ، بس — کیونکہ تم سب سے مختلف ھو، کیونکہ میں زندگی بھر تمھارے جیسے اور کسی شخص سے نہیں ملی۔ ،،

نینا سوچ رھی تھی کہ اس کی باتوں میں بڑا خلوص ھے۔ خزاں کی ھوا کی جنوں انگیز تازگی، اسٹیشن کے ھنگامے اور خود اپنے حسن کے احساس نے اور اس احساس‌نشاط نے جو بوبروف کی محبت بھری نظر نے اس کے دل میں پیدا کر دیا تھا، اس کے پورے جسم میں بجلی کی لھریں سی دوڑا دیں۔ اور تمام اعصابی اور جذباتی لوگوں کی طرح وہ بھی بڑے وجد سرشاری اور بے خودی کے عالم میں جھوٹ بولتی چلی گئی۔ وہ اپنے اس نئے روپ کو دل ھی دل میں سراہ رھی تھی۔ اس نئے روپ کو دیکھئے تو ایسا لگتا تھا کہ وہ اخلاقی مدد کی تلاش میں سرگرداں ھے۔ وہ بوبروف سے اچھی باتیں کرنا چاھتی تھی۔

’’میں جانتی ھوں تم مجھے دل‌پھینک سمجھتے ھو۔ دیکھو انکار نہ کرنا۔ میں یہ بھی جانتی ھوں کہ تمھاری اس رائے کی ذمہ‌دار خود میں ھوں۔ کیونکہ میں اکثر ملر سے گپ‌شپ کرتی ھوں اور اس کے مذاقوں پر ھنستی ھوں لیکن کاش تم سمجھ سکتے کہ مجھے تیل میں چپڑے ھوئے اس

چھوکرے سے کس قدر نفرت ہے! ان دو طالب علموں ہی کو لے لو - میں تو کہتی ہوں کہ حسین مرد اور کسی وجہ سے نہیں تو اس وجہ سے برا لگتا ہے کہ وہ ہر وقت اپنے حسن کو سراہتا رہتا ہے - ہے تو یہ بات بڑی عجیب سی لیکن سچ کہتی ہوں — مجھے تو ہمیشہ سادگی پسند مردوں نے متاثر کیا - ،،

اس نے بڑے محبت بھرے اور کومل لہجے میں یہ جملہ کہا اور بوبروف نے دکھی ہوکر آہ بھری - آہ! نجانے کتنی بار وہ عورتوں کے منہ سے دلاسے کے یہ بے رحم لفظ سن چکا تھا - وہ اپنے بد صورت عاشقوں کا دل رکھنے کو ہمیشہ دو چار ایسے جملے کہہ دیتی ہیں -

''تب تو میں بھی امید کر سکتا ہوں کہ کبھی نہ کبھی تمھیں متاثر کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا؟،، اس نے چوٹ کی- اس کے لہجے کی تلخی سے ظاہر تھا کہ وہ خود اپنا مذاق اڑا رہا ہے -

نینا اپنی غلطی کی تلافی کرنے کو بے تاب ہوگئی -

''اف حد ہے، کیسے آدمی ہو تم! واقعی تم سے بات کرنا نا ممکن ہے - ہمیشہ تعریفیں کراتے رہنا ضروری ہے کیا؟ شرم آنی چاہئے!،،

وہ اپنے بے تکےپن پر خود ہی شرمندہ سی ہوگئی - اور بات بدلنے کی خاطر اس نے بڑے من چلے انداز میں پوچھا:

''اچھا، ہاں یہ بتاؤ وہ کونسی بات ہے جو تم کسی اور وقت پر ٹال رہے ہو، جی نہیں، ابھی بتانی پڑے گی!،،

''معلوم نہیں۔ مجھے تو یاد ہی نہیں رہی،، بوبروف ہکلایا۔ اس کا جوش ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔

''اف میرے دوست، تم کتنے گھنے ہو، تو لو میں تمھیں یاد دلائے دیتی ہوں، تم کل رات کا ذکر کر رہے تھے۔ تم نے چند لاجواب لمحوں کی بات کی اور کہا کہ غالباً مجھے اندازہ ہوگا۔ مگر تم نے بات ختم نہیں کی کہ کس بات کا اندازہ؟ تو بھئی، مہربانی سے اب کہہ ڈالو کہ کیا بات تھی وہ، بھئی کھوڑا، سن رہے ہو تم؟،،

وہ ہنستی ہوئی آنکھوں سے بوبروف کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں شرارت کی چمک بھی تھی۔ محبت کا حسن بھی اور امید کی کرن بھی۔ لمحہ بھر کو بوبروف کا دل دھڑکنا بھول گیا، اف کس قدر لطیف، کتنا حسین تھا یہ لمحہ۔ اور اس کی ٹوٹی ہوئی ہمت پھر لوٹنے لگی۔ ''وہ سب کچھ جانتی ہے، وہ خود میرے منہ سے نغمہ محبت سننا چاہتی ہے،، اس نے سوچا اور اس کے دل‌ودماغ میں بڑی جولانی پیدا ہوگئی۔

وہ پلیٹ‌فارم کے آخری سرے پر رک گئے، جہاں ان کے سوا کوئی نہ تھا۔ اس وقت دونوں نہایت جذباتی ہو رہے تھے۔ نینا اس کے جواب کی منتظر

تھی۔ وہ اس خیال سے بے حد خوش تھی اور خوب لطف لے رہی تھی کہ اس کا شروع کیا ہوا کھیل اتنا چٹ پٹا ہے، بوبروف جذبات کی شدت سے بھاری سانس لے رہا تھا اور مناسب لفظ ڈھونڈ رہا تھا۔ ٹھیک اسی وقت سگنل کی چیختی ہوئی آواز کے ساتھ پلیٹ فارم پر ہل چل مچ گئی۔

"میں مجسم انتظار ہوں، تم سن رہے ہو، اندرئی ایلیچ؟"، نینا نے بوبروف سے دور ہٹتے ہوئے سرگوشی کی۔ "تمھیں کوئی اندازہ نہیں ہے یہ میرے لئے کتنی اہم بات ہے۔"

موڑ کے اس پار دھوئیں کے سیاہ بادلوں میں لپٹی ہوئی اکسپرس اچانک دندناتی ہوئی نظروں کے سامنے آگئی۔ چند منٹ بعد وہ کھڑکھڑاتی ہوئی بڑھی اور تیرتی ہوئی سی تیزی کے ساتھ آہستہ ہوئی اور پلیٹ فارم پرا پہنچ کر گاڑی رک گئی۔ ریل کے آخر میں ایک لمبے سے سرکاری ڈبے کا نیلا روغن جھلملا رہا تھا، مجمع اس طرف لپکا۔

کنڈکٹر دروازہ کھولنے کے لئے نہایت احترام کے ساتھ آگے بڑھے اور سیڑھی کھولی گئی۔ اسٹیشن ماسٹر کا بھاگتے بھاگتے اور گھبراتے گھبراتے برا حال تھا۔ اس کا چہرہ لال ہو گیا تھا۔ اور اس کے چہرے پر خوف کے آثار نظر آ رہے تھے، وہ بار بار مزدوروں کو تاکید کر رہا تھا کہ سرکاری ڈبہ کھول دو۔

کواشنین ''ن،، ریلوے کے سب سے اہم حصےداروں میں سے ایک تھا۔ چھوٹی لائنوں پر تو وہ ایسی شان و شوکت سے سفر کرتا جو بڑے سے بڑے ریلوے افسر کو بھی میسر نہیں تھی۔

ڈبے میں صرف چار آدمی داخل ہوئے — شیلکوونیکوف، اندرئی‌آس اور دو صاحب اقتدار بلجیائی انجنیر۔ کواشنین آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ من من بھر کی ٹانگیں چری ہوئی تھیں اور توند آگے کو نکلی ہوئی۔ اس کے سر پر گول فیلٹ ہیٹ تھا جس کے اندر سے اس کے آتشیں بال چمک رہے تھے۔ داڑھی مونچھ ایکٹروں کی طرح بنی ہوئی تھی، جبڑے موٹے موٹے تھے اور ٹھوڑیاں ایک نہ دو تین تین تھیں۔ یہی نہیں بلکہ اس پر جھریاں بھی پڑی ہوئی تھیں، غرض بہت ہی کوفت‌ده اور سویا سویا سا منظر تھا، اس کے ہونٹ بڑے مڑے ہوئے تھے اور ان سے خفگی اور حقارت عیاں تھی۔

انجنیروں کے سلام کا جواب دینے کے لئے وہ بڑی مشکل سے اٹھا۔

''آداب عرض، حضرات،، اس نے بھاری بھرکم آواز میں کہا اور اپنا بڑا کچوری سا ھاتھ بڑھا دیا تاکہ وہ سب باری باری بڑے احترام سے اسے چھو سکیں۔ ''مل میں سب ٹھیک ٹھاک ہے؟،،

شیلکوونیکوف نے سخت اور کھری کاروباری زبان میں جواب دیا۔ مل میں سب ٹھیک ٹھاک ہے،

وہ واسیلی تیرینتیوچ کی آمد کے منتظر تھے تاکہ بھٹی چالو ہو سکے اور نئی عمارتوں کا سنگ بنیاد رکھ دیا جائے۔ مزدور اور فورمین مناسب اجرت پر کام کرنے کے لئے حاضر ہیں۔ آرڈر پر آرڈر آ رہے ہیں اور منتظمین چاہتے ہیں کہ جلد از جلد تعمیر کا کام شروع کر دیا جائے۔

کواشنین کا چہرہ کھڑکی کی طرف مڑا ہوا تھا، وہ کھوئے کھوئے انداز میں گاڑی کے گرد کھڑے ہوئے مجمع کو دیکھ رہا تھا اور شیاکوونیکوف کی رپورٹ سن رہا تھا۔ اس کے چہرے پر قابل نفرت تھکن کے سوا اور کوئی جذبات نہ تھے۔

اچانک اس نے مینیجر کو ٹوکا: "اسے سنو۔ یہ لڑکی کون ہے؟"

شیلکوونیکوف نے کھڑکی سے باھر نظر ڈالی۔

"وہ، وہ جس کے ہیٹ میں زرد پر لگا ہوا ہے"، کواشنین نے بےتابی سے اشارہ کیا۔

"اوہ، یہ لڑکی؟"، مینیجر نے کواشنین کے کان کے پاس منہ لیجا کر فرانسیسی زبان میں نہایت پراسرار انداز سے سرگوشی کی: "ہمارے گودام مینیجر زینینکو کی بیٹی ہے"۔

کواشنین نے افسردگی سے دھیرے سے سر ہلایا۔ شیلکوونیکوف نے دوبارہ رپورٹ دینی شروع کی لیکن حاکم نے پھر ٹوک دیا۔

''زینینکو؟،، وہ کھڑکی سے باہر گھورتے گھورتے کچھ سوچ کر غرایا۔ ''کون زینینکو؟ میں نے کہاں سنا تھا اس ـ کا نام؟،،

''ہمارے گودام کا مینیجر ہے، جناب،، شیلکوونیکوف نے نہایت احترام اور بظاہر بڑی بےپروائی سے جواب دیا۔

''اوہ، ہاں، یاد آیا،، کواشنین نے کہا۔ ''پیٹرسبرگ میں کسی نے مجھ سے اس کا ذکر کیا تھا۔ ہاں، چلو اور بتاؤ۔ ،،

نینا کے معصوم دل اور نکتہ رس نگاہ نے بھانپ لیا کہ اس وقت کواشنین اسے گھور رہا ہے اور اس کے بارے میں بات کر رہا ہے۔ وہ دوسری طرف مڑ گئی لیکن کواشنین کو اب بھی اس کا چہرہ نظر آ سکتا تھا۔ نینا کا چہرہ اس کی عشوہ نما سرمستی کی وجہ سے گلاب ہو رہا تھا اور چہرے کے تل اور بھی نمایاں ہو گئے تھے۔

آخر رپورٹ ختم ہو گئی۔ اور کواشنین شیشے جڑے ہوئے اس بڑے شامیانہ کی طرف چلا گیا جو ڈبے کے آخری سرے پر تھا۔

بوبروف نے سوچا کہ یہ لمحہ تو اس قابل تھا کہ اسے ایک اچھے کیمرے کی مدد سے امر بنا دیا جاتا۔ نجانے کیوں کواشنین بڑی دیر تک شیشے جڑی دیوار کے پیچھے رکا رہا، اس کا تنومند جسم اس مجمع سے کہیں بلند تھا جو گاڑی کے دروازے

کے گرد جمع ہو گیا تھا۔ اس کی ٹانگیں چری ہوئی تھیں اور چہرے سے بیزاری ٹپک رہی تھی۔ اس کا سراپا کسی بھدے جاپانی بت کا سا تھا۔ اس دیوھیکل شخص کا ٹھس پن دیکھ کر ان لوگوں کو بڑی مایوسی ہوئی جو اس سے ملنے آئے تھے۔ انھوں نے سہمی سہمی اور غلامانہ نظروں سے کواشنین کو دیکھا اور ان کی مصنوعی مسکراھٹوں نے ان کے ھونٹوں پر جان توڑدی۔ یہ مسکراھٹیں خاص اس موقع کے لئے تیار کی گئی تھیں۔ سخت گیر کنڈکٹر دروازے کے دونوں طرف سپاھیوں کی طرح ایستادہ ھو گئے۔ اتفاق سے بوبروف کی نظر نینا پر پڑی اور یہ دیکھ کر اس کے دل میں ٹیس سی اٹھی کہ نینا کے چہرے پر بھی وھی مسکراھٹ، وھی خوف ھے جو بت کو دیکھ کر کسی وحشی کے چہرے پر بکھر جاتا ھے۔

"یہ کیا ھے، تین لاکھ سالانہ کی آمدنی کے لئے جذبۂ احترام اور حیرت یا کچھ اور؟"، اس نے سوچا۔ "اگر ایسا ھے تو آخر یہ لوگ ایک ایسے شخص کے سامنے دم کیوں ھلا رھے ھیں جو ایک نگاہ غلط انداز سے انھیں دیکھنے کا روادار بھی نہیں ھے؟ شاید یہ کرشمہ نفسیاتی ذھنی غلامی کے قانون کا ھے؟"

کواشنین تھوڑی دیر اوپر کھڑا رھا پھر آھستہ آھستہ سڑھیاں اترنے لگا، اس کی توند آگے آگے

تھی۔ ریل کا عملہ بڑی احتیاط سے اسے سہارا دے رہا تھا۔

مجمع تعظیماً جھک کر پیچھے ہٹ گیا تاکہ وہ گزر سکے۔ ان کے سلام کے جواب میں اس نے نچلا ہونٹ نکال کر کچھ یونہی برائے نام سا اشارہ کیا اور منمنی سی آواز میں اعلان کیا ''کل تک کے لئے تم سبکی چھٹی۔''

پھاٹک تک پہنچنے سے پہلے وہ مینیجر کی طرف جھکا۔

''سرگئی والیریانووچ، اس کا تعارف کرا دینا مجھ سے'' اس نے زیرلب کہا۔

''آپ کا مطلب ہے زینینکو سے؟'' شیلکوونیکوف نے خوشامدانہ لہجے میں پوچھا۔

''اور کس سے، لعنتی!'' اچانک کواشنین چڑکر غرایا۔ ''نہیں، نہیں، یہاں نہیں!'' اس نے مینیجر کو لپکتے دیکھا تو اس کی آستین پکڑ لی۔ ''یہ سب مل میں کرنا ہوگا۔''

۷

سنگ بنیاد رکھنے اور نئی بھٹی کو چالو کرنے کا کام کواشنین کی آمد کے چار دن بعد ہونا طے پایا تھا۔ طے یہ ہوا تھا کہ ان دو رسومات کو بہت شان و شوکت سے منایا جائے۔ اس موقع پر

قرب و جوار کے شہروں کروتو گوری، وورونینو اور لووف کے آھن ساز کارخانوں میں باقاعدہ چھپے ہوئے دعوت نامے بھیجے گئے تھے۔

کواشنین کے بعد پیٹرسبرگ سے بورڈ آف ڈائریکٹرس کے دو ممبر، چار بلجیائی انجنیر اور متعدد بڑے حصےدار اور آئے۔ مل میں یہ خبر گرم تھی کہ بورڈ نے جشن کے کھانے کے لئے تقریباً دو ہزار روبل کا تخمینہ پاس کیا ھے، لیکن اب تک ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا تھا جس سے یہ افواہ صحیح ثابت ہو سکے، شراب اور کھانے کا سامان خریدنے کا بوجھ ابھی تک ٹھیکے داروں کے کندھوں پر تھا۔

خوش قسمتی سے جشن کے دن موسم بہت شاندار رہا۔ یہ دن آغاز خزاں کے ان روشن اور نتھرے ہوئے دنوں میں سے ایک تھا جب نیل گگن کی نیلاھٹ میں بلا کی چمک اور گہرائی آ جاتی ھے اور ٹھنڈی ھوا کے جھونکے نفیس اور تیز شراب کی طرح مدھوش کن ھوتے ھیں۔ لوھا پگھلانے کی نئی بھٹی اور آتش‌دان کی دھونکنیوں کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے چوکور گڑھے کھودے گئے تھے۔ ان کے گرد مزدوروں کا بےپناہ ھجوم نیم دائیرے کی شکل میں کھڑا تھا۔ انسانوں کی اس جیتی جاگتی دیوار کے بیچوں‌بیچ ایک معمولی سی بےروغن میز رکھی تھی جس پر سفید کپڑا پڑا ھوا تھا۔ میز پر ایک

صلیب، ایک انجیل، پوترجل کے لئے ایک ٹین کا پیالہ اور پانی چھڑکنے کا کیوڑادان رکھا تھا۔ تھوڑی دور پر پندرہ مزدوروں کے آگے سبز قبا میں ملبوس پادری کھڑا تھا۔ ان مزدوروں نے نعت گانے کے لئے اپنی خدمات پیش کی تھیں۔ پادری کی قبا پر کشیدے سے زربفت کی صلیبیں بنی ہوئی تھیں۔ نیم دائیرے کے کھلے ہوئے حصے میں انجنیروں، ٹھیکے داروں، اونچے درجے کے فورمینوں اور کلرکوں وغیرہ کا مجمع براجمان تھا، اس پرشور اور رنگارنگ مجمع میں تقریباً دو سو آدمی ہوں گے۔ کونے میں ایک کیمرہ‌مین اپنے سر اور کیمرے پر سیاہ کپڑا ڈالے مصروف پیکار تھا۔

دس منٹ بعد کواشنین بہترین قسم کے تین خاکستری گھوڑوں‌والی گاڑی میں بیٹھا ہوا موقع جشن پر پہنچا۔ وہ گاڑی میں تنہا تھا، شاید اس لئے کہ اس کے پاس اور کوئی شخص سما ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے پانچ چھ گاڑیاں اور آئیں۔ مزدور فوراً سمجھ گئے کہ ''حاکم'' یہی ہے۔ چنانچہ سب نے ایک ساتھ ٹوپیاں اتار لیں۔ کواشنین ان کے قریب سے گزرا اور اشارے سے پادری کو سلام کیا۔

مجمع پر سناٹا چھا گیا تھا۔ لیکن پادری کی چیختی ہوئی چھوٹی سی منمنی آواز سناٹے کو چیرتی ہوئی گونجی: ''ہمیشہ ہمیشہ خدا کی رحمت رہے۔''

”آمین،، خود ساختہ منڈلی نے خاصے آھنگ کے ساتھ کہا۔

اس وقت مزدوروں کی تعداد کل تین ہزار ہوگی۔ انھوں نے بڑے زوروشور سے سینوں پر صلیب کا نشان بنایا، بالکل اسی طرح جس طرح انھوں نے کواشنین کو سر جھکا کر بیک وقت سلام کیا تھا۔ پل بھر کو سب نے سر جھکائے اور پھر بال پیچھے جھٹک کر سر بلند کر لئے۔ بوبروف بڑے غور سے انھیں تک رہا تھا۔ اگلی دو صفوں میں سنجیدہ صورت معمار کھڑے تھے۔ ان سب کے جسم پر سفید اپرن تھے۔ تقریباً سب کے بال سن کے سے اور داڑھیاں لال تھیں، ان کے پیچھے لوھا پگھلانے والے مزدور تھے۔ ان کی چوڑی چکلی سیاہ صدریاں انگریز اور فرانسیسی مزدوروں کی صدریوں کے طرز پر کٹی ہوئی تھیں۔ اور چہروں پر لوھے کی گرد کا غازہ تھا جسے دھونا ناممکن تھا۔ ان کے درمیان طوطا چونچ بدیسی مزدوروں کے چہرے جھانک رہے تھے۔ ان کے پیچھے، لوھا پگھلانے اور گڑھائی کرنےوالے مزدوروں کی اوٹ سے چونے کی بھٹی کے مزدوروں کی جھلک نظر آ رہی تھی، ان کے چہرے آٹے جیسی گرد کے غازے میں دھنسے ہوئے تھے اور شعلہ‌ریز سرخ آنکھیں اتنی دور سے بھی دھک رہی تھیں۔

ھر بار جب حمد منڈلی ھم آواز ھوکر زور زور سے گاتی ”اے پاک مریم، اپنے غلاموں کو سزا

سے بچا!،، تو پورے تین ھزار افراد بڑے استقلال کے ساتھ سینوں پر صلیب کا نشان بنا کر سر جھکا لیتے اور فضا میں ھلکی سی بے جان سرسراھٹ گونج اٹھتی۔ بوبروف کو محسوس ھوا کہ سرمئی رنگ کے اس بے پناہ ھجوم کی دعا میں نہایت بنیادی، زوردار مگر بچکانی اور اثرانگیز خصوصیت ھے۔ اگلے دن سے یہ مزدور روزانہ بارہ گھنٹے تک خون پسینہ بہائیں گے۔ نجانے ان میں سے کس کس کی قسمت میں یہ لکھا ھے کہ کل ھی کسی اونچے مینار سے گر کر، پگھلے ھوئے لوھے میں تڑپ کر یا ٹوٹے ھوئے پتھروں اور اینٹوں کے ڈھیر کے نیچے دب کر اپنی زندگی اس جانفشانی، اس محنت و مشقت کی نذر کر دے؟ حمد منڈلی پاک مریم سے درخواست کر رھی تھی کہ وہ اپنے غلاموں کو سزا سے محفوظ رکھے، مزدور تعظیماً سر جھکا رھے تھے اور اپنے بھورے بال جھٹک رھے تھے، کون جانے اس وقت وہ قسمت کے اس اٹل فیصلے کے بارے میں سوچ رھے ھوں؟ یہ طاقتور اور جیالے مگر سیدھے سادھے بڑے بڑے بچے، یہ منکسر سورما جو روز اپنی سرد اور تاریک کچی جھونپڑیوں سے نکل کر اپنے جرأت آزما اور صبرآزما کارنامے پر نکل کھڑے ھوتے ھیں، یہ کنواری مریم پر بھروسہ نہ کریں تو پھر کس پر کریں؟

بوبروف کے دل میں کچھ اسی قسم کے خیالات کا ھجوم تھا۔ اسے وسیع و عریض شاعرانہ مناظر سے

خاص لگاؤ تھا۔ اس نے مدتوں سے عبادت نہیں کی تھی، لیکن جب کبھی پادری کی دور دور سے آتی ہوئی تیز آواز کے بعد منڈلی کی ہم‌آہنگ آواز گونجتی تو جذبات کی شدت سے اس کی رگوں میں لہر سی دوڑ جاتی۔ یہ سیدھے سادے محنت کش لوگوں کی بےلوث عبادت تھی جو سخت اور خطرناک مزدوری کرنے کے لئے اپنے گھربار سے جدا ہوکر نہ جانے کس کس کونے سے یہاں آکر اکٹھے ہوئے تھے۔ ان کی سیدھی سادی عبادت میں بلا کی طاقت، بلا کا وجدان، بلا کی قربانی تھی۔

عبادت ختم ہو گئی۔ کواشنین نے نہایت شان سے گڑھے میں ایک سنہری سکہ پھینک دیا۔ لیکن وہ ہاتھ میں چھوٹا سا کدال لےکر جھکنے سے قاصر تھا۔ چنانچہ یہ کام شیلکوونیکوف نے انجام دے دیا اور پھر پورا گروہ بھٹیوں کی طرف چل پڑا جن کے سیاہ مینار آہنی بنیادوں پر کھڑے تھے۔

یہ نئی پانچویں بھٹی ٹکنیکی لفظوں کے مطابق "زوروں میں چالو تھی"۔ بھٹی میں سطح زمین سے تیس انچ اوپر ایک سوراخ تھا جس سے پگھلی ہوئی دھات کے میل کا کھولتا دھکتا ہوا سفید چشمہ ابل رہا تھا اور گندھک کے نیلے نیلے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ دھات کے میل کا یہ چشمہ نالی سے بہتا ہوا بھٹی کی عمودی نیو کے پاس رکھی ہوئی

پلیوں میں گر رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر یہ چشمہ سخت ہوکر جو کی شکر جیسا گاڑھا اور سبز سبز سا ہو جاتا۔ بھٹی کے اوپر کھڑے ہوئے مزدور مستقل اس میں کوئلہ اور کچی دھات جھونک رہے تھے جو ہرہر منٹ گاڑیوں میں لدلد کر اوپر پہنچ رہی تھی۔

پادری نے بھٹی کے مختلف حصوں پر پوتر جل چھڑکا اور بوڑھوں کی طرح ڈگمگاتا ہوا نہایت عاجزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ بھٹی کی دیکھ بھال کرنے والا فورمین سیاہ چہرےوالا ایک مضبوط شخص تھا، اس نے اپنے اوپر صلیب کا نشان بنایا اور اپنی ہتیلی پر تھوک دیا۔ اس کے چاروں مددگاروں نے بھی یہی کیا۔ پھر انھوں نے ایک لمبی سی فولادی سابر اٹھائی اور بڑی دیر تک اسے آگے پیچھے جھلاتے رہے، ذرا دیر دم لیا اور بھٹی کے اندر پھنسا دی۔ سابر مٹی کے ڈاٹ سے ٹکرائی اور فضا میں جھنکار گونج گئی۔ تماشائیوں نے گھبرا کر کسی خوفناک حادثے کے اندیشے میں آنکھیں بند کر لیں۔ بعض بعض تو جلدی سے پیچھے ہٹ گئے۔ پانچوں آدمیوں نے تین چار دفعہ سابر پھنسائی، اور چوتھی دفعہ اچانک جہاں سابر پھنسی تھی وہاں سے پگھلی ہوئی دھات کا چمکتا ہوا سفید فوارہ ابل پڑا۔ فورمین نے سابر گھما گھما کر سوراخ بڑا کیا اور ڈھلا ہوا لوہا آہستہ آہستہ ریتیلی نالی میں بہنے لگا۔

لوہے کا رنگ آتشیں اور بادامی سا ہو گیا تھا۔ سوراخ سے بڑے بڑے چمکدار تارے پھوٹتے، فضا میں جا کر چٹختے اور پگھل جاتے۔ لوہا بہت آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا اور اس سے ایسی ناقابل برداشت تپش نکل رہی تھی کہ توبہ۔ مہمان اس تپش کے عادی کہاں تھے، وہ مستقل گھبرا گھبرا کر پیچھے ہٹتے رہے۔ انھوں نے چہروں کو ہاتھوں سے ڈھانپ رکھا تھا۔

بھٹی سے انجنیر دھونکنی مشینوں کے شعبے کی طرف چلے۔ کواشنین نے پہلے ہی اس کا خاص انتظام کر لیا تھا کہ جشن میں شرکت کرنے والے حصے دار اس عظیم الشان مل اور اس کے کام کی گھما گھمی کو اچھی طرح دیکھ سکیں۔ وہ خوب جانتا تھا کہ ان جدید طریقوں کو اور ان کی خوبیوں کو دیکھ کر ان لوگوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی اور وہ اپنی اپنی تنظیموں میں لوٹ کر ان عجیب وغریب کارناموں کی داستانیں سنائیں گے۔ وہ کاروباری لوگوں کی نفسیات سے خوب واقف تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس طرح وہ حصوں کی نئی کھیپ بیچ سکے گا جس کو نکالنے سے مجلس عامہ نے اب تک انکار کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کھیپ سے خود اس کی ذات کو بہت فائدہ پہنچے گا۔

حصے دار تو ایسے متاثر ہوئے کہ ان کے سروں میں درد ہونے لگا اور ٹانگیں کانپ گئیں۔

6*

پریشانی اور گھبراہٹ سے ان کا رنگ فق تھا۔ دھونکنی مشینوں کے شعبے میں پندرہ پندرہ فٹ کے چار عمودی فشاروں کے ذریعے نلکوں میں ہوا ٹھونسی جا رہی تھی۔ انھیں ہوا کی گرج سنائی دی جس کے زور سے عمارت کی پتھریلی دیواریں کانپ رہی تھیں۔ اب ہوا دس فٹ قطروالے دیوھیکل آھنی نلکوں کے ذریعہ بھٹی کے دھکتے ہوئے چولھوں سے بھی گزر رہی تھی۔ ان چولھوں کی دھکتی ہوئی گیس ہوا کو تپاکر اس کی حرارت ھزار ڈگری تک پہنچا رہی تھی، یہاں سے ہوا بھٹی میں جاتی اور ہوا کا دھکتا ہوا شعلہ بار سانس کچی دھات اور کوئلے کو پگھلا دیتا۔ اس شعبے کا انچارج انجنیر یہ سب تفصیل سمجھا رہا تھا۔ وہ ایک ایک کرکے ہر حصےدار کے کان کے قریب منہ لیجاتا اور اپنی پوری آواز سے چیختا یہاں تک کہ اس کے پھیپھڑے دکھنے لگتے۔ لیکن اس کے الفاظ مشینوں کی خوفناک کھڑکھڑاھٹ میں ڈوب کے رہ جاتے، اور ایسا معلوم ھوتا جیسے وہ بڑی خاموشی اور محنت سے صرف ھونٹ ھلا رہا ھو۔

اور پھر شیلکوونیکوف نے مہمانوں کو فولاد بنانےوالی بھٹی میں مدعو کیا، یہ اونچی عمارت اتنی کشادہ تھی کہ اس کا آخری سرا ایک ننھا سا نقطہ لگ رہا تھا۔ عمارت کی ایک دیوار کے ساتھ ساتھ ایک پتھریلا چبوترا تھا جس

میں بے پہیوں کی ریل گاڑیوں کی شکل کی بیس بھٹیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان میں لوہا پگھلایا جاتا تھا۔ یہاں پگھلے ہوئے لوہے میں کچی دھات ملا کر تپایا جاتا اور فولاد بنایا جاتا تھا۔ اور پھر یہ فولاد نلکوں سے گزر کر لوہے کے بڑے بڑے سانچوں میں بھر جاتا — یہ سانچے بے تلی کے ڈبوں کی طرح تھے اور ان میں ہینڈل لگے ہوئے تھے۔ یہاں لوہا سخت ہوکر ڈلا سا بن جاتا تھا، ہر ڈلے کا وزن تقریباً تین چوتھائی ٹن کے برابر تھا۔ شیڈ کے دوسری طرف پٹریاں بچھی ہوئی تھیں جن پر بھاپ سے چلنے والے کرین سدھے ہوئے وفادار اور پھرتیلے جانور کی طرح ادھر سے ادھر دوڑتے رہتے۔ ان کے تنے ہوئے دھڑ سرسراتے اور ان سے جھنجھناہٹ کی آواز گونجتی رہتی۔ کرین، سانچے کا ہینڈل پکڑ کر اسے اٹھاتا، اور فولاد کی ایک دھکتی ہوئی سرخ سلاخ پھسل کر باہر نکل آتی۔ لیکن اس سے پہلے کہ سلاخ زمین کو چھوئے، ایک مزدور غیرمعمولی پھرتی سے اس کی گردن میں کلائی بھر موٹی زنجیر پھنسا دیتا۔ دوسرا کرین زنجیر باندھتا اور نہایت سبک روی سے سلاخ کو اڑا کر لے جاتا اور دوسری سلاخوں کے ساتھ تیسرے کرین میں جڑے ہوئے تختے پر رکھ دیتا۔ تیسرا کرین یہ بوجھ شیڈ کے آخری کونے تک لے جاتا جہاں چوتھا کرین سلاخوں کو تختے سے اٹھا کر گیس کی زمین دوز بھٹی میں

لٹکا دیتا۔ اس کرین میں کانٹوں کے بجائے دستپنے سے لگے ہوئے تھے۔ یہاں سلاخوں کا رنگ تپ کر سفید سا ہو جاتا۔ آخر میں پانچواں کرین انھیں بھٹی سے نکالتا، اور ایک ایک کرکے تیز دندانوں والے بڑے سے پہیے میں رکھ دیتا، یہ پہیہ انتہائی حیرت انگیز رفتار سے اپنے افقی دھرے پر گھومتا رہتا۔ پانچ سیکنڈ میں فولاد کی یہ موٹی موٹی سلاخیں مکھن کی ٹکیہ کی طرح ٹوٹ کر دو ہو جاتیں۔ اس کے بعد ہر سلاخ کے دونوں ٹکڑے، باری باری بھاپ سے چلنے والے ہتوڑے کے پچیس ہزار پاؤنڈ بوجھ تلے دبتے اور موم کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے۔ مزدور بڑھ کر ان ٹکڑوں کو گاڑیوں میں لادتے اور دھکیل کر دوڑا دیتے۔ دھکتے ہوئے سرخ لوہے سے شعلوں کی لہریں سی اٹھ کر راستے میں آنے والوں کو چکاچوند کرتی رہتیں۔

اس کے بعد شیلکوونیکوف، مہمانوں کو ریل رولنگ مل دکھانے کو بڑھا۔ دھکتی ہوئی سرخ دھات کی ایک بڑی سی سلاخ بہت سی مشینوں سے گزر کر رولر کے اوپر سے ہوتی ہوئی ایک مشین سے دوسری کی طرف جا رہی تھی۔ یہ گھومتے ہوئے رولر زیادہ تر زیر زمین تھے، ان کا صرف اوپری حصہ نظر آ رہا تھا۔ سلاخ متضاد سمتوں میں گھومنے والے دو فولادی بیلنوں کے بیچ میں دب کر انھیں جھٹکے سے ایک دوسرے سے دور کر دیتی

تھی، رولر اس بوجھ تلے کانپ رہے تھے۔ تھوڑی دور پر ایک اور مشین تھی جس کے بیلنوں کا درمیانی فاصلہ اس سے بھی کم تھا۔ فولاد کی سلاخ ایک کے بعد ایک مشین سے گزر کر لمبی اور پتلی ہوتی چلی گئی، ریل مل کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کے کئی چکر لگانے کے بعد سلاخ نے ستر فٹ لمبی دھکتی ہوئی سرخ پٹڑی کی شکل اختیار کرلی۔ اور ان پندرہ مشینوں کو چلانے کا پیچیدہ کام صرف ایک آدمی کے ذمے تھا جو بھاپ کے انجن کے قریب جہاز کے پل نما اونچے چبوترے پر کھڑا تھا۔ وہ دستہ کھینچتا اور تمام بیلن اور رولر ایک سمت میں گھومنے لگتے، پھر وہ دستہ واپس کھینچ لیتا اور وہ سب دوسری سمت میں گھومنے لگتے۔ پٹڑی پوری طرح پھیل کر لمبی ہو جاتی تو ایک گول آری اس کے تین ٹکڑے کر دیتی، اس عمل سے ہوا میں چنگاریوں کا طوفان سا اٹھتا اور بڑی جھنجھناہٹ پیدا ہو جاتی۔

اب پورا مجمع خراد کے کارخانے کی طرف بڑھا جہاں گاڑیوں اور انجنوں کے پہیے وغیرہ بنائے جاتے تھے۔ چمڑے کی ٹرانسمیشن بیلٹ لوہے کے ایک مضبوط ستون سے بندھی ہوئی پوری چھت کے ساتھ دوڑتی چلی گئی تھی۔ اس بیلٹ نے مختلف وضع قطع اور مختلف حجم کی دو تین سو مشینوں میں جان ڈال رکھی تھی۔ چاروں طرف ان گنت پٹیاں ادھر

سے ادھر پھیلی ہوئی تھیں - یہ سمجھئے کہ پٹیوں کا اچھا خاصا گچھا مرتعش جال سا بن گیا تھا - بعض مشینوں کے پہیے ایک ایک سیکنڈ میں بیس بیس چکر کھا رہے تھے اور بعض کی رفتار اتنی کم تھی کہ پتہ بھی نہیں چلتا تھا کہ گھوم رہے ہیں یا نہیں - زمین پر لوہے، فولاد اور پیتل کی چھیلن کے پتلے لمبے اور بل کھائے ہوئے ٹکڑوں کی موٹی سی تہہ بچھی ہوئی تھی - سوراخ کرنےوالی مشینوں کا ناقابل برداشت شور فضا میں گونج رہا تھا - مہمانوں کو ڈھبریاں بنانےوالی مشین دکھائی گئی - مشین کیا تھی لوہے کے دو بڑے بڑے جبڑے تھے جو مسلسل کچھ چبا رہے تھے - دو مزدور ایک لمبی سی دھکتی ہوئی سرخ سلاخ کا ایک کونا مشین کے منہ میں گھسا رہے تھے، مشین اس کا ایک ٹکڑا توڑتی اور پل بھر بعد بنی بنائی ڈھبری اگل دیتی -

وہ لوگ خراد سے نکلے تو شیلکوونیکوف نے، حسب‌معمول صرف حصےداروں سے مخاطب ہوکر، رائے دی کہ اب آپ لوگ ۹۰۰ گھوڑوں کی طاقت‌والے ''کمپاؤنڈ،، کا معائنہ کیجئے کیونکہ یہی تو وہ حصہ ہے جس پر مل کو ناز ہے - پیٹرسبرگ سے آئے ہوئے حضرات نے اب تک جو کچھ دیکھا اور سنا تھا وہ اسی سے بےانتہا متاثر اور پریشان تھے - نئی معلومات میں دلچسپی لینے کا تو سوال ہی کیا

اب تو اس خیال ہی سے ان کی پریشانی بڑھ رہی تھی۔ ریل مل کی گرمی سے ان کے چہرے سرخ ہو گئے تھے اور ہاتھ اور کپڑے گرد میں اٹے ہوئے تھے۔ اس لئے وہ محض دنیا دکھاوے کو ذرا سا تکلف کرنے کے بعد مینیجر کا مشورہ مان گئے۔ آخر انہیں ان لوگوں کی عزت کا پاس بھی تو تھا جنہوں نے انہیں یہاں بھیجا تھا۔

''کمپاؤنڈ،، ایک علحدہ عمارت میں تھا، یہ عمارت بہت صاف ستھری اور خوبصورت تھی، کھڑکیاں بہت روشن اور فرش پکا تھا۔ مشین کا حجم بہت تھا لیکن وہ کسی قسم کا شور پیدا نہیں کر رہی تھی۔ تیس تیس فٹ لمبے دو فشارے بڑی پھرتی اور آہنگ کے ساتھ لکڑی میں رکھے ہوئے بیلنوں پر پھسل رہے تھے۔ بیس فٹ قطر کا ایک پہیہ اسی پھرتی اور خاموشی کے ساتھ گھوم رہا تھا۔ پہیے پر بارہ رسیاں پھسل رہی تھیں۔ مشین کی رفتار انتہائی تیز ہونے کی وجہ سے کمرے سے خشک اور گرم ہوا کے تیزوتند جھونکے نکل رہے تھے۔ یہ مشین رولنگ مل، دھونکنی اور خراد کی مشینوں کے لئے طاقت مہیا کرتی تھی۔

''کمپاؤنڈ،، کا معائنہ کرنے کے بعد حصے داروں کو یقین ہو گیا کہ ان کی مشکل آسان ہونے والی ہے۔ لیکن شیلکوونیکوف کا دل اب بھی نہ بھرا،

اس نے نہایت انکساری کے ساتھ ایک نئی تجویز پیش کی:

"صاحبان، اب میں آپ کو مل کی زندگی اور چہل پہل کا مرکز، مل کا دل دکھاؤں گا۔"

وہ انھیں تقریباً گھسیٹتا ہوا اسٹیم بائلر ہاؤس لے گیا۔ لیکن حصے دار اب تک اتنا کچھ دیکھ چکے تھے اور اتنے تھکے ہوئے تھے کہ "مل کے دل نے" — پینتیس فٹ لمبے، دس فٹ اونچے بیلن نما بارہ بائلروں نے انھیں ذرا بھی متاثر نہیں کیا۔ ان کا دل تو بڑی دیر سے اس کھانے میں پڑا ہوا تھا جو ان کے لئے چنا جا چکا تھا۔ اب تو انھوں نے پوچھ گچھ کا سلسلہ بھی منقطع کر دیا تھا، شیلکوونیکوف کے سمجھانے پر بے تعلقی اور کھوئے کھوئے پن سے ہاں ہوں کر دیتے اور بس شیلکوونیکوف کی بک بک ختم ہوتے ہی انھوں نے اطمینان کا سانس لیا اور نہایت جوش و خروش سے اس سے ہاتھ ملایا۔

اور اب صرف بوبروف بائلروں کے پاس رہ گیا تھا۔ وہ بھٹیوں کے قریب نیم تاریک پتھریلے اور عمیق غار کے دہانے پر کھڑا ہوا بڑی دیر تک ان چھ انسانوں کی سخت محنت کو دیکھتا رہا جو کمر تک ننگے تھے۔ ان کا فرض تھا کہ وہ دن رات سانس لئے بغیر بھٹی میں کوئلہ جھونکتے رہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد لوہے کے گول دروازے

چرچرا کر کھلتے اور بھٹیوں میں چنگھاڑتے ہوئے سفید سفید شعلے بوبروف کی نگاھوں کے سامنے ناچ اٹھتے۔ مزدوروں کے نیم برھنہ جسموں کو آگ نے جھلس دیا تھا اور ان کی جلد پر کوئلے کی گرد جمی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی یہ سیاہ جسم نیچے جھکتے اور ان کی پشت کے تمام پٹھے اور ریڑھ کی ھڈی کے تمام جوڑ ابھر آتے۔ ان کے تھکے ماندے کمزور ھاتھ باربار کرچھا بھر کوئلہ اٹھاتے اور انتہائی پھرتی سے اسے بھٹی کے دھکتے ہوئے منہ میں جھونک دیتے۔ دو اور مزدور اوپر کھڑے تھے تاکہ وہ بائلر ھاؤس کے گرد پڑے ہوئے کوئلے کے ڈھیر سے کوئلہ بھربھر کر مستقل وھاں پہنچاتے رھیں۔ بوبروف نے سوچا کہ بھٹی جھونکنےوالوں کی یہ مسلسل مشقت کتنی تکلیف‌دہ اور انسانیت سوز ھے۔ ایسا معلوم ھوتا تھا جیسے کسی غیرفطری طاقت نے انھیں زندگی بھر کے لئے بھٹی کے اس کھلے ہوئے منہ سے باندھ دیا ھے اور وہ اس وقت تک اس لالچی اور پیٹو درندے کا پیٹ بھرتے رھیں‌گے یہاں تک کہ موت انھیں اپنی خوفناک آغوش میں کھینچ لےگی۔

”کہو کیا دیکھ رھے ھو، یہی نا کہ یہ لوگ تمھارے مولخ کا پیٹ کس طرح بھر رھے ھیں؟“ بوبروف کے پیچھے سے کسی کی ھنستی ہوئی آواز آئی۔

بوبروف چونک کر غار میں گرتے گرتے بچا۔ وہ حیران تھا کہ اس کے خیالات اور ڈاکٹر کے مذاق میں کس قدر بلاکی یکسانیت ہے۔ وہ اپنے حواس پر قابو پانے کے بعد بھی بڑی دیر تک اس عجیب اتفاق پر حیران ہوتا رہا۔ اس کا ہمیشہ سے یہ حال تھا کہ اگر اس کے قریب بیٹھا ہوا کوئی شخص اچانک کوئی ایسی بات کہہ دے جو اس وقت خود بوبروف پڑھ یا سوچ رہا ہو تو اسے بڑی حیرت ہوتی، اور یہ بات بہت دلچسپ اور پر اسرار لگتی تھی۔

"کیوں ڈر گئے کیا؟" ڈاکٹر نے بوبروف کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "بھئی معاف کرنا۔"

"ہاں۔ تھوڑا سا گھبرا گیا تھا۔ تم اتنی خاموشی سے آئے کہ ایک دم سے بڑی حیرت ہوئی۔"

"اندرئی ایلیچ، اپنے اعصاب کا خیال رکھنا چاہئے تمھیں۔ تمھارے اعصاب بہت خراب ہیں۔ میرا کہنا مانو: تھوڑے دن کی رخصت لے کر کہیں باہر چلے جاؤ۔ آخر یہاں جان کیوں کھپائے ہو؟ چھہ سات مہینے ذرا مزے کی زندگی گزارو، عمدہ شراب پیو، شہسواری کرو اور ذرا عشق و محبت سے دل بہلاؤ۔"

ڈاکٹر بھٹی کے دھانے پر پہنچ کر نیچے دیکھنے لگا۔

"اف جہنم ہے یہ تو!" وہ چلایا۔ "ان ننھے ننھے سماواروں کا وزن کتنا ہوگا بھلا؟

میرے خیال میں ہر ایک پندرہ پندرہ ٹن کا تو ہوگا ہی؟''

''اس سے کچھ زیادہ، پچیس ٹن سے کچھ زیادہ۔''

''افوہ! اور اگر ان میں سے ایک اچانک... ار... بھک سے ہو جائے تب؟ بڑا دلچسپ نظارہ رہے گا نہ؟ کیوں؟''

''بہت دلچسپ۔ عین ممکن ہے کہ یہ سب عمارتیں زمین پر آ رہیں۔''

گولڈبرگ نے سر ہلایا اور معنی خیز انداز میں سیٹی بجانے لگا۔

''لیکن یہ حادثہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''اوہ، بہت سی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ عام طور پر تو یہ ہوتا ہے کہ بائلر میں پانی بہت کم رہ جاتا ہے اور اس کی دیواریں گرم ہو ہوکر لال انگارہ بن جاتی ہیں۔ اگر ایسے میں بائلر میں اور پانی بھیج دیا جائے تو پل بھر میں ڈھیروں بھاپ بن جائےگی مگر دیواریں اس کا دباؤ برداشت نہیں کر سکتیں اور بائلر پھٹ جاتا ہے۔''

''تو تم چاہو تو جان بوجھ کر یہ تماشہ کر سکتے ہو؟''

''جب چاہو کہو۔ ایک دفعہ دیکھنا چاہتے ہو کیا؟ مقیاس میں پانی کم ہو تو اس چھوٹے سے لیور کو ذرا سا گھماتے ہی قصہ ختم۔''

بوبروف مذاق میں یہ سب کہہ رہا تھا لیکن اس کی آواز میں بلا کا خلوص تھا اور نگاہوں میں سختی اور اداسی کی جھلک تھی۔

''لعنت ہے،، ڈاکٹر نے دل ہی دل میں کہا۔ ''آدمی دل کا اچھا ہے مگر خبطی ہے۔،،

''کھانے پر کیوں نہیں گئے تم، اندرئی ایلیچ؟،، اس نے غار سے پیچھے ہٹتے ہوئے پوچھا۔ ''ذرا جا کے دیکھو تو سہی ان لوگوں نے تجربہ‌گاہ میں کیسا خوبصورت سرما باغ بنا لیا ہے۔ کیا شاندار دعوت تھی، حیران رہ جاتے دوست۔،،

''جہنم میں جائے دعوت! میں تو ان انجنیروں کی دعوتیں برداشت نہیں کر سکتا،، بوبروف نے برا سا منہ بنایا۔ ''شیخی بازی، شور ہنگامہ، ایک دوسرے پر چھینٹے اچھالنا، اور پھر وہی گھسے پٹے جام جن میں مقرر حضرات کی شراب خود ان کے اوپر یا ان کے برابروالوں کے اوپر چھلکنے لگتی ہے... نفرت ہے مجھے ان دعوتوں سے!،،

''ہاں، دوست، ٹھیک کہتے ہو،، ڈاکٹر ہنسا۔ ''میں نے تو دعوت کا آغاز دیکھلیا۔ کواشنین کا تو جواب نہیں ہے۔ کہنے لگا: 'حضرات، انجنیر کے فرائض بہت اہم، بہت بلند ہیں۔ وہ دیس کے دوردراز کونوں میں ریل کی پٹڑیاں بھی بچھاتا ہے، بھٹیاں اور کانیں بھی بناتا ہے، تعلیم کے بیج بھی بوتا ہے اور تہذیب کے پھول بھی کھلاتا ہے،

اس کے بعد نجانے کن پہلوں کا ذکر کرنے لگا، نمبری فریبی ہے! کہنے لگا: 'صاحبو، آئیے ہم سب ایک ہوکر اپنے مفید فن کا مقدس پرچم بلند کریں!، ظاهر ہے یہ سنتے ہی ہر طرف تالیاں گونجنے لگیں۔ ''

وہ خاموشی سے چند قدم آگے بڑھے، اچانک ڈاکٹر کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔

''واہ کس قدر مفید فن ہے!'' اس نے غصے سے کہا۔ ''اور مزدوروں کی چالیں کنکروں اور کوڑے کباڑ سے بنائی گئی ہیں۔ بیمار لوگوں کی کوئی گنتی شمار نہیں ہے، بچے مکھیوں کی طرح ختم ہو رہے ہیں، یہی ہے تعلیم کا پرچار! ایوان کووہ میں اچانک ٹائیفائڈ پھیل جائے گا تب انہیں چین آئے گا۔ ''

''ڈاکٹر! کیا واقعی ٹائیفائڈ کے کچھ کیس ہوئے ہیں ادھر؟ اف ان کی چالوں کا تو ایسا حال ہے کہ یہ وبا بہت خوفناک ثابت ہوگی۔ ''

ڈاکٹر نے رک کر سانس لیا۔

''اور کیا!'' اس نے تلخی سے کہا۔ ''کل دو مریض آئے تھے۔ ان میں سے ایک آج صبح ختم ہو گیا، اور دوسرا اگر ابھی ختم نہیں ہوا تو یقیناً آج رات تک ٹھنڈا ہو جائے گا، نہ ہمارے پاس دوائیں ہیں نہ اسپتال میں مریضوں کے لئے جگہ ہے، نہ

اچھی نرسیں۔ ذرا دیکھتے رہو، اس کی کتنی قیمت ادا کرنی پڑےگی انھیں!،، اس نے ہوا میں مکا گھماتے ہوئے خفگی سے کہا۔

۸

افواہ بازوں نے چہ‌میگوئیاں شروع کر دیں۔ کواشنین کی آمد سے پہلے بھی مل میں طرح طرح کی چٹ‌پٹی کہانیاں پھیلی ہوئی تھیں، اس لئے جب لوگوں نے زینینکو کے خاندان سے یوں اچانک ربط ضبط بڑھتے دیکھا تو مطلب سمجھنے میں کسی کو دیر نہ لگی۔ خواتین دبی دبی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اس کا ذکر کرتیں اور مرد آپس میں بات کرتے ہوئے لاؤلپیٹ کے بغیر بہت ہی کھلے کھلے لفظوں میں سیاہ کو سیاہ کہہ دیتے۔ لیکن کسی کو کسی بات کا قطعی علم نہیں تھا۔ ہر شخص چٹ پٹے معاشقے کا منتظر تھا۔

اور واقعہ تو یہ ہے کہ یہ افواہیں کچھ ایسی بےبنیاد بھی نہیں تھیں۔ ایک بار مدعو ہونے کی دیر تھی، پھر تو کواشنین کی ہر شام زینینکو کے گھر میں گزرنے لگی۔ روزانہ گیارہ سوا گیارہ بجے اس کی نفیس ٹم‌ٹم جاگیر شپیتوفکا میں داخل ہوتی اور کوچوان اعلان کرتا: ”میرے مالک نے خاتون خانہ اور نوجوان خواتین سے درخواست

کی ہے کہ وہ ناشتہ ان کے ساتھ کریں،،۔ ان ناشتوں پر اور کوئی شخص مدعو نہ ہوتا۔ کواشنین کا کھانا ایک فرانسیسی باورچی تیار کرتا تھا۔ یہ باورچی تو ہر سفر میں، یہاں تک کہ ولایت کے سفر میں بھی کواشنین کے ساتھ رہتا تھا۔

کواشنین اپنے ان نئے ملاقاتیوں کے ساتھ ایک خاص قسم کا برتاؤ کرتا تھا۔ پانچوں لڑکیوں کے ساتھ تو اس کے تعلق فوراً کنوارے زندہ دل بے‌تکلف اور پھکڑ چچا کے سے ہو گئے تھے۔ تین ہی دن میں وہ انھیں ان کے پیار کے ناموں سے پکارنے لگا البتہ پیار کے نام کے ساتھ ان کے باپ کا نام بھی چپکا دیتا تھا۔ سب سے چھوٹی لڑکی یعنی کاسیا کو تو وہ ''بچی،، اور ''چوزی،، کہہ کہہ کر چھیڑتا اور اس کی موٹی ٹھڈی کو پکڑتا۔ ایسے موقعوں پر شرم کے مارے کاسیا کی آنکھوں میں آنسو آجاتے، لیکن وہ بھول کر بھی احتجاج نہ کرتی۔

آننا افاناسئیونا مذاق میں اسے برا بھلا کہتیں، لعنت ملامت کرتیں اور کہتیں کہ وہ ان کی لڑکیوں کو لاڈ پیار میں بالکل بگاڑ دے‌گا۔ واقعی، جہاں ان میں سے کسی کے منہ سے یونہی کوئی بات نکلی یا کسی خواہش کا اظہار ہوا، جھٹ وہ چیز حاضر ہو گئی۔ ماں کا بچاری نے ایک دفعہ بڑی معصومیت سے کہہ دیا کہ مجھے سائیکل

سیکھنے کا بہت شوق ہے، بس جناب اگلے ہی دن ایک ہرکارہ خارکوف سے بہترین سائیکل لئے چلا آ رہا ہے، سائیکل کی قیمت کچھ نہیں تو تین سو روبل تو ضرور ہوگی۔ بیتا سے اس نے یونہی کسی چھوٹی سی بات پر شرط لگائی اور پانچ سیر مٹھائی ہار گیا، کاسیا سے کوئی اور شرط ہارنے کے جرم میں وہ اس کے لئے ایک بروچ لایا جس میں جڑے ہوئے مونگا، یاقوت، یشب اور نیلم اس کے نام کے حروف بنا رہے تھے۔ ایک دفعہ اس نے کہیں سن لیا کہ نینا کو گھوڑ سواری کا شوق ہے۔ دو دن بعد اس کے پاس انگریز نسل کی ایک تنومند گھوڑی پہنچ گئی، یہ گھوڑی خواتین کی سواری کے لئے ایسی سدھی ہوئی تھی کہ کیا کہنا۔ نوجوان خواتین اس رحم دل فرشتے پر فریفتہ ہو گئیں جو ان کے دل میں جھانک کر ان کی ہر خواہش پڑھتا اور فوراً انھیں پورا کر دیتا۔ آننا افاناسئیونا کے ذہن میں کبھی کبھی ایک دبا دبا سا خیال پیدا ہوتا کہ یہ فراخدلی کچھ نامناسب سی ہے۔ لیکن نہ اس میں اتنی ہمت تھی نہ اسے اس کا ڈھنگ آتا تھا کہ وہ موقع محل دیکھ کر کواشنین پر یہ ظاہر کر دے۔ اگر کبھی وہ بڑی چاپلوسی کے ساتھ غلامانہ انداز میں تنبیہ کرتی بھی تھی تو کواشنین ہاتھ ہلا کر بات ختم کر دیتا اور بھدی مگر جمی جمائی آواز میں کہتا: ”ٹھیک ہے جی، ان

چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔،،

بہر حال اتنا ضرور تھا کہ وہ ان کی سب ہی بیٹیوں کا ایک سا خیال کرتا تھا۔ وہ تو ان سب کو خوش کرنے کی کوشش کرتا اور بڑی بےتکلفی سے ان سب سے کھیلتا تھا۔ وہ سب نوجوان جو کبھی اس گھر میں آیا جایا کرتے تھے اب نہایت انکسار اور سعادت مندی کے ساتھ پردۂ سیمیں سے غائب ہو گئے تھے۔ لیکن سویڑیفسکی جو اب تک سب ملا کر بہت سے بہت دوتین دفعہ آیا ہوگا مستقل آنے جانے لگا۔ اسے کسی نے مدعو نہیں کیا تھا، بس خود ہی گویا کسی پراسرار دعوت نامے پر آنے لگا۔ جلد ہی وہ خاندان کے ہر فرد کے لئے اس قدر اہم بن گیا کہ اس کے بغیر کام ہی نہ چل سکے۔ البتہ زینینکو کے گھر سے تعلقات قائم ہونے سے پہلے ایک چھوٹا سا واقعہ ضرور ہوا تھا۔ ہوا یہ کہ پانچ چھ مہینے پہلے اس نے اپنے رفیقان کار سے کہا تھا کہ میں تو کبھی نہ کبھی کروڑپتی بننے کا خواب دیکھتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ چالیس سال کا ہوتے ہوتے کروڑپتی بن جاؤں گا۔

”لیکن کیسے؟،، انھوں نے پوچھا۔

سویڑیفسکی دبی سی آواز میں ہنسا اور

7*

بھیگے بھیگے ہاتھوں کو مل کے بڑے پراسرار طریقے سے کہنے لگا:

"کامیابی کی ہر ایک راہ روم کو جاتی ہے۔"

اور اسے جیسے القا سا ہوا تھا کہ شپیتوفکا جاگیر کے حالات کا یہ نیا رخ اس کے روشن مستقبل کے لئے بہت سازگار ہے۔ کون جانے ایک دن وہ اپنے اس عظیم الشان افسر کے کام آ سکے یہ خیال آتے ہی اس نے اپنے تمام پتے داؤ پر لگائے۔ اور نہایت خوشامدانہ انداز میں کھی کھی کرتا ہوا کواشنین کی موجودگی میں وہاں حاضر ہو گیا۔ کواشنین کے سامنے اس کا حال کچھ ایسا ہوتا تھا جیسا کسی بڑے سے خوفناک کتے کے سامنے پلے کا ہوتا ہے، اس کے چہرے اور آواز کے ہر اتار چڑھاؤ سے ظاہر تھا کہ وہ کواشنین کے اشارے پر گندے سے گندہ کام کرنے کو تیار ہے۔

کواشنین کو اس کی موجودگی پر ذرا بھی اعتراض نہیں تھا۔ وہی کواشنین جو فیکٹری کے ڈائریکٹروں اور مینیجروں کو کھڑے کھڑے چلتا کر دیتا اور وجہ بتانے کی زحمت بھی گوارا نہ کرتا اس وقت خاموشی سے سویژیفسکی کی موجودگی پر رضامند ہوگیا۔ یقیناً راہ میں کوئی اہم کام اٹکا ہوا تھا۔ مستقبل کا کروڑپتی بڑی بےتابی سے لمحے گن رہا تھا۔

یہ اڑتی اڑتی سی خبر بوبروف کے کانوں تک

بھی پہنچ ہی گئی۔ اسے یہ سن کر ذرا بھی حیرت نہ ہوئی۔ وہ زینینکو کے خاندان سے خوب واقف تھا، اور اس کی اپنی اٹل رائے تھی۔ البتہ اسے یہ پریشانی ضرور تھی کہ کہیں نینا بھی اس افواہ کی گندی لپیٹ میں نہ آ جائے۔ اسٹیشن والی بات‌چیت کے بعد تو نینا سے اس کی محبت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اس نے بوبروف کے سامنے اپنی روح کھول کے رکھ دی تھی، اف یہ روح تمام تر کمزوریوں، تمام‌تر تذبذب کے باوجود کتنی حسین تھی۔ وہ سوچتا کہ میرے سوا باقی اور سب تو صرف اس کے ظاہری بناؤ سنگار، اس کے کپڑوں اور لباس سے واقف ہیں۔ اس کی طبیعت میں اتنا بھروسہ اور اس قدر نزاکت تھی کہ رشک و حسد سے اسے دور دور کوئی واسطہ نہ تھا۔ رشک و حسد کا تخلیق کیا ہوا اندھا شک، بگڑی بگڑی سی خودی، غرور، کمینگی اور بدتہذیبی اس میں نام کو نہ تھی۔

بوبروف ابھی تک عورت کی سچی اور گہری محبت کی گرمی سے ناآشنا تھا۔ وہ اتنا شرمیلا اور کم‌ہمت تھا کہ زندگی سے وہ سب حاصل نہ کر سکا جو اس کا حق تھا۔ ظاہر ہے آج اس کا دل ان نئے اور والہانہ جذبات سے سرشار ہونے کو بے تاب تھا۔

پچھلے چند دن سے اس کے دل و دماغ پر اسٹیشن والی بات چیت چھائی ہوئی تھی۔ وہ بار

بار اس کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل یاد کرتا اور ہر دفعہ اسے نینا کے الفاظ میں اور بھی زیادہ گہرے معنی پنہاں نظر آتے۔ روز صبح کو آنکھ کھلتی تو اسے احساس ہوتا کہ اس کی روح میں کوئی بہت وسیع، بہت شگفتہ چیز جنم لے رہی ہے اور اس چیز نے اس کے دل میں امیدوں اور آشاؤں کے دیپ جلا دئے تھے۔

اس کا دل اس خاندان کی طرف کھنچا چلا جا رہا تھا۔ وہ ایک دفعہ پھر خوشی و مسرت کا یقین کرنا چاہتا تھا، ایک دفعہ پھر نینا کے منہ سے وہ لجایا لجایا سا اقرار محبت سننا چاہتا تھا۔ اس اقرار محبت میں کبھی بلا کی شرم پیدا ہو جاتی تھی تو کبھی انتہائی سادگی اور جوش۔ لیکن کواشنین کی موجودگی کی وجہ سے اس نے اپنی خواہش کو کچل رکھا تھا اور یہ کہہ کر دل کو اطمینان دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایوان کووہ میں کواشنین کا قیام حد سے حد پندرہ دن رہے گا۔

لیکن کواشنین ابھی گیا بھی نہ تھا کہ خوش قسمتی سے اس کی نینا سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ یہ حادثہ بھٹی چالو کرنے کے جشن سے تین دن بعد اتوار کو ہوا۔ بوبروف کا فیروے گھوڑا مل سے اسٹیشن کو جانے والی سڑک کے کشادہ سینے پر دوڑ رہا تھا۔ تقریباً دو کا وقت تھا، دن بہت نکھرا ہوا اور سرد تھا۔ فیروے کان کھڑے کئے

جھبرا سر جھلاتا ہوا سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ گودام کے قریب والے موڑ کے پاس بوبروف کو ایک خاتون نظر پڑی جو گھوڑ سواری کے لباس میں ملبوس تھی۔ وہ ایک بڑی سی گھوڑی پر پہاڑی سے اتر رہی تھی، اس کے پیچھے سفید کرغیز گھوڑے پر کوئی صاحب تھے۔ بوبروف نے پل بھر میں نینا کو پہچان لیا۔ اس کا لمبا سا گہرا سبز اسکرٹ ہوا میں اڑ رہا تھا، ہاتھوں میں زرد دستانے تھے اور سر پر نیچا سا بھڑکیلا ہیٹ۔ نینا بڑے اعتماد اور شان کے ساتھ زین پر بیٹھی تھی۔ انگریزی نسل کی نازک اندام گھوڑی بڑی دبلی پتلی ٹانگیں اٹھا اٹھا کر بڑی لچک کے ساتھ دلکی چل رہی تھی۔ اس کی گردن مڑ کر ہلال‌نما ہو گئی تھی۔ نینا کا ساتھی، سویژیفسکی دیکھتے دیکھتے بہت پیچھے رہ گیا۔ وہ ڈگمگا کر زور زور سے لگام کھینچ رہا تھا، اچھل رہا تھا اور جھولتی ہوئی رکاب میں جوتے کی نوک پھنسانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

بوبروف کو دیکھتے ہی نینا نے گھوڑی کو سرپٹ دوڑا دیا۔ بوبروف کے پاس پہنچ کر اس نے اچانک اس کی لگام کھینچ لی جس سے گھوڑی بےچین ہو گئی اور اس کے بڑے بڑے نفیس نتھنے پھڑکنے لگے۔ وہ گھوڑی جنون کے عالم میں لگام کو کاٹ رہی تھی اور لگام سے جھاگ ٹپک رہا

تھا۔ گھوڑ سواری کی وجہ سے نینا کا چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔ کنپٹیوں کے قریب کے بال ھیٹ کی قید سے آزاد ہو گئے تھے اور لمبی پتلی گھونگھریالی زلفیں پریشان تھیں۔

"یہ حسینہ کہاں سے ماری؟" بوبروف نے ہانپتے ہوئے فیروے کو قابو میں کیا اور آگے جھک کر نینا کی انگلیوں کے پورے دبائے۔

"اچھی ھے، نا؟ کواشنین کا تحفہ ھے۔"

"تمھاری جگہ میں ہوتا تو ایسا تحفہ قبول کرنے سے صاف انکار کر دیتا" بوبروف نے سختی سے کہا۔ نینا کی یہ شان بےنیازی دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا۔

نینا سرخ ہوگئی۔

"کیوں؟"

"کیونکہ — میں پوچھتا ہوں کواشنین تمھارا کون ھے؟ عزیز رشتےدار ھے یا منگیتر؟"

"اف خدا، دوسروں کے لئے تو تم بڑے نازک دماغ ہو!" نینا نے طنزیہ کہا۔

لیکن بوبروف کے چہرے پر دکھ کے آثار دیکھ کر وہ نرم پڑگئی۔

"بھئی، اسے خریدنے میں مشکل ھی کیا ھے۔ جانتے تو ہو کتنا امیر ھے وہ!"

سویڑیفسکی ان سے دس بارہ قدم کے فاصلے پر پہنچ چکا تھا۔ اچانک نینا بوبروف کی طرف جھکی،

اس نے بڑی محبت سے اس کے ھاتھ کو ہنٹر چھوایا اور چھوٹی سی لڑکی کی طرح اعتراف گناہ کرتے ہوئے زیرلب بولی: ''اچھا، چلو خفا نہ ہو۔ میں گھوڑی واپس کردوں گی۔ اف کتنے چڑچڑے ہو تم! دیکھا میری نظر میں تمھاری رائے کی کتنی قدر ھے!''

بوبروف کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں، اس نے بے اختیار نینا کی طرف ھاتھ بڑھایا لیکن گہرا سانس لیکر چپ ہو گیا۔ سویڑیفسکی نے اس کے پاس آکر سر جھکاتے ہوئے سلام کیا۔ وہ بظاھر بڑی بےپروائی اور شان سے بیٹھنے کی کوشش کرتا ہوا گھوڑا بڑھائے چلا آ رہا تھا۔

''ارے بھئی، ھماری پک نک کی اطلاع ملی آپ کو؟'' وہ دور ھی سے چلایا۔

''نہیں، میں نے تو کچھ سنا نہیں'' بوبروف نے جواب دیا۔

''میرا اشارہ اس پک‌نک کی طرف ھے جس کا منصوبہ واسیلی تیرینتیوچ نے بنایا ھے۔ بھئی، ھم لوگ بیشیناپا بالکا جا رھے ھیں نا۔''

''نہیں، میں نے کچھ نہیں سنا۔''

''سچ، اندرئی ایلیچ دیکھو ضرور آنا'' نینا نے لقمہ دیا۔ ''اگلے بدھ کو پانچ بجے اسٹیشن سے روانگی ہوگی۔''

''چندے سے ہوگی؟''

"ھاں شاید چندے سے ھی ھوگی۔ بھئی، مجھے ٹھیک نہیں معلوم۔"

نینا نے سوالیہ نظروں سے سویژیفسکی کی طرف دیکھا۔

"ھاں، ھاں۔ چندے سے ھوگی"، اس نے بھی صادر کیا۔ "واسیلی تیرینتیوچ نے ضروری انتظامات میرے سپرد کئے ھیں۔ یار، بڑا ھنگامہ رھے گا۔ بہت شاندار پلان ھے۔ لیکن بھئی، ابھی تک یہ سب باتیں راز ھیں۔ یار، دیکھ کر حیران رہ جاؤگے۔"

نینا بھی مست ھوکر بےاختیار کہہ اٹھی: "ارے یہ چکر میں نے ھی تو شروع کیا تھا۔ ابھی کل ھی کی تو بات ھے۔ میں نے کہا اگر سب مل کر جنگل کی طرف چلیں تو کتنا لطف آئے۔ یہ سنتے ھی واسیلی تیرینتیوچ نے..."

"نہیں، میں نہیں جاؤں گا"، بوبروف نے سختی سے کہا۔

"اوہ نہیں، چلوگے"، نینا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "اچھا بھئی، اب آگے بڑھیں!" وہ چلائی اور گھوڑا دوڑاکر ھوا ھو گئی۔ "اندرئی ایلیچ، سنو تو، تمھیں ایک بات بتانی ھے!"

سویژیفسکی پیچھے رہ گیا۔ نینا اور بوبروف برابر برابر چل رھے تھے۔ نینا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکرا رھی تھی۔ اور بوبروف کی تیوری پر بل پڑے ھوئے تھے۔

''اف میرے نامہربان اور بدگمان دوست۔ میں نے تو خاص طور پر تمھاری وجہ سے اس پک نک کا منصوبہ بنایا ھے،، اس نے دلی محبت سے کہا۔ ''جانتے ھو میں وہ بات معلوم کرنے کو بےتاب ھوں جو تم نے اسٹیشن پر بتانی شروع کی تھی۔ پک‌نک کے وقت ھماری راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ھوگی۔ ،،

اور بوبروف کا دل اچانک پھر بدل گیا۔ اس کی آنکھوں میں محبت کے آنسو چھلکنے لگے اور اس نے انتہائی جذباتی ھوکر کہا: ''اوہ نینا، مجھے کتنی محبت تم سے!،،

لیکن شاید نینا نے اس کا اقرار محبت سنا ھی نہیں۔ اس نے لگام کھینچی اور گھوڑی کی رفتار پر قابو پاکر اسے آھستہ آھستہ چلانے لگی۔

''تو آؤگے نا تم؟،، اس نے پوچھا۔

''ھاں، ھاں، ضرور!،،

''دیکھو ضرور آنا۔ بھئی، اب مجھے اپنے ساتھی کا انتظار کرنا چاھئے۔ اچھا، خدا حافظ، اب گھر جانا چاھئے۔ ،،

بوبروف نے رخصت ھوتے ھوئے نینا سے ھاتھ ملایا اور اسے بڑی دیرتک دستانے میں چھپے ھوئے ھاتھ کی گرمی محسوس ھوتی رھی۔ نینا کے ھاتھ نے کتنے جوش سے اس کا ھاتھ دبایا تھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں سے محبت چھلکی پڑ رھی تھی۔

اگلے دن چار بجے اسٹیشن پر پک نک والوں کا هجوم تھا۔ ہر شخص خوش اور مطمئن تھا۔ کم سے کم اس دفعہ تو کواشنین کے دورے کا انجام لوگوں کی امید سے کہیں زیادہ خوشگوار تھا۔ نہ اس نے طوفان اٹھائے نہ کسی پر برسا نہ گرجا۔ کسی کو بھی تو نوکری سے ھاتھ نہیں دھونے پڑے بلکہ، سنتے ھیں، بہت جلد کلرکوں کے پورے عملے کی تنخواہ میں اضافہ ھونےوالا تھا۔ اور اس پک‌نک نے تو اس ھنگامے کو اور بھی خوشگوار بنا دیا۔ بیشینایا بالکا یہاں سے حد سے حد دس میل پر تھا۔ یوں بھی سڑک کا نظارہ بڑا رنگین اور خوبصورت تھا۔ ھفتے بھر سے پک‌نک کے اعزاز میں موسم نکھرا ھوا تھا۔

کل ملاکر تقریباً نوے آدمی مدعو تھے۔ ان کے مست گروہ پلیٹ‌فارم پر جمع تھے۔ زور زور سے ھنسی مذاق ھو رھا تھا اور لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ روسی زبان کے ساتھ ساتھ فرانسیسی، جرمن اور پولش زبان بھی سننے میں آرھی تھی۔ تین بلجیائی کیمرے ساتھ لائے تھے، انھیں امید تھی کہ فلیش سے تصویریں لے سکیں‌گے۔ پک‌نک کی تفصیلات کو بالکل راز رکھا گیا تھا اس لئے ہر شخص کے دل میں ھل چل سی مچی

ہوئی تھی۔ سویژیفسکی نہایت اہمیت کے ساتھ پراسرار انداز میں بعض ''اچنبھوں،، کی طرف اشارہ کرتا رہا لیکن کوئی ٹھوس بات نہ بتائی۔

پہلا اچنبھا تو اسپیشل ٹرین تھی۔ ٹھیک پانچ بجے دس پہیوں‌والا امریکی انجن شیڈ سے نکل کر آگے بڑھا۔ خوشی اور حیرت کے مارے خواتین بےاختیار چیخ اٹھیں۔ یہ دیوھیکل انجن رنگ‌برنگی جھنڈیوں اور تازے تازے پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ اس کے گرد تارا پھول، ڈالیا، کارنیشن اور اسٹاک کی شاخوں اور شاہ بلوط کی پتیوں کے سرسبز ہار لپٹے ہوئے تھے۔ چمنیوں اور بھونپو پر بھی ہار ہی ہار تھے۔ مختصر یہ کہ شیڈ کے گرد ایک سرسبزوشاداب دیوار سی بن گئی تھی۔ خزاں کے ڈوبتے سورج کی سنہری کرنوں میں پھولوں کے سبز گھونگھٹ کی اوٹ سے انجن کا فولاد اور پیتل اترا اترا کر چمک رہا تھا۔ پلیٹ‌فارم کے قریب کھڑے ہوئے چھ بہترین کمپارٹمنٹ پک‌نک والوں کو ''دو سو میل،، نامی اسٹیشن تک لیجانے کو تیار تھے جہاں سے ییشینایا بالکا صرف دو سو گز رہ جاتا ہے۔

''حضرات و خواتین، واسیلی تیرینتیوچ کے حکم کے مطابق میں آپ سب کو بتانا چاہتا ہوں کہ پک‌نک کے تمام اخراجات وہ اٹھائیں‌گے،، سویژیفسکی

ایک گروہ سے دوسرے کی طرف بھاگ بھاگ کر بار بار اعلان کر رہا تھا۔

بہت سے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے اور وہ انھیں طرح طرح کی تفصیلات بتانے لگا۔

''آپ لوگوں نے واسیلی تیرینتیوچ کا ایسا پرجوش سواگت کیا ہے کہ ان کا دل خوش ہو گیا۔ انھیں بہت خوشی ہے کہ انھیں اس مہمان‌نوازی کا شکریہ ادا کرنے کا موقع مل سکا۔ پک‌نک کے تمام اخراجات وہ خود برداشت کر رہے ہیں۔''

امرا کے خاص خدمت‌گار ہمیشہ اپنے مالک کی فیاضیوں کی شیخی بگھارا کرتے ہیں، سویژیفسکی سے بھی نہ رہا گیا۔ اس نے نہایت غلامانہ ذہنیت کے ساتھ زور شور سے اعلان کیا: ''ہم نے پک‌نک پر تین ہزار پانچ سو نوے روبل خرچ کئے ہیں!''

''تمھارا مطلب ہے اس میں تم اور کواشنین نصف نصف کے حصےدار ہو؟'' پیچھے سے کسی نے طنز کیا۔ سویژیفسکی نے پلٹ کر دیکھا کہ یہ زہریلا سوال اندرئی‌آس نے کیا تھا۔ وہ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈھونسے ہوئے حسب معمول نہایت بےحسی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''معاف کیجئےگا میں نے سنا نہیں، آپ نے کیا فرمایا؟'' سویژیفسکی نے پوچھا، اس کا چہرہ کوفت اور تکلیف کی وجہ سے سرخ ہو گیا تھا۔

''جی، فرمایا تو آپ نے تھا۔ آپ نے کہا

کہ ’ہم نے تین ہزار خرچ کئے ہیں، اور میں سمجھا کہ اس کا مطلب ہے آپ نے اور مسٹر کواشنین نے۔ اگر یہ واقعہ ہے تو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ اگر میں مسٹر کواشنین کی دعوت قبول کر سکتا ہوں تو مسٹر سویژیفسکی کی دعوت رد بھی کر سکتا ہوں۔“

”اوہ، نہیں، آپ میرا مطلب نہیں سمجھے“ سویژیفسکی ھکلایا۔ ”یہ سب واسیلی تیرینتیوچ کی دین ہے۔ میں تو بس، میرا مطلب ہے، ان کا مشیر ہوں۔ ھرکارہ سمجھ لیجئے“ اس نے کہا اور اس کے چہرے پر تھکی تھکی سی مسکراھٹ پھیل گئی۔

ٹھیک اسی وقت زینینکو خاندان کے سب اراکین کواشنین اور شیلکوونیکوف کے ساتھ گاڑی سے وھاں پہنچے۔ لیکن کواشنین نے گاڑی سے قدم نکالا ھی تھا کہ ایک ایسا عجیب مضحکہ خیز اور المیہ سا حادثہ رونما ھوا جس کا کسی کو دور دور شبہ نہ تھا۔ ھوا یہ کہ پک‌نک کی خبر سن کر صبح سے مزدوروں کی بیویاں، بہنیں اور مائیں اسٹیشن پر جمع ھو رھی تھیں۔ ان میں سے بعض کے ننھے ننھے بچے ان کے ساتھ تھے۔ دھوپ میں جھلسے ھوئے تھکے ماندے چہروں سے بےحسی اور صبر کی کیفیت جھلک رھی تھی۔ وہ گھنٹوں سے دیوار کے سائے میں سیڑھیوں یا زمین پر بیٹھی

تھیں - سب ملاکر کم سے کم دو سو کا مجمع تھا - جب اسٹیشن کے عملے نے ان سے پوچھا کہ کیا چاھتی ھو تو انھوں نے کہا کہ ھم تو ''سرخ سروالے مالک کو دیکھنے آئے ھیں'' - چوکیدار نے انھیں وھاں سے چلتا کرنے کی کوشش کی، تو انھوں نے اتنا شور مچایا کہ چوکیدار نے ھار مان لی اور انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا -

جیسے ھی کوئی گاڑی پلیٹ‌فارم پر پہنچتی ویسے ھی پل بھر کو عورتوں میں ھل چل سی مچ جاتی، لیکن جب وہ دیکھتیں کہ ان کا ''موٹا اور سرخ سروالا مالک'' اس گاڑی میں نہیں ھے تو پھر بیٹھ جاتیں -

ھاں تو کواشنین نے کوچ بکس پکڑ کر پائیدان پر پاؤں رکھا، اور گاڑی اس کے بوجھ تلے جھک گئی، اس کا سانس پھولا ھوا تھا - اچانک مزدور عورتیں چاروں طرف سے جھپٹیں اور اس کے گرد دوزانو بیٹھ گئیں - گاڑی کے تنومند گھوڑے مجمع کے شور پر چونکے اور گھبرا گھبرا کر ھنہنانے لگے - کوچوان لگامیں کھینچے بمشکل انھیں قابو میں کئے کھڑا تھا - شروع میں تو کواشنین اس واقعے کا سرپیر ھی نہ سمجھ سکا - ساری عورتیں ایک آواز ھوکر چیخ رھی تھیں، ان کے ھاتھوں میں بچے تھے اور سنولائے ھوئے رخساروں پر آنسوؤں کی دھاریں بہہ رھی تھیں -

اچانک کواشنین کو اندازہ ہوا کہ اس جیتے جاگتے حلقے سے نکلنے کا کوئی امکان نہیں ہے جس میں اس وقت وہ مقید تھا۔

''خاموش، عورتو، خاموش! یہ آہ و زاری بند کرو!،، وہ گرجا اور عورتوں کی آوازیں اس کی گرج کے نیچے دب کر رہ گئیں۔ ''مچھلی بازار سمجھ رکھا ہے کیا؟ میرے پلے ایک لفظ نہیں پڑ رہا کہ تم کہہ کیا رہی ہو۔ تم میں سے ایک عورت بتاؤ کہ چاہتی کیا ہو۔،،

ہر عورت نے سوچا کہ میں ہی کیوں نہ بولوں۔ چنانچہ ہنگامہ اور زیادہ بڑھ گیا، اور آنسوؤں کا طوفان زیادہ تیز ہو گیا۔

''ہماری مدد کرو، مالک! اب ہم سے نہیں سہا جاتا، مالک! اس نے ہمارا خون چوس لیا! ہم مر رہے ہیں۔ یہ ٹھنڈ بچوں، بڑوں سبکو ختم کر دے گی!،،

''ہوں تو چاہتی کیا ہو تم؟ مارنے کی کیا مصیبت ہے آخر؟،، کواشنین پھر پھنکارا۔ ''مگر سب ایک ساتھ مل کر تو نہ چیخو! اے تم بولو،، اس نے انگلی سے ایک لمبی سی عورت کی طرف اشارہ کیا، جو نڈھال چہرے کی زردی کے باوجود خوبصورت تھی۔ ''باقی سب خاموش!،،

زیادہ تر عورتوں نے چیخنا بند کر دیا لیکن سسکیاں لیتی رہیں اور آہستہ آہستہ بین کر کرکے

اسکرٹ کے گندے دامنوں سے ناک اور آنکھیں پونچھتی رہیں۔

پھر بھی بیک وقت کم سے کم پچیس تو چیخ ہی رہی تھیں۔

"ہم سردی سے مر رہی ہیں، مالک! خدا کے لئے کچھ کرو۔ اب ہم سے یہ نہیں سہا جاتا۔ جاڑے کے لئے کمبختوں نے ہمیں چالوں میں ڈال دیا ہے لیکن تمھیں بتاؤ بھلا وہاں ہم کیسے رہیں۔ ان کے راج کی چالیں ہیں یہ کنکری اور کوڑے کرکٹ کا ڈھیر! ابھی سے رات کو سردی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے، دانت بجنے لگتے ہیں، ارے ابھی سے یہ رنگ ہے تو بتاؤ مالک، جاڑے میں کیا حال ہوگا ہمارا؟ ارے ہمارے معصوموں ہی کی حالت پہ رحم کھاؤ۔ مالک، اچھے مالک، ہماری مدد کرو! کچھ نہیں تو چولہے تو بنوا دو، کھانا پکانے تک کی جگہ نہیں ہے۔ باھر گلی میں هانڈی چولہا کرتے ہیں۔ ہمارے مرد سارا سارا دن کام کرتے ہیں، نامراد سر سے پاؤں تک بھیگے ہوئے کانپتے رہتے ہیں، اور گھر آنے پہ اتنا بھی نہیں ہوتا کہ کپڑے ہی سکھا لیں۔"

کواشنین جال میں پھنس گیا تھا، جدھر مڑتا ادھر سجدہ‌ریز اور دوزانو عورتیں اس کی راہ میں حائل نظر آتیں۔ اس نے زبردستی نکلنے کی کوشش کی تو

وہ سب اس کے قدموں اور اس کے لمبے سے خاکستری کوٹ کے دامن سے لپٹ گئیں۔ کواشنین کو اپنی بےبسی کا اندازہ ہوا تو اس نے شیلکوونیکوف کو اشارہ کیا، شیلکوونیکوف مجمع کو چیرتا ہوا اس تک پہنچا تو اس نے بگڑ کر فرانسیسی زبان میں پوچھا: "تم سن رہے؟ کیا مطلب ہے اس کا؟"

شیلکوونیکوف دم بخود رہ گیا۔

"میں نے کئی دفعہ بورڈ کو لکھا"، وہ ہکلایا۔ "لیکن مزدوروں کی کمی تھی۔ گرمی کا زمانہ تھا اور فصل کی کٹائی شروع ہو چکی تھی... اور پھر قیمتیں انتہائی چڑھی ہوئی تھیں، اس لئے بورڈ نے کسی طرح اس کی اجازت نہیں دی۔ میں کیا کر سکتا تھا، جناب؟"

"پھر لو، مزدوروں کی چالوں کو دوبارہ تعمیر کرنے کا کام کب سے شروع کر رہے ہو؟" کواشنین نے سختی سے پوچھا۔

"یقین سے کچھ کہنا تو مشکل ہی ہے۔ اب تو کسی نہ کسی طرح انہیں چالوں میں گزارا کرنا ہوگا۔ فی‌الحال تو کلرکوں کے مکانوں کی تعمیر ضروری ہے۔"

"ہوں، تو تمہارے راج میں یہ اندھیر نگری ہو رہی ہے!" کواشنین بڑبڑایا۔ اس نے عورتوں کی طرف مڑ کر زور سے کہا: "سنو، عورتو! کل سے تمہارے لئے چولہے بنانے کا کام شروع ہو

8*

جائے گا۔ اور چالوں پر کھپریل کی چھت ڈال دی جائے گی۔ سمجھ گئیں؟''

''ہاں، مالک! خدا تمھارا بھلا کرے، مالک! ہاں ہاں، ہم تمھاری بات سن رہے ہیں، سرکار!'' خوشی میں ڈوبی ہوئی آوازیں ابھریں۔ ''بس اب ٹھیک ہے — مالک نے خود حکم دیا ہے تو کام بن جائے گا۔ شکریہ، مالک! اور مالک، اگر ہم تعمیر کی جگہ سے کچھ کنکر پتھر چن لیا کریں تو تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟''

''اچھا اچھا، چن لینا۔''

''کیا کریں سرکار، جدھر دیکھو ادھر چرکیشیائی کھڑے رہتے ہیں، ہم پہنچے نہیں کہ انھوں نے ہنٹر برسانے شروع کر دیئے۔''

''کوئی بات نہیں، تم کنکر جمع کر لینا، کوئی کچھ نہیں کہے گا تمھیں،'' کواشنین نے ان کی تسلی کی۔ ''اچھا عورتو، اب تم جاؤ، جا کر اپنے برتن بھانڈے کرو! جاؤ، جلدی کرو!''، اس نے ان کی ہمت بندھائی۔ ''کل دو ٹھیلہ اینٹیں ان کی چالوں کے پاس ڈھیر کرا دو''، اس نے شیلکوونیکوف سے زیرلب کہا۔ ''بس بہت دن کے لئے ان کے منہ بند ہو جائیں۔ چلو اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہو لیا کریں گی۔''

عورتیں خوش خوش تتربتر ہو گئیں۔

”یاد رکھنا چولہے نہ بنائے گئے تو ہم ان انجنیروں سے کہیں گے آکے ہمیں گرم کریں،، کواشنین کی منتخب کی ہوئی عورت چلائی۔

”ہاں ہاں، دیکھ لینا!،، ایک اور عورت شوخی سے بولی۔ ”نہیں تو مالک خود آکے گرم کریں۔ دیکھو تو سہی کیسا موٹا اور مست ہے، یہ تو ہمارے لئے دس چولہوں سے بڑھ کر ہے!،،

اس واقعے کا انجام اس قدر خوشگوار ہوا کہ سب لوگوں کی طبیعت زوروں پر آ گئی۔ عورتوں کا یہ مطالبہ سن کر کواشنین کا غصہ بھی ہوا ہو گیا۔ وہ ہنسا اور شیلکوونیکوف کا دل بڑھانے کے لئے اس کا بازو تھام لیا۔

”دیکھا تم نے،، اس نے بھاری بھرکم انداز سے اسٹیشن کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے شیلکوونیکوف سے کہا۔ ”آدمی کو چاہئے کہ ان لوگوں سے نبٹنے کا گر سیکھے۔ اجی اس میں مشکل کیا ہے، جس چیز کا چاہو وعدہ کر لو۔ الومونیم کے مکان چاہئے؟ حاضر ہے۔ آٹھ گھنٹے کے دن کا مطالبہ ہے؟ ضرور پورا ہوگا۔ روز صبح کو گوشت کی پلیٹ چاہئے، ضرور ملے گی۔ شرط یہ ہے کہ وعدہ بڑے یقین سے کرو۔ اجی میں دعوی کرتا ہوں کہ بڑے سے بڑے ہنگامے اور ہنگامہ پرور مظاہرے کو صرف جھوٹے وعدوں کے ذریعے چٹکی بجاتے ٹھنڈا کر سکتا ہوں۔،،

کواشنین عورتوں کی بغاوت کی تفصیل یاد کرکے خوب خوب ہنسا اور ریل میں سوار ہو گیا۔ تین منٹ بعد ریل روانہ ہو گئی۔ کوچوانوں سے کہا گیا کہ وہ سیدھے بیشینایا بالکا پہنچ جائیں کیونکہ ان لوگوں نے طے کیا تھا کہ واپسی پر مشعلیں لے لےکر گاڑیوں سے آئیں گے۔

بوبروف کو نینا کے رویے سے سخت الجھن ہو رہی تھی۔ وہ نہایت بےتابی سے نینا کے اسٹیشن پہنچنے کا منتظر تھا۔ کل رات سے اس کی یہی کیفیت تھی۔ تمام برے اندیشے اور شبہے ہوا میں تحلیل ہو گئے تھے اور اسے یقین تھا کہ سکھ کے دن قریب ہیں، اس کی نظروں میں پہلے کبھی دنیا اتنی حسین، لوگ اتنے مہربان اور زندگی اس قدر خوش مطمئن اور رنگین نہیں تھی جتنی آج ہو گئی تھی۔ وہ نینا سے ملاقات کے بارے میں سوچ رہا تھا اور یہ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کس دھج میں آئے گی۔ بوبروف دل ہی دل میں محبت بھرے دلکش اور جذباتی جملے سوچتا اور خود ہی اپنے اوپر ہنس پڑتا۔ بھلا اظہار محبت کے لئے پہلے سے الفاظ ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے؟ ضرورت کے وقت حسین اور والہانہ الفاظ کا چشمہ ابل پڑے گا۔

اسے ایک نظم یاد آئی جو اس نے کسی رسالے میں پڑھی تھی۔ شاعر اپنی محبوبہ سے کہتا

ہے کہ ہم قسمیں نہیں کھائیں گے، یہ ہمارے والہانہ عشق کی بے عزتی ہے۔

بوبروف کو کواشنین کی گاڑی کے پیچھے پیچھے زینینکو کے خاندان کی دو گاڑیاں بھی نظر آئیں۔ نینا ہلکے زرد فراک میں ملبوس تھی، فراک پر اسی رنگ کی چوڑی سی لیس ٹنکی ہوئی تھی اور ہلال نما گریبان بہت گہرا تھا۔ سفید اطالوی ہیٹ کے کنارے چوڑے تھے، اور اس میں گلاب کے پھولوں کا گچھا بہار دے رہا تھا۔ اس لباس میں وہ بوبروف کو ہمیشہ سے زیادہ زرد، زیادہ سنجیدہ نظر آئی۔ اس نے دور ہی سے بوبروف کو دیکھا لیکن اس کی نظروں میں وہ اس خاص جذبے کی جھلک نہیں تھی جس کا بوبروف کو اتنی دیر سے انتظار تھا۔ یہی نہیں بلکہ اسے تو ایسا محسوس ہوا کہ نینا نے جان بوجھ کر نظر بچا لی۔ اور بوبروف گاڑی کی طرف لپکا تاکہ اسے سہارا دے کر اتار لے، لیکن نینا پھرتی سے دوسری طرف کود گئی، شاید محض اسے ناامید کرنے کے لئے! اس کے ذہن میں برے برے خیالات پیدا ہوئے اور دل میں ٹیس سی اٹھی لیکن وہ یہ سوچ کر دل کو تسلی دینے لگا کہ ”نینا بچاری، اپنے فیصلے اور اپنی محبت پر لجاتی ہے، وہ سمجھتی ہے کہ ہر شخص اس کی آنکھوں میں اس کا راز پڑھ سکتا ہے، اس کی محبت کی دلکش سادگی دیکھ سکتا ہے!“

اسے یقین تھا کہ پچھلی دفعہ کی طرح آج بھی نینا رازونیاز کی چند باتیں کرنے کے لئے خود ھی موقع ڈھونڈ نکالے گی۔ لیکن وہ تو مزدور عورتوں اور کواشنین کی بات چیت میں ایسی کھوئی ہوئی تھی کہ اس نے بوبروف پر اچٹتی سی نظر تک نہ ڈالی، اس کا دکھی اور پریشان دل خوف سے دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ میں ابھی زینینکو کے خاندان کے پاس جاؤں گا، وہ سب ساتھ ھی کھڑے تھے۔ باقی خواتین ان سب سے کٹی کٹی سی کھڑی تھیں۔ اس نے سوچا کہ اس وقت موقع اچھا ھے، سب لوگ اس ھنگامے کی طرف متوجہ ھیں۔ میں ابھی جاکر نینا سے پوچھوں گا، کم سے کم نظروں ھی نظروں میں پوچھوں گا کہ یہ بےتعلقی کیوں؟

بوبروف نے آننا افاناسئیونا کو سلام کیا اور ان کے ھاتھ کو بوسہ دینے کے بعد ان کی آنکھوں میں یہ پڑھنے کی کوشش کی کہ آیا انھیں کچھ معلوم ھے یا نہیں۔ ھاں انھیں یقیناً کچھ نہ کچھ معلوم ھے۔ ان کی کھنچی ہوئی باریک بھویں غصے میں تنی ہوئی تھیں، اور ھونٹوں سے غرور و تکبر ٹپک رھا تھا۔ بوبروف کا کہنا تھا کہ بڑی بی کی بھویں ان کے گھٹیا کردار کی آئینہ دار ھیں۔ بوبروف نے سوچا کہ نینا نے اپنی ماں کو سب کچھ بتایا ہوگا اور ماں نے بیٹی کو خوب ڈانٹا ہوگا۔

وہ قدم بڑھا کر نینا کے پاس پہنچا۔ لیکن نینا نے ایک نگاہ غلط انداز سے بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ بوبروف نے بڑھ کر، کانپتے ھاتھوں سے اس کا ھاتھ تھام لیا۔ لیکن اس کا ھاتھ بالکل سرد اور بےجان تھا۔ نینا نے اس کے سلام کا جواب دینے کی زحمت بھی گوارا نہ کی، بیتا کی طرف منہ کرکے اس سے یونہی ادھر ادھر کی بات کرنے لگی۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کے پیچھے ضرور کوئی خاص بات ھے۔ اس نے سوچا کہ نینا اپنی فطری بزدلی کی وجہ سے صاف جواب کے خیال ھی سے کانپ اٹھتی ھے۔ بوبروف کی ٹانگیں جواب دینے لگیں اور جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ وہ حیران تھا کہ کیا سمجھے، کیا سوچے۔ اگر نینا نے ماں سے دل کی بات کہہ بھی دی تھی تو اس کی تیز اور معنیٰ‌خیز نگاھیں تو بوبروف سے کہہ سکتی تھیں کہ ”ھاں تمھارا خیال ٹھیک ھے، وہ ھماری بات چیت کے بارے میں جانتی ھیں، لیکن گھبراؤ نہیں، پیارے، میں بالکل نہیں بدلی، گھبراؤ نہیں، میں آج بھی وھی ھوں!،، لیکن وہ تو اس کے بجائے دوسری طرف مڑ گئی۔ ”خیر کوئی بات نہیں، پک‌نک کے ھنگامے میں ضرور اس سے پوچھوں گا۔،، اس نے سوچا۔ نجانے کیوں اس کے ذھن کے کسی گوشے میں ایک خوفناک اور اداس بات کا مبہم سا اندیشہ سر اٹھا رھا تھا۔ ”بہرحال اسے بتانا پڑے گا۔،،

۱۰

''دو سو میل'' نامی اسٹیشن پر پک‌نک پارٹی گاڑی سے اتر کر بیشینایا بالکا کی طرف روانہ ہو گئی۔ ان کی لمبی چوڑی رنگارنگ قطار اس سڑک پر پھیلی ہوئی تھی جو چوکی‌دار کی کوٹھڑی کے قریب سے گزرتی ہے۔ خزاں دیدہ جنگلوں کی بھینی بھینی خوشبو دور سے آتی اور ان کے تمتمائے ہوئے چہروں سے اٹھکھیلیاں کرنے لگتی۔ سڑک زیادہ سے زیادہ ڈھلوان ہوتے ہوتے آخر پھولوں پھلوں کے بوجھ تلے جھکی ہوئی جھاڑیوں اور بیلوں کی چھتری کے نیچے غائب ہو گئی۔ مرجھائی ہوئی زرد اور مڑی تڑی پتیاں پاؤں کے نیچے آ آ کر چرمرا رہی تھیں۔ آگے بہت آگے جنگلوں کے پیچھے ڈوبتے سورج نے شفق کے پھول کھلا رکھے تھے۔

اور پھر جھاڑیاں ختم ہو گئیں اور نظر کے سامنے ایک وسیع و عریض صاف ستھرا اور ہموار میدان پھیل گیا جس پر باریک باریک ریت بچھا ہوا تھا۔ اس کے ایک کونے پر ایک ہشت پہلو شامیانہ ہریالی اور جھنڈیوں کے زیور پہنے کھڑا تھا۔ دوسرے سرے پر بینڈ کے لئے چھت‌دار چبوترہ تھا۔ پک‌نک پارٹی کے جنگل سے نمودار ہوتے ہی بینڈ نے کوچ کی ایک تڑپتی ہوئی دھن بجانی

شروع کر دی۔ پیتل کی شوخ جھنکار ہنستی کھیلتی پورے جنگل میں پھیل گئی۔ اس کی گونج ایک درخت سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے میں ہوتی ہوئی دور ایک اور بینڈ میں مدغم ہو گئی جو کبھی تو اس بینڈ پر حاوی ہو جاتا اور کبھی بہت پیچھے رہ جاتا تھا۔ شامیانے میں میزوں کے قریب ویٹر مصروف پیکار تھے۔ سفید کپڑوں سے ڈھکی ہوئی یہ میزیں نیم‌دائیرے کی شکل میں سجائی گئی تھیں۔

بینڈ خاموش ہوتے ہی مگن اور مسرور پک‌نک پارٹی کی تالیاں گونج اٹھیں۔ واقعی خوش ہونے کی بات ہی تھی۔ ہفتہ عشرہ پہلے تک یہ میدان جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا ایک سنسان ٹیلہ‌سا تھا۔

بینڈ نے والز کی دھن بجانی شروع کر دی۔

سویڑیفسکی اس وقت نینا کے پہلو میں کھڑا تھا۔ بوبروف کے دیکھتے دیکھتے اس نے نینا سے اجازت لئے بغیر اس کی کمر میں ھاتھ ڈالا اور اس کے ساتھ محو رقص ہو گیا۔

جیسے ہی اس نے نینا کا پیچھا چھوڑا شعبہ کان کنی کا ایک طالبعلم اس کی طرف لپکا اور پھر کسی اور کی باری آ گئی۔ بوبروف ناچنے میں کورا تھا۔ اسے ناچ کا کوئی خاص شوق بھی نہیں تھا۔ بھرحال اس نے سوچا کہ نینا کو کواڈریلے ناچنے کی دعوت دے۔ ”اس طرح اس سے بات کرنے کا

موقع بھی مل جائیگا۔،، اس نے سوچا۔ نینا دو ناچ ختم کرنے کے بعد بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی کہ بوبروف اس کے پاس آیا۔

''نینا گریگورئیونا، مجھے یقین ہے ایک کواڈریلے تو تم نے میرے لئے بچا ہی لیا ہوگا؟،،

''اوہ، میرے خدا! کتنی بری بات ہے، میں تو سب ناچوں کے لئے وعدے کر چکی ہوں،، اس نے بوبروف کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

''واقعی؟ اتنی جلدی؟،، بوبروف نے جما جما کر پوچھا۔

''ظاہر ہے،، اس نے بےچینی اور طنز کے ساتھ کندھے جھٹکے۔ ''بڑی جلدی یاد آیا تمھیں! میں نے تو ریل ہی میں اپنے تمام کواڈریلے ناچوں کے لئے وعدے کر لئے تھے۔،،

''اور مجھے بالکل بھول گئیں تم،، اس نے اداسی سے کہا۔

اس کے لہجے سے نینا کا دل کچھ پگھلا، اس نے گھبرا کر پنکھا بند کیا، پھر کھولا، پھر بند کیا لیکن نظر اٹھا کر اوپر نہیں دیکھا۔

''غلطی تمھاری ہے، پہلے کیوں نہیں کہا مجھ سے؟،،

''نینا، میں پک‌نک میں صرف تمھاری وجہ سے آیا تھا۔ نینا گریگورئیونا، کیا یہ محض تمھارا کھیل تھا؟،،

اس نے کوئی جواب نہیں دیا، اضطراب کے عالم میں پنکھے سے الجھتی رہی۔ ٹھیک اس وقت ایک نوجوان انجنیر اس کی طرف لپکا اور اسے الجھن سے نجات مل گئی۔ وہ تیزی سے اٹھی اور بوبروف کی طرف دیکھے بغیر انجنیر کے شانے پر اپنا نازک ہاتھ رکھ دیا۔ لمبا سا سفید دستانہ اس کے ہاتھ کے حسن کو دوبالا کر رہا تھا۔ بوبروف نظروں ہی نظروں میں اس کا تعاقب کرتا رہا۔ اس نے صرف ایک چکر لگایا اور میدان کے دوسرے سرے پر بیٹھ گئی۔ بوبروف کو ایسا محسوس ہوا کہ نینا جان‌بوجھ کر اتنی دور بیٹھی تھی۔ وہ بوبروف سے سہمی ہوئی سی تھی یا شاید اس کی موجودگی پر نادم ہوگی۔

اس کے روح و دل پر ایک دفعہ پھر وہی بےرنگ اور تکلیف‌دہ اداسی چھا گئی جو مدتوں سے اس کی رفیق تھی۔ اسے اپنے گردوپیش کا ہر شخص قابل رحم، نامعقول اور مضحکہ خیز معلوم ہونے لگا۔ موسیقی کی سرد تانیں اس کے دماغ میں ایک کراہ کی طرح گونج اٹھیں، لیکن اس نے ابھی آشادیپ بجھایا نہ تھا، وہ مختلف باتیں سوچ سوچ کر دل کو تسلی دیتا رہا: "ہو سکتا ہے اس کی خفگی کی وجہ یہ ہو کہ میں نے اسے پھول نہیں بھیجے۔ یا شاید وہ میرے جیسے پھوہڑ اور ریچھ‌نما آدمی کے ساتھ ناچنا پسند نہ کرتی ہو؟

ہاں، شاید اس کا خیال ٹھیک ہے۔ لڑکیوں کے لئے یہ چھوٹی موٹی باتیں بہت اہم ہوتی ہیں! بلکہ یہ چیزیں تو ان کی زندگی کی تمام تر خوشیوں، تمام تر اداسیوں کا سرچشمہ ہیں، یہ تو ان کی زندگی کی تمام‌تر شاعری ہیں۔ ،،

شام کا دھندلکا پھیلتے ہی پویلین میں چینی لالٹینیں قطاردرقطار ٹمٹمانے لگیں۔ لیکن روشنی کافی نہیں تھی، میدان تک تو برائے نام روشنی پہنچ رہی تھی۔ اچانک میدان کے دو کونوں پر دو برقی سورجوں کی دودھیا روشنی جگمگا اٹھی، یہ سورج ابھی تک بہت احتیاط سے جھاڑیوں میں دبکے ہوئے تھے۔ میدان کے چاروں طرف کھڑے ہوئے برچ اور ہورن بیم کے پیڑ جگمگانے لگے۔ ان کی بےحس وحرکت اور گھنگھریالی چوٹیاں اس وقت بڑے غیرفطری انداز میں جھلملا رہی تھیں اور کچھ ایسا سماں پیش کر رہی تھیں جیسے اسٹیج کا پس منظر بالکل خالی اور اجاڑ ہو۔ اس سرسبز اور سیمیں جھنڈ کے بعد دوسرے درختوں کی گول اور ناہموار چوٹیاں سیاہ فام آسمان کے پس منظر میں بہت ہی دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھیں۔ بینڈ کی موسیقی بھی میدانوں میں پھدکتے ہوئے ٹڈوں کی جھنکار کو نیچا نہ دکھا سکی۔ ان ٹڈوں کا مسلسل کورس بڑا انوکھا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک ہی

ٹڈا کبھی دائیں طرف تان لگاتا ہے کبھی بائیں طرف اور کبھی اوپر منہ اٹھا کر چیخ اٹھتا ہے۔

بال جاری تھا، ایک کے بعد دوسرا ناچ ہوتا چلا گیا اور محفل زیادہ سے زیادہ جاندار، زیادہ سے زیادہ پرشور ہو گئی۔ بینڈوالوں کو سانس لینے کی مہلت نہ تھی۔ اس موسیقی نے اور شاعرانہ اور پرستانی پس منظر نے عورتوں کو مدھوش کر رکھا تھا۔

جھاڑیوں، مڑی تڑی پتیوں اور سیلے سیلے جنگلوں کی بو اور کہیں دور کٹی ہوئی سبز گھاس کی بھینی بھینی خوشبو میں عطر اور تپتے ہوئے جسموں کی گرمی کچھ عجیب طرح رچ بس گئی تھی۔ ہوا میں چاروں طرف پنکھے لہرا رہے تھے، گویا رنگارنگ کے حسین پرند پر پھیلائے اڑنے کو تیار ہوں۔ بلند آوازیں، ہنسی مذاق اور ریت سے ڈھکی ہوئی زمین پر پڑتے ہوئے قدموں کی چاپ مل کر ایک عجیب مسلسل مگر جاندار شور پیدا کر رہے تھے۔ جب کبھی بینڈ خاموش ہوتا تو اس شور کی گونج اور بھی بلند ہو جاتی۔

بوبروف نے پل بھر کو بھی نینا کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹائیں، ایک دو دفعہ تو وہ اپنے لباس سے اسے گدگداتی ہوئی سی گزر گئی۔ وہ ناچتی ہوئی تیزی سے گزرتی تو بوبروف کو لگتا کہ ہوا کا جھونکا سا گزر گیا۔ وہ ناچ رہی تھی

اور اس کا بایاں بازو اپنے ساتھی کے کندھے پر رکھا تھا، وہ بڑی دلکش بےچارگی سے آگے کو جھکی ہوئی تھی۔ اس نے اس طرح سر جھکا رکھا تھا جیسے ابھی اپنے ساتھی کے سر پر رکھ دیگی۔ کبھی کبھی اسے نینا کے سفید پیٹی کوٹ کی لیس کی ایک جھلک نظر آتی۔ نینا کے تیز تیز گھومنے کی وجہ سے پیٹی کوٹ کی لیس ہوا میں اڑ رہی تھی، کبھی اسے نینا کے سیاہ موزے، ننھے ننھے پاؤں، نازک ٹخنے اور متناسب اور خم‌دار پنڈلی نظر آتی اور ایسے میں نجانے کیوں وہ کچھ شرمندہ سا ہو جاتا اور دل ھی دل میں ان سب آدمیوں پر جھنجھلانے لگتا جنھیں نینا نظر آ سکتی تھی۔

مزورکا شروع ہو گیا۔ تقریباً نو بج رہے تھے۔ نینا کا ساتھی سویژیفسکی مزورکا کی ھدایت کا فرض انجام دے رہا تھا۔ اسے کسی پیچیدہ سے قدم میں الجھا ہوا دیکھ کر نینا نے موقع کا فائدہ اٹھایا اور دونوں ہاتھوں سے پریشان بال سنبھالتی ہوئی بھاگی۔ وہ بڑی سبک رفتاری سے موسیقی کی دھن پر تیرتی ہوئی تیزی سے ڈریسنگ روم کی طرف جا رہی تھی۔ بوبروف نے میدان کے دوسرے کونے سے یہ سب دیکھا، تیزی سے اس کے پیچھے لپکا اور دروازے پر کھڑا ہوگیا۔ اس کونے میں خاصا اندھیرا تھا۔ پویلین کے عقب میں بنا ہوا لکڑی کا یہ ڈریسنگ روم گھرے جھنڈ میں چھپا

کھڑا تھا۔ بوبروف نے سوچا کہ وہ نینا کے باھر نکلنے تک وھیں انتظار کرےگا اور اس سے سب کچھ کھلواکے دم لیگا۔ اس کے دل میں درد کی ٹیسیں سی اٹھ رھی تھیں۔ انگلیاں عالم اضطراب میں مڑی ھوئی تھیں اور بالکل سرد اور نم ھو گئی تھیں۔

چار پانچ منٹ بعد نینا باھر نکلی۔ بوبروف نے اوٹ سے نکل کر اس کی راہ روک لی۔ نینا ھلکے سے چیخ مارکر پیچھے ھٹ گئی۔

''مجھے ستا کیوں رھی ھو، نینا گریگورنیونا؟،، بوبروف نے کہا اور عجیب منت کے عالم میں اپنے ھاتھ باندھ لئے۔ ''تمھیں کچھ اندازہ ھے تم مجھے کس طرح تڑپا رھی ھو؟ افسوس، تم میرے دکھوں کا مذاق اڑا کر مجھ پر ھنس رھی ھو!،،

''میں سمجھی نہیں تم چاھتے کیا ھو،، نینا نے مصنوعی تکبر کے ساتھ کہا۔ ''میں تو کبھی خواب میں بھی تم پر نہیں ھنسی۔،،

اس کی ھر ادا سے خاندانی خصوصیات جھلک رھی تھیں۔

''نہیں سمجھیں؟،، بوبروف نے افسردگی سے کہا۔ ''تو پھر بتاؤ نا آج رات تمھارے اس رویے کا مطلب کیا ھے؟،،

''کیسا رویہ؟،،

''اف نینا، تم مجھ سے کتنی سرد مہری، کتنی نفرت سے پیش آ رھی ھو۔ مجھے دیکھ کر منہ

پھیر لیتی ہو، تمھیں میرے وجود سے گھبراھٹ ہو رہی ہے۔"

"نہیں، مجھے تو اس سے کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔"

"یہ تو اور بھی بدتر ہے، نینا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ تم خوفناک حد تک بدل گئی ہو، تمھاری یہ تبدیلی میری سمجھ سے باھر ہے۔ نینا، خدا کے لئے کھل کے بات کرو، آج صبح تک میں تمھیں انتہائی سچا اور صاف گو سمجھتا تھا۔ آج بھی مجھ سے اسی صاف گوئی سے بات کرو، نینا۔ تم بری سے بری بات کہو مگر صاف، صاف اور کھل کر۔ ضرورت اس کی ہے کہ ایک دفعہ ہم کھل کے بات کریں۔ ھمارے درمیان سب کچھ طے ہو جائے۔"

"طے ہونے کو ہے ہی کیا؟ میں سمجھی نہیں تمھارا مطلب کیا ہے!"

بوبروف کی کنپٹیوں میں خون کا دوران انتہائی تیز ہو گیا۔ اس نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

"اوہ، نینا گریگورئیونا، بنو نہیں، تم خوب سمجھتی ہو میرا مطلب کیا ہے۔ طے ہونے کو بہت کچھ ہے، نینا۔ ہم نے ایک دوسرے سے محبت کی باتیں کی ہیں، ھاں یہ باتیں کسی طرح بھی اقرار محبت سے کم نہ تھیں۔ ہم نے چند ایسے حسین

لمحے گزارے ھیں جنھوں نے ھمیں محبت کے نازک بندھنوں میں باندھ دیا تھا۔ میں سمجھتا ھوں تم اعتراض کروگی کہ مجھے غلط فہمی ھوئی۔ ھاں، شاید میں غلطی پر تھا۔ لیکن نینا گریگورئیونا، یاد کرو یہ تم ھی نے کہا تھا کہ اس پک‌نک میں ضرور آنا تاکہ ھم اطمینان سے بات چیت کر سکیں؟،،

اچانک نینا کا دل پسیج گیا۔

''ھاں، میں نے تم سے آنے کو کہا تھا،، اس نے سر جھکا کر کہا۔ ''میں تمھیں بتانا چاھتی تھی۔ بتانا چاھتی تھی کہ ھمیں ھمیشہ ھمیشہ کو جدا ھونا ھے۔،،

اچانک جیسے کسی نے اس کے سینے میں خنجر بھونک دیا۔ وہ لڑکھڑایا اور اس کے چہرے پر پھیلی ھوئی زردی اس تاریکی میں بھی نمایاں ھو گئی۔

''جدا ھونا ھے؟،، اس کا سانس گھٹنے لگا۔ ''نینا گریگورئیونا، جدائی کی باتیں نہ کرو — یہ باتیں بہت تکلیف‌دہ، بہت تلخ ھیں، نینا!،،

''میں یہ سب کہنے پر مجبور ھوں۔،،

''مجبور؟،،

''ھاں، یہ فیصلہ میرا اپنا فیصلہ نہیں ھے، بوبروف۔،،

9=

''پھر کس کا ہے؟''

کوئی سایہ ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ نینا نے تاریکی میں جھانک کر دیکھا۔

''یہ ہے وہ ہستی جس نے یہ فیصلہ کیا ہے۔''

یہ ہستی آننا افاناسئیونا تھی۔ اس نے مشکوک نظروں سے بوبروف اور نینا کو دیکھا اور لپک کر بیٹی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''وہاں سے بھاگ کیوں گئی، نینا؟'' اس نے تنبیہہ کی۔ ''یہاں اندھیرے میں سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ واہ کیا اچھا مشغلہ ڈھونڈا ہے! اور میں کونے کونے ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ اور بوبروف صاحب آپ!'' اچانک وہ بوبروف کی طرف مڑکر چنگھاڑتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''اگر خود ناچنا نہیں جانتے یا نہیں چاہتے تو کم سے کم لڑکیوں کے راستے میں تو نہ آئیے۔ تاریک گوشوں میں چھپ چھپ کر انہیں سبز باغ دکھانے اور للچانے کی ضرورت نہیں ہے!''

وہ یہ کہتی ہوئی نینا کو لئے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

''گھبرائیے نہیں، مادام، آپ کی دوشیزہ کی آبرو کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں اتار سکتی!'' بوبروف نے بہ آواز بلند کہا اور اچانک ایسی عجیب و غریب اور تلخ ہنسی ہنسا کہ ماں بیٹی دونوں پلٹ کر حیرت سے دیکھنے لگیں۔

''دیکھا! میں نہ کہتی تھی کہ یہ کمبخت گدھا ہے بےحیا؟،، آننا افاناسئیونا نے نینا کے ہاتھ کو ٹھوکا دیا۔ ''اس کے منہ پہ تھوک دو تب بھی ہنس کے ٹال دےگا، ذرا اثر نہیں ہوتا کمبخت پر... ہاں، نینا، اب عورتیں اپنے ساتھی چنیں گی،، اس نے پرسکون آواز میں کہا۔ ''جاکر کواشنین سے درخواست کرو۔ انھوں نے ابھی کھیل ختم کیا ہے۔ ادھر پویلین کے دروازے میں کھڑے ہیں۔،،

''مگر اماں! بھلا وہ کیا ناچیں گے! ہل تو سکتے نہیں بچارے!،،

''جو میں کہتی ہوں وہی کرو، ایک زمانے میں ان کا شمار ماسکو کے بہترین رقاصوں میں ہوتا تھا۔ اور کچھ نہیں تو وہ خوش تو ہو ہی جائیں گے۔،،

بوبروف کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ اس دھند کے پیچھے سے اس نے دیکھا کہ نینا بڑی پھرتی سے میدان کے دوسرے کنارے تک پہنچی اور بڑی غمزہ‌خیز مسکراہٹ کے ساتھ کواشنین کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کا سر انداز دل ربائی اور عشوے کے ساتھ ایک طرف کو جھکا ہوا تھا۔ کواشنین نے اس کی درخواست سنی اور نینا پر ہلکا سا جھک گیا۔ اچانک اس نے ایسا فلک شگاف قہقہہ لگایا کہ اس کا پورا

9—1348

جسم ہل اٹھا اور وہ سر ہلاکر انکار کرنے لگا۔ نینا بڑی دیر تک اصرار کرتی رہی اور پھر روکھا سا منہ بنایا اور مڑکر وہاں سے جانے لگی۔ لیکن کواشنین اپنے لحیم شحیم جثے کے باوجود بڑی پھرتی سے اس کے پاس پہنچ گیا اور اس انداز سے کندھے جھٹکے جیسے کہہ رہا ہو ''اچھا بھئی، یہی سہی، بچوں کا دل تو خوش کرنا ہی ہے۔،، اس نے نینا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ تمام رقاصوں کے قدم رک گئے، وہ سب بڑے تجسس سے اس نئے جوڑے کو دیکھ رہے تھے۔ کواشنین اور مزورکا ناچےگا — عجیب سماں ہوگا!

کواشنین نے تال کا انتظار کیا اور پھر اچانک ایک خاص انداز شاہانہ کے ساتھ اپنی ساتھی کی طرف مڑا اور بڑے اعتماد اور مہارت کے ساتھ پہلا قدم اٹھایا۔ اس کا انداز دیکھتے ہی ہر شخص تاڑ گیا کہ یہ قدم بیتے دنوں کے کسی بہترین رقاص کے قدم ہیں۔ وہ سر ترچھا کئے بڑے تکبر اور بڑی شوخی کے ساتھ نینا کو دیکھ رہا تھا۔ شروع میں تو وہ موسیقی کی گت پر لچکدار چال سے جھوم جھوم کر چلتا سا رہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کا بلاخیز قد و جسامت، راہ میں رکاوٹ بننے کے بجائے اس کے بھاری بھرکم جسم کی شان و شوکت کو چارچاند لگا رہا ہے۔ موڑ پر پہنچ کر وہ

پل بھر کو رکا، ایڑیاں بجا کر نینا کو ایک چکر دیا اور بڑی سبک‌روی سے موٹی موٹی لچک‌دار ٹانگوں پر دوڑتا ہوا میدان کے مرکز سے گزرتا چلا گیا۔ اس کے چہرے پر مروت بھری مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اب وہ اس جگہ پہنچ چکا تھا جہاں اس نے ناچ شروع کیا تھا، یہاں پر اس نے نینا کو پھر بڑی تیزی اور خوبصورتی سے ایک چکر دیا، اچانک اسے کرسی پر بٹھایا اور اس کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

دیکھتے دیکھتے عورتوں کے جھرمٹ نے اسے گھیر لیا۔ ہر ایک اس سے التجا کر رہی تھی کہ میرے ساتھ ناچو لیکن اسے عادت کے خلاف اتنی محنت کرنی پڑی تھی کہ وہ نڈھال ہو گیا تھا۔ وہ بار بار رومال سے منہ پر پنکھا جھل رہا تھا اور بری طرح ہانپ رہا تھا۔

"بس، بھائی، بس... اس بوڑھے آدمی پر کچھ تو ترس کھائیے آپ لوگ"، اس نے ہنس کر زور زور سے سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ناچنے کی عمر کب کی بیت چکی۔ آئیے اب ذرا کھانا پینا ہو جائے۔"

پک‌نک منڈلی نے زور زور سے کرسیاں کھسکائیں اور کھانے کے لئے بیٹھنا شروع کر دیا۔ بوبروف ابھی تک وہیں کھڑا تھا جہاں نینا نے اسے چھوڑا تھا۔ کبھی بے‌عزتی کے خیال سے اس کے سینے میں شعلے بھڑکنے لگتے اور کبھی یاس و ناامیدی دل مسوسنے

لگتی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے، پر آگ سی لگی ہوئی تھی۔ اور حلق سوکھ کر اس میں کانٹے سے پڑ گئے تھے۔ موسیقی کی مسلسل، بے رنگ اور تکلیف دہ گونج اس کے دماغ سے ٹکرا رہی تھی۔

''ارے، میں گھنٹوں سے تمھیں ڈھونڈ رہا ہوں!،، اسے قریب سے ڈاکٹر کی سرشار آواز آئی۔ ''کہاں چھپے ہوئے تھے، یار؟ میں تو پہنچا ہی تھا کہ یار لوگوں نے تاش میں پھنسا لیا۔ بڑی مشکل سے پیچھا چھڑایا ہے۔ آؤ چلو کھانا کھائیں۔ میں نے دو جگہیں رکھ چھوڑی ہیں تاکہ دونوں ساتھ بیٹھ سکیں۔،،

''تم جاؤ، ڈاکٹر،، بوبروف نے بمشکل جواب دیا۔ ''میں نہیں جاؤنگا۔ بھوک نہیں ہے۔

''کیوں نہیں آ رہے؟ کیوں، بھئی، کیا بات ہے؟،، ڈاکٹر غور سے بوبروف کو دیکھ رہا تھا۔ ''دوست، بات کیا ہے آخر؟ ذرا دیکھو تو سہی تمھارا چہرہ کس قدر اترا اترا سا لگ رہا ہے،، اس وقت ڈاکٹر کی باتوں میں دلی خلوص کی بو تھی۔ ''تم برا مانو یا بھلا اس وقت میں تمھیں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ آؤ یار، بس اب زیادہ حجت نہ کرو۔،،

''ڈاکٹر، تم سوچ نہیں سکتے مجھے کتنی ذلت محسوس ہو رہی ہے، میرا دل گھبرا رہا ہے، ڈاکٹر!،، بوبروف نے گولڈبرگ کے ساتھ گھسٹتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''بکواس ہے یار، چلو چلو! مرد بنو، میں کہتا ہوں چٹکیوں میں اڑا دو اس قصے کو۔ 'کیا تیرا دل یونہی دکھا کرے گا اور تو آزمائش کے شعلوں میں تڑپا کرے گا؟'،، ڈاکٹر نے بڑے دوستانہ طریقے سے بوبروف کے گلے میں باھیں ڈال کر بڑی محبت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے یہ شعر پڑھا۔ ''دوست، میں تمھارے لئے بہترین نسخہ تجویز کرتا ہوں۔ 'وانیا، میرے دوست، آؤ دو ایک جام ہو جائیں۔ ذرا روح میں گرمی آ جائیگی!، ارے بھائی، میں نے اندرئی‌آس کے پاس بہت سی کونیاک رکھ چھوڑی ہے۔ افوہ، یہ جن کس طرح شراب چڑھاتا ہے! آؤ آؤ، مرد بنو۔ جانتے ہو اندرئی‌آس کو تم سے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ آؤ چلیں!،،

ڈاکٹر بولتا گیا اور بوبروف کو پویلین کی طرف کھینچتا گیا۔ وہ دونوں برابر برابر بیٹھ گئے۔ بوبروف کا دوسرا شریک دسترخوان اندرئی‌آس تھا۔

وہ دور ھی سے بوبروف کو آتے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ قریب آنے پر تھوڑا سا کھسک کر بوبروف کو بیٹھنے کی جگہ دی اور بڑی محبت سے اس کی کمر تھپکی۔

''آؤ، بھئی آؤ، تمھیں دیکھ کر دل خوش ہو گیا،، اس نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ''تم بہت اچھے جوان ہو، بوبروف — مجھے

اس قسم کے لوگ بہت پسند ھیں۔ کیا، پیوگے کونیاک؟،،

اس کی شیشے جیسی مست آنکھیں زرد چہرے پر عجیب طرح چمک رہی تھیں۔ چھہ مہینے پہلے تک کسی کو دور دور تک خیال بھی نہ تھا کہ یہ خاموش طبیعت، سنجیدہ، محنتی اور قابل شخص روزانہ شام کو کسی تنہا گوشے میں بیٹھ کر شراب میں کھو جاتا ہے۔

’’واقعی تھوڑی سی شراب پی لوں تو طبیعت کچھ ہلکی ہو جائیگی،، بوبروف نے سوچا۔ ’’مارو گولی، لاؤ ذرا سی چکھ ھی لوں!،،

اندرئی‌آس بوتل جھکائے بیٹھا تھا۔ بوبروف نے ڈونگا بڑھا دیا۔

’’اتنا کہ اور؟،، اندرئی‌آس نے بھویں چڑھا کر پوچھا۔

’’ھاں،، بوبروف نے مری مری سی اداس مسکراھٹ کے ساتھ جواب دیا۔

’’لو! جب چاھو خود ھی بس کر دینا۔،،

’’جام خود کہہ دےگا!،،

’’وہ مارا۔ کوئی دیکھے تو سمجھے کہ سیدھے سویڈن کے بحری بیڑے سے آ رہے ہو۔ بس؟،،

’’ڈالے جاؤ۔،،

’’ارے یار، بھئی، یہ وسوپ مارکہ مارتیل ھے۔ نشیلی پرانی اصلی اور تیز کونیاک۔،،

''ڈالے جاؤ، ڈالے جاؤ، گھبراؤ نہیں۔ ،،

''اچھا ہے وہ دیکھ لے کہ میں شراب کے نشے میں کس طرح دھت ہوں،، اس نے نفرت سے سوچا۔

جام لبریز ہو گیا۔ اندرئی‌آس نے بوتل رکھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے بوبروف کو دیکھنے لگا۔ بوبروف نے ایک گھونٹ میں پورا جام چڑھایا اور کانپ اٹھا۔

''لگتا ہے تمھیں اندر ہی اندر کوئی غم کھائے جا رہا ہے، دوست؟،، اندرئی‌آس نے بڑی پرخلوص نظروں سے بوبروف کی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں،، بوبروف نے بڑی افسردگی سے سر ہلایا۔

''تمھارا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے؟،،

''ہاں۔ ،،

''پھو! تب تو اور شراب پیو!،،

''بھر دو،، بوبروف نے بڑی افسردگی سے سر تسلیم خم کر دیا۔

اس نے بڑی نفرت سے کونیاک چڑھائی اور غم غلط کرنے کی پوری کوشش کرتا رہا۔ لیکن عجیب بات ہے شراب نے اس پر ذرا بھی اثر نہ کیا۔ بلکہ ہر جام کے بعد اداسی بڑھتی ہی چلی گئی، آنسوؤں نے اس کی آنکھوں کی آگ کو پہلے سے بھی زیادہ شدید کر دیا تھا۔

اتنے میں ویٹروں نے شمپین پیش کی۔ کواشنین دو انگلیوں میں جام تھام کر جگہ سے اٹھا اور

گلاس کی اوٹ سے ہنڈے کی جلوہ خیز روشنی کو تکنے لگا۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ اب قوس کی لالٹینوں کی سرسراہٹ اور ٹڈے کی مسلسل چک چک کے سوا بالکل خاموشی تھی۔

کواشنین نے گلا صاف کیا۔

''خواتین اور حضرات!،، اس نے شروع کیا اور پھر بڑے انداز کے ساتھ رکا۔ ''مجھے یقین ہے کہ آپ میں سے کوئی میرے خلوص پر شک نہیں کرے گا کہ یہ جام کس قدر تشکر اور کس قدر جذبات کے ساتھ پی رہا ہوں۔ ایوان کووہ میں میرا ایسا پرجوش سواگت ہوا ہے کہ میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ اس چھوٹی سی پک نک کی یاد میرے لئے ہمیشہ بڑی خوشگوار ہوگی۔ اس پک نک کی کامیابی کا سہرا ان تمام خواتین کی دلکشی اور دلنوازی کے سر رہا جنھوں نے پک نک میں شرکت کرکے اس میں جان ڈال دی ہے۔ خواتین کا جام صحت!،،

اس نے گلاس بلند کرکے ہلکے سے گھمایا اور ایک گھونٹ پیا۔

''میرے رفیقان کار اور میرے مشیروں، اب میں آپ سے مخاطب ہوتا ہوں،، وہ کہہ رہا تھا۔ ''میری باتوں میں پند و نصائح کا رنگ پیدا ہو جائے تو برا نہ ماننا۔ میں عمر میں تم سب سے بہت بڑا ہوں۔ بھئی، بڑے بوڑھوں کو تو لکچر بازی کی اجازت ہونی ہی چاہئے۔،،

اندرئی‌آس بوبروف کے کان کے پاس منہ لے گیا۔
"ذرا دیکھنا، بدمعاش سویژیفسکی کیسے کیسے منہ بنا رہا ہے،، اس نے سرگوشی کی۔

سویژیفسکی انتہائی خوشامدانہ طریقے سے ہمہ‌تن توجہ بنا بیٹھا تھا۔ کواشنین نے اپنی ضعیف عمر کا ذکر کیا تو اس نے دونوں ہاتھوں اور سر کے اشارے سے سخت احتجاج کیا۔

"اب میں ایک گھسی پٹی اور پرانی کہاوت ضرور دوہراؤنگا جسے ہمیشہ ہر ممکن اداریے میں استعمال کیا جاتا ہے،، کواشنین کہہ رہا تھا۔ "آؤ ہم اپنا پرچم بلند رکھیں۔ یہ نہ بھولیں کہ ہم زمین کے جوہر ہیں، اور مستقبل ہمارے ہاتھ میں ہے۔ کرہ زمین پر ریلوں کا جال ہم نے نہیں بچھایا تو کس نے بچھایا؟ زمین کا سینہ ہم نے چاک نہیں کیا تو کس نے کیا؟ اس کے خزانے کو توپوں، پلوں، ریل گاڑیوں اور دیوھیکل مشینوں کا روپ ہم نے نہیں دیا تو کس نے دیا؟ کیا ہم نے مشکل سے مشکل میدان میں عقل و خرد کے جوہر دکھا کر لاکھوں کروڑوں کے سرمائے میں جان نہیں ڈالی؟ حضرات اور خواتین، یاد رکھئے کہ فطرت ایک پوری نسل کو وجود میں لانے کے لئے اپنی تمام تخلیقی قوتیں داؤ پر لگا دیتی ہے تاکہ اس نسل سے چند چنیدہ ہستیاں جنم لیں۔ حضرات

و خواتین، اپنے اندر وہ ھمت، وہ قوت پیدا کیجئے کہ وہ چنیدہ ھستی آپ ھی ھو جائیں۔ ھرا!،،

''ھرا!،، پک‌نک والے چلائے، سویڑیفسکی کی آواز سب سے اونچی تھی۔

وہ سب اٹھ کر جام ٹکرانے کے لئے کواشنین کی طرف بڑھے۔

''اف نفرت‌انگیز جام ھے،، ڈاکٹر نے زیرلب کہا۔

اس کے بعد شیلکوونیکوف اٹھا۔

''حضرات و خواتین!،، وہ چلایا۔ ''ھمارے قابل احترام مربی، ھمارے محبوب استاد اور ھمارے میزبان واسیلی تیرینتیوچ کواشنین کا جام صحت! ھرا!،،

''ھر۔ ر۔ ا۔ ا!،، پک‌نک والے ھم‌آواز ھو کر چلائے اور ایک دفعہ پھر جام ٹکرانے کے لئے اس کی طرف لپکے۔

تقریربازی کا بازار گرم ھو گیا۔ کمپنی کی کامیابی کے اور غیر حاضر حصےداروں کے نام کے جام پئے گئے۔ اور پک‌نک میں شرکت کرنےوالی خواتین اور عام طور پر صنف نازک کے جام صحت پئے گئے۔ بعض بعض ٹوسٹ تو بہت ھی گھٹیا تھے، مذاق ھی مذاق میں خاصی بےھودگی کی نوبت آگئی۔

درجن بھر بوتلوں میں بھری ھوئی شمپین رنگ دکھا رھی تھی۔ پویلین میں چاؤں چاؤں مچی ھوئی تھی اور ھر مقرر کو اپنی تقریر شروع کرنے

سے پہلے بہت دیر تک گلاس بجانا پڑتا تھا۔ حسین ملر سب سے الگ تھلگ دور ایک چھوٹی سی میز پر بیٹھا بڑے سے سیمیں پیالے میں گرم گرم پنچ* بنا رہا تھا۔ اچانک کواشنین پھر کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر مکاری اور عیاری بھری مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

''حضرات و خواتین، میں بڑی خوشی و مسرت کے ساتھ آپ کو یہ خوشخبری سنانا چاہتا ہوں کہ آج کا یہ جشن ایک ذاتی اور خاندانی واقعہ سے بغل گیر ہو گیا ہے،، اس نے بڑے دلکش انداز میں کہا۔ ''آئیے ہم ایک نئے نئے منگنی شدہ جوڑے کو مبارک باد دیں اور اپنی دعاؤں سے مالامال کریں۔ آئیے ہم جام صحت پئیں نینا گریگورئیونا زینینکو کا اور — ،، وہ ھکلایا کیونکہ اسے سویژیفسکی کا نام اور خاندانی نام یاد نہیں آ رہا تھا۔ ''اور اپنے مشیرکار مسٹر سویژیفسکی کا۔ ،،

یہ خبر ایسی غیرمتوقع تھی کہ کواشنین کی تقریر کے بعد شور اور ھنگامہ پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گیا۔ اندرئی آس کو اپنے قریب سے ایک آواز آئی، آواز کیا تھی ایک درد بھری کراہ تھی، اس نے پلٹ کر دیکھا۔ بوبروف کا زرد چہرہ درد و غم کی شدت سے بگڑا ہوا تھا۔

---

* آگ کی لو اٹھتی ہوئی خاص قسم کی شراب۔ (ایڈیٹر)

''ارے یار، تمھیں نہیں معلوم یہ کتھا،، اس نے سرگوشی کی۔ ''ذرا ٹھیرو، دیکھنا میں کیا لاجواب تقریر کرتا ہوں۔ ،،

وہ بڑے اعتماد کے ساتھ اٹھا۔ اس کی کرسی الٹ گئی اور شراب کا آدھا جام چھلک گیا۔

''حضرات و خواتین!،، وہ چلایا۔ ''ہمارے قابل احترام میزبان نے اپنی عالی‌ظرفی اور دوراندیشی کی وجہ سے اپنا ٹوسٹ مکمل نہیں کیا، اور یہ بالکل بجا ہے۔ آئیے ہم اپنے عزیز ساتھی مسٹر سویژیفسکی کو ان کی ترقی پر بھی مبارکباد دیں۔ اگلے ماہ سے وہ کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرس کے کاروباری مینیجر کا بلند عہدہ سنبھال لیں‌گے۔ بس یوں سمجھئے کہ قابل احترام واسیلی تیرینتیوچ نے انھیں یہ ملازمت دے‌کر گویا اس نوجوان جوڑے کو شادی کا تحفہ پیش کیا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہمارے قابل‌عزت مربی کے چہرے پر اس وقت ناگواری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ شائد میں نے بے سمجھے بوجھے ایسی بات کہہ دی جسے وہ عین شادی کے دن منظر عام پر لانا چاہتے تھے۔ اگر ایسا ہے تو میں معافی کا طلبگار ہوں۔ بہرحال دوستی اور احترام کے جذبے سے مجبور ہوکر اتنا ضرور کہوں‌گا کہ مجھے امید ہے کہ ہمارے عزیز ساتھی مسٹر سویژیفسکی پیٹرسبرگ میں نیا عہدہ سنبھالنے کے بعد اسی قدر محنتی کارکن اور قابل محبت ساتھی

ثابت ہوں گے جیسے یہاں تھے۔ لیکن حضرات و خواتین، میں جانتا ہوں آپ میں سے کوئی بھی حسد کی آگ میں نہیں جلے گا،، وہ ٹھیرا اور بڑے طنزیہ انداز میں کنکھیوں سے سویڑیفسکی کی طرف دیکھا۔ ’’ہم سب اتنے خلوص سے ان کی کامیابی کے خواہاں ہیں کہ ...،،

اس کا ٹوسٹ گھوڑے کے قدموں کی چاپ میں کھو کر رہ گیا۔ ایک سوار سرپٹ دوڑتا ہوا جھنڈ کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ اس کا سر ننگا تھا اور گھوڑا پسینے میں تر ۔ اس کا چہرہ دہشت و پریشانی کی وجہ سے بڑا بھیانک سا ہو گیا تھا۔ وہ ٹھیکے دار دیختیریف کے زیرسایہ کام کرنے والا ایک فورسین تھا۔ اس نے تھکن سے چور چور گھوڑے کو میدان کے بیچوں بیچ چھوڑ دیا اور کواشنین کی طرف لپکا۔ اور بڑی بے تکلفی سے کواشنین پر جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا۔ پویلین میں موت کا سا سناٹا چھا گیا۔ ہاں روشنیوں کی سرسراہٹ اور ٹڈوں کی چک چک ابھی تک جاری تھی۔

کواشنین کا چہرہ شراب کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا، لیکن اب ایکدم زرد پڑ گیا۔ اس نے اضطراب کے عالم میں ہاتھ سے گلاس رکھا تو میزپوش پر شراب چھلک گئی۔

’’اور بلجیائیوں کا کیا رنگ ہے؟،، اس نے بھنچی بھنچی سی آواز میں کہا۔

فورمین نے سر ہلایا اور پھر کواشنین کے کان میں منہ دے کر کچھ کھسر پھسر کرنے لگا۔

"لعنت ہے!" کواشنین نے جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ گھبراہٹ میں اپنا رومال مروڑ رہا تھا۔ "کیا ہنگامہ ہے! ٹھیرو، اسی لمحے گورنر کے نام کا ایک تار لیکر جاؤ۔ حضرات و خواتین،" اس نے تھرتھراتی ہوئی بلند آواز میں کہا۔ "مل میں ہنگامہ ہو گیا ہے۔ اس سلسلے میں کوئی ضروری قدم اٹھانا چاہئے، میرے خیال میں ہمیں اسی وقت محفل برخاست کرنی پڑے گی۔"

"میں جانتا تھا یہ ہوگا،" اندرئی آس نے حقارت سے کہا۔ اس کی آواز سے خاموش غصہ جھلک رہا تھا۔

ہر شخص گڑبڑاہٹ کے عالم میں اٹھنے لگا لیکن اس نے اطمینان سے ایک نیا سگار اٹھایا، اپنی جیب میں دیاسلائی ڈھونڈی اور جام میں کونیاک بھر لی۔

۱۱

ہر طرف انتہائی ہیجان اور ہنگامہ پھیل گیا۔ ہر شخص اٹھ کر پویلین میں ادھر سے ادھر دوڑنے لگا۔ ہر شخص دھکے دے رہا تھا، چیخ رہا تھا اور الٹی ہوئی کرسیوں سے ٹکرا رہا تھا۔ خواتین کانپتے ہاتھوں سے جلدی جلدی ہیٹ اوڑھ رہی تھیں۔ حالات

کو بد سے بدتر بنانے کے لئے کسی نے بجلیاں بجھانے کا حکم دے دیا اور تاریکی میں عورتوں کی اضطراری چیخیں گونج اٹھیں۔

تقریباً پانچ بج رہے تھے۔ سورج ابھی تک طلوع نہیں ہوا تھا۔ لیکن آسمان پر خاصی روشنی ہو چلی تھی۔ بےرنگ اور ملگجا آسمان بارش پکار رہا تھا۔ طلوع سحر کی دھندلی روشنی نے اچانک بجلی کی روشنی کی جگہ قبضہ جما لیا تھا۔ اس دھندلکے میں یہ ہنگامہ اور گڑبڑ اور بھی زیادہ خوفناک، تکلیف‌دہ اور غیرحقیقی معلوم ہو رہی تھی۔ انسانی ڈھانچے کسی پراسرار وحشتناک اور طلسماتی کہانی کے بھوت معلوم ہو رہے تھے۔ رت جگے کے بعد مرجھائے ہوئے چہرے بڑے خوفناک نظر آ رہے تھے۔ کھانے کی میز پر شراب کے دھبے پڑے ہوئے تھے اور پلیٹیں، جام اور بوتلیں بکھری ہوئی تھیں، یہ میز گویا پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ ایک عظیم‌الشان اور عجیب و غریب دعوت میں اچانک بھگدڑ مچ گئی ہے۔

گاڑیوں کے چاروں طرف اور بھی زیادہ نفرت‌خیز ہنگامہ تھا: سہمے ہوئے گھوڑے ہنہنا اور بدک رہے تھے۔ گھوڑے لگام توڑ کر بھاگنے کو بےتاب تھے، پہیوں میں پہیئے پھنسے ہوئے تھے اور دھرے چٹخ رہے تھے۔ انجنیر اپنے اپنے کوچوان کو پکار رہے تھے اور کوچوان ایک دوسرے سے دست‌وگریبان

تھے۔ کچھ ایسا منظر تھا جیسے رات کے وقت کہیں بے طرح آگ لگ جانے سے قیامت سی مچ گئی ہو۔ کہیں سے ایک چیخ ابھری — شاید کوئی کچل گیا تھا اور کون جانے کچل کر ختم ہی ہو گیا ہو۔

بوبروف کو میتروفان کا کچھ پتہ نہ تھا۔ ایک دو دفعہ تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ گاڑیوں کے انبار سے اس کے کوچوان نے جواباً اسے پکارا۔ لیکن وہاں تک پہنچنا ناممکن تھا کیونکہ ہجوم ہر پل بڑھ رہا تھا۔

اچانک مجمع کے سروں پر پیرافین کی ایک دیوپیکر مشعل جل اٹھی۔ ''راستے سے ہٹو! حضرات خواتین، پیچھے رہئے! راستے سے ہٹئے!،، کا شور بلند ہوا۔ انسانوں کا جم‌غفیر خود بخود مستقل پیچھے ہٹ رہا تھا، اچانک اس ہجوم نے بوبروف کو پیچھے دھکیل دیا۔ وہ گرتے گرتے بچا اور ایک گاڑی کے عقب اور دوسرے کے بم کے بیچ میں دب کے رہ گیا۔ وہاں سے اس نے دیکھا کہ گاڑیوں کے درمیان پلک جھپکتے چوڑاسا راستہ بنا اور کواشنین گاڑی میں بیٹھا ہوا گزرتا چلا گیا۔ گاڑی پر لگی ہوئی مشعل کے تھرتھراتے ہوئے شعلے کواشنین کے تنومند جسم پر خون جیسی دھکتی ہوئی بھیانک روشنی پھینک رہے تھے۔

مجمع چاروں طرف سے کچلا ہوا تھا اور تکلیف، خوف اور غصے سے دیوانہ سا ہو رہا تھا اور گاڑی کے

گرد چنگھاڑ رہا تھا۔ بوبروف کو لگا کہ اس کی کنپٹیاں دھڑک رہی ھیں۔ لمحے بھر کو اسے ایسا محسوس ہوا کہ یہ کواشنین نہیں ھے بلکہ کوئی ایسا خوفناک اور نفرت‌خیز خونی دیوتا ھے جو مذہبی مظاھروں کے وقت گاڑی میں بیٹھ کر نکلتا ھے تو مذھب کے دیوانے جوش جنوں کے عالم میں اس کی گاڑی کے نیچے آکر جان دے دیتے ھیں۔ بوبروف غصے سے کانپ اٹھا۔

کواشنین کی گاڑی گزرنے کے بعد دھکاپیلی کچھ کم ھوئی تو بوبروف نے مڑکر دیکھا کہ اس کی کمر میں اس کی اپنی ھی گاڑی کا بم گڑا ھوا تھا۔ میتروفان کوچ بکس کے پاس کھڑا مشعل جلا رہا تھا۔

''میتروفان، جلدی کرو، مل چلو!،، اس نے گاڑی میں بیٹھتے ھوئے آواز لگائی۔ ''ھمیں دس منٹ کے اندر اندر وھاں پہنچنا ھے، سن رہے ھو تم؟،،

''جی سرکار،، میتروفان نے بےدلی سے کہا۔

وہ گاڑی کا چکر لگاکر دائیں طرف سے کوچ‌بکس پر بیٹھا۔ اچھا کوچوان ھمیشہ اسی طرح سوار ھوتا ھے۔ اس نے لگام تھام لی۔

''گھوڑے دم توڑ دیں تو مجھے الزام نہ دینا، مالک،، اس نے ھلکے سے سڑتے ھوئے کہا۔

''اونہہ بلا سے!،،

میتروفان نے بہت مشکل اور کمال احتیاط سے گاڑیوں اور گھوڑوں کے طوفان میں راستہ بنایا اور جنگل کی تنگ سڑک پر پہنچ کر گھوڑوں کو ایڑ لگائی۔ گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے۔ گاڑی سڑک تک پھیلی ہوئی لمبی لمبی جڑوں پر ڈگمگا رہی تھی اور اس طرح دائیں بائیں جھوم رہی تھی کہ کوچوان اور مسافر دونوں کیلئے خود کو سنبھالنا مشکل تھا۔

مشعل کا سرخ شعلہ تڑپ تڑپ کر ناچ رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ درختوں کے لمبے لمبے عجیب و غریب سائے گاڑی کے گرد تھرتھرا رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے لمبے دبلے اور دھندلے سے بھوتوں کا ایک جم غفیر عجیب مضحکہ‌خیز ناچ ناچتا ہوا گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا ہو۔ کبھی کبھی بھوت گھوڑے کے برابر پہنچ جاتے اور تب ان کے جسم بالکل چھوٹے ہو جاتے۔ گاڑی دوڑتی رہتی اور وہ زمین پر گرگرکر سکڑتے اور بوبروف کے پیچھے تاریکی میں کھو جاتے۔ لمحے بھر کو وہ جھنڈ میں کودتے اور پھر لپک کر نظروں کے سامنے آجاتے اور گاڑی کے ساتھ بھاگنے لگتے۔ کبھی ان کی قطار سرسراتی ہوئی بھاگنے لگتی اور کبھی وہ چونک اٹھتے جیسے آپس میں سرگوشی کر رہے ہوں۔ گھنی جھاڑیوں کی شاخیں نازک کلائیوں کی طرح سڑک پر پھیلی ہوئی تھیں۔ کئی دفعہ وہ میتروفان اور بوبروف کے چہروں پر تھپڑ مارتی ہوئی گزر گئیں۔

ان کی گاڑی جنگل سے نکل آئی ۔ گھوڑے چھپ چھپ کرتے ہوئے تڑپ کر ایک چھوٹے سے تالاب سے گزرے تو تالاب میں مشعل کے شعلے کا عکس لپکا اور ٹکڑے ٹکڑے ہوکر بکھر گیا ۔ اچانک ڈھلوان پہاڑی کی بلندی پر پہنچ کر انھوں نے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑا دیا ۔ نظروں کے سامنے سیاہ اور اداس کھیت پھیلے ہوئے تھے ۔

''میتروفان، جلدی کرو، ورنہ ہم وقت پر نہیں پہنچ سکتے !،، بوبروف بےچین ہوکر چلایا حالانکہ گاڑی سرپٹ دوڑ رہی تھی ۔ میتروفان اپنی بھاری بھرکم آواز میں کچھ بڑبڑایا اور اس نے فیروے کے ہنٹر لگایا جو پہلے ہی سرپٹ دوڑ رہا تھا ۔ کوچوان حیران تھا کہ اس کے مالک کو کیا ہو گیا ہے ۔ وہ تو گھوڑوں کا اتنا شیدائی تھا کہ دن رات ان کا خیال کرتا تھا ۔

افق پر تیرتے ہوئے بادل کے چند ٹکڑوں پر بےکراں آگ کا عکس تھرتھرا رہا تھا ۔ بوبروف نے دھکتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا ۔ اس کے دل میں کینہ بھری مسرت کی لہر دوڑ گئی ۔ اندرئیآس کے بےدرد اور منہ پھٹ ٹوسٹ نے بوبروف کی آنکھیں کھول دی تھیں ۔ اب وہ خوب سمجھتا تھا کہ گذشتہ شام نینا کی سردمہری، مزورکا کے دوران میں اس کی ماں کی بدتمیزی اور سویژیفسکی اور کواشنین کی اس قدر گہری یاری کی وجہ کیا ہے ۔ اسے وہ سب افواہیں

اور گپیں یاد آگئیں جو اس نے مل میں کواشنین اور نینا کے معاشقے کے بارے میں سنی تھیں۔ ''بہت اچھی سزا ملی اس لال بالوں والے شیطان کو!،، وہ بڑبڑایا۔ وہ نفرت کی آگ میں اس طرح جل رہا تھا اور اسے اپنی بےعزتی کا احساس اس قدر شدید تھا کہ اس کا حلق خشک ہو گیا۔ ''کاش اس وقت وہ مجھے مل جائے۔ میں اس کے رنگ میں ایسا بھنگ ملاؤں کہ یاد کرے۔ نوجوان جسموں کا ذلیل خریدار، سونے میں سنڈھا ہوا گندا اور موٹا تھیلا۔ میں اس کی تانبے جیسی پیشانی پر ہمیشہ ہمیشہ کو نشان چھوڑ دوں گا!،،

اس نے اتنی شراب پی تھی مگر بدمست نہ ہو سکا۔ البتہ اس کی رگوں میں بلا کی طاقت آگئی تھی اور کچھ کر ڈالنے کی ایک عجیب مریضانہ اور اضطراری خواہش دل میں بیدار ہو گئی تھی۔ وہ بےطرح کانپ رہا تھا۔ اس کے دانت بج رہے تھے اور دماغ بہت تیزی سے اور الجھے ہوئے انداز سے کام کر رہا تھا، مختصر یہ کہ شدید بخار کا سا عالم تھا۔ وہ بےاختیار زور زور سے بولتا کراھتا اور بے تحاشہ ھنستا رھا، وہ ھنستا تو اس کا بدن کانپ اٹھتا اور اس کی مٹھیاں خودبخود بھنچ جاتیں۔

''آپ تو بیمار معلوم ہو رہے ہیں، مالک۔ کیوں نہ ہم گھر چلے چلیں؟،، میتروفان نے عاجزی سے کہا۔

بوبروف کا پارہ چڑھ گیا۔

"خاموش رہو، بے وقوف!"، اس نے بیٹھی ہوئی سی آواز میں کہا۔ "بڑھے چلو!"

تھوڑی دیر بعد انہوں نے ایک پہاڑی سے دیکھا کہ پوری مل کچھ دودھیا کچھ گلابی سے دھوئیں میں لپٹی ہوئی ہے۔ اس سے آگے ایندھن کے گودام آگ کا شعلہ بنے ہوئے تھے۔ آگ کے دھکتے ہوئے پس منظر میں چھوٹے چھوٹے سیاہ انسانی جسموں کا اژدہام ادھر سے ادھر دوڑ رہا تھا۔ آگ میں جلتے ہوئے خشک ایندھن کے تڑخنے کی آواز دور دور تک سنائی دے رہی تھی۔ بھٹیوں اور چولہوں کے گول گول مینارے پل بھر کو جھلملاتے اور تاریکی میں کھو جاتے۔ چوک کے بڑے تالاب کے مٹیالے پانی میں آگ کے دھکتے ہوئے سرخ عکس نے بڑی خوفناک چمک پیدا کر دی تھی۔ تالاب کا اونچا سا بند ان گنت انسانی جسموں کی سیاہ چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا مجمع دور سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس میں ابال آ رہا ہو۔ اس چھوٹی سی جگہ میں گھٹتی ہوئی ناقابل عبور انسانی دیوار سے ایک عجیب مبہم مبہم اور منحوس سا شور اٹھ رہا تھا۔

"ابے کہاں لئے جا رہا ہے، احمق! سور کے بچے، نظر نہیں آتا لوگ کھڑے ہیں؟"، سامنے سڑک سے چیخنے کی آواز آئی اور دیکھتے دیکھتے سڑک پر ایک

لمبا سا داڑھی والا شخص کچھ اس طرح نمودار ہوا جیسے اچانک گھوڑے کے سموں کے نیچے سے نکل پڑا ہو ۔ اس کا سر ٹوپی کی قید سے آزاد تھا اور اس کے چاروں طرف سفید چیتھڑے لپٹے ہوئے تھے ۔

"بڑھے چلو، میتروفان!"، بوبروف نے آواز لگائی۔

"کسی نے آگ لگا دی ہے، مالک"، میتروفان کی کانپتی ہوئی آواز آئی ۔

لمحے بھر بعد پیچھے سے پتھر پھینکنے کی سنسنی خیز آواز آئی ۔ بوبروف کی دائیں کنپٹی کے ذرا اوپر درد کی شدید ٹیس اٹھی ۔ اس نے کنپٹی چھو کر ہاتھ ہٹایا تو وہ گرم گرم خون میں تر تھا ۔

گاڑی سرپٹ دوڑ رہی تھی۔ آگ کی چمک تیزتر ہوتی چلی گئی۔ گھوڑے کے لمبے لمبے سائے سڑک کے ایک کنارے سے دوسرے تک دوڑتے رہے۔ بوبروف کو بار بار ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی انتہائی ڈھلوان جگہ دوڑ رہا ہو ۔ اسے لگ رہا تھا کہ عنقریب وہ خود، اس کا گھوڑا اور سب کچھ کھائی میں گر جائے گا۔ اس کے دل و دماغ میں اتنی صلاحیت بھی نہیں تھی کہ وہ اپنی حدود کو سمجھ سکتا ۔ وہ اس جگہ کو بھی نہ پہچان سکا جہاں سے وہ گزر رہا تھا۔ اچانک گھوڑے ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔

"ارے میتروفان، ارے بھئی، ٹھیر کیوں گئے؟"، بوبروف زچ ہو کر چلایا ۔

"بھلا آدمی سامنے ہوں تو چلاؤں کیسے؟"
میتروفان نے دبے دبے غصے کے ساتھ جواب دیا۔
بوبروف نے سپیدۂ سحر کی مدھم مدھم روشنی میں جھانکنے کی لاکھ کوشش کی لیکن اسے ایک ناھموار سیاہ دیوار اور اس کے اوپر شعلہ بار آسمان کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔
"ارے لعنتی، آدمی کیسے، کیا کہہ رہے ہو؟"
بوبروف اتر کر سفید سفید پھین میں تر گھوڑوں کا طواف کرنے لگا۔
گھوڑوں سے چند قدم آگے بڑھتے ھی اسے اندازہ ھوا کہ جسے وہ سیاہ دیوار سمجھ رھا تھا وہ تو مزدوروں کا ایک بہت بڑا مجمع تھا جس نے سڑک پر حملہ کر دیا تھا اور جو آھستہ آھستہ خاموشی سے آگے بڑھ رھا تھا۔ بوبروف کے قدم بےاختیار مزدوروں کے ساتھ ساتھ اٹھنے لگے، وہ چالیس پچاس قدم ان کے پیچھے پیچھے چلا اور پھر میتروفان کی طرف مڑ گیا تاکہ کسی اور راستے سے مل تک پہنچ سکے۔ لیکن میتروفان اور گھوڑے وھاں سے جا چکے تھے۔ بوبروف سمجھ نہ سکا کہ میتروفان اس کی تلاش میں ادھر ادھر ھو گیا یا وہ خود بھٹک گیا تھا ۔ اس نے کوچوان کو پکارنا شروع کیا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے سوچا کہ چلو ان مزدوروں کی طرف لپکا جائے جن کے ساتھ وہ پل بھر پہلے تک چل رھا تھا۔ وہ اپنے خیال میں اسی سمت میں دوڑنے لگا۔ عجیب بات ھے، ایسا لگ

رہا تھا جیسے مزدور اچانک ہوا میں غائب ہو گئے ہوں۔ بوبروف ان تک پہنچنے کے بجائے ایک نیچی سی چوبی باڑھ سے جا ٹکرایا۔

دائیں بائیں کسی طرف اس باڑھ کا اورچھور نہ تھا۔ بوبروف اس کے اوپر سے کودکر ایک لمبی سی ڈھلوان پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ یہ پہاڑی اونچی اونچی گھنی جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ بہہ رہا تھا اور زبان خشک ہوکر ایسی سخت ہو گئی تھی جیسے لکڑی کا ٹکڑا ہو۔ ہر سانس کے ساتھ سینے میں درد کی شدید ٹیس اٹھ رہی تھی اور سر میں خون بےطرح ابال کھا رہا تھا۔ زخمی کنپٹی کی تکلیف ناقابل برداشت تھی۔

چڑھائی کا کوئی اورچھور نہ تھا۔ اس کے دل پر تھکن اور نراشا کے بادل چھا گئے۔ پھر بھی وہ کانٹےدار جھاڑیوں کو پکڑتا ہوا گرتا پڑتا چڑھتا رہا۔ اس کے گھٹنے لہو لہان ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی تو اسے ایسا لگتا کہ وہ حسب معمول کوئی خوفناک مضمحل و بیمار خواب دیکھ رہا ہے۔ یہ ھل چل، سڑک پر یوں بھٹکتے پھرنا، یہ بیکراں چڑھائی غرض یہ سب اتنے ھی غیرمتوقع، اتنے ھی بےمعنی اور اتنے ھی تکلیف‌دہ تھے جتنے اس کے ڈراؤنے خواب۔

اور آخرکار چڑھائی ختم ہو گئی اور تب بوبروف کو پتہ چلا کہ وہ ریل کے کنارے کھڑا ہے۔ کل،

مذہبی رسوم کے وقت یہاں اوپر ہی سے تو فوٹوگرافر نے انجنیروں کے گروہ اور مزدوروں کی تصویریں لی تھیں۔ وہ تھکن سے چور چور ریل کی پٹری پر بیٹھ گیا۔ پل بھر بعد اس کے ساتھ ایک عجیب واقعہ ہوا، اس کی ٹانگیں بالکل بےجان ہو گئیں، سینے اور معدے میں عجیب تکلیف‌دہ سی جلن ہونے لگی اور پیشانی اور رخسار برف کی طرح ٹھنڈے ہو گئے۔ اور پھر اس کی نظروں کے سامنے سے ہر چیز بھاگتی ہوئی کہیں غائب ہو گئی جیسے کسی اتھاہ گہرائی میں ڈوب گئی ہو۔

اسے تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہوش آیا۔ وہاں سے نیچے دیوھیکل مل اور مل کا مسلسل شور دن رات چالو رہتا تھا لیکن اس وقت وہاں بڑی بھیانک خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وہ پاؤں گھسیٹتا بھٹی کی طرف چل پڑا۔ اس کا سر ایسا بھاری ہو رہا تھا کہ سنبھالے نہ سنبھلے اور زخمی کنپٹی میں ہر قدم پر درد کی ناقابل برداشت ٹیس اٹھ رہی تھی۔ اس نے زخم کو چھوا تو اس کی انگلیوں پر پھر گرم گرم خون لگ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر بھی خون تھا اور منہ میں بھی۔ اسے خون کا نمکین اور چکٹا چکٹا مزا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ابھی تک پوری طرح ہوش میں نہیں تھا۔ اس نے گزشتہ واقعے کو یاد کرنے اور سوچنے سمجھنے کی کوشش کی تو اس کا سر

درد سے پھٹنے لگا۔ اس کی روح میں گہری اداسی، مایوسی اور غصے کا طوفان سا اٹھ رہا تھا۔

صبح قریب تھی۔ دھرتی، آکاش، مرجھائی ہوئی زرد گھاس اور سڑک کے دونوں طرف پڑے ہوئے پتھروں کے بےرنگ انبار غرض ہر چیز دھندلی دھندلی، سرد اور بھیگی بھیگی سی نظر آ رہی تھی۔ بوبروف بےمقصد اور بےسبب مل کی سنسان عمارتوں میں بھٹکتا رہا۔ وہ خودبخود زور زور سے بول رہا تھا۔ شدید ذہنی صدمے کے بعد اکثر لوگوں کا یہی حال ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے منتشر خیالات کو سمیٹنے اور ان میں کوئی منظم سلسلہ پیدا کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا۔

"ارے خدا کےلئے کوئی مجھے بتاؤ آخر میں کیا کروں، خدا کے لئے کچھ کہو"، اس نے جذباتی ہوکر کسی ایسی اجنبی ہستی سے کہا جو خود اس کے اندر چھپی ہوئی تھی۔ "اف کتنا تکلیف‌دہ ہے یہ واقعہ! کتنا دردناک! کس قدر ناقابل برداشت حد تک تکلیف‌دہ! اف میں جان دے دوں‌گا! نہیں، میں یہ دکھ برداشت نہیں کر سکتا!"

لیکن اس اجنبی ہستی نے روح کی گہرائیوں سے باآواز بلند جواب دیا، اس جواب میں طنز کی چاشنی تھی: "یار، چھوڑو بھی، تم خودکشی نہیں کر سکتے۔ بیکار باتیں کرنے سے کیا فائدہ؟ تمھیں زندگی سے اتنی محبت ہے کہ تم اپنے وجود کو ختم نہیں کرسکتے،

اس کام کے لئے تم میں حوصلہ نہیں ہے، تمھارے بس کی بات نہیں ہے یہ۔ جسمانی اذیت سے تمھاری روح کانپتی ہے۔ تم تو بس دن رات سوچا کرتے ہو!''

''تو پھر کیا کروں؟ کیا کرنا چاہئے مجھے؟'' بوبروف نے ہاتھ ملتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''اف وہ اتنی نازک، اتنی پاکیزہ ہے — میری نینا! اس کے سوا دنیا میں میرا کوئی بھی تو نہ تھا اور اچانک — اف کس قدر نفرت‌خیز ہے یہ خیال! اس کی بھرپور جوانی اور اس کا کنوارا جسم فروخت ہو جائے!'' ''ختم کرو یہ تصنع — پرانے طربیہ ڈراموں کی سی یہ اونچی اونچی باتیں بنانے سے کیا حاصل؟'' دوسری ہستی نے چوٹ کی۔ ''کواشنین سے اتنی نفرت ہے تو جاکر اسے قتل کیوں نہیں کر دیتے!''

''میں ضرور کروں‌گا!'' بوبروف نے چیخ کر گھونسے تانے۔ ''ہاں ضرور! اب وہ مخلص اور ایماندار لوگوں کی زندگی کو اپنے گھناؤنے سانس سے زھرآلود نہیں کرےگا! میں اسے مار ڈالوں‌گا!''

لیکن دوسری ہستی نے انتہائی طنزیہ لہجے میں کہا: ''نہیں! تم یہ نہ کر سکتے! اسے نہیں مار وگے۔ تم خود اچھی طرح جانتے ہو کہ تم یہ نہ کر سکتے! ہرگز نہیں ماروگے۔ تمھارے دل میں نہ اتنی ہمت ہے نہ قوت فیصلہ کہ تم یہ قدم اٹھا سکو۔ کل تک تم پھر ہوش‌مند ہو جاؤگے اور کمزور بھی پڑ جاؤگے، پھر ہوش‌وخرد کا دامن تھام لوگے۔''

اس خوفناک ذهنی هیجان اور باطنی انتشار کے عالم میں بعض روشن لمحے بھی آئے، ایسے لمحے جب بوبروف سوچتا کہ آخر اسے کیا ہو گیا ھے، وہ یہاں کہاں آگیا، اور اسے کیا کرنا چاھئے۔ اسے کچھ نہ کچھ کرنا تھا ــ کوئی بڑا اور اهم کارنامہ۔ لیکن وہ بالکل بھول چکا تھا کہ وہ کارنامہ کیا ھے۔ وہ یاد کرنے کی پوری کوشش کر رھا تھا اور درد کی شدت سے برے برے منہ بنا رھا تھا۔ ایسے ھی ایک لمحے میں اس نے دیکھا کہ وہ بھٹی جھونکنےوالے غار کے کنارے کھڑا ھے، اسے وہ تمام باتیں اور ان کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل یاد آنے لگی جو اس نے ٹھیک اسی جگہ کھڑے ھوکر حال میں ڈاکٹر سے کی تھیں۔

بھٹی جھونکنےوالا ایک مزدور بھی نیچے موجود نہ تھا۔ وہ سب جا چکے تھے۔ بائلر کب کے ٹھنڈے پڑے تھے۔ صرف دائیں بائیں کونے کی دو بھٹیوں میں ابھی تک کوئلے کے مرے مرے سے شعلے ٹمٹما رھے تھے۔ بوبروف کے دماغ میں اچانک ایک وحشیانہ خیال آ بھرا۔ اس نے زمین پر بیٹھ کر غار میں پاؤں لٹکائے اور ھاتھوں کے بل جھک کر اندر کود گیا۔

کوئلے کے ڈھیر سے ایک کرچھا جھانک رھا تھا۔ اس نے لپک کر کرچھا اٹھایا اور انتہائی تیزی سے دونوں بھٹیوں میں کوئلہ جھونکنے لگا۔ دو چار منٹ بعد بھٹیوں میں سفید سفید شعلے چنگھاڑنے

اور بائلر کا پانی ابلنے لگا۔ بوبروف کرچھا بھربھر کر کوئلہ جھونکتا رہا۔ وہ کوئلہ جھونکتا رہا اور اس کے چہرے پر معنی‌خیز مسکراہٹ کھیلتی رہی۔ وہ کسی ان دیکھی ہستی کو اشارے کر رہا تھا اور بےمعنی جملے بول رہا تھا۔ راستے میں اس کے ذہن میں انتقام کے ایک بخار اور خوفناک جذبے نے سر اٹھایا تھا، اب یہ جذبہ اس کی روح و دل پر چھاتا چلا گیا۔ اس نے شعلے میں دھکتے ہوئے بائلر کے سنسناتے ہوئے وسیع و عریض پیکر کو دیکھا اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے یہ بائلر کوئی زندہ اور قابل نفرت ہستی ہو۔

اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ ناپنےوالے آلے میں بڑی تیزی سے پانی کم ہورہا تھا۔ بائلر کی کھنکھناہٹ اور بھٹیوں کی چنگھاڑ بڑھتی اور زیادہ سے زیادہ خوفناک ہوتی چلی گئی۔

لیکن اس غیرمعمولی محنت نے بہت جلد بوبروف کو نڈھال کر دیا۔ اس کی کنپٹیوں کی رگوں میں خون ابل رہا تھا اور گالوں پر خون کے قطرے پھسل رہے تھے۔ اس کی وحشیانہ قوت کا خزانہ ختم ہو رہا تھا۔ اس کی روح میں چھپے ہوئے اجنبی نے بڑے طنزیہ انداز میں باآواز بلند کہا:

”بس ایک قدم کی کسر ہے! لیکن تم وہ قدم نہیں اٹھاؤگے۔ نہیں، تم ہرگز نہیں اٹھاؤگے وہ قدم۔ ارے میاں، یہ ہنگامہ اس قدر مضحکہ‌خیز ہے کہ کل تم

خود کو یقین دلاتے نظر آؤ گے کہ تم نے کبھی بائلر اڑانے کا ارادہ بھی نہیں کیا تھا۔ ،،

* * *

بوبروف مل کے اسپتال میں داخل ہوا تو بڑا سا دھندلا دھندلا سورج افق پر ابھر چکا تھا۔

ڈاکٹر گولڈبرگ لمحے بھر پہلے زخمیوں اور لولے لنگڑوں کی مرہم پٹی سے فارغ ہوا تھا۔ اس وقت وہ پیتل کے تسلے میں ہاتھ دھو رہا تھا۔ اس کا مددگار تولیہ تھامے قریب کھڑا تھا۔ بوبروف کو دیکھ کر ڈاکٹر حیران رہ گیا۔

''اندرئی ایلیچ ، تمھیں کیا ہوا؟ یہ کیا حالت بنی ہوئی ہے تمھاری!،، اس نے گھبرا کر کہا۔

واقعی بوبروف اس وقت بڑا بھیانک لگ رہا تھا۔ زرد چہرے پر جمے ہوئے خون کے سیاہ دھبے کوئلے کی گرد میں اٹ گئے تھے۔ بازوؤں اور گھٹنوں پر پانی میں بھیگے ہوئے کپڑوں کے چیتھڑے لٹکے ہوئے تھے اور پریشان بال چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔

''خدا کے لئے کچھ بولو، ارے بھئی، کچھ تو کہو ! کیا ہوا آخر ؟،، ڈاکٹر نے جلدی جلدی ہاتھ پونچھے اور بوبروف کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، ڈاکٹر، کوئی خاص بات نہیں ہے،،

بوبروف کراہ اٹھا۔ ”ڈاکٹر، خدا کے لئے تھوڑا سا مورفیا دے دو۔ جلدی کرو، تھوڑا سا مورفیا ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا! اب یہ اذیت سہی نہیں جاتی، ڈاکٹر!“

ڈاکٹر گولڈبرگ بوبروف کا بازو تھام کر اسے جلدی سے دوسرے کمرے میں لے گیا اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

”دوست“ اس نے کہا ”میں سمجھتا ہوں تمہیں کیا دکھ ہے۔ یقین جانو تمہارے خیال سے میرا دل دکھتا ہے۔ میں تمہاری ہر ممکن مدد کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن میرے عزیز دوست!“ اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگ گئی۔ ”میرے پیارے اندرئی ایلیچ، کیا مارفیا کے بغیر کسی طرح کام نہیں چلا سکتے؟ ذرا سوچو اس بےہودہ عادت پر قابو پانے کےلئے تم نے کیسے کیسے جتن کئے تھے! اس وقت میں نے تمہیں ایک انجکشن بھی لگایا تو قیامت ہو جائےگی، پھر تم کبھی — تم سمجھ رہے ہو نا؟ — تم پھر کبھی اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکوگے۔“

بوبروف چمڑے کے بڑے سے صوفے پر اوندھے منہ پڑا تھا۔

”میری بلا سے، ڈاکٹر“ وہ دانت بھینچے بھینچے بڑبڑایا اور سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔ ”مجھے ذرہ برابر پروا نہیں، ڈاکٹر۔ اب مجھ سے یہ دکھ برداشت نہیں ہوتا۔ نہیں ہو سکتا۔“

ڈاکٹر گولڈبرگ نے ٹھنڈا سانس لیا اور کندھے جھٹک کر ایک الماری سے انجکشن کی پچکاری نکالی۔ پانچ سنٹ بعد بوبروف صوفے پر بےخبر سو رہا تھا۔ اس کے زرد چہرے پر شاداں مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔ اف یہ چہرہ ایک رات میں کس طرح ستَ گیا تھا۔ ڈاکٹر گولڈبرگ بہت احتیاط سے سوئے ہوئے بوبروف کے سر کا زخم دھونے لگا۔

۱۸۹۶ء

اولیسیا

۱

میرا ملازم، باورچی اور شکار کا ساتھی جنگلوں کا رکھوالا یرمولا لکڑی کے گٹھے کے بوجھ تلے جھکا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے گٹھا زمین پر پٹخا اور پھونکیں مارمار کر ٹھٹھری ہوئی انگلیوں کو گرم کرنے لگا۔

"ہوا خاصی تیز ہے، مالک،" وہ آتش‌دان کے دروازے کے آگے زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ "آتش‌دان اچھی طرح گرم کرنا چاہئے۔ آپ کا آگ جلانے‌والا استعمال کر لوں؟"

"تو پھر کل خرگوش کے شکار کو نہ جائیں، کیوں؟ تمھارا کیا خیال ہے، یرمولا؟"

"اجی کوئی امید نہیں ہے۔ ذرا سنئے تو سہی۔ کیسی ہوا چل رہی ہے۔ اجی ایسے میں تو خرگوش بھی چھپے پڑے ہوں‌گے۔ مجال ہے جو کل پنجوں کا ایک نشان بھی نظر آ جائے۔"

قسمت کا کھیل دیکھئے کہ ایک دفعہ مجھے ایک چھوٹے سے گاؤں میں چھ ماہ کی طویل مدت

گزارنے کا اتفاق ہوا۔ یہ پولیسئے* کی سرحد کے قریب والنسک کے صوبے میں دنیا زمانے سے کٹا ہوا گاؤں تھا۔ یہاں میرے پاس وقت گزاری کا واحد طریقہ، اکلوتا مشغلہ تھا شکار۔ سچی بات یہ ہے جب مجھ سے دیہات جانے کی درخواست کی گئی تو مجھے دور دور تک خیال نہ تھا کہ گاؤں کی زندگی ایسی ناقابل برداشت، ایسی بےجان اور بےکیف ہوگی۔ سو میں خوشی خوشی جانے کو تیار ہو گیا۔ ''ہرے بھرے جنگل، دنیا سے الگ تھلگ، ایک خاموش کنج، سیدھے سادھے انداز، بھولے بھالے کردار، فطرت اپنے پورے شباب پر ہوگی ''، میں نے ریل میں بیٹھ کر سوچا۔ ''بالکل اجنبی، بالکل نئے لوگ جن کے رواج انوکھے ہوں گے اور زبان نئی اور اجنبی — اور نجانے کیسی کیسی شاعرانہ اور رومانی داستانوں، کیسے کیسے گیتوں سے پر ہوگی یہ زندگی۔ ''، آپ کو معلوم ہے (بات چھڑ ہی گئی ہے تو لاؤ آج دل کھول کر رکھ دوں آپ کے سامنے) اس وقت تک ایک چھوٹے سے اخبار میں میرا ایک افسانہ چھپ چکا تھا جس میں دو قتل اور ایک خودکشی کی داستان پیش کی تھی اور میرا تو، بھئی، شروع سے یہ اصول تھا کہ ادیب کو رسم و رواج کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

مگر پریبروڈ کے کسان تو جیسے قسم کھائے

---

* جنگلی علاقہ۔ (ایڈیٹر)

بیٹھے تھے کہ نہ منہ سے بولیں گے نہ سر سے کھیلیں گے، یا پھر میں ہی ملنے جلنے کے فن سے واقف نہ تھا۔ بہرحال میرے اور ان کے تعلقات رسمی صاحب سلامت سے آگے نہ بڑھ سکے۔ وہ دور ہی سے مجھے دیکھ کر ٹوپیاں اتارتے اور قریب آنے پر بے جان طریقے سے بدبداتے ''اللہ کی رحم۔'' یہ تھا مخفف اس جملے کا ''اللہ کی رحمت ہو!'' اور جب میں ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کی کوشش کرتا تو وہ بڑی حیرت سے مجھے تکتے بار بار میرے ھاتھوں کو بوسہ دیتے اور میرے آسان سے آسان سوال کو سمجھنے سے انکار کر دیتے، ھاتھ کو بوسہ دینے کی یہ قدیم رسم پولینڈ کے کسان غلامی دور سے چلی آ رھی تھی۔

میرے پاس جتنی کتابیں تھیں وہ بھی بہت جلد میں نے پڑھ ڈالیں اور آخر، بیکاری سے گھبرا کر میں نے مقامی دانش مندوں سے میل جول بڑھانا شروع کیا — شروع شروع میں خاصی کوفت محسوس ھوئی مگر میں نے اپنی کوششیں جاری رکھیں — ان لوگوں میں پولینڈ کا ایک پادری تھا جو میرے مکان سے دس میل کے فاصلے پر رھتا تھا، اس کا آرگن نواز، مقامی اریادنک* اور قریب کی ایک جاگیر کا ایک کلرک تھا (جو سابق میں فوجی افسر تھا) — یہ سب تھا مگر کچھ بات نہ بنی۔

---

* دیہی پولیس افسر۔ (ایڈیٹر)

اس کے بعد میں نے پریبروڈ کے باسیوں کو اپنی نیم‌حکیمی کا شکار بنانا شروع کیا۔ میرے پاس کسٹر ائیل، کاربولک ایسڈ، بورک ایسڈ اور آیوڈین موجود تھی۔ مگر اپنی کم علمی کے ساتھ ساتھ ایک مصیبت اور تھی، وہ یہ کہ مرض کی تشخیص کرنا میرے بس سے باھر تھا کیونکہ میرے سارے مریضوں کو ایک ھی روگ تھا جو ھے یہی کہہ رھا ھے ”اندر تکلیف ھوتی ھے“، ”کھایا پیا نہیں جاتا“۔

مثلاً کوئی بوڑھی عورت، گھبرائی گھبرائی سی آتی، کلمےوالی انگلی سے ناک پونچھتی، گریبان میں ھاتھ ڈال کر دو تین انڈے نکالتی اور مجھے اس کی بھوری بھوری جلد کی ایک جھلک نظر آنے لگتی۔ وہ انڈوں کا تحفہ میری میز پر رکھتی، میرا ھاتھ تھام کر بوسہ دینے کیلئے آگے بڑھتی اور میں ھاتھ کھینچ لیتا اور اس سے درخواست کرتا ”ارے نہیں، دادی، نہیں، یہ نہ کرو۔ میں پادری نہیں ھوں، اس کی کوئی ضرورت نہیں ھے، دادی، کہو کیا تکلیف ھے تمھیں؟“

”اندر تکلیف ھوتی ھے، مالک، ٹھیک یہاں، اندر — نہ کچھ کھایا جاتا ھے نہ پیا جاتا ھے۔“

”کب سے ھے یہ حال؟“

”تو بھلا میں کیا جانوں؟“ وہ الٹا مجھ سے پوچھنے لگتی۔ ”بس آگ سی دھکتی رھتی ھے۔ کھایا پیا نہیں جاتا۔“

اور اس کے بعد لاکھ سر مارنے پر بھی، اس کی بیماری کی اور کوئی علامت معلوم کرنے میں کامیابی نہ ہوتی۔

''اجی آپ گھبرائیے نہیں،، ایک دن سابقہ فوجی افسر نے (جو اب کلرک تھا) مشورہ دیا۔ ''کمبخت آپ ہی ٹھیک ہو جائیں گے، کتوں سے بدتر ہیں یہ تو۔ معلوم ہے میں تو لے دے کے بس ایک ایمونیا استعمال کرتا ہوں۔ کوئی کسان آیا۔ 'کیوں کیا بات ہے، کیا چاہئے؟'، میں پوچھتا ہوں۔ 'بیمار ہوں، مالک، وہ کہتا ہے۔ اور میں ایمونیا کی بوتل جھٹ اس کی ناک سے لگا دیتا ہوں۔ 'لو سونگھو! ' اور وہ سونگھتا ہے۔ 'اور سونگھو، اور زور سے!'، میں کہتا ہوں۔ وہ پھر سونگھتا ہے۔ 'کہو کچھ آرام آیا؟'، 'ہاں کچھ آرام تو لگے ہے جی، وہ کہتا ہے۔ 'تو پھر جاؤ، مزے کرو، میں کہتا ہوں۔ ،،

اور جب انھوں نے میرا ہاتھ چومنا شروع کیا تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی (کچھ مریض تو میرے قدموں پر گر کر جوتے چومنے کی کوشش کرنے لگے)۔ اور سہی تو بات یہ ہے کہ یہ لوگ اظہار خلوص اور تشکر کے طور پر ایسا نہیں کرتے بلکہ صدیوں کی غلامی اور ظلم وستم نے ان کے اندر خوشامد کی عادت پیدا کر دی ہے۔ میں کلرک اور اریادنک کو دیکھتا تو حیران رہ جاتا کہ وہ کس قدر اطمینان اور کیسی نخوت سے اپنے سرخ سرخ

دیوهیکل پنجے گاؤں والوں کے لبوں کے سامنے کر دیتے ہیں۔

اب میرے پاس بس ایک ہی صورت تھی کہ شکار سے دل بہلاؤں۔ مگر جنوری کے آخر میں موسم اتنا خراب ہو گیا کہ وہ بھی ناممکن ہو گیا۔ دن بھر انتہائی تیز و تند ہوائیں چلتیں، اور رات کو نرم نرم برف پر سخت برف کی چادر سی جم جاتی اور خرگوش اس پر بھاگتے مگر ان کے کھروں کے نشان نہ بن سکتے۔ گھر میں بند بیٹھے بیٹھے اور چنگھاڑتی ہوئی ہواؤں کا طوفانی نغمہ سنتے سنتے میں زندگی سے عاجز آ گیا۔ آخر میں نے انتہائی ذوق و شوق سے یرسولا کو لکھنا پڑھنا سکھانے کا معصوم اور بے ضرر شغل ڈھونڈ نکالا۔

یہ سلسلہ کچھ عجیب انوکھے انداز سے شروع ہوا۔ ایک دن ایک خط لکھتے لکھتے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے پیچھے کوئی کھڑا ہے۔ میں مڑا تو یرسولا نظر آیا جو درخت کی چھال کے نرم جوتے پہنے حسب معمول بےآواز میرے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے، یرسولا؟" میں نے پوچھا۔

"بس ذرا دیکھ رہا تھا۔ جی چاہتا ہے میں بھی آپ کی طرح، نہیں، نہیں، میرا مطلب ہے آپ کی طرح تو خیر نہیں مگر ..." وہ مجھے مسکراتے دیکھ کر شرمندہ سا ہو گیا اور جلدی سے اپنی بات کی وضاحت

کرنے لگا۔ ''میرا مطلب ہے بس اتا بھر سیکھ لیتا کہ اپنا نام لکھ سکوں۔ ''

''مگر کیوں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ یہاں میں یہ بتا دوں کہ یرمولا پریبروڈ بھر میں سب سے زیادہ غریب اور کاهل کسان سمجھا جاتا تھا۔ اس کو فصل سے اور جنگل کی دیکھ بھال سے جو کچھ آمدنی ہوتی وہ اسے شراب میں اڑا دیتا، اس کی بیلوں کی جوڑی آس پاس کی سب جوڑیوں سے بری تھی۔ اور مجھے ایسا لگا کہ بھلا اسے پڑھنے لکھنے کی کیا ضرورت۔ میں نے پھر کچھ حیران سا ہو کر اس سے پوچھا:

''نام لکھنا سیکھ کر کیا کروگے تم؟''

''بات یہ ہے، مالک'' اس نے انتہائی نرمی سے کہا ''گاؤں بھر میں کسی کو پڑھنا لکھنا نہیں آتا، اور کسی کاغذ پتر پر دستخط کرنے کا سوال آن پڑے یا کسی چکر میں وولوست* جانا پڑ جائے تو کوئی اتنا نہیں کہ بڑھ کے اپنا کام کر سکے۔ مکھیا لوگ مہر لگا دیتے ہیں مگر یہ تو نہیں جانتے کہ کاغذ میں لکھا کیا ہے۔ ایسے میں اگر کوئی شخص اپنے دستخط کرنے لائق ہو جائے تو سبھی کے لئے اچھا ہوگا۔''

یرمولا کو جنگل کی رکھوالی کرتے دیکھ کر بے اختیار منہ سے نکل جاتا — خالہ بلی اور پکوان کی

---

* دیہی ضلع مرکز۔ (ایڈیٹر)

رکھوالی! اس منچلے آوارہ گرد کی بات پر گاؤں والے کان نہ دھرتے۔ لیکن پھر بھی گاؤں والوں کی بھلائی کے لئے اس کے دل میں ایسی لگن تھی کہ میرا دل بھی پگھل گیا۔ میں اسے پڑھانے پر راضی ہو گیا۔ مگر اف! اسے لکھنا پڑھنا سکھانے کی مہم کتنی کٹھن، کتنی دشوار تھی! وہ جنگل کے ہر ہر راستے سے واقف تھا، راہ کے ہر درخت کو جانتا تھا، دن ہو یا رات کہیں بھی پہنچ سکتا تھا۔ اور بھیڑیوں، خرگوشوں اور لومڑیوں کے پاؤں کے نشان دیکھ کر قرب و جوار کے تمام بھیڑیوں، خرگوشوں اور لومڑیوں کے بارے میں بتا سکتا تھا۔ لیکن یہ بات زندگی بھر اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی کہ مثلاً 'م' اور 'الف' ملکر 'ما' کیوں بن جاتے ھیں۔ وہ دس ایک منٹ کسی اسی قسم کے سوال کو لئے بڑے دکھ کے ساتھ سر دھنتا رهتا۔ اس کی الجھی هوئی سیاہ داڑھی، لمبی لمبی مونچھوں سے ڈھکے هوئے سیاہ اور سوکھے مارے چہرے اور انتہائی گہری اور سیاہ آنکھوں کو دیکھ کر اندازہ هوتا کہ وہ کس قدر شدید دماغی محنت کر رہا ہے۔

"چلو، یرمولا، کہو — ما۔ بس تم — ما — کہو" میں اسے بڑھاوا دیتا۔ "کاغذ کو مت تکو، میری طرف دیکھو۔ ھاں یہ بات۔ اب کہو — ما۔"

یرمولا سرد آہ بھرتا اور پنسل میز پر رکھ دیتا

اور انتہائی اداسی اور یقین کے ساتھ کہتا ''نہیں، مجھ سے نہیں کہا جاتا۔''

''مگر کیوں نہیں؟ یہ تو اتنا آسان ہے، میری طرح — ما کہہ دو اور بس۔''

''نہیں، میں نہیں کہہ سکتا، مالک، میں بھول جاتا ہوں۔''

اس کی بےمثال کندذہنی کے سامنے ہر ایک طریقہ، ہر مقابلہ ہار گیا۔ لیکن علم کے لئے اس کی پیاس میں کمی نہیں آئی۔

''بس میں اپنے دستخط کرنا سیکھ لوں''، وہ میری منت کرتا۔ ''مجھے زیادہ نہیں چاہئے، بس اپنا نام — یرمولا پوپروژوک اور کچھ نہیں۔''

اور آخر میں نے اسے معقول طرح سے لکھنا پڑھنا سکھانے کا ارادہ چھوڑ دیا اور اسے بےسمجھے بوجھے اپنے دستخط کرنے کا ڈھنگ سکھانے لگا۔ اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ نیا طریقہ اس کے لئے کہیں زیادہ آسان ثابت ہوا، یہاں تک کہ دوسرا مہینہ ختم ہوتے ہوتے اس نے اپنا دوسرا نام لکھنے کی مہم تقریباً سر کر لی۔ جہاں تک پہلے نام کا سوال ہے تو ہم نے فیصلہ کیا کہ اس کی مشکل آسان کرنے کی خاطر پہلا نام ہم سرے سے چھوڑ ہی دیں گے۔

شام کو آتش‌دان میں ایندھن ڈالنے کے بعد یرمولا بےتابی سے میرے پکارنے کا انتظار کرتا رہتا۔

''چلو، یرمولا، آؤ پڑھائی کریں''، میں کہتا۔

وہ نہایت نیازمندی سے ٹیڑھا ٹیڑھا میز تک آتا اور اس پر کہنیاں ٹکا دیتا، اس کی گندی سیاہ انگلیاں موڑے نہ مڑتیں، وہ جیسے تیسے قلم تھامتا اور بھویں چڑھا کر مجھ سے پوچھتا:

"لکھوں؟"

"لکھو۔"

وہ خاصے اعتماد کے ساتھ پہلا حرف 'پ' لکھتا جسے ہم "تین بند کیوں والا لیٹا ہوا ڈنڈا" کہتے تھے۔ پھر وہ اوپر دیکھتا اور اس کا چہرہ سوالیہ نشان بن جاتا۔

"رک کیوں گئے؟ بھول گئے کیا؟"

"ہاں" وہ جھنجھلا کر سر ہلاتا۔

"عجیب چیز ہو تم بھی! چلو دم والا گولا بناؤ۔"

"یہ بات ہوئی — دم والا! اب مجھے یاد آگیا!" اس کا چہرہ چمک اٹھتا اور وہ بڑی احتیاط سے مڑی ہوئی لمبی دم والے چوہے جیسی شکل بناتا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی سے اپنی محنت کو سراہتا۔ ایسا کرتے ہوئے کبھی اس کا سر دائیں طرف جھک جاتا، کبھی بائیں طرف اور آنکھیں مچ جاتیں۔

"کیوں کیا بات ہے؟ چلو چلو، آگے بڑھو۔"

"پل بھر ٹھیرو، مالک، بس ایک پل دم لو۔"

دو ایک منٹ وہ سر دھنتا رہتا اور پھر ڈرتے ڈرتے پوچھتا "پہلے ہی جیسا ہے نا یہ بھی؟"

"ہاں، چلو آگے بڑھو۔"

اسی طرح آہستہ آہستہ ہم 'ک' تک پہنچ گئے، اس حرف کو ہم "آنکڑے اور دم‌والی لکڑی" کہتے تھے۔

"جانتے ہو، مالک"، کبھی کبھی وہ بڑے پیار اور فخر سے اپنی محنت کا پھل دیکھتا اور کہتا "اگر میں پانچ چھ مہینے اور پڑھتا رہا تو دستخط کرنے میں خاصہ ماہر ہو جاؤں گا۔ کیوں کیا کہتے ہو؟"

۲

یرمولا آتش‌دان کے سامنے اکڑوں بیٹھا، کوئلے کریدتا رہا اور میں اپنے کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلتا رہا۔ زمین‌دار کی لمبی چوڑی حویلی کے بارہ کمروں میں سے میرے قبضے میں صرف ایک کمرہ تھا جو کسی زمانے میں "بیٹھنے کا کمرہ" ہوگا۔ باقی کمرے مقفل تھے۔ مشجر منڈھا ہوا قدیم فرنیچر، کانسے کے انوکھے نقش و نگار اور اٹھارھویں صدی کی تصویریں گرد میں اٹی ہوئی تھیں۔

حویلی کے باہر ہوا چنگھاڑ رہی تھی جیسے کوئی کانپتا ہوا بوڑھا شیطان چیخ رہا ہو۔ ہوا کی چنگھاڑ کے ساتھ تھوڑے تھوڑے وقفے سے کراہوں، چیخوں اور وحشی قہقہوں کا شور بھی بلند ہونے لگتا۔ رات ہوتے ہوتے برفانی طوفان اور بھی شدید ہو گیا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی مٹھی میں باریک باریک خشک برف بھرکر شیشے پر مار رہا ہو۔ تھوڑی دور پر جنگل مسلسل سائیں سائیں کر رہا تھا اور اس کی سائیں سائیں میں ایک عجیب دبی دبی سی دھمکی تھی۔

خالی کمروں اور چمنیوں میں ہوا کے جھونکے اٹھکھیلیاں کرنے لگتے اور ٹوٹی پھوٹی کھنڈر نما حویلی میں جیسے جان پڑ جاتی اور عجیب عجیب آوازیں پیدا ہونے لگتیں۔ ان آوازوں کو سن کر میرا دل بے اختیار دھک دھک کرنے لگتا۔ دودھ جیسے اجلے ہال میں اداس اداس اور شکستہ سی کراہ گونج اٹھتی — نہ جانے کس کے دل سے نکلی تھی یہ آہ۔ اور پھر کوئی بھاری بھاری قدموں سے دبے پاؤں چلتا اور فرش کے سڑے گلے اور خشک تختے قدموں کے بوجھ تلے چرچرا اٹھتے۔ پل بھر بعد مجھے خیال ہوتا کہ میرے کمرے کے برابروالی گزرگاہ میں کوئی بہت سنبھل سنبھل کر مگر مستقل مزاجی سے چٹخنی کھول رہا ہے اور پھر اچانک وہ انتہائی جنون کے عالم میں گھر میں دیوانہوار دوڑنے لگتا، غصے میں ہر جھلملی اور دروازے کو جھنجھوڑ ڈالتا یا پھر چمنی میں گھس جاتا، اور وہاں اس کا کبھی نہ ختم ہونےوالا نوحہ گونجنے لگتا، کبھی اس کی فریاد انتہائی دردناک کراہ میں تبدیل ہو جاتی اور کبھی پھر کسی درندے کے غرانے میں بدل جاتی۔ کبھی کبھی یہ خوفناک

مہمان جس کا کوئی وجود ہی نہ تھا یکبارگی دندناتا ہوا میرے کمرے میں گھستا اور اچانک میری رگوں میں سنسنی سی دوڑ جاتی۔ اور میرے مدھم مدھم لیمپ کی لو کانپ جاتی جو کاغذ کے ہرے شیڈ کی آغوش میں چھپی ہوئی اسے جھلس رہی تھی۔

میری روح اور میرے دل پر ایک عجیب سی بے اطمینانی اور پریشانی طاری ہو گئی۔ ''میں کون ہوں، کیا ہوں،، میں سوچتا ''کہ شہری زندگی، مہذب محفلوں، عورتوں کی نقرئی ہنسی اور انسانوں کی گپ شپ اور باتوں سے ہزاروں میل دور جنگلوں اور برفانی طوفان میں گھرے ہوئے ایک گاؤں کے اس ٹوٹے پھوٹے مکان میں بیٹھا موسم سرما کی یہ تاریک اور طوفانی رات جھیل رہا ہوں۔ ،، اور مجھے ایسا لگتا کہ یہ طوفانی رات کبھی ختم نہ ہوگی، دسیوں برس تک، میری موت تک یوں ہی کھنچتی چلی جائے گی، ہوا اسی افسردگی سے چنگھاڑتی رہے گی، اس بدحال سبز شیڈ کے نیچے چھپا ہوا لیمپ اسی طرح مری مری سی لو دیتا رہے گا، میں اسی بے چینی سے اپنے کمرے کے چکر کاٹتا رہوں گا اور سوچ میں ڈوبا ہوا اور گم سم یرمولا اسی انداز میں آتش دان کے سامنے اکڑوں بیٹھا رہے گا— یہ یرمولا بھی ایک عجیب ہستی ہے، وہ میرے لئے بالکل اجنبی ہے، وہ دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز ہے اور اس حقیقت سے بے نیاز ہے کہ اس کے خاندان کے پاس کھانے کو کچھ بھی نہیں ہے، وہ ان

چنگھاڑتی ہوئی ہواؤں سے اور میری نامعلوم سی اندر ہی اندر کھا جانےوالی اداسی سے بھی بےنیاز ہے۔

اچانک میرے دل میں ایک انتہائی شدید خواہش نے سر اٹھایا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کاش کوئی انسانی آواز اس اداس خاموشی کو توڑ دے۔ چنانچہ میں نے پوچھا ''کیوں کیا خیال ہے، یرمولا، یہ خوفناک ہوا کہاں سے آ رہی ہے آخر؟''

''ہوا؟'' یرمولا نے کاہلی سے نظریں اٹھائیں۔ ''کیوں، آپ نہیں جانتے، مالک؟''

''بالکل نہیں۔ بھلا مجھے کیا معلوم؟''

''سچ، نہیں معلوم؟'' یرمولا حیران رہ گیا۔ ''میں بتاتا ہوں آپ کو'' وہ بڑے پراسرار انداز میں بولا۔ ''میں بتاتا ہوں۔ بات یہ ہے، مالک، کہ یا تو آج کسی چڑیل نے جنم لیا ہے یا کوئی جادوگر رنگ رلیاں منا رہا ہے۔''

''چڑیل، تمھارا مطلب ہے جادوگرنی؟''

''ہاں، جی ہاں... جادوگرنی۔''

میں بڑے اشتیاق سے یرمولا کی طرف جھک گیا۔ ''کون جانے'' میں نے سوچا ''ہو سکتا ہے اس وقت میں اس سے کوئی پھڑکتی ہوئی دلچسپ داستان اگلوا لوں۔ جادو ٹونوں، پراسرار خزانوں یا بن مانسوں کی داستان۔''

''اور یہاں پولیسئے میں ہیں کچھ چڑیلیں وغیرہ؟'' میں نے پوچھا۔

''معلوم نہیں، ہوں گی کہیں،، اس نے حسب عادت بےپرواهی سے جواب دیا۔ اور پھر آتش‌دان پر جھک گیا۔ ''بڑے بوڑھے کہتے هیں که ایک زمانے میں تو تھیں دوچار چڑیلیں، کون جانے جھوٹ هو۔،،

میں ناامید هو گیا۔ میں جانتا تھا که یرمولا بےحد کم‌گو آدمی هے، مجھے یقین هو گیا که اس دلچسپ موضوع کے بارے میں میں اس سے اور کچھ نہیں اگلوا سکتا۔ لیکن خلاف توقع اچانک وه اپنی مخصوص بےپرواهی اور کاهلی کے انداز میں کچھ اس انداز سے بولنے لگا جیسے مجھ سے بات نہیں کر رها بلکه چٹختے هوئے آتش‌دان سے مخاطب هے:

''پانچ ایک سال پہلے یہاں ایک چڑیل رهتی تھی۔ لیکن گاؤں والوں نے اسے مار بھگایا۔،،

''کہاں، کدھر مار بھگایا؟،،

''کہاں... ارے ظاهر هے جنگل کی طرف، اور کہاں؟ اور اس کا گھر مسمار کر دیا، یہاں تک که اس کے منحوس گھونسلے کا ایک تنکا بھی باقی نه بچا۔ وه اس کی گردن دبوچ کر گھسیٹتے هوئے چیری کے باغ کے اس طرف تک لے گئے اور پھر اسے مار بھگایا۔،،

''مگر یه سب هوا کیوں آخر؟،،

''اجی اس نے بہت تکلیفیں پہنچائیں گاؤں والوں کو۔ هر شخص سے لڑی، گھر گھر جا کر طرح طرح کی جڑی بوٹیاں بکھیریں، اور ایک مرتبه اس نے گاؤں کی ایک نوجوان عورت سے ایک

زلوتی * مانگی، عورت نے کہا کہ 'میرے پاس نہیں ہے۔ '، 'خیر خدا تمھارا بھلا کرے!، چڑیل نے کہا۔ 'مجھے چار کوڑیاں دینے سے انکار کر رہی ہو، دیکھ لینا سر پکڑکے روؤگی۔ '، اور جانتے ہو، مالک، پھر کیا ہوا؟ چڑیل کا یہ کہنا تھا کہ اس عورت کا بچہ بیمار پڑ گیا۔ بچارا بہت دن بیمار رہا اور پھر آخر ایک دن ہمیشہ کی نیند سو گیا۔ بس جی، تب گاؤں‌والوں نے اس چڑیل کو نکال باھر کیا، آنکھیں پھوٹیں کمبخت کی!،،

''اور اب کہاں ہے وہ چڑیل؟،، میں نے پوچھ ہی لیا آخر۔

''چڑیل؟،، اس نے حسب‌عادت دھیرے سے دھرایا۔ ''مجھے کیا معلوم بھلا؟،،

''کیوں اس کے کوئی عزیز رشتےدار نہیں ہیں یہاں گاؤں میں؟،،

''نہیں، یہاں کوئی نہیں ہے، یہاں کی نہیں تھی وہ، قصاپ ** یا جپسی نسل کی تھی۔ وہ یہاں آئی تو میں لونڈا سا تھا۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی لڑکی تھی۔ نہ جانے اس کی بیٹی تھی یا نواسی۔ لوگوں نے ان دونوں کو مار بھگایا۔ ،،

---

* پندرہ کوپک۔ (مصنف)

** یوکرین میں روسیوں کے لئے کہا جاتا ہے۔ (ایڈیٹر)

''کیا اب کبھی کوئی نہیں جاتا اس کے پاس — اپنی قسمت پوچھنے یا کوئی جڑی بوٹی لینے؟''

''عورتیں بھاگی جاتی ہیں'' یرمولا نے حقارت سے کہا۔

''اوھو تب تو انہیں معلوم ہوگا کہ وہ کہاں رہتی ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم، لوگ کہتے ہیں کہ ''گوشۂ شیطان'' کے قریب کہیں رہتی ہے۔ ارینووا سڑک کے اس پاروالی دلدل دیکھی ہے تم نے؟ بس وہیں رہتی ہے وہ منحوس ساحرہ!''

''چڑیل میرے گھر سے صرف چند میل کے فاصلے پر رہتی ہے... سچ مچ کی جیتی جاگتی چڑیل!'' یہ سن کر میرے سارے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی، اور میرا شوق ابھر آیا۔

''یرمولا'' میں نے کہا ''اس سے کیسے ملوں میں۔ میرا مطلب ہے اس چڑیل سے؟''

''تھو!'' اس نے انتہائی نفرت سے تھوک دیا۔ ''لو اور سنو، واہ کیا شہزادی ڈھونڈی ہے۔''

''شہزادی ہو یا بھنگن میں تو اس سے ضرور ملوں گا۔ سردی ذرا کم ہوتے ھی میں اس کے ھاں جاؤں گا۔ مجھے راستہ تو دکھا دوگے نا؟''

یہ آخری بات سن کر تو یرمولا کے جیسے بچھو نے کاٹ لیا۔ وہ اچھل کر کھڑا ھو گیا۔

''میں؟!'' وہ نفرت سے چلایا۔ ''کبھی نہیں، ہرگز

نہیں! ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے پر بندہ ادھر نہیں جاتا!،،

”کیا بکواس ہے — ضرور جاؤگے تم۔ ،،

”نہیں، مالک، میں نہیں جاتا، کسی حالت میں نہیں، اس کے گھر جاؤں؟،، اس پر پھر غصے کا بھوت سوار ہو گیا۔ ”میں اور ایک چڑیل کے گھونسلے میں جاؤں؟ خدا بچائے! اور مالک، میں تو آپ کو بھی یہی کہوں گا کہ نہ جائیے۔ ،،

”جیسی تمھاری مرضی مگر میں تو بہرحال جاؤں گا۔ میں تو اسے ایک نظر دیکھنے کے لئے بے تاب ہوں۔ ،،

”اس میں ایسے کونسے سرخاب کے پر ہیں جو دیکھوگے،، یرمولا غصے سے آتش‌دان کا کواڑ بند کرتے ہوتے بڑبڑایا۔

گھنٹے بھر بعد یرمولا نے تاریک گلیارے میں بیٹھ کر چائے ختم کی اور گھر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس وقت میں نے اس سے پوچھا ”ہاں، اور نام کیا ہے چڑیل کا؟،،

”مانوئلیخا،، اس نے ترشی سے جواب دیا۔

اس نے کبھی منہ سے اپنی محبت اور خلوص کا اظہار نہیں کیا تھا مگر میں خوب جانتا تھا کہ اسے مجھ سے بہت لگاؤ ہو گیا ہے۔ اور کیوں نہ ہوتا — ہم دونوں شکار کے رسیا تھے، میں اس کے ساتھ بہت دوستانہ برتاؤ کرتا، وقت بے وقت اس کے دکھیارے

خاندان کی مدد کرتا اور سب سے بڑی بات یہ کہ شراب کباب پر کبھی نہ جھڑکتا، اسے نفرت تھی ان نصیحتوں سے، مگر ہر آیا گیا کچھ نہ کچھ ضرور کہہ جاتا تھا۔ چنانچہ چڑیل سے ملنے کی اسٹ خواہش اور میرے مسلسل اصرار کو دیکھ کر اس کا پارہ چڑھ گیا۔ وہ بھنا کر زور زور سے سوں سوں کرنے لگا، ایسے میں اس کے کتے ریابچک کی جو شامت آئی تو وہ برساتی میں آگیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ کتے کی پسلیوں میں انتہائی زور سے ایک لات رسید کر دی۔ ریابچک انتہائی دردناک آواز میں چیخا، ایک طرف کو کھسکا اور منمناتا ہوا یرمولا کے پیچھے بھاگنے لگا۔

۳

تین دن بعد سردی کم ہو گئی۔ ایک دن یرمولا صبح تڑکے میرے کمرے میں پہنچا۔

"مالک، کہئے، بندوقیں صاف کر ڈالوں"، اس نے بظاہر لاپرواھی سے کہا۔

"کیوں کیا بات ہے؟"، میں نے لحاف کے اندر انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

"کل رات خرگوش بھاگتے پھر رہے تھے۔ بہت سے نشان موجود ہیں، ان کا پیچھا کیا جائے؟"

یرمولا جنگل میں جانے کو بےقرار تھا لیکن شکار کی خواہش کو دبانے اور بےتعلقی ظاہر کرنے

کی پوری کوشش کرتا رہا۔ اس کی قرابین تک ہال میں موجود تھی، بارود کی گیس اور زنگ نے بندوق کی نال کو خراب کر دیا تھا، جگہ جگہ ٹین کے پیوند چمک رہے تھے، مگر زخموں سے نڈھال بندوق کا کوئی نشانہ آج تک خالی نہیں گیا تھا۔

جنگل میں داخل ہوتے ہی ہمیں خرگوش کے پاؤں کے نشان نظر آئے — اگلی ٹانگوں کے دو چھوٹے چھوٹے نشان اور ذرا سا پیچھے ہٹ کر پچھلی ٹانگوں کے نشان۔ خرگوش سڑک پر آیا تھا، چند سو گز اس پر دوڑا تھا اور پھر اچانک پلٹ کر چیڑ کے ننھے ننھے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا تھا۔

"لو، بھئی، گھیر لو سالے کو"، یرمولا نے کہا۔ "جہاں چھلانگ لگائی تھی وہیں دبکا ہوا ہوگا۔ مالک، آپ آگے بڑھئے"، وہ رکا اور ان نشانات کے ذریعے جن کے متعلق اس کے سوا کوئی بھی نہ جانتا تھا یہ طے کرنے لگا کہ مجھے کس طرف بھیجے۔ "آپ پرانے شراب خانے کی طرف جائیے۔ اور میں زاملین کی طرف سے بڑھوں گا۔ جیسے ہی کتا اسے چونکائے گا میں آپ کو ہانک لگاؤں گا۔"

وہ گھنی جھاڑیوں میں گھس کر فوراً نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے خوب کان لگا لگا کر سنا مگر ہلکی سے ہلکی آواز نے بھی اس شکاری کا راز فاش نہ کیا، اس کے قدموں کے نیچے ایک پتی بھی نہ کھڑکی۔

میں پرانے شراب خانے کی طرف گیا۔ شراب‌خانہ کیا تھا ایک سنسان اور ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی تھی۔ جنگل کے کنارے پہنچ کر میں ایک اونچے سے درخت کے قریب رک گیا جس کا تنا بہت لمبا اور گنجا تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ جاڑے کے پرسکون دنوں کی یہ خاموشی جنگلوں کے سوا اور کہیں نظر نہیں آتی۔ ڈالیوں میں جھولتے ہوئے برف کے ٹکڑوں نے انھیں انتہائی رنگارنگ سجایا اور مگن بنا دیا تھا۔ کبھی کسی درخت کی چوٹی سے کوئی شاخ ٹوٹ کر گرتی اور نچلی شاخوں سے ٹکرا کر ہلکی ہلکی سرسراہٹ سی پیدا کر دیتی۔ دھوپ میں برف کا رنگ گلابی اور سائے میں نیلا نیلا سا لگ رہا تھا۔ میں اس پروقار اور ٹھنڈی ٹھنڈی خاموشی کے سحر سے مسحور ہو گیا، اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں وقت کو قریب ہی کیوں دبے پاؤں گزرتے دیکھ رہا ہوں۔

اچانک دور گھنے جنگل سے ریابچک کے بھونکنے کی آواز آئی — شکار کے پیچھے لپکتے ہوئے کتے کی آواز، باریک، تیز اور گھبرائی گھبرائی سی تھی جیسے پھنکار رہا ہو۔ اس کے فوراً بعد مجھے یرمولا کی آواز آئی۔ وہ انتہائی غصے میں کتے پر چیخ رہا تھا۔ ”اوبی ی ی! اوبی ی ی!“ پہلا لفظ بہت تیز اور لمبی سی چیخ کی شکل میں ابھرتا اور دوسرا جھٹکے کے ساتھ ایک گرج کی شکل میں۔ پہلے بہت دنوں

تک مجھے پتہ نہیں چلا کہ پولیسئے کے شکاریوں کی اس ھانک کا مخزن ھے ''اوبی وات''* ۔

میں نے کتے کی آواز پر کان لگائے تو مجھے خیال ھوا کہ غالباً وہ میرے بائیں ھاتھ پر شکار کا پیچھا کر رہا ھے، چنانچہ میں کھلے میدان کو پار کرتا ھوا اس کے پیچھے دوڑا ۔ میں بیس گز بھی نہ گیا ھوں گا کہ ایک ٹھنٹھ کے پیچھے سے بھورا خرگوش نکلا ۔ اس نے بظاھر نہایت اطمینان سے گھبرائے بنا کان سر کے پیچھے چپکائے لمبی قلانچیں بھر کر سڑک پار کی اور جھاڑیوں میں غائب ھو گیا ۔ خرگوش کے پیچھے پیچھے ریابچک نمودار ھوا ۔ مجھے دیکھ کر اس نے آھستہ سے دم ھلائی، برف چاٹا اور اپنی مہم پر بھاگ گیا ۔

اچانک جھنڈ کے پیچھے سے یرمولا نمودار ھوا ۔

''آپ نے اس کو مارا کیوں نہیں، مالک؟'' وہ چلایا اور افسوس سے تت تت کرنے لگا ۔

''مگر میں تو اس سے بہت دور تھا، کم سے کم دو سو قدم دور، بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ۔ ''

میری پریشانی دیکھ کر وہ کچھ نرم پڑ گیا ۔

''کوئی بات نہیں، بھاگ کے جائے گا کہاں ۔ ارینووا سڑک کی طرف جائیے ۔ دم بھر میں پہنچ جائے گا ادھر ۔ ''

---

* مارنا ۔ (مترجم)

میں سڑک کی طرف بڑھ گیا۔ اور دو منٹ بعد مجھے پھر قریب ہی کہیں کتے کی شکار کا پیچھا کرنے کی آواز آئی۔ میری رگ رگ میں شکاریوں کا سا جوش دوڑنے لگا۔ میں بندوق تان کر گھنی جھاڑیوں کو چیرتا ہوا بھاگا۔ اس وقت مجھے شاخوں کے بےرحم طمانچوں کی بھی پروا نہ تھی۔ میں تھوڑی دیر اسی طرح بھاگتا رہا یہاں تک کہ میرا سانس پھول گیا اور اب کتے کے بھونکنے کی آواز بھی نہ تھی۔ میں نے قدم آہستہ کر دئے۔ میں نے سوچا کہ اگر سیدھا بڑھتا چلا جاؤں تو اریئووا سڑک پر یرمولا سے مڈبھیڑ ہونی لازمی ہے۔ مگر جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ جھاڑیوں اور ٹھنٹھوں سے گزرتے ہوئے میں نے سمت کا خیال نہیں کیا اور میں راستے سے بھٹک گیا ہوں۔ میں نے یرمولا کو آواز دی مگر اس نے جواب نہیں دیا۔

میں بےسوچے سمجھے آگے بڑھتا چلا گیا۔ دھیرے دھیرے جنگل چھدرا اور زمین دلدلی ہوتی جا رہی تھی۔ برف پر میرے قدموں کے نشان بنتے اور تیزی سے سیاہ ہو جاتے اور ان میں پانی بھر جاتا۔ کئی دفعہ تو میں گھٹنوں گھٹنوں دلدل میں پھنس گیا۔ میں مجبوراً ایک ٹیلے سے دوسرے ٹیلے پر کود کود کر بڑھنے لگا۔ میرے پاؤں اس طرح بھوری بھوری کائی میں دھنس رہے تھے گویا وہ کائی نہ ہو نرم نرم قالین ہو۔

تھوڑی دیر بعد میں جھاڑیوں سے نکل آیا۔ میرے سامنے بڑا سا دائرے نما دلدل پھیلا ہوا تھا۔ دلدل کے اوپر بچھی ہوئی برف کی تہہ سے کہیں کہیں گھاس کا گچھا یا اکادکا جھاڑی جھانک رہی تھی۔ دلدل کے اس پار، درختوں کے جھنڈ میں ایک جھونپڑی کی سفید دیواریں نظر آ رہی تھیں۔ ''ہو نہ ہو یہ ارینووا کے لکڑھارے کا گھر ہوگا،، میں نے سوچا۔ ''وہاں تک جاکے راستہ پوچھنا چاھئے۔ ،،

لیکن جھونپڑی تک پہنچنا کچھ ایسا آسان نہ تھا۔ میں ہر لمحہ نئے سرے سے دلدل میں پھنس جاتا۔ میرے اونچے جوتوں میں پانی بھر گیا، وہ ہر قدم پر باآواز بلند پچر پچر کر رہے تھے۔ انھیں گھسیٹنا لمحہ بہ لمحہ زیادہ مشکل ہوتا چلا گیا۔

آخرکار میں نے دلدل پار کی اور ایک چھوٹے سے ٹیلے پر چڑھ گیا جہاں سے جھونپڑی صاف نظر آ رہی تھی۔ جھونپڑی کیا تھی، طلسماتی قصے کہانیوں کی چڑیل کا اڈا تھی۔ جھونپڑی زمین سے بہت اونچی تھی اور کھمبوں پر بنائی گئی تھی، شاید اس لئے کہ بہار میں ارینووا جنگلوں میں طغیانی آ جاتی تھی۔ زمانے کی ستائی ہوئی اس جھونپڑی کی ایک دیوار بیٹھ گئی تھی، اور اس سے ایک اداسی اور شکستگی ٹپک رہی تھی۔ کھڑکیوں کے کئی شیشے ٹوٹے ہوئے تھے، ان کی جگہ گندے گندے چیتھڑے ٹھونسے ہوئے تھے جو جگہ جگہ سے باھر کو نکلے پڑ رہے تھے۔

میں نے چٹخنی کھسکا کر دروازہ کھول دیا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ اتنی دیر تک برف پر نظریں جمانے کے بعد اب اس تاریکی میں پہنچ کر میری آنکھوں کے آگے سرخ سرخ تارے ناچنے لگے اور مجھے بڑی دیر تک اندازہ نہ ہو سکا کہ اندر کوئی ھے یا نہیں۔

"جناب، اندر کوئی ھے کیا؟"، میں نے زور سے پوچھا۔

چولہے کے قریب کسی چیز کو کچھ جنبش سی ھوئی۔ میں اس کے پاس پہنچا تو مجھے ایک بوڑھی عورت زمین پر بیٹھی نظر آئی۔ اس کے سامنے مرغی کے پروں کا انبار لگا ھوا تھا۔ وہ ایک ایک پر اٹھاتی جاتی اور ان کے ریشے ٹھیک کر کرکے انھیں ٹوکری میں رکھتی جاتی اور ڈنٹھل زمین پر پھینکتی جاتی۔

"ارے یہ تو ارینووا کی چڑیل مانوئلیخا ھے"، بڑھیا پر بھرپور نظر پڑتے ھی میرے دماغ میں یہ خیال کوند گیا۔ وہ بالکل روائتی بابایاگا* جیسی تھی۔ وھی سوکھے مارے اندر کو دھنسے ھوئے رخسار، وھی لمبی اور نوکیلی ٹھوڑی جو اس کی طوطا چونچ ناک کو چھونے کی کوشش کر رھی تھی۔ اندر کو دھنسا ھوا پوپلا منہ مسلسل ھل رھا تھا جیسے وہ کچھ چبا رھی ھو۔ اس کی ابھری آنکھیں

---

* چڑیل۔ (ایڈیٹر)

جو کبھی نیلی ہوں‌گی، اب بالکل بے رنگ اور بے جان تھیں اور اپنے چھوٹے چھوٹے سرخ پپوٹوں کی وجہ سے کسی منحوس پرندے کی آنکھوں جیسی معلوم ہو رہی تھیں۔

''نانی، آداب،، میں نے اپنی بساط بھر انتہائی دوستانہ لہجے میں کہا۔ ''آپ ہی ہیں مانوئلیخا؟،،

بڑھیا کے سینے میں عجیب گھڑگھڑاہٹ اور خرخراہٹ سی ہوئی۔ اور اس کے پوپلے اور بدبداتے ہوئے لبوں سے عجیب عجیب آوازیں نکلیں، جیسے کوئی ہانپتا ہوا بوڑھا کوا کائیں کائیں کر رہا ہو، کبھی کبھی یہ آوازیں دبی دبی سی چیخ میں بدل جاتیں۔

''شاید کبھی خدا کے نیک بندے مجھے مانوئلیخا کے نام سے پکارتے ہوں۔ مگر اب تو نہ نام ہے نہ شہرت، اب بوڑھی بطخ کہتے ہیں۔ مجھے بتاؤ کیا چاہئے تمھیں؟،، اس کا انداز بہت غیردوستانہ تھا۔ اس نے لمحے بھر کو بھی اپنا بےکیف اور اکتا دینےوالا کام بند نہیں کیا۔

''میں راستہ بھول گیا، نانی، ذرا سا دودھ مل جائیگا کیا؟،،

''یہاں دودھ اودھ کچھ نہیں ہے رے،، وہ چلائی۔ ''تم جیسے ہزاروں گزرتے ہیں یہاں سے، تم سب کا دوزخ تو بھرنے سے رہی میں۔ ،،

''ارے نانی، بڑی سخت ہو، مہمان کا ذرا پاس نہیں کرتیں۔ ،،

''ٹھیک کہتے ہو، میاں، میں بہت سخت ہوں، یہاں میٹھے بول نہیں مل سکتے، میاں، تھک گئے تو بیٹھ کر گھڑی دو گھڑی دم لے لو، میں منع بھی نہیں کرتی۔ تم نے یہ کہاوت تو سنی ہوگی: 'آؤ، ہمارے گھر کے پاس بیٹھو، ہمارے گرجا کی گھنٹیوں کی آواز سنو، اور کھانے کے وقت ہم خود ہی تمھارے مہمان بن جائیں گے۔' بس سو بات کی ایک بات ہے۔''

اس انداز تقریر کو سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ بڑھیا اس علاقے کی نہیں ہے۔ یہاں لوگ ایسی تیر کی طرح چبھتی ہوئی زبان کو پسند نہیں کرتے جس میں شمالی باشندوں کے پسندیدہ عجیب عجیب سے الفاظ کی چاشنی ہو۔ اس اثنا میں بڑھیا کٹھ پتلی کی طرح اپنا کام کئے گئی۔ وہ اب بھی خودبخود کچھ بدبدائے جا رہی تھی اور اس کے الفاظ زیادہ سے زیادہ مدھم ہوتے چلے گئے۔ کبھی کبھی کچھ ٹوٹے پھوٹے جملے میرے کان میں پڑ جاتے ''ہوں، تیری نانی، مانوئلیخا ... لیکن کون جانے کون ہے وہ... اور میری یہ عمر ہونے کو آئی... ہر وقت بے چین گوریا کی طرح بے قرار رہنا، ہر وقت چہچہانا، ہر وقت چیخنا... ڈھلی ڈھلائی گوریا ہے!''

تھوڑی دیر میں اس کی باتیں سنتا رہا اور اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرے سامنے پاگل بڑھیا بیٹھی ہے اور یہ سوچ کر مجھے بڑی کراہیت اور خوف محسوس ہوا۔

بہرحال میں نے ادھر ادھر نظر ڈالی۔ کوٹھری کا بڑا حصہ تو پتھر کے چولھے نے گھیر رکھا تھا۔ سامنےوالے کونے میں عیسی کی شبیہہ کا نام نشان بھی نہ تھا۔ عام گھروں کی دیواروں پر عام طور پر ھری مونچھوں‌والے شکاریوں، ان کے سرخ سرخ کتوں اور ایسے ایسے جنرلوں کی تصویریں آویزاں ھوتی ھیں جن کو دور دور کوئی نہیں جانتا۔ مگر یہاں دیواروں پر سوکھی ھوئی جڑی بوٹیوں کے ھار، مڑی تڑی جڑوں کے گچھے اور باورچی‌خانے کا سامان لٹکا ھوا تھا۔ کوٹھری میں کہیں کوئی الو یا کالا بلا نظر نہیں آیا، مگر چولھے کے اوپر بیٹھی ھوئی دو گمبھیر چتکبری مینائیں بڑی حیرت اور تجسس سے مجھے تک رھی تھیں۔

”اور کچھ نہیں تو کم سے کم ایک گلاس پانی تو مل جائےگا، نانی؟“ میں نے بلند آواز میں پوچھا۔

”وہ رکھا ھے، ادھر بالٹی میں“ اس نے کہا۔

پانی کا مزہ دلدلی سا تھا۔ میں نے بڑی بی کا شکریہ ادا کیا مگر اس نے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ پھر میں نے اس سے پوچھا کہ میں راستہ کس طرح ڈھونڈھ سکتا ھوں۔

اس نے سر اٹھایا، پرندے جیسی بےجان آنکھوں سے بڑے غور سے میری طرف دیکھا اور جلدی سے بڑبڑائی:

”جا، جا، نوجوان، جا اپنی راہ لے۔ یہاں کیا کام تیرا؟ مان نہ مان میں تیرا مہمان جا بھائی جا۔“

اور اب وہاں سے چل دینے کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ لیکن مجھے خیال آیا کہ اس سخت گیر بڑھیا کو ذرا نرم کرنے کے لئے ایک آخری کوشش اور کر دیکھوں۔ میں نے جیب سے چاندی کا ایک چمکتا ہوا سکہ نکالکر اس کی طرف بڑھا دیا۔ میرا خیال ٹھیک نکلا، پیسہ دیکھتے ھی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں، اور اس نے کپکپاتی ہوئی مڑی مڑی تڑی اور ھڈیالی انگلیاں بڑھا کر سکہ لینا چاہا۔

''ایسے نہیں، مانوئلیخا نانی، ایسے نہیں، مفت میں نہیں ملےگا پیسہ،، میں نے سکہ چھپاتے ہوئے اسے چڑایا۔ ''پہلے قسمت بتاؤ میری۔ ،،

چڑیل کا جھریوں بھرا بھورا چہرہ بگڑ کر اور بھی غضب‌ناک ہو گیا۔ وہ میری سکےوالی بند ھتیلی کو مشکوک نظروں سے دیکھ رھی تھی اور کچھ ھچکچا رھی تھی۔ لیکن آخر ھوس کی جیت ھوکر رھی۔

''اچھا، لاؤ دیکھ دوں، آؤ،، وہ بڑی مشکل سے زمین سے اٹھتے ہوئے منمنائی۔ ''بیٹے، اب میں کسی کی قسمت نہیں بتاتی۔ اب تو بھول بھال گئی سارا فن، بوڑھی ہوئی، ٹھیک سے نظر بھی نہیں آتا۔ بس تمھیں خوش کرنے کو دیکھ لوں‌گی۔ ،،

وہ دیوار کے سہارے میز تک گئی، اس کا جھکا ہوا بدن مستقل تھرتھر کانپ رہا تھا۔ اس نے بھورے بھورے تاشوں کی گڈی نکالی جو مدتوں کے استعمال

کی وجہ سے بہت موٹے ہو گئے تھے۔ بڑھیا انھیں پھینٹنے لگی۔ ''لو کاٹو... بائیں ہاتھ سے کاٹو۔ جی لگا کر کاٹنا...'' اس نے کہا اور گڈی میری طرف سرکا دی۔

اس نے انگلیوں پر تھوک لگایا اور تاش پھیلانے لگی۔ تاش دھپ دھپ کرکے میز پر گرنے لگے جیسے وہ گندھا ہوا آٹا ہوں، اور ان سے ایک ہشت پہلو ستارہ سا بن گیا۔ اور جب آخری پتا بادشاہ پر الٹا گرا تو مانوئلیخا نے اپنی ہتیلی پھیلا دی۔

''لاؤ سونے سے مٹھی بھرو، تم بہت خوش رہوگے، بڑی دولت ملےگی تمھیں'' وہ ایک جپسی بھکارن کے مخصوص خوشامدانہ انداز میں گڑگڑائی۔

میں نے سکہ اس کی ہتیلی پر رکھا اور اس نے بندر کی سی پھرتی سے منہ میں چھپا لیا۔

''تمھیں ایک لمبے سفر سے بہت فائدہ ہوگا'' اس نے رٹے رٹائے الفاظ دھرانے شروع کئے۔ ''اینٹ کی ملکہ سے ملاقات ہوگی، اور ایک بہت بڑے گھر میں بہت دلچسپ بات‌چیت کرنے کا موقع ملےگا۔ کچھ دن میں تمھیں چڑی کے بادشاہ کی طرف سے غیرمتوقع خبریں ملیں‌گی۔ تاشوں کا کہنا ہے کہ تمھیں کچھ دقتوں کا سامنا کرنا پڑےگا اور پھر تمھیں کچھ روپیہ ملےگا۔ پھر کسی بڑی محفل میں جانے کا اتفاق ہوگا۔ شراب کے جام لنڈھاؤگے، دھت تو نہیں مگر مست ہو جاؤگے۔ کچھ نہ

کچھ رنگ تو دکھائےگی ہی شراب۔ تمھاری عمر بہت بڑی ہوگی۔ اگر تم سرسٹھ سال کی عمر میں نہ مرے تو...،،

وہ رکی اور سر اٹھا کر گویا کچھ سننے کی کوشش کرنے لگی۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ ایک تڑپتی مچلتی نسوانی سریلی آواز کوئی نغمہ آلاپ رہی تھی، آواز جھونپڑی سے قریب ہوتی چلی جا رہی تھی۔ میرے کان میں یوکرین کے ایک سریلے نغمے کے بول گونج اٹھے:

پھول ہیں یا کلیاں،
کہ جھک گئی ہیں ڈالیاں
ہوش ہے یا بےہوشی،
کہ سر ذرا جھکا ہے آج

''اچھا اچھا تو، بیٹے، اب تم جاؤ،، مانوئلیخا نے انتہائی اضطراب اور بےچینی سے مجھے دھکیلتے ہوئے کہا۔ ''غیروں کے گھر میں یوں چکر لگانے کا کیا مطلب ہے بھلا، جاؤ، جدھر سے آئے تھے اسی طرف جاؤ۔،،

وہ مجھے آستین پکڑ کر دروازے کی طرف کھینچنے لگی... اس کے چہرے سے انتہائی وحشت ٹپک رہی تھی۔

اچانک نغمے کی آواز جھونپڑی کے بالکل قریب پہنچی اور ایکدم خاموشی ہو گئی۔ لوہے کی چٹخنی

13*

کھڑکھڑی اور کواڑ چوپٹ کھل گئے۔ ایک ہنس مکھ اور دراز قد لڑکی دروازے میں داخل ہوئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے بڑی احتیاط سے دھاری‌دار اپرن کا داخل تھام رکھا تھا اور اپرن سے تین ننھے ننھے پرندوں کے سر جھانک رہے تھے۔ ان کی گردنیں لال اور آنکھیں سیاہ موتیوں جیسی تھیں۔

''نانی، دیکھنا ذرا ان چڑیوں کو، پھر چمٹی جا رہی ہیں مجھ سے،، وہ کھل کر ہنسی۔ ''دیکھو تو سہی کیسی عجیب ہیں۔ بھوکی ہیں بچاریاں، اور میرے پاس روٹی بھی نہیں ہے۔،،

اور پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ اچانک شرم سے سرخ ہوکر خاموش ہو گئی۔ اس کی سیاہ بھویں غصے سے تن گئیں اور اس نے سوالیہ نظروں سے مانوئلیخا کی طرف دیکھا۔

''یہ صاحب راستہ پوچھنے آئے ہیں،، بڑی بی نے بتایا۔ ''اچھا میاں،، اس نے فیصلہ کن انداز سے میری طرف پلٹ کر کہا۔ ''بہت وقت برباد کر لیا تم نے، دل بھر کے پانی پیا، گھڑی دو گھڑی گپ شپ کی، بس اب رخصت۔ ہمارا تمھارا کوئی جوڑ ہے بھلا۔،،

''ذرا سنو تو سہی، میری حسینہ،، میں نے لڑکی سے کہا ''مجھے ارینووا سڑک کا راستہ دکھا دو ذرا؟ نہیں تو میں ساری عمر تمھاری اس دلدل سے نہیں نکل سکتا۔،،

شاید میری باتوں کی نرمی اور ملائمت نے اس کے دل پر اثر کیا۔ اس نے بہت احتیاط سے اپنی چڑیوں کو آتش‌دان پر بیٹھی ہوئی میناؤں کے قریب بٹھایا، کوٹ اتار کر بنچ پر ڈالا اور خاموشی سے باھر نکل گئی۔

میں اس کے پیچھے پیچھے چل‌دیا۔

''چڑیاں تو خوب سدھائی ھیں تم نے!،، میں نے اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔

''ھاں،، اس نے میری طرف دیکھے بغیر درشتی سے جواب دیا۔ ''ھوں، وہ دیکھئے،، اس نے باڑھ کے پاس رکتے ہوئے کہا۔ ''ادھر چیڑ کے درختوں کے بیچ میں وہ راستہ نظر آ رھا ھے نا؟،،

''ھاں...،،

''بس سیدھے اسی پر چلے جائیے۔ شاہ بلوط کے پرانے لٹھے کے قریب پہنچ کر بائیں ھاتھ کو مڑ جانا اور ناک کی سیدھ میں بڑھ جانا۔ اس طرح آپ ارینووا سڑک پر پہنچ جائیں‌گے۔ ،،

وہ دایاں بازو پھیلائے راستے کی طرف اشارہ کر رھی تھی اور میں اس کے حسن سے مسحور ھو رھا تھا۔ اس کی کوئی ادا بھی تو اس علاقے کی لڑکیوں جیسی نہیں تھی جو اس قدر بھدے انداز میں رومال باندھتی ھیں کہ اوپر سے پیشانی تک ڈھک جاتی ھے اور نیچے سے ٹھوڑی اور منہ تک۔ ان کے چہرے ھمیشہ سہمے سہمے سے لگتے ھیں۔ بھورے بالوں‌والی اس سروقد دوشیزہ کے انداز میں بڑا وقار، بڑی سرکشی

اور بےنیازی تھی۔ اس کی عمر بیس بائس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کا جوان اور ابھرا ہوا سینہ بڑی نزاکت اور خوبصورتی سے چوڑے سے سفید بلاؤز میں چھپا ہوا تھا۔ جس کسی نے ایک دفعہ بھی اس انوکھے حسن کو دیکھا ہوگا وہ کبھی بھی اسے بھلا نہیں سکتا لیکن اس حسن، اس سندرتا کا عادی ہونے کے بعد بھی اسے الفاظ کا جامہ پہنانا مشکل تھا۔ اس کی دلکشی ان بڑی بڑی چمکدار سیاہ آنکھوں میں تھی جن کو اس کی کھنچی ہوئی پتلی پتلی بھووں نے تیزی و طراری، تحکم پسندی اور بھولپن کی شوخی سے مالامال کر دیا تھا، اس کے سرخی مائل زیتونی رنگ اور ہونٹوں کی سرکش تراش نے چہرے کی دلکشی کو چارچاند لگا دئے تھے۔

''اس بھیانک علاقے میں تن تنہا رہنے سے ڈر نہیں لگتا تمھیں؟'' میں نے باڑھ کے قریب رکتے ہوئے پوچھا۔

اس نے بے پروائی سے کندھے جھٹکے۔

''ڈر کس بات کا؟ بھیڑئے ادھر نہیں آتے۔''

''مگر صرف بھیڑئے ہی تو... اگر تم برف کے طوفان میں دب جاؤ یا آگ لگ جائے۔ سو طرح کی باتیں ہو سکتی ھیں۔ تم یہاں سب سے الگ تھلگ پڑی ہو، کوئی بچا بھی تو نہیں سکتا۔''

''ارے، شکر ھی ھے!'' اس نے خفگی سے کہا۔ ''کاش، وہ مجھے اور نانی کو ھمیشہ ھمیشہ کے لئے

سکون کی زندگی گزارنے دیتے کتنا اچھا ہوتا، لیکن...،،
''لیکن کیا؟،،
''جانتے ہو، بہت زیادہ معلومات آدمی کو بڈھا کر دیتی ہیں،، اس نے بات کاٹی - ''اور آپ ہیں کون؟،، اس نے بےچینی سے پوچھا -
میں سمجھ گیا کہ بڑھیا اور لڑکی دونوں کو دھڑکا لگا رہتا ہے کہ حکام کسی دن بھی انہیں کسی نہ کسی قسم کی ایذا پہنچا سکتے ہیں - میں نے فوراً اسے اطمینان دلایا -
''ارے تم، گھبراؤ نہیں، میں اریادنک، کلرک یا چنگی کا داروغہ تو ہوں نہیں - میرا حکام سے کوئی واسطہ نہیں ہے - ،،
''نہیں؟ آپ سچ کہتے ہیں؟،،
''بخدا - یقین مانو، میں تو یہاں اجنبی مسافر ہوں - چند مہینے کے لئے آیا ہوں، پھر واپس چلا جاؤں گا - اگر تم چاہتی ہو تو میں کسی سے ذکر بھی نہیں کروں گا کہ یہاں آیا تھا اور تم لوگوں سے ملا تھا - مجھ پر بھروسہ ہے نا تمھیں؟،،
اس کے چہرے پر خفیف سی چمک آگئی -
''اچھا - اگر آپ جھوٹ نہیں بول رہے ہیں تو پھر ٹھیک ہے - مگر ایک بات بتائیے - آپ نے پہلے کبھی ہمارے بارے میں کچھ سنا تھا یا یوں ہی اتفاقاً آنکلے؟،،

"سمجھ میں نہیں آ رہا کیا جواب دوں ... سنا تو ضرور تھا، بلکہ پہلے سے ارادہ تھا کہ کسی نہ کسی دن تمھارے ھاں آؤں گا لیکن آج تو بالکل اتفاقاً آ نکلا۔ راستہ بھول کر ۔ اچھا ایک بات بتاؤ۔ تم انسانوں سے اتنا ڈرتی کیوں ھو ۔ انھوں نے تمھیں کوئی دکھ پہنچایا ھے کبھی؟"

اس نے شک بھری نظروں سے مجھے دیکھا ۔ لیکن میرا ضمیر صاف تھا اور میں بلا جھجک اس کی نگاھوں کو جھیل گیا۔ پھر اس نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا :

"ان کی وجہ سے ھم نے مصیبت کے دن دیکھے ھیں۔ عام لوگ تو خیر اتنے برے نہیں ھیں مگر یہ حکام... اریادنک ھے تو اس کی مٹھی گرم کرو، استانووئی * اور آئے تو اس کو نذر دو، غرض جو کوئی ھے رشوت مانگ رھا ھے، اور اسی پر بس نہیں، نانی کو جادوگرنی کہتے ھیں، بھتنی کہتے ھیں، جیل کا پرندہ کہتے ھیں، خیر! چھوڑو، ان باتوں سے کیا فائدہ!"

"تمھیں تو نہیں ستاتے نا؟" میں سوچے سمجھے بغیر یہ احمقانہ سوال پوچھ بیٹھا۔

اس نے انتہائی وقار اور خودداری کے ساتھ سر اٹھایا، اور اس کی مچی ھوئی آنکھوں سے اپنی برتری اور فتح کا احساس جھلکنے لگا۔

---

* ضلع پولیس کمشنر ۔ (ایڈیٹر)

''نہیں ... بس ایک دفعہ ایک زمین ناپنے والے نے مجھ پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کی تھی۔ عشق و عاشقی کی سوجھی تھی حضرت کو، ایسا سبق دیا تھا میں نے کہ آج تک یاد کرتا ہوگا۔''

ان طنز بھری باتوں اور ان مغرور الفاظ میں اس قدر کھراپن تھا اور آزادی اور خودمختاری کی ایسی جھلک اور خواہش تھی کہ میں بےاختیار سوچنے لگا: ''پولیسئے کے سنسان جنگلوں کی ہوا بیکار نہیں گئی۔ تیری ھرھر ادا پکار رھی ھے کہ تو قدرت کی گود میں پل کر جوان ھوئی ھے۔ تیرے منہ لگنا ٹھیک نہیں ھے۔''

''ہم کس کو تنگ کرتے ھیں ذرا، بتائیے، آپ ھی بتائیے؟'' مجھ پر اس کا اعتماد بڑھا اور وہ بولتی چلی گئی۔ ''ہم تو لوگوں سے میل جول بڑھانے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ میں صرف سال میں ایک مرتبہ نمک اور صابن خریدنے قصبے جاتی ھوں، اور ھاں نانی کے لئے تھوڑی سی چائے بھی لینی ھوتی ھے۔ انھیں چائے بہت پسند ھے ورنہ چاھے اتنا بھی کسی کو دیکھنے یا ملنے کی ضرورت نہیں۔''

''مجھے تو لگتا ھے کہ تم اور تمھاری نانی لوگوں سے کوئی شکایت نہیں کرتے... اگر میں کسی دن دو چار گھڑی کو آجاؤں تو کچھ ھرج تو نہیں ھے؟''

وہ ھنسی اور اس کا دلکش چہرہ اچانک ایک عجیب انوکھے اور غیرمتوقع انداز میں بدل گیا! اب

چہرے پر پہلی سی سختی کا ھلکا سا سایہ بھی باقی نہ تھا۔ اور اچانک اس کے مکھڑے پر بچوں کی سی معصومیت اور چمک پیدا ھوگئی۔

"مگر ھمارے یہاں آپ کا بھلا کیا کام؟ میری اور نانی کی صحبت بڑی بے کیف ھے۔ لیکن اگر آپ واقعی اچھے آدمی ھیں تو آئیے، شوق سے آئیے۔ لیکن ایک بات کہوں کہ اگر کبھی ھماری طرف آئے تو اپنی یہ بندوق وھیں رکھ آئیے۔"

"کیوں، ڈرتی ھو؟"

"ڈرتی کیوں؟ میں کسی سے نہیں ڈرتی"، اور پھر اس کی آواز میں خود اعتمادی پیدا ھو گئی۔ "مگر مجھے اچھی نہیں لگتیں یہ چیزیں، بھلا چڑیوں اور خرگوشوں کو مارنے سے کیا فائدہ؟ کسی کو کوئی دکھ نہیں دیتے بچارے۔ اور وہ بھی اسی طرح زندہ رھنے کو بےقرار ھیں جس طرح میں اور آپ۔ مجھے ان پر بہت پیار آتا ھے۔ اتنے ننھے ننھے سے اور معصوم ھوتے ھیں۔ اچھا تو اب چلی"، اس نے تیزی سے کہا۔ "ارے مگر مجھے تو آپ کا نام بھی نہیں معلوم ... آج نانی ضرور مجھے برا بھلا کہیں گی۔"

وہ نہایت تیزی اور سبک‌روی سے جھونپڑی کی طرف بھاگ گئی۔ اس کا سر جھکا ھوا تھا، اس کی زلفیں ھوا میں لہرا رھی تھیں اور وہ انہیں دونوں ھاتھوں سے تھام رھی تھی۔

”ذرا ٹھیرو، ٹھیرو تو سہی!“ میں نے پکارا۔ ”نام کیا ہے تمھارا؟ کم سے کم معقولیت سے تعارف تو کرا لیں ہم لوگ۔“

وہ لمحے بھر کو ٹھٹکی اور پھر تیزی سے میری طرف آئی۔

”میرا نام الیونا ہے۔ یہاں والے اولیسیا کہتے ہیں۔“

میں نے بندوق کندھے پر رکھی اور اس کی بتائی ہوئی سمت میں چل پڑا۔ آگے چل کر میں ٹیلے پر چڑھا جہاں سے ایک تنگ و تاریک جنگلی راستہ شروع ہوتا تھا، یہ راستہ اتنا تنگ تھا کہ اس کا نظر آنا بھی مشکل ہی تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ اولیسیا کا ہوا میں لہراتا ہوا سرخ اسکرٹ ابھی تک سیڑھیوں پر نظر آ رہا تھا۔ چمکتے ہوئے سفید برف کے ایک رنگ پس منظر میں جھلملاتا ہوا یہ اسکرٹ دور سے ایک نقطہ سا معلوم ہو رہا تھا۔

یرمولا مجھ سے گھنٹے بھر بعد گھر پہنچا۔ اسے بیکار باتیں کرنے سے سخت چڑ تھی، چنانچہ اس نے مجھ سے ایک سوال بھی نہ کیا کہ میں کیسے اور کہاں راستے سے بھٹکا۔ البتہ یوں ہی چلتے چلتے اتنا ضرور کہا: ”وہ خرگوش باورچی خانے میں موجود ہے، کہئے تو اسے بھون دوں یا کسی کو تحفتاً بھیجیں گے؟“

”یرمولا، تمھیں کچھ بھی تو نہیں معلوم کہ آج میں کہاں رہا“، میں نے کہا۔ میں نے تصور ہی

تصور میں اس کے چہرے سے ٹپکتی ہوئی حیرت کو دیکھا۔

''کیوں، جانتا کیوں نہیں؟'' وہ بڑبڑایا۔ ''ظاہر ہے ان جادوگرنیوں کے ہاں گئے ہوں گے۔''

''ارے تمھیں کیسے پتہ چلا؟''

''مگر اس میں مشکل ہی کیا تھی؟ آپ نے میرے ہنکارنے کا جواب نہیں دیا، تو میں آپ کے قدموں کے ساتھ ساتھ بڑھا۔ آپ کو اس چکر میں نہیں پڑنا چاہئے، مالک!'' اس نے افسردگی اور غصے سے کہا۔ ''یہ گناہ ہے!''

٤

اس سال بہار اپنی تمام تر لطافتوں کے ساتھ بہت جلد اور اچانک کھل اٹھی۔ پولیسئے میں بہار ہمیشہ یونہی اچانک ڈیرا ڈالتی ہے۔ گاؤں کے گلی کوچوں میں مٹیالے اور گدلے پانی کے بے چین چشمے بہنے اور سورج کی کرنوں میں جگمگانے لگے۔ وہ راہ کے پتھروں کو جھاگ کی چادر اڑھاتے، بطخوں کے پروں اور لکڑی کے ٹکڑوں کو نچا کر بھنور سا بناتے اور جھنجھلاتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ ان گنت جوھڑوں میں نیلے آسمان اور اس پر تیرتے ہوئے سفید بادل کے گول گول ٹکڑوں کا عکس چمکتا رہتا۔ ایسا لگتا جیسے یہ بادل کچھ چکر سا کھا کر گزر رہے ہوں۔ چھتوں سے پانی کی ننھی ننھی بوندیں ٹپک

ٹپک کر فضا میں گیت بکھیر رہی تھیں۔ سڑک کے کنارے اگے ہوئے بید پر گوریاں اس قدر زور سے چہچہاتیں کہ اور سب آوازیں ڈوب کر رہ جاتیں۔ ہر طرف ابھرتی ہوئی زندگی کی پرمسرت گہما گہمی نظر آتی۔

برف پگھل چکا تھا لیکن گڑھوں اور سائے دار جگہوں میں اسپنج کے گندے گندے ٹکڑوں کی سی شکل میں ابھی تک موجود تھا۔ برف پگھلا اور بھیگی بھیگی سی گرم دھرتی کے چہرے سے جیسے نقاب ہٹ گئی۔ دھرتی نے جاڑے بھر خوب آرام کیا تھا اور اب اس میں نئی جان پڑ گئی تھی۔ اناج اور ہریالی کو جنم دینے کی خواہش دو چند ہو گئی تھی۔ سیاہ کھیتوں سے بھاپ کی دھواں دھواں سی لہریں اٹھیں اور ہوا میں بھیگی ہوئی دھرتی کی سوندھی خوشبو بس گئی — بہار کی یہ تازہ، سبک اور نشہ‌آور خوشبو شہروں میں بھی سینکڑوں خوشبوؤں کے درمیان الگ سے الگ پہچانی جا سکتی ہے۔ یہ جان آفرین خوشبو میری روح میں بس گئی اور مجھے ایسا لگا کہ اس کے ساتھ ساتھ روح پر بہار کی لطیف اور دلکش افسردگی چھا گئی ہے، اس افسردگی میں دھندلی سی امیدیں اور آرزوئیں انگڑائیاں لے رہی تھیں۔ روح پر وہ شاعرانہ اداسی چھائی ہوئی تھی جو نظر پر ایسا جادو کرتی ہے کہ اچانک ہر عورت جیسے حسین اور دلکش روپ دھار لیتی ہے، ساتھ ہی پچھلی بہاروں کی

یاد اور دکھ کا دبا دبا سا احساس دل میں چٹکیاں لیتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ راتیں گرم ہو گئیں اور اس نم سی فضا اور گھپ اندھیرے میں فطرت کی ان‌دیکھی تخلیقی قوتیں بڑی سبک روی سے اپنا کام کرتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

بہار کے ان دنوں میں لمحے بھر کو بھی میرے ذہن سے اولیسیا کا تصور نہیں ہٹا۔ تنہائی نصیب ہوتے ہی میں لیٹ جاتا اور تصور کے جھولے میں جھولنے کے لئے آنکھیں بند کر لیتا، میری نظروں کے سامنے اس کا چہرہ ابھرتا جو کبھی ترش اور سخت ہوتا تو کبھی دلکش مسکراہٹ سے دمک اٹھتا۔ میں اس کے نوجوان جسم کو یاد کرتا۔ جو قدیم جنگلوں کی آزاد فضا میں بڑھے ہوئے نوجوان صنوبر کی طرح نازک اور تناور تھا۔ مجھے اس کی شگفتہ آواز یاد آتی اور اس کے انتہائی مدھم مدھم اور ریشمی ریشمی سے سر یاد آنے لگتے۔ ''اس کی ہر ادا میں، اس کے ہرھر بول میں ایک عجیب عظمت ہے،، میں نے سوچا (کتنا عام ہو گیا ہے یہ لفظ ''عظمت،، لیکن نہیں میں یہاں یہ لفظ اپنے بہترین معنی میں استعمال کر رہا ہوں)۔ ''ایک عجیب بےساختگی، عجیب وقار ہے اس کے کردار میں۔ ،، ایک اور چیز نے مجھے اولیسیا کی طرف کھینچا۔ اور وہ تھا وہ پراسرار سا ہالہ جو اس کے وجود کے گرد بنا ہوا تھا، جنگلوں اور دلدل میں رہنےوالی ساحرہ جیسی طلسماتی شہرت، خوداعتمادی، اپنی

طاقت پر ناز اور یقین — یہ تھیں وہ چیزیں جنھوں نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔ اس کی یہ خصلت اس کی کبھی ہوئی گنتی کی چند باتوں سے جھلکتی رہتی تھی۔

ظاہر ہے جنگلی راستے کے خشک ہوتے ہی میں جادوگرنی کی جھونپڑی کی طرف چل پڑا۔ لڑاکو بڑھیا کو خوش کرنے کی خاطر میں نے اپنے ساتھ پاؤ بھر چائے اور تھوڑی سی شکر بھی لے لی۔

وہ دونوں گھر پر ہی تھیں۔ مانوئلیخا دھکتے ہوئے چولہے سے مصروف پیکار تھی اور اولیسیا ایک اونچے سے بنچ پر بیٹھی سن کات رہی تھی۔ جب میں اندر داخل ہوا تو دروازے کی آواز ہونے سے اس نے مڑکر دیکھا۔ اس کا دھاگہ ٹوٹ گیا اور تکلا زمین پر لڑھکنے لگا۔

بڑھیا نے چند لمحے بڑے غصے سے میری طرف دیکھا۔ اس نے اپنے جھریوں بھرے چہرے کو چولہے کی گرمی سے بچانے کے لئے ہتیلی کا سایہ کر رکھا تھا۔

''آداب‌عرض، نانی!،، میں نے جوش سے بھرپور آواز میں زور سے کہا۔ ''غالباً آپ نے پہچانا نہیں مجھے؟ یاد ہے، پچھلے مہینے میں راستہ پوچھنے ادھر آنکلا تھا؟ اور آپ نے میری قسمت بتائی تھی، یاد ہے؟،،

''مجھے کچھ یاد نہیں، میاں،، وہ خفگی سے سر ہلاکر بڑبڑائی ''کچھ یاد نہیں، سمجھ میں نہیں آتا تمھیں کیا ضرورت پڑگئی یہاں آنے کی، ہمارا تمھارا کیا

جوڑ ہے، بھلا؟ ہم معمولی جاہل لوگ ہیں، تمہیں ہم سے کیا سروکار ۔ جنگل بہت وسیع ہے ۔ میاں جاؤ کہیں اور چہل قدمی کرو، بس ...،،

میں اس غیردوستانہ استقبال کو دیکھ کر ایسا گھبرایا کہ ہوش و حواس کھو بیٹھا ۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں کیا نہ کروں، اس بد تمیزی کو مذاق میں ٹال دوں، غصے میں چیخنے لگوں یا ایک لفظ کہے بغیر خاموشی سے واپس چلا جاؤں ۔ میں نے بے کسی سے بے اختیار اولیسیا کی طرف دیکھا ۔ وہ بڑی خوش مزاجی کے ساتھ ذرا طنزیہ سے انداز میں دھیرے سے مسکرائی ۔ چرخے کے پاس سے اٹھی اور بڑھیا کے پاس گئی ۔

’’ڈرو نہیں، دادی،، اس نے تسلی دی ۔ ’’یہ آدمی برا نہیں ہے، یہ ہمیں کوئی تکلیف نہیں دے گا ۔ تشریف رکھئے، جناب ۔ ،، اس نے بڑھیا کی بڑبڑاہٹ کو نظر انداز کرکے سامنے والے کونے میں بچھے ہوئے بنچ کی طرف اشارہ کیا ۔

اس کی توجہ سے میری ہمت بڑھی اور میں نے سب سے زیادہ موثر طریقہ آزمایا ۔

’’آپ کتنی کھری ہیں، نانی! مہمان داخل ہو نہیں کہ آپ نے اسے برا بھلا کہنا شروع کر دیا اور میں آپ کے لئے تحفہ لایا ہوں،، میں نے تھیلے سے پوٹلیاں نکالیں ۔

مانوئلیخا نے ایک نظر پوٹلیوں کی طرف دیکھا اور فوراً چولھے کی طرف مڑ گئی۔

"مجھے نہیں چاھئیں تیرے تحفے،، وہ غصے میں چمٹے سے کوئلے کریدتے ہوئے بڑبڑائی۔ "تم جیسوں کی اصلیت سے خوب واقف ہوں میں۔ پہلے تو للو پتو کرکے دل میں گھر کر لیتے ہو اور پھر... تمھارے اس تھیلے میں ہے کیا؟،، اچانک اس نے میری طرف پلٹ کر پوچھا۔

میں نے چائے اور شکر اس کی طرف بڑھائی تو اس کا غصہ ذرا ٹھنڈا پڑا۔ وہ اب بھی بڑبڑا رہی تھی لیکن اب آواز میں پہلے جیسی خفگی نہ تھی۔ اولیسیا پھر کتائی میں لگ گئی اور میں اس کے قریب ایک نیچے سے ٹوٹے پھوٹے بنچ پر بیٹھ گیا۔ وہ بائیں ہاتھ سے نہایت پھرتی سے سفید اور نرم ڈھیر سے دھاگہ بٹتی اور دائیں ھاتھ سے ہلکی سی گھرگھراھٹ کے ساتھ تکلا کاتتی جاتی۔ ہر بار تکلا نیچے زمین تک جاتا، اور پھر وہ انتہائی ہوشیاری سے اسے اٹھاتی اور اپنی انگلی کی ھلکی سی جنبش سے گھما دیتی۔ وہ نہایت اطمینان اور آسانی سے اپنا کام کر رہی تھی۔ پہلی نظر میں تو یہ کام بہت ھی آسان معلوم ہوتا تھا لیکن حقیقتاً اس کےلئے انتہائی مہارت اور پھرتی کی ضرورت تھی جو مدتوں کی کوششوں سے حاصل ہوتی ہے۔ میری نظریں بار بار ان ھاتھوں پر پڑ رہی تھیں جنھیں چوبیس گھنٹے کی محنت نے سیاہ اور

کھردرا کردیا تھا لیکن یہ چھوٹے چھوٹے ھاتھ اس قدر خوبصورت تھے کہ سوسائٹی کی بہت سی خواتین کو ان پر رشک آئے۔

''پچھلی دفعہ آپ نے مجھے بتایا ھی نہیں کہ نانی نے آپ کی قسمت دیکھی تھی،، اولیسیا نے کہا۔ اور میری نظروں میں گھبراھٹ اور پریشانی دیکھ کر بولی ''ان کی پروا نہ کرو۔ وہ تو بہری ھیں، کچھ نہیں سنیں گی۔ صرف میری آواز سنتی ھیں نانی۔،،

''ھاں دیکھی تو تھی، کیوں؟،،

''بس یوں ھی پوچھ رھی تھی۔ آپ کو یقین ھے اس پر؟،، اس نے دزدیدہ نظروں سے مجھے دیکھا اور جلدی سے نظر جھکالی۔

''کس چیز پر؟ تمھاری نانی کے بتائے ھوئے پر یا عام طور پر قسمت دیکھنے دکھانے پر؟،،

''میرا مطلب ھے عام طور سے۔،،

''بھئی، مشکل ھے کچھ کہنا۔ یقین تو نہیں ھے، مگر پھر بھی ... کون کہہ سکتا ھے؟ کہتے ھیں کبھی کبھی بالکل ٹھیک نکلتی ھے۔ ارے بڑی بڑی کتابوں میں ذکر آیا ھے ان باتوں کا۔ تمھاری نانی نے مجھے جو کچھ بتایا ھے اس پر مجھے ذرا بھروسہ نہیں۔ کوئی بھی دیہاتن اس قسم کی باتیں بتا سکتی ھے۔،،

اولیسیا مسکرائی۔

''ھاں یہ تو ٹھیک ھے کہ اب بچاری کو اچھی

طرح نظر نہیں آتا ۔ بوڑھی ہوئیں، اور پھر ڈرتی بھی بہت ھیں ۔ مگر پتوں سے کیا نکلا؟‘‘

’’کوئی خاص بات نہیں تھی، مجھے تو یاد بھی نہیں رہا اب، وھی گھسی پٹی باتیں: لمبا سفر، بےحساب منافع... بھئی، میں تو بھول گیا ۔ ‘‘

’’ھاں اب وہ قسمت بتانے کے کام کی نہیں رھیں ۔ بڑھاپے کی وجہ سے بہت سی باتیں بھول جاتی ھیں ۔ پھر بھلا قسمت کیا دیکھیں‌گی؟ اور پھر ڈرتی بھی ھیں ۔ البتہ روپیہ دیکھ کر کبھی کبھار بتانے بیٹھ جاتی ھیں ۔ ‘‘

’’لیکن ڈرتی کیوں ھیں وہ؟‘‘

’’ظاھر ھے حکام سے ڈرتی ھیں ۔ اریادنک جب کبھی آتا ھے انھیں تنگ کرتا ھوا آتا ھے ۔ ’میں جب چاھوں تب تمھیں گرفتار کر سکتا ھوں، وہ کہتا ھے۔ ’جانتی ھو تم جیسی جادوگرنیوں کو جادو ٹوٹکوں کی کیا سزا ملتی ھے؟ زندگی بھر کو کالے پانی بھجوا دوں‌گا ۔ ، آپ کا کیا خیال ھے، وہ جھوٹ کہتا ھے یا سچ؟‘‘

’’نہیں، بالکل جھوٹ تو نہیں کہتا ۔ اس قسم کی باتیں قابل گرفت ضرور ھیں، مگر اتنا بڑا گناہ نہیں ھے یہ ۔ اور اولیسیا تم، تم دیکھ سکتی ھو قسمت؟‘‘

وہ لمحے بھر کے لئے کچھ جھجکی۔

’’ھاں، لیکن روپئے کی خاطر نہیں‘‘ اس نے جلدی سے کہا ۔

14*

"میرے لئے پھیلاؤگی تاش؟"
"نہیں" اس نے نرمی سے مگر زور دے کر کہا۔
"مگر کیوں؟ اس وقت نہیں، پھر کسی دن سہی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم جو کچھ کہوگی ٹھیک کہوگی۔"
"نہیں، نہیں بتاؤں گی، ہرگز نہیں بتاؤں گی۔"
"اوہ، اولیسیا، دیکھو یہ زیادتی ہے تمہاری۔ ہماری پہلی ملاقات کی لاج رکھو، انکار نہ کرو۔ آخر انکار کی وجہ کیا ہے؟"
"کیونکہ میں آپ کے لئے پہلے ہی تاش پھیلا چکی ہوں دوسری دفعہ پھیلانا منع ہے..."
"منع ہے؟ مگر کیوں؟ میں سمجھا نہیں کچھ۔"
"نہیں، نہیں، منع ہے، بالکل منع" اس نے انتہائی سہمی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔ "قسمت کو دو دفعہ چھیڑنا منع ہے... یہ نہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے، اسے پتہ چل جائے، آپ کی بات اس کے کان میں پڑ جائے۔ قسمت کو دخل در معقولات پسند نہیں۔ اسی لئے تو قسمت بتانے والوں کی زندگی ہمیشہ ناکام اور اداس رہتی ہے۔"
میں اولیسیا کی بات کے جواب میں کوئی چٹکلہ چھوڑنا چاہتا تھا مگر کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کے الفاظ میں اس قدر یقین اور ایسا خلوص تھا کہ جب قسمت و تقدیر کا ذکر کرنے کے بعد اس نے خوفزدہ

نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا تو میں بھی بےاختیار ادھر دیکھنے لگا۔

"اچھا، خیر تاش نہ پھیلاؤ مگر کم سے کم یہ تو بتا دو کہ پچھلی دفعہ کیا نکلا تھا۔" میں نے منت کی۔

اچانک اس نے تکلا پھینکا اور دھیرے سے میرا ہاتھ چھوا۔

"نہیں، میں نہیں بتاؤں گی" اور اس کی آنکھوں میں بچوں کی سی منت جھلکنے لگی۔ "خدا کےلئے نہ پوچھئے۔ مجھے کوئی نیک فال نظر نہ آ سکی۔ نہیں، خدا کےلئے کچھ نہ پوچھئے۔"

لیکن میں بضد رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اولیسیا کے اس انکار اور قسمت کے متعلق اس کے ان مبہم مبہم سے اشاروں میں پیشہ‌ور نجومیوں کا سا تصنع تھا یا وہ واقعی جو کچھ کہہ رہی تھی پورے یقین اور صدق دل سے کہہ رہی تھی۔ بہرحال جو بھی ہو میں کچھ بےکل سا ہو گیا، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ مجھ پر کچھ خوف کا سا جذبہ طاری ہو گیا۔

"اچھا خیر، لائیے بتا ہی دوں" آخر اولیسیا تیار ہو گئی۔ "مگر ایک بات یاد رکھئے، کاروبار کاروبار ہے، اگر میں کوئی ایسی ویسی بات بتاؤں جو آپ کو پسند نہ آئے تو دیکھئے خفا نہ ہوئیے مجھ پر۔ ہاں تو تاش سے پتہ چلا کہ: آپ بھلے آدمی ہیں مگر

ذرا کچی طبیعت کے ہیں۔ آپ کی نیکی اچھی نہیں ہے، اس میں دلی خلوص کا رنگ نہیں ہے۔ آپ کو وعدے کا پاس نہیں رہتا۔ آپ چاہتے ہیں کہ سب پر حاوی رہیں مگر اپنی خواہش کے خلاف ان سے ہار مان لیتے ہیں۔ آپ کو شراب کی لت ہے، اور... اوہ، اچھا خیر، اب شروع کر ہی دیا ہے تو سب ہی کچھ بتا دوں۔ حسین عورتیں آپ کی بڑی کمزوری ہیں اور ان کی وجہ سے زندگی میں بہت ٹھوکریں کھائیں گے۔ آپ کی نظر میں روپے کی کوئی قیمت نہیں ہے اور جمع جوڑنے کے فن سے بھی ناواقف ہیں۔ آپ کے پاس کبھی دولت کی فراوانی نہیں ہوگی۔ کہئیے اور بتاؤں؟،،

”ہاں، جو کچھ معلوم ہے سب بتاؤ۔،،

”پتہ چلا ہے کہ آپ کی زندگی زیادہ خوشگوار نہیں ہوگی۔ کسی سے بھی دل کی گہرائیوں سے محبت نہیں کریں گے کیونکہ آپ کا دل جذبات سے عاری اور بے جان ہے۔ اور ہاں آپ ان سب کے لئے دکھ اور مصیبت کا باعث بنیں گے جو آپ کو دل سے چاہیں گے۔ آپ کی شادی نہیں ہوگی، یونہی کنوارے مریں گے۔ زندگی بھر کبھی کوئی بڑی خوشی میسر نہیں آئے گی بلکہ بہت سی سختیوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور پھر ایک دن آپ کا دل چاہے گا کہ اپنی زندگی کا خاتمہ کر دے... کوئی... ہاں آپ کی زندگی کا ایک واقعہ آپ کو خودکشی پر

مجبور کرے گا... لیکن آپ کی ہمت جواب دے جائیگی اور آپ زندگی سے سمجھوتہ کرلیں گے۔ زندگی بھر روپے کی تنگی رہے گی لیکن آخر میں بالکل اتفاقی طور پر آپ کے کسی پیارے کی موت کے بعد آپ کی قسمت بدل جائے گی۔ لیکن یہ سب بہت سال بعد ہوگا اور اس سال... میں ٹھیک نہیں جانتی کہ کب لیکن تاشوں کا کہنا ہے کہ بہت جلد۔ شاید اسی مہینے...،،

''ہاں کیا ہوگا اس سال؟،، وہ پھر رکی تو میں نے اس سے پوچھا۔

''نہیں، آگے بتانے سے ڈر لگ رہا ہے مجھے، سچ! چڑی کی ملکہ آپ پر بری طرح عاشق ہو جائے گی! کچھ کہہ نہیں سکتی وہ شادی‌شدہ ہے یا کنواری، لیکن اتنا جانتی ہوں کہ اس کے بال سیاہ ہیں...،،

میں نے بےاختیار اولیسیا کے سر پر نظر ڈالی۔

''مجھے کیوں دیکھ رہے ہیں؟،، اچانک وہ میری نظروں کا مطلب بھانپ کر شرم سے سرخ ہو گئی۔ بعض عورتوں میں نگاہ محبت کو بھانپنے کا یہ تحت‌جذبہ بہت شدید ہوتا ہے، وہ میری نگاہوں کا مطلب بھانپ گئی۔ ''ہاں، تقریباً ایسے ہی سیاہ بال،، اس نے بال سنوارتے ہوئے کہا اور بےاختیار اور بھی زیادہ شرما گئی۔

''چڑی کی ملکہ بری طرح عاشق ہو جائے گی! کیوں؟،، میں نے مذاقاً کہا۔

''مذاق نه اڑائیے میرا ۔ مزاق نه اڑائیے،، اس نے انتہائی خلوص بلکه سختی سے میری تنبیه کی ۔ ''میں آپ کو سچ سچ بتا رہی ہوں ۔ ،،

''اچھا، اچھا، نہیں ہنسوں گا، نہیں ہنسوں گا ۔ ہاں تو اور کیا نکلا؟،،

''اور... اوه! اس ملکه کا حشر بہت خراب ہوگا، موت سے بھی زیاده بھیانک ۔ وه آپ کی وجه سے بہت ذلت اٹھائے گی ۔ اس ذلت، اس دکھ کو وه زندگی بھر نه بھلا سکے گی ۔ لیکن اس کی وجه سے آپ پر کوئی برا اثر نہیں پڑے گا ۔ ،،

''سنو، اولیسیا، کہیں تمھارے تاشوں نے غلط تو نہیں بتایا؟ میں چڑی کی ملکه کے ساتھ ایسا برا سلوک کیوں کروں گا بھلا؟ میں تو بچارا خاموش طبیعت اور منکسر مزاج آدمی ہوں، تم نے اتنی بہت سی برائیاں میرے سر مڑھ دیں ۔ ،،

''معلوم نہیں، مگر آپ جان بوجھ کر یه سب تھوڑی ہی کریں گے، لیکن مصیبتوں کے یه سارے پہاڑ آپ کی وجه سے ٹوٹیں گے ۔ جب میری بات ٹھیک ثابت ہوگی تو مجھے یاد کریں گے ۔ ،،

''اولیسیا، یه سب تاشوں نے بتایا ہے تمھیں؟،،

اس نے فوراً میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا ۔ اور جب دیا تو بات ٹالتے ہوئے دیا ۔

''تاشوں نے بھی بتایا،، وه ہچکچا رہی تھی ۔ ''مگر میں تو تاشوں کے بغیر بھی بہت کچھ بتا سکتی

ہوں۔ کہیں تو آدمی کا چہرہ دیکھ کر بتا دوں۔ ارے اگر کوئی بہت جلد کسی خوفناک موت کا شکار ہونے والا ہے تو مجھے فوراً اس کے چہرے پر لکھا ہوا نظر آ جاتا ہے۔ مجھے اس سے بات کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔''

''مگر آخر ایسا کیا نظر آتا ہے اس کے چہرے پر؟''

''پتہ نہیں۔ بس اچانک میں دہشت زدہ سی ہو جاتی ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میرے سامنے مردہ کھڑا ہو۔ نانی سے پوچھ لو، وہ گواہ ہیں کہ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ پچھلے سال چکی والے تروفیم اپنی مل میں پھندا باندھ کر پھانسی پر لٹک گیا تھا۔ میں نے اس کی موت سے دو دن پہلے اسے دیکھا اور چھوٹتے ہی نانی سے کہہ دیا: 'نانی، دیکھ لینا، تروفیم بہت جلد بڑی خوفناک موت مرے گا'، اور وہی ہوا۔ پچھلے سال کرسمس کے بعد گھوڑوں کا چور یاشکا یہاں آیا اور اس نے نانی سے قسمت پوچھی۔ نانی نے تاش پھیلا کر بتانا شروع کیا تو اس نے مذاقاً نانی سے پوچھا: ''نانی جی، یہ تو بتاؤ کہ میں کیسی موت مروں گا؟''، وہ یہ کہہ کر ہنسا مگر میں نے اس کی طرف دیکھا اور جیسے شل سی ہو گئی۔ یاشکا اسی طرح بیٹھا تھا، مگر اس کے چہرے پر موت کی پیلی کھنڈ جم چکی تھی... اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ سیاہ۔ اور پھر ہفتے بھر بعد ہم نے سنا کہ

یاشکا گھوڑے چرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کسانوں نے اسے پکڑ لیا۔ وہ رات بھر اسے مارتے رہے، ارے یہاں والے بڑے بےرحم اور ظالم ہیں۔ ہاں تو انھوں نے اس کی ایڑیوں میں کیلیں گاڑ دیں اور مار مار کر اس کی پسلیاں توڑ ڈالیں، صبح ہوتے ہوتے بچارا ٹھنڈا ہو گیا۔"

"مگر تم نے اس سے کہا کیوں نہیں کہ وہ مصیبت میں پھنسنے والا ہے؟"

"میں کیوں کہوں؟" اولیسیا نے جواب دیا۔ "بھلا آدمی تقدیر کے لکھے سے بچ کر کہاں جائیگا؟ بیکار زندگی کے آخری دنوں میں پریشان رہتا۔ مجھے تو خود بڑا عجیب سا لگتا ہے کہ مجھے سب کچھ کیسے پتہ چل جاتا ہے۔ بعض بعض دفعہ تو مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ مگر میں کیا کروں؟ میری قسمت ہے۔ نانی بھی جب جوان تھیں تو اسی طرح موت کی پیش گوئی کر دیتی تھیں۔ اور میری ماں بھی۔ اور نانی کی ماں بھی۔ اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے، یہ تو ہمارے خون میں ہے۔"

اس نے کتائی بند کر دی اور سر جھکا کر بیٹھ گئی، اس کے ہاتھ خاموشی سے گود میں رکھے ہوئے تھے۔ اس کی ساکت آنکھوں اور پھیلی پھیلی پتلیوں سے عجیب بھیانک خوف جھانک رہا تھا جیسے اس کا پورا وجود بےاختیار ان پراسرار طاقتوں اور اس حیرت‌انگیز اور غیرفطری علم کے آگے جھک گیا ہو جو اس کی روح میں بسا ہوا تھا۔

ٹھیک اسی وقت مانوئلیخا نے میز پر صاف ستھرا تولیہ بچھایا جس کے کنارے پر کشیدہ بنا ہوا تھا۔ بڑی بی نے تولئے پر بھاپ نکلتا ہوا ایک پیالہ رکھ دیا۔

''اولیسیا، کھانا تیار ہے۔'' اس نے نواسی کو پکارا اور لمحے بھر تذبذب کے بعد مجھ سے مخاطب ہوئی: ''کیوں، جناب، آپ ہمارے کھانے میں شریک نہیں ہوں گے؟ آئیے، کھانا حاضر ہے، مگر ہمارا کھانا غریبا موٗ ہے۔ لے دے کر بس ایک شوربہ۔''

اس نے بہت زیادہ اصرار نہیں کیا۔ میں انکار کرنا چاہتا تھا کہ اولیسیا نے بڑی دلکشی، سادگی اور دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ مجھے بلایا اور میں انکار نہ کر سکا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے مجھے دلیئے کے شوربہ کی پلیٹ دی جس میں سور کی چربی، پیاز، آلو اور چوزہ پڑے ہوئے تھے۔ سوپ بے حد خوش ذائقہ اور مقوی تھا۔ نانی نواسی دونوں میں سے ایک نے بھی کھانے پر بیٹھتے ہوئے صلیب کا نشان نہیں بنایا۔ کھانے کے وقت میں دونوں عورتوں کی ہر حرکت کا جائزہ لیتا رہا کیونکہ میرا خیال ہے کہ لوگ ہر موقع سے زیادہ کھاتے ہوئے اپنے کردار کا صحیح مظاہرہ کرتے ہیں۔ مانوئلیخا بہت تیزی اور ہوس کے ساتھ سوپ پی رہی تھی، کھاتے ہوئے چپڑ چپڑ کر رہی تھی اور منہ میں روٹی کے بڑے بڑے ٹکڑے رکھ

رہی تھی، جس سے اس کے پچکے ہوئے رخسار پھول گئے تھے۔ اس کے برخلاف اولیسیا کے کھانے کے انداز سے بہت ہی تمیز اور تہذیب کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔

کھانے کے گھنٹے بھر بعد میں جادوگرنی کی جھونپڑی کے باسیوں سے رخصت ہوا۔

''آپ کہیں تو میں کچھ دور آپ کے ساتھ چلوں؟،، اولیسیا نے کہا۔

''ساتھ جانے کی کیا مصیبت ہے بھلا؟،، مانوئلیخا غصے میں بڑبڑائی۔ ''تھوڑی دیر نچلا نہیں بیٹھا جاتا تجھ سے، چلبلی۔ ،،

لیکن اولیسیا اتنی دیر میں سرخ کشمیری چادر اوڑھ چکی تھی۔ اچانک وہ بھاگتی ہوئی نانی کے پاس گئی اور اس کے گلے میں باہیں ڈال کر زور سے اسے پیار کر لیا۔

''نانی، میری پیاری نانی۔ بس منٹ بھر کے لئے۔ بس ابھی واپس آئی۔ ،،

''اچھا، اچھا،، بڑھیا نے نقاہت سے احتجاج کیا۔ ''تم اس کی باتوں کو نظر انداز کر دینا، بھائی، بالکل پگلی ہے۔ ،،

ہم ایک تنگ سی پگڈنڈی پر ہوتے ہوئے جنگلی راستے پر آ گئے جو کیچڑ کی وجہ سے سیاہ ہو رہا تھا، گھوڑوں نے راستے کو خوب خوب روندا تھا اور اس پر گاڑی کے پہیوں نے نالیاں سی بنا دی تھیں۔

ان نالیوں میں پانی بھرا ھوا تھا اور پانی میں غروب آفتاب کا سنظر چمک رہا تھا۔ ھم سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگے جس پر پچھلے سال کی مرجھائی ھوئی پتیوں کا جال بچھا ھوا تھا۔ برف کی وجہ سے پتیاں ابھی تک نم نم سی تھیں۔ جا بجا بڑے بڑے گھنٹی‌نما پھول پتیوں کے زرد انبار سے ارغوانی سر نکال رہے تھے۔ پولیسئے میں سب سے پہلے انھیں پھولوں پر بہار آتی ھے۔

''اولیسیا، سنو،، میں نے کہنا شروع کیا ''ایک بات پوچھوں؟ لیکن مجھے ڈر ھے کہیں تم مجھ سے خفا نہ ھو جاؤ۔ اچھا خیر بتاؤ، کیا یہ صحیح ھے کہ تمھاری نانی ... اف کیسے کہوں؟،،

''جادوگرنی ھیں؟،، اس نے پرسکون انداز میں جملہ پورا کر دیا۔

''نہیں، جادوگرنی نہیں،، میں ھکلایا۔ ''ھاں، اچھا، جادوگرنی ھی کہہ لو۔ لوگ طرح طرح کی حماقت کی باتیں کہتے ھیں۔ شاید وہ کچھ جڑی بوٹیوں، کچھ دواؤں اور ٹونوں سے واقف ھوں‌گی۔ تم چاھو میرے سوال کا جواب دو چاھو نہ دو۔،،

''کیوں نہیں؟ مجھے کوئی اعتراض نہیں ھے،، اس نے سادگی سے جواب دیا۔ ''ھاں وہ جادوگرنی ھیں۔ لیکن اب تو وہ بوڑھی ھو گئیں، اب وہ سب نہیں کر سکتیں جو کبھی کیا کرتی تھیں۔،،

''اور پہلے کیا کر سکتی تھیں وہ؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''سب کچھ کر سکتی تھیں، وہ لوگوں کو اچھا کر دیتی تھیں، دانت کا درد ٹھیک کرتی تھیں، خون بند کر سکتی تھیں، پاگل کتے یا سانپ کے کاٹے کا توڑ کر سکتی تھیں، خزانے ڈھونڈ نکالتی تھیں — کوئی کام ایسا نہیں تھا جو وہ نہ کر سکتی ہوں۔''

''جانتی ہو، اولیسیا، معاف کرنا، اولیسیا، مگر میں اس قسم کی باتوں میں یقین نہیں رکھتا۔ میرے ساتھ کھل کے بات کرو۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ لوگوں کو بےوقوف بنانے کے ڈھکوسلے ہیں یہ سب، ہیں نا؟''

اس نے کندھے جھٹکے۔

''جو چاہیں سمجھیں، ظاہر ہے دیہاتیوں کو بےوقوف بنانا کیا مشکل ہے، مگر آپ جیسے پڑھے لکھے آدمی کو دھوکا دینے کا کیا سوال۔''

''تو تمھیں جادو سحر پر پورا پورا اعتقاد ہے؟''

''بالکل! ہمارے پورے خاندان نے آزمایا ہے، خود میں بھی بہت کچھ کر سکتی ہوں۔''

''اولیسیا، پیاری ... تمھیں کیا معلوم، اولیسیا، مجھے ان چیزوں میں کس قدر دلچسپی ہے۔ مجھے کبھی کوئی جادو نہیں دکھاؤگی، اولیسیا؟''

''کیوں نہیں؟'' اس نے فوراً حامی بھری۔ ''کیوں، ابھی دکھاؤں؟''

”ہاں ممکن ہو تو ضرور دکھاؤ۔“
”ڈروگے تو نہیں؟“
”اب بکواس شروع کر دی تم نے۔ رات ہوتی تو ڈرنے کا کوئی سوال بھی تھا، لیکن ابھی تو دن کی روشنی باقی ہے۔“
”اچھا لائیے‘ اپنا ہاتھ لائیے۔“
میں نے حکم کی تعمیل کی۔ اس نے تیزی سے میرے اورکوٹ کی آستین موڑکر اوپر چڑھائی اور کف کا بٹن کھول ڈالا، پھر اپنی جیب سے پانچ انچ لمبا خنجر نکالا اور جھٹکے سے اس کا چرمی غلاف اتار دیا۔
”یہ کیا کر رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔ میرے دل میں خوف کا ذلیل سا احساس ابھرا۔
”لیجئے ابھی، آپ نے تو کہا تھا ڈریں گے نہیں!“
اچانک اس کے ہاتھ کو برائے نام جنبش ہوئی۔ اور مجھے اپنی کلائی پر، نبض سے ذرا اوپر تیز چاقو کا تکلیف‌دہ لمس محسوس ہوا۔ زخم سے خون کا فوارہ ابلا اور سرخ سرخ خون میری کلائی سے ٹپک ٹپک کر تیزی سے زمین پر گرنے لگا۔ میں نے مشکل سے چیخ روکی اور مجھے ایسا لگا کہ میرا رنگ فق ہو گیا۔
”ڈرئیے نہیں۔ مروگے نہیں آپ“، اولیسیا ہنسی۔
اس نے زخم کے اوپر سے میرا بازو مضبوطی سے تھاما اور اس پر سر جھکا کر تیزی سے کچھ سرگوشی کرنے لگی۔ اس کا رک رک کر آتا ہوا گرم سانس

میری کھال کو جلا رہا تھا۔ وہ سیدھی ہوئی اور اس نے میرا بازو چھوڑا تو مجھے زخم کی جگہ ایک لال لال خراش کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔

''کہئے، اب تو یقین آیا؟،، وہ خنجر الگ رکھتے ہوئے بڑی مکاری سے مسکرائی۔ ''یا اور دیکھنا چاہتے ہو؟،،

''ہاں ہاں، ضرور۔ مگر اب کے ذرا کم وحشت‌ناک چیز دکھاؤ۔ اور ہاں دیکھو اب خون نہ بہنے پائے۔،،

''کیا دکھاؤں آپ کو؟،، وہ کچھ سوچتے ہوئے مسکرائی۔ ''اچھا، سڑک پر میرے آگے آگے چلئے مگر دیکھئے پیچھے مڑکر نہ دیکھئے گا۔،،

''خطرناک چیز تو نہیں ہوگی، بولو؟،، میں نے کہا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور کوئی کراھیت آمیز اور حیرت‌انگیز چیز کر دکھائے گی، مگر میں ھنس کر ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''نہیں، بالکل نہیں، چلئے۔،،

میں آگے بڑھا۔ مجھے اس تجربے میں انتہائی دلچسپی ہوری تھی اور میں اپنی پشت پر اولیسیا کی نظریں محسوس کر رہا تھا۔ لیکن بیس ایک قدم چلنے کے بعد میں ایک انتہائی ھموار جگہ پر لڑکھڑایا اور اوندھے منہ گر پڑا۔

''چلئے چلئے، بڑھے چلئے،، اولیسیا نے پکارا۔ ''پیچھے مڑکے نہ دیکھئیگا! ڈرئے نہیں، ابھی تو آپ

برسوں جیئں گے، ابھی تو شادی رچائیں گے۔ گرنے لگیں تو زمین پر قدم جمالیں۔ ''

میں چلتا رہا مگر دس قدم چلنے کے بعد ایک دفعہ پھر زمین پر لیٹ گیا۔

اولیسیا قہقہہ مارکر ہنسی اور تالیاں بجانے لگی۔

''کہئے، طبیعت سیر ہوئی؟'' اس نے کہا اور اس کے سفید دانت جھلملا اٹھے۔ ''اب تو یقین آیا؟ خیر غم نہیں... آپ اڑے تو سہی مگر اوپر کی طرف نہیں، نیچے کی طرف۔ ''

''مگر یہ کیا کیسے تم نے؟'' میں نے کپڑوں سے سوکھی ہوئی گھاس کے تنکے اور ڈنڈیاں ہٹاتے ہوئے حیرت سے کہا۔ ''کیوں یہ راز تو نہیں ہے نا؟''

''نہیں، راز بالکل نہیں ہے، ضرور بتاؤں گی آپ کو۔ لیکن مجھے معلوم ہے آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ ہو سکتا ہے میں اچھی طرح بتا بھی نہ سکوں۔''

اس کا خیال ٹھیک تھا — میں پوری طرح اس کی بات نہیں سمجھ سکا۔ لیکن اگر میں ٹھیک سمجھا تو سارا کرتب یہ تھا کہ وہ میرے پیچھے پیچھے ایک خاص فاصلے پر میرے قدم بہ قدم چل رہی تھی، وہ ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھتی رہی اور میری ہر ہر بات کی نقل اتارتی رہی، اس وقت وہ چھوٹی سے چھوٹی چیز میں مجھے اور خود کو ایک سمجھ رہی تھی۔ چند قدم چلنے کے بعد اس نے سوچنا شروع کیا کہ

میرے سامنے تھوڑی دور پر زمین سے تقریباً دس انچ اوپر ایک رسی لٹکی ہوئی ہے۔ جیسے ھی میرے قدموں نے اس خیالی رسی کو چھوا اس نے اچانک گرنے کی سی کوشش کی، اور اس نے کہا کہ ایسی صورت میں مضبوط سے مضبوط آدمی کا گرنا بھی یقینی تھا۔ کافی عرصے بعد ڈاکٹر شارکوٹ کے تجربات کا ذکر پڑھتے ہوئے مجھے اولیسیا کا الجھا ہوا سا بیان یاد آگیا۔ یہ تجربات انھوں نے سلپیترائر کی دو مریضاؤں یعنی دو پیشہور جادوگرنیوں کے سلسلے میں کئے تھے جو ھسٹیریا کا شکار تھیں۔ مجھے یہ پڑھ کر بےحد حیرت ہوئی کہ فرانس کی پیشہور جادوگرنیاں بھی وھی ٹونے کرتی تھیں جو پولیسئے کی حسین جادوگرنی نے اپنائے تھے۔

''میں اور بھی بہت کچھ کر سکتی ہوں،، اولیسیا نے یقین کے ساتھ کہا۔ ''چاھیں تو میں آپ کو خوفزدہ کر دوں۔،،

''کیا مطلب؟،،

''میں چاھوں تو آپ کے بدن میں خوف کی کپکپی دوڑ جائے۔ آپ اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے اچانک اس قدر خوف و دھشت محسوس کریں گے کہ بیٹھے کانپتے رھیں گے مگر مڑکے دیکھنے کی ھمت نہیں ہوگی۔ مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ مجھے یہ معلوم ہے کہ آپ کہاں رہتے ھیں اور میں نے ایک دفعہ آپ کا کمرہ دیکھا ہے۔،،

''تو پھر اس میں کیا مشکل ہے بھلا،، میں نے طنز کیا۔ ''تم اچانک میری کھڑکی کے پاس آکر اس پر دستک دوگی یا کچھ چلانے لگوگی۔ ،،

''نہیں، میں تو یہاں رهوں‌گی، جنگل میں، لیکن میں یہاں گھر میں بیٹھے بیٹھے سوچوں گی کہ میں سڑک پر گئی، پھر آپ کے گھر میں داخل ہوئی، آپ کا دروازہ کھولا اور آپ کے کمرے میں گھس گئی۔ آپ کمرے میں کہیں بیٹھے ہونگے۔ مان لیں میز کے پاس۔ میں تصور ہی تصور میں پیچھے سے چوری چوری آپ کے پاس پہونچ جاؤں‌گی مگر آپ میری آواز نہیں سنیں‌گے — اور میں آپ کا شانہ پکڑ لوں‌گی اور اسے دبانے لگونگی زور سے، اور زور سے اور زور سے اور اس اثنا میں اس طرح آپ کو گھورتی رہوں‌گی — دیکھئے اس طرح...،،

اچانک اس نے پتلی پتلی بھویں چڑھا کر غور سے میرے چہرے کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب وحشت اور بلا کی کشش تھی، اس کی پتلیاں پھیلی جا رہی تھیں اور ان کا رنگ گہرا نیلا ہو گیا تھا۔ مجھے اچانک میدوزا کا سر یاد آ گیا، مصوری کا یہ رنگین نمونہ میں نے ماسکو کی تریتیاکوف آرٹ گیلری میں دیکھا تھا۔ مصور کا نام میرے ذہن سے نکل گیا ہے۔ اولیسیا کی ان تیز اور انوکھی نگاہوں کے بوجھ تلے میرے جسم میں جادو سحر کے خوف سے سنسنی سی دوڑ گئی۔

”اف بند کرو یہ کرتب، اولیسیا“، میں نے مصنوعی ہنسی ہنس کے کہا۔ ”مسکراتے ہوئے تم کہیں زیادہ پیاری لگتی ہو۔ تم کیا جانو ہنستے ہوئے تمھارا چہرہ اس قدر دلکش اور معصوم لگتا ہے۔“

ہم چلتے رہے۔ میں اولیسیا کے انداز بیان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کیا سلجھا ہوا اور مدلل انداز تھا۔ ایک ایک سیدھی سادی ان‌پڑھ لڑکی کی زبان سے یہ باتیں کیسی نازک اور لطیف معلوم ہوتی تھیں۔ میں نے اولیسیا سے کہا: ”جانتی ہو، اولیسیا، مجھے تمھاری کس بات پر حیرت ہوتی ہے؟ تم انسانوں سے دور، جنگلوں کی آغوش میں جوان ہوئی ہو، اور ظاہر ہے بہت زیادہ پڑھنے لکھنے کا موقع بھی نہیں ملا ہوگا تمھیں ...“

”میں بالکل بھی نہیں پڑھ سکتی۔“

”لو، تب تو اور بھی تعجب ہے! تم اس سب کے باوجود بڑی سے بڑی مہذب خواتین کی طرح بات کر سکتی ہو۔ بولو یہ ہنر تم نے کہاں سیکھا؟ اولیسیا، تم سمجھ رہی ہو نا، میں کیا کہہ رہا ہوں؟“

”ہاں سمجھتی ہوں۔ یہ سب نانی کی دین ہے۔ ان کی ظاہری حالت پر نہ جائیے۔ ارے بڑی ہوشیار ہیں وہ! آپ کی صحبت کی عادی ہونے کے بعد ہو سکتا ہے کسی دن آپ سے بھی کھل جائیں۔ وہ سب

کچھ جانتی ہیں، سب کچھ جو چاہو پوچھ دیکھو۔ پوچھ سکتے ہو۔ ظاہر ہے اب تو بچاری بوڑھی ہو گئی ہیں۔"

"انہوں نے تو اپنی زندگی میں بہت کچھ دیکھا ہوگا؟ وہ ہیں کہاں کی؟ پہلے کہاں رہتی تھیں؟"

میرے سوالات اولیسیا کو کچھ پسند نہ آئے۔ اس نے کچھ سوچ بچار کے بعد بےدلی سے جواب دیا۔

"معلوم نہیں"، اس نے رک رک کر جھجکتے ہوئے کہا۔ "یوں بھی نانی اس بارے میں بات کرنا پسند نہیں کرتیں ، اگر کبھی کچھ بتایا بھی تو مجھ سے کہہ دیا کہ اس کان سن اس کان نکال دے اور آئیندہ کبھی منہ نہ کھولیو۔ اچھا اب میں چلی"، اس نے جلدی سے کہا۔ "ورنہ نانی مجھ پر بہت بگڑیں گی۔ خدا حافظ۔ معاف کیجئے گا، مجھے تو آپ کا نام بھی نہیں معلوم۔"

میں نے اپنا تعارف کرایا۔

"ایوان تیموفیئوچ؟ اچھا تو اب خدا حافظ، ایوان تیموفیئوچ! ہماری جھونپڑی سے منہ نہ پھیرئے گا۔ کبھی آیا کریں۔"

میں نے ہاتھ بڑھایا اور اس کے چھوٹے سے قوی ہاتھ نے بڑی گرمجوشی اور دوستی سے مصافحہ کیا۔

اس دن سے میں اکثر جادوگرنی کی جھونپڑی میں آنے جانے لگا۔ میں جب بھی جاتا، اولیسیا ہمیشہ ایک خاص پروقار انداز میں میرا سواگت کرتی۔ مجھے دیکھ کر اس کے بدن میں بےاختیار خفیف سی جنبش ہوتی اور میں سمجھ جاتا کہ اسے میرے آنے سے دلی خوشی ہوئی ہے۔ مانوئلیخا کا اندر ہی اندر بڑبڑانا جاری رہا مگر خیر نواسی کی دبی دبی سی مگر شدید محبت شفاعت اور خلوص کو دیکھ کر نانی بھی اور کسی طرح غیردوستانہ جذبات کا اظہار نہ کرتی۔ اور پھر میں اکثر اس کے لئے تحفے تحائف بھی لاتا رہتا، کبھی گرم رومال لے آیا کبھی ڈبہ بھر جیم اور کبھی اور چیری کی شراب کی بوتل۔ ان تحفوں نے میرے متعلق اس کی رائے بدل دی تھی۔ میرا اور اولیسیا کے درمیان کبھی کوئی معاہدہ نہ ہوا مگر ہمارا خودبخود یہ معمول ہو گیا کہ میری واپسی پر وہ ہمیشہ ارینووا سڑک تک میرے ساتھ جاتی۔ ہم راستے بھر ہمیشہ گرماگرم بحث اور دلچسپ باتیں شروع کرتے رہتے اور ہمارے قدم خودبخود سست بڑھتے اور جنگل کے کنارے ہماری یہ چہل‌قدمی طویل سے طویل تر ہوتی جاتی۔ سڑک تک پہنچنے کے بعد وہ واپس لوٹتی اور میں آدھے میل تک اس کے ساتھ واپس آتا۔ پھر بھی رخصت ہونے سے پہلے ہم

بڑی دیر تک چیڑ کی شاخوں کے خوشبودار سائے میں کھڑے باتیں کرتے رہتے۔

میں اولیسیا کے حسن سے مسحور تھا۔ دل پر اس کا بھرپور کردار، خودرو پودے کی سی اٹھان اور آزاد فطرت کا جادو بھی چل گیا تھا۔ کتنی ذہین تھی وہ، اس کی ذہانت بلور کی طرح شفاف مگر ساتھ ہی خاندانی توہمات کے اٹوٹ بندھنوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ اس کی فطرت میں بچوں کا سا بھولپن اور سادگی بھی تھی اور حسیناؤں کی چنچلتا اور نازو ادا بھی۔ وہ مجھ سے مسلسل ان تمام باتوں کے متعلق سوال کرتی رہتی جو اس کے تصور کے سیدھے سادھے اور دھندلے دھندلے سے افق پر ابھر سکتی تھیں: وہ مجھ سے دوسرے ممالک اور ان کے باسیوں کے بارے میں پوچھتی، قدرت کے کھیل، زمین اور کائنات کی بناوٹ کے متعلق سوال کرتی اور عالم فاضل ہستیوں اور بڑے بڑے شہروں کے بارے میں پوچھتی۔ زندگی کی بہت سی چیزیں اسے حیرت‌انگیز، انوکھی اور ناممکن نظر آتیں، لیکن چونکہ اس سے بات کرتے ہوئے میں ہمیشہ بڑے خلوص اور سادگی سے بات کرتا اور میری بات میں سچائی کو بڑا دخل رہتا اس لئے وہ فوراً میری باتوں پر یقین کر لیتی۔ بعض دفعہ وہ کوئی ایسی بات پوچھ بیٹھتی جو میرے خیال میں اس کے وحشی ذہن کے لئے بہت پیچیدہ ہوتی (یا جس کے متعلق میں خود بہت صاف نہ ہوتا)۔ ایسے موقعوں

پر میں اس کے پرشوق سوالوں کے جواب میں کہہ دیا کرتا : ''اولیسیا، یہ مسئلہ ایسا ہے کہ میں شاید تمھیں سمجھا نہیں پاؤں گا۔ میرے خیال میں تم میری بات نہیں سمجھ سکوگی۔ ''

اور پھر وہ خوشامدیں کرنے لگتی : ''نہیں خدا کے لئے، انکار نہ کریئے، میں سمجھنے کی پوری کوشش کروں گی۔ کم سے کم کچھ تو بتائیے... ہو سکتا ہے آپ کی بات سمجھ میں نہ آئے، پھر بھی...''

اور اس کا یہ شوق دیکھ کر میں عجیب عجیب تشبیہوں اور ناقابل بیان مثالوں کی تلاش کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ اگر کبھی مجھے مناسب الفاظ تلاش کرنے میں ناکامی ہوتی تو اولیسیا طرح طرح کے سوالات کرکے میری ہمت بندھاتی، اس کے یہ سوالات کچھ اس طرح ہوتے جیسے لوگ ہنکلوں کو اٹکتے دیکھ کر ان سے کرتے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ آخرکار اس کا شوق اور ولولہ، اس کا ہمہ گیر ذہن اور اس کا بھرپور تصور مجھ جیسے کم مایہ استاد پر فتح حاصل کرتا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے ماحول اور اس کی تربیت کو دیکھتے ہوئے (بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جنگل کی ہرنیوں جیسی اس زندگی کو دیکھتے ہوئے) اس میں بڑی غیرمعمولی صلاحیتیں پنہاں تھیں۔

ایک دفعہ اتفاقاً میں نے پیٹرسبرگ کا ذکر کر دیا۔ اس نے فوراً مجھ سے پوچھا : ''پیٹرسبرگ کیا ہے؟ کوئی جگہ ہے؟''

”نہیں، جگہ کیا، بہت بڑا شہر ہے۔ روس کا سب سے بڑا شہر۔“

”سب سے بڑا؟ آپ کا مطلب ہے واقعی سب سے بڑا؟ اتنا بڑا کہ اس سے بڑا کوئی اور شہر ہے ہی نہیں؟“ اس نے سادگی سے مجھ سے سوال کیا۔

”ہیں اور کیا۔ ملک کے سارے بڑے بڑے لوگ وہیں رہتے ہیں۔ اور سارے مکان پختہ ہیں۔ لکڑی کا تو ایک مکان بھی نظر نہیں آتا۔“

”تب تو... ہمارے استیپان سے بھی بہت بڑا ہوگا“ اس نے یقین سے کہا۔

”ہاں، ذرا بڑا۔ تقریباً پانچ سو گنا بڑا۔ پیٹرس‌برگ کے ایک ایک مکان میں استیپان بھر کے لوگوں سے دو گنے آدمی رہتے ہیں۔“

”اف میرے خدا! یہ کیسے گھر ہیں!“ اس نے خوفزدہ سا ہوکر پوچھا۔

مجھے ایک دفعہ پھر تشبیہوں اور مثالوں کا سہارا لینا پڑا۔

”خوفناک حد تک بڑے، کوئی پانچ منزل اونچا ہے، کوئی چھ کا اور کوئی سات سات منزل اونچا۔ وہ چیڑ کا درخت دیکھ رہی ہو نا؟“

”کونسا، یہ سب سے اونچاوالا؟ ہاں دیکھ رہی ہوں۔“

”ہاں تو اس درخت جتنے اونچے مکان ہیں وہاں۔ اوپر سے نیچے تک انسانوں سے بھرا پڑا ہے۔

وھاں لوگ باگ چھوٹے چھوٹے کمروں میں رھتے ھیں، کمرے کیا ھیں مرغی کے ڈربے ھیں، بالکل ایک ایک کمرے میں بارہ بارہ آدمی بھرے ھوئے ھیں۔ بچاروں کو تازہ ھوا بھی میسر نہیں آتی۔ اور بعض لوگ تو نیچے رھتے ھیں زیرزمین — سرد اور نم تہہ خانوں میں۔ بعضوں کو تو سال سال بھر سورج کی ایک شعاع بھی میسر نہیں ھوتی۔ "

"اوہ، اف، مجھ سے تو کوئی لاکھ کہے تب بھی اپنا جنگل چھوڑ کر آپ کے اس شہر میں نہ جاؤں،، اس نے سر ھلاکر کہا۔ "میں تو کبھی خریداری کرنے استیپان تک جاتی ھوں تو میرا دل گھبرانے لگتا ھے۔ ھر طرف دھکا پیل، چیخ پکار، تو تو میں میں۔ جنگل کے لئے دل بےتاب ھو جاتا ھے اور لگتا ھے ھر چیز چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جاؤں۔ اللہ بچائے آپ کے اس شہر سے۔ میں تو بھئی کبھی شہر میں نہیں رہ سکتی۔ "

"اور اگر شوھر شہر کا ھوا تب؟،، میں نے ھلکی سی مسکراھٹ کے ساتھ پوچھا۔

اس کی بھویں تن گئیں اور نازک نتھنے پھڑکنے لگے۔

"لو اور سنو!،، اس نے نفرت سے کہا۔ "مجھے نہیں چاھئے شوھر۔ "

"ارے، اولیسیا، سب کہنے کی باتیں ھیں، ساری لڑکیاں ایسی باتیں کرتی ھیں، آخر سب کی شادیاں

ہو جاتی ہیں۔ ذرا ٹھیرو، ابھی کسی سے محبت ہو جانے دو۔ پھر دیکھنا، شہر تو شہر تم تو اس کے ساتھ دنیا کے دوسرے سرے تک جانے کو تیار ہو جاؤگی۔"

"اوہ، نہیں نہیں، یہ ذکر چھوڑیں..."، اس نے خوف‌زدہ ہوکر ہاتھ جھٹکا۔ "ایسی باتوں سے کیا فائدہ بھلا..؟ نہیں، خدا کےلئے یہ باتیں چھوڑئیے۔"

"کیسی پگلی ہو تم، اولیسیا، کیا واقعی تم سمجھتی ہو کہ تمھیں کبھی کسی سے محبت نہیں ہوسکتی؟ ذرا سوچو تو سہی تم کس قدر نوجوان، کتنی دلکش، کیسی البیلی ہو۔ ارے ایک دفعہ خون میں ابال آنے دو، پھر وہ سارے عہد و پیمان بھول جاؤگی جو تم نے اپنے دل سے کئے تھے۔"

"تو کیا ہوا، اگر محبت ہو گئی تو ہو جائے!"، اس نے جواب دیا۔ اور اس کی آنکھوں میں سرکشی کی چمک پیدا ہو گئی۔ "کسی سے اجازت لینے نہیں جاؤں‌گی۔"

"تب تو شادی بھی کر لوگی"، میں نے اسے چھیڑا۔

"آپ کا مطلب ہے گرجا گھر جا کر؟"

"ہاں ہاں، ظاہر ہے گرجا گھر میں ایک پادری تمھیں کلیسا کے منبر کے گرد گھمائےگا، دوسرا گائےگا اور تمھارے سر پر تاج رکھا جائےگا۔"

اس کی نظریں جھک گئیں اور اس نے بجھی بجھی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلایا۔

''نہیں، میرے دوست، نہیں... ممکن ہے آپ کو میری بات بری لگے مگر سچی بات ــ ہمارے خاندان میں آج تک کسی کی شادی گرجا میں نہیں ہوئی۔ میری ماں اور نانی دونوں کی زندگی کٹ گئی مگر انھوں نے گرجا کی صورت نہیں دیکھی۔ گرجا گھر میں گھسنے کی اجازت ہی نہیں ہے ہمیں..!''

''یہ کیوں، محض تمھارے جادو سحر کی وجہ سے؟''

''ہاں، جادو سحر کی وجہ سے'' اس نے سکون سے جواب دیا۔ ''ذرا سوچو میں گرجا کیسے جا سکتی ہوں، میری روح تو پیدا ہوتے ہی ''اس'' کی ہو چکی ہے۔''

''اولیسیا پیاری، میری بات مانو، تم خود کو دھوکا دے رہی ہو۔ تم جو کچھ کہہ رہی ہو بالکل لچر ہے... مضحکہ‌خیز ہے...''

اس کے چہرے میں اپنی پراسرار قسمت کے سامنے سر جھکا دینے کی وہ عجیب و غریب کیفیت پیدا ہو گئی جو میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

''نہیں، آپ نہیں سمجھ سکتے یہ سب ــ مگر میں محسوس کرتی ہوں... یہاں محسوس کرتی ہوں...'' اس نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''اپنی روح میں محسوس کرتی ہوں۔ ہمارا پورا خاندان صدیوں سے معتوب ہے۔ آپ خود ہی سوچیں، اگر ''وہ'' ہماری مدد نہیں کرتا تو پھر کون کرتا

ہے؟ بھلا کوئی معمولی آدمی وہ سب کر سکتا ہے جو میں کرتی ہوں؟ ہماری ساری قوت ''اسی،، کے دم سے ہے۔ ''

جب کبھی یہ انوکھی بحث چھڑتی تو بحث کا انجام ہمیشہ کچھ اسی طرح ختم ہوتا۔ میں نے اس کی سمجھ کے مطابق ہر ممکن دلیلیں دیں، ہلکے پھلکے انداز میں اس کو مسمیریزم، عمل توجہ، ذہنی بیماریوں کے معالج اور ہندستانی فقیروں کے بارے میں بتایا مگر کسی بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بعض وقت میں نے اسے جسمانی ساخت کے متعلق بتایا اور اس طرح اس کے بعض تجربوں کی وضاحت کرنے کی کوشش کی مثلاً میں نے اس سے کہا کہ ایک خاص شریان کو مہارت کے ساتھ دبانے سے خون کا بہاؤ روکنا ممکن ہے، مگر میری ہر کوشش بےکار گئی۔ وہ اور سب باتوں میں مجھ پر جتنا بھروسہ کرتی تھی اس سلسلے میں اتنی ہی درشتی سے میری تمام دلیلوں کو جھٹک دیتی۔

''اچھا خیر، چلئے خون روکنے کے بارے میں آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ مان لیا، مگر اور سب باتیں کیسے ہوتی ہیں؟،، وہ چیخ چیخ کر کہتی۔ ''میں کیا خون روکنے کے سوا اور کچھ جانتی ہی نہیں، کیوں؟ آپ چاہیں تو میں ایک دن کے اندر اندر آپ کے گھر کو چوہوں اور تل چٹوں سے پاک کرکے دکھا دوں؟ آپ کہیں تو سادہ پانی پلا کر دو

دن کے اندر اندر مہلک سے مہلک بخار کا علاج کر دوں، ایسے مریض کو اچھا کر دکھاؤں جس کے بارے میں آپ کے ڈاکٹر بالکل ناامید ہو چکے ہوں؟ میں چاہوں تو ایسا کر سکتی ہوں کہ آپ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کوئی لفظ بھول جائیں۔ اور خوابوں کی تعبیر کیسے نکالتی ہوں؟ مستقبل کے بارے میں کیوں کر بتا دیتی ہوں۔ ''

ہماری لڑائی کا انجام ہمیشہ خاموشی پر ہوتا، مگر دل میں ایک دوسرے کی طرف سے رنجش تو رہ ہی جاتی۔ اس کے جادو سحر کی بہت سی چیزوں کو میں اپنی کم علمی کی وجہ سے غلط ثابت کرنے میں ناکام رہتا تھا۔ نجانے وہ ان تمام رازھائے پنہاں میں سے راز بھی جانتی تھی یا نہیں جن کا ذکر اس قدر سادگی، بھولپن اور یقین سے کرتی تھی۔ مگر بعض بعض چیزیں ایسی تھیں جنھیں دیکھ کر مجھے پورا یقین ہو گیا کہ واقعی اولیسیا ایک ایسے مبہم اور انوکھے فطری علم کی مالک ھے جو انسان اتفاقی قسم کے تجربات کی بنا پر حاصل کرتا ھے۔ جس علم نے آج سے صدیوں پہلے سائنسی علم کی بنیاد ڈالی تھی اس کے سوتے ان پڑھ عوام کے دلوں میں پنہاں ھیں۔ یہ علم عجیب و غریب اور خوفناک توھمات سے لبریز ھے اور ایک عظیم راز کی طرح نسل درنسل انسانوں کے سینوں میں محفوظ رھتا ھے۔

اس بات کو اگر نظرانداز کر دیا جائے کہ ہمارے درمیان انتہائی اختلاف رائے تھا پھر بھی ہم روزبروز ایک دوسرے سے زیادہ قریب آتے چلے گئے۔ ہم نے اب تک اشاروں میں بھی اظہار محبت نہیں کیا تھا، لیکن اب ہمیں ایک دوسرے کے بغیر چین بھی نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھی چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اچانک میری نظریں اولیسیا کی نگاہوں سے ٹکراتیں اور اچانک اولیسیا کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں اور کنپٹی کی نازک سی نیلی رگ تیزی سے پھڑکنے لگتی۔

دوسری طرف میرے اور یرمولا کے تعلقات ہمیشہ ہمیشہ کےلئے خراب ہو چکے تھے۔ میرا جادوگرنی کے ہاں آناجانا اور شام کے وقت اولیسیا کے ساتھ چہل‌قدمی کرنا اس کےلئے راز نہ تھا۔ عجیب بات ہے اسے ہمیشہ ''اپنے'' جنگلوں کا رتی رتی حال معلوم رہتا تھا۔ وہ مجھ سے دور دور رہنے لگا۔ جب کبھی میں جنگل کی طرف جانے کی تیاری کرتا، اس کی کالی کالی آنکھیں دور سے میرا تعاقب کرنے لگتیں۔ وہ زبان سے کبھی کچھ نہ کہتا لیکن اس کی نگاہوں سے ناراضگی اور ملامت ٹپکنے لگتی۔ تعلیم و تربیت کا وہ انوکھا سلسلہ بھی ختم ہوگیا جو ہم نے بڑی سنجیدگی سے شروع کیا تھا۔ کبھی شام کو میں سبق کا ذکر کرتا تو وہ بےدلی سے انکار کر دیتا۔

”اجی کیا ہوگا پڑھ کے؟ بیکار کی بات ہے،،
وہ کاہلی اور نفرت سے کہتا۔

اب ہم شکار پر بھی نہ جاتے۔ جب کبھی میں ذکر چھیڑتا یرمولا کوئی نہ کوئی بہانہ تراش لیتا: بندوق ٹوٹی پڑی ہے، کتا بیمار ہے، وقت نہیں ہے، وغیرہ وغیرہ۔

”وقت نہیں ہے، مالک، کھیت جوتنے ہیں، مالک،، وہ میری دعوت کے جواب میں عام طور پر یہی کہتا۔ میں خوب جانتا تھا کہ وہ کبھی ہرگز ہل نہیں چلائےگا بلکہ سارے دن اس امید میں شرابخانے میں پڑا رہےگا کہ شاید کوئی اسے تھوڑی سی شراب پلا دے۔ میں اس کی اس اندر ہی اندر سلگتی ہوئی خاموش خفگی سے پریشان ہو گیا اور جلد از جلد اسے الگ کرنے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ البتہ اس کے بھرے پورے فاقہزدہ خاندان کی وجہ سے مجھے ہچکچاہٹ ہو رہی تھی، ان غریبوں کے پاس اس کی تنخواہ کے چار روبل کے سوا پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔

۷

ایک بار میں حسب معمول شام کے قریب جادوگرنی کی جھونپڑی میں پہنچا تو اس کے باسیوں کی افسردہ دلی اور مردنی دیکھ کر حیران رہ گیا۔

مانوئلیخا پاؤں سکیڑے سر پکڑے، جھکی جھکی سی پلنگ پر بیٹھی تھی اور جھوم جھوم کر کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ اس نے میرے سلام کا جواب بھی نہ دیا۔ اولیسیا نے حسب معمول بڑے دوستانہ انداز میں سلام کا جواب دیا مگر باتوں کا سلسلہ نہ چل سکا۔ وہ کچھ کھوئی کھوئی سی میری باتیں سنتی رہی اور بےموقع اور بےتکے جواب دیتی رہی۔ اس کے دلکش چہرے سے دلی الجھن کے آثار ہویدا تھے۔

"اولیسیا، میرے خیال میں تم لوگ کچھ پریشان ہو" میں نے یہ کہکر بڑی محبت سے اس کا ہاتھ چھوا جو بنچ پر رکھا ہوا تھا۔

اولیسیا تیزی سے کھڑکی کی طرف مڑ گئی، جیسے وہاں کچھ تک رہی ہو۔ وہ اپنی پریشانی چھپانے کی پوری کوشش کر رہی تھی مگر اس کی کھنچی ہوئی بھویں کانپیں اور وہ شدت جذبات میں نچلا ہونٹ کاٹنے لگی۔

"نہیں، ہمیں کیا تکلیف ہوگی بھلا؟" اس نے بےدلی سے کہا۔ "زندگی اسی پرانے ڈھچر پر چل رہی ہے۔"

"اولیسیا، تم سچ نہیں بول رہیں مجھ سے! دیکھو یہ غلط بات ہے۔ اور میں سوچتا تھا کہ ہم تم ایک دوسرے کے سچے دوست ہیں۔"

"سچ، ایسی کوئی بات نہیں ہے، یہی روزمرہ

کی چھوٹی موٹی پریشانیاں اور الجھنیں ہیں... اور بس...''

''نہیں، اولیسیا، چھوٹی موٹی پریشانیاں نہیں ہیں۔ ذرا صورت تو دیکھو اپنی، چھوٹی موٹی الجھنوں سے یہ حالت نہیں ہو سکتی تمھاری۔''

''آپ کو تو یونہی وہم ہو گیا ہے۔''

''اولیسیا، دیکھو مجھ سے کھل کر بات کرو۔ پتہ نہیں میں تمھاری کچھ مدد کر بھی سکوں گا یا نہیں۔ بہرحال کم سے کم کوئی معقول رائے تو دے ہی سکتا ہوں۔ یوں بھی مجھ سے اپنا دکھ بیان کرکے تمھارا دل ہلکا ہو جائیگا۔''

''نہیں، سچ کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے جس کا ذکر کر سکیں''، اس نے بے صبری سے کہا۔ ''آپ کسی طرح ہماری مدد نہیں کر سکتے۔''

اچانک بڑھیا نے بڑے جوش کے ساتھ ٹانگ اڑائی:

''اری جھٹک پٹک کیوں کر رہی ہے بدبخت؟ وہ تجھ سے عقل کی بات کر رہا ہے مگر تیری ناک ہی سیدھی نہیں ہوتی، مانو دنیا میں تجھ سے بڑھ کر عقل مند پیدا ہی نہیں ہوا؟ آئیے صاحب، میں بتاؤں آپ کو سارا قصہ''، اس نے میری طرف پلٹتے ہوئے کہا۔

خوددار اولیسیا کے اشاروں سے مجھے اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ ان کی مصیبت ایسی بھیانک

ہے۔ قصہ یہ تھا کہ گزشتہ رات اریادنک جادوگرنی کی جھونپڑی میں آیا تھا۔

”پہلے تو کمبخت شرافت سے بیٹھا رہا، پھر وادکا مانگا،“ مانوئلیخا نے کہا۔ ”اور پھر اچانک برس پڑا، بولا: ’نکل جاؤ تم لوگ اس گھر سے۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر سامان سمیٹ کر چلتی ہو جاؤ۔‘ کہنے لگا ’اگر اگلی دفعہ یہاں آنے پر میں نے تمھیں دیکھا تو اس علاقے ہی سے نکلوا دوں گا۔‘ سمجھیں۔ ’دو سپاہی ہاتھ باندھ کر تمھیں تمھارے وطن دھکیل دیں گے۔ لعنت ہو تم پر!‘ ذرا سوچو تو سہی، میاں، میرا دیس بہت دور ہے، آمچنسک قصبے میں ہے۔ اجی میں تو اب وہاں کسی چڑیا کو بھی نہیں جانتی، اور پھر ہمارے پاسپورٹ کی مدت ختم ہوئے زمانہ گزر چکا ہے، یوں بھی ان میں تو کچھ کھوٹ ہے، اف خدا!“

”مگر یہ بتاؤ کہ پہلے اسے تمھارے یہاں رہنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا؟ ہیں؟“ میں نے کہا۔ ”تو پھر اب کیوں تنگ کر رہا ہے؟“

”میں بھی تو یہی پوچھتی ہوں، بھیا۔ کمبخت کچھ بک تو رہا تھا مگر میری سمجھ میں خاک نہیں آیا کہہ کیا رہا ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں، میاں، یہ جھونپڑی ہماری اپنی نہیں ہے، زمیندار کی ہے۔ پہلے تو بھیا ہم گاؤں ہی میں رہتے تھے مگر پھر...“

''جانتا ہوں، نانی۔ اس بارے میں بہت کچھ سن چکا ہوں۔ کسان تم سے بگڑ گئے تھے۔ ''

''ہاں، بیٹا، وہ بگڑ گئے تھے۔ پھر میں زمیندار ابروسیموف صاحب کے پاس گئی، روئی چلائی اور اس نے مجھے یہ ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا دے دیا۔ لیکن اب معلوم ہوتا ہے جنگل کسی نئے زمیندار نے خرید لئے ہیں۔ خدا جانے وہ دلدل کو کچھ خشک و شک کرانا چاہتا ہے۔ لیکن میں پوچھتی ہوں، ہمارے یہاں رہنے سے اس کا کیا بگڑ جائیگا، بھیا؟''

''اجی کون جانے یہ سارا قصہ یونہی من گھڑنت ہو؟'' میں نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے اریادنک مٹھی گرم کرانا چاہتا ہو۔ ''

''میں نے پیسہ دینے کی کوشش بھی کی، بیٹے۔ مگر اس نے تو زر پر ہاتھ بھی نہ لگایا! بھلا کبھی کاھے کو سنی ہوگی ایسی بات؟ میں نے پچیس روبل اس کے قدموں میں ڈال دئے مگر وہ راضی نہ ہوا۔ اف، میرے خدا، اس پر تو ایسا جنون سوار تھا کہ میرے تو حواس گم ہو گئے۔ بس یہی بکے گیا: 'نکل جاؤ یہاں سے!'، تم ہی بتاؤ اب ہم غریب لاوارث کیا کریں، کہاں جائیں! بیٹے، تم ہی ہماری کچھ مدد کرو، اس لالچی کتے سے بات کرکے یہ قصہ ختم کروا سکو تو میں مرتے دم تک تمھاری شکرگزار رہوں‌گی!''

''نانی!'' اولیسیا نے جھنجھلا کر کہا۔

"نانی کیا؟"، مانوئلیخا نے منہ بنا کر جواب دیا۔ "میں چوبیس سال سے تیری نانی ہوں۔ تو چاہتی ہے کہ بھیک مانگتی پھرے؟ اس کی بات پر دھیان نہ دیجئے، میاں، جہاں تک ہو سکے ہماری مدد کیجئے۔"

میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں ان کی طرف سے بات کروں گا حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی اسید کم ہی تھی۔ ضرور کوئی خاص بات ہوگی، جب ہی تو اریادنک نے رشوت تک لینے سے انکار کر دیا۔ اس شام اولیسیا نے مجھے بہت رکھائی سے رخصت کیا، ہمیشہ مجھے چھوڑنے ساتھ جاتی تھی، مگر آج کسی طرح چلنے پر تیار نہ ہوئی۔ میں سمجھ گیا کہ اس باوقار لڑکی کو میرا دخل دینا اچھا نہیں لگا اور پھر وہ اپنی نانی کی آہ و فریاد سے بھی شرمندہ تھی۔

۸

صبح ابرآلود اور گرم تھی۔ بارش کی بڑی بڑی بوندوں کی کئی بوچھاریں پڑ چکی تھیں۔ ان بوندوں کے بعد دیکھتے دیکھتے نئی نئی گھاس لہلہا اٹھتی ہے اور نئی نئی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں۔ ہر بوچھار کے بعد لمحے بھر کے لئے سورج بڑی شوخی سے جھانکتا اور بارش میں نہائے ہوئے نیلے اور

سفید پھولوں کی پتیوں کو دیکھنے لگتا۔ یہ پتیاں سامنےوالے باغ میں پھیلی ہوئی تھیں اور ان کا رنگ ابھی تک ہلکا سبز تھا۔ پائیں باغ کی اجڑی ہوئی نرم نرم کیاریوں پر شوخ و شنگ گوریاں اپنی پوری طاقت سے چہچہا رہی تھیں۔ سفیدے کی بھوری بھوری کونپلوں کی خوشبو اور تیز ہو گئی۔ میں بیٹھا جنگلی جھونپڑی کی تصویر بنا رہا تھا کہ یرمولا اندر داخل ہوا۔

"اریادنک آ گیا ہے،" اس نے بگڑ کر کہا۔

میں تو بھول ہی گیا تھا کہ دو دن پہلے میں نے اس سے کہا تھا کہ اگر اریادنک آئے تو مجھے خبر کر دینا، سو پل بھر تو میری سمجھ ہی میں نہ آیا کہ حکام کے اس نمائندے کو مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے۔

"کیا کام ہے؟" میں نے الجھ کر کہا۔

"میں نے کہا اریادنک آگیا،" یرمولا نے رکھائی سے جواب دیا۔ پچھلے چند دنوں سے میرے ساتھ اس کا رویہ بڑا غیر دوستانہ ہو گیا تھا۔ "منٹ بھر پہلے بند کے پاس نظر پڑا تھا، اسی طرف آ رہا ہے۔"

باہر پہیوں کی گڑگڑاہٹ ہوئی۔ میں نے بھاگ کر کھڑکی کھولی۔ کشمشی رنگ کا ایک لمبا سا سوکھا مارا گھوڑا بوجھل قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا اور اونچی سی ٹم ٹم جھٹکے کھاتی ہوئی

گھسٹ رہی تھی۔ گھوڑے کا نچلا ہونٹ لٹکا ہوا تھا اور چہرے پر خفگی کے آثار تھے۔ ٹم‌ٹم میں صرف ایک ہی بم تھی، دوسری کی جگہ ایک موٹی سی رسی نے پر کر رکھی تھی۔ گاؤں کے مسخروں کا کہنا تھا کہ وہ جان بوجھ کر ایسی گھٹیا گاڑی استعمال کرتا ہے تاکہ الٹی سیدھی افواہوں سے بچا رہے۔ اریادنک خود ہی گاڑی ہانک رہا تھا، اس کا بھاری بھرکم جسم دونوں سیٹوں پر لدا ہوا تھا۔ اریادنک بھڑکیلی سرمئی رنگ کی فوجی وردی میں ملبوس تھا۔

"آداب عرض ہے، ایپسیخی افریکانووچ!"، میں کھڑکی سے لٹک کر چلایا۔

"اوہو، آداب عرض! کہئے مزاج بخیر؟"، اس نے بلندمرتبہ لوگوں کی طرح پرلطف اور گہری آواز میں جواب دیا۔

گھوڑے کی لگام کھینچ کر مجھے سلام کیا اور نہایت بھونڈے پن مگر وقار کے ساتھ آگے کو جھک گیا۔

"آئیے نا، ذرا گھڑی دو گھڑی کو اندر تشریف لائیے، کچھ باتیں بھی کرنی ہیں آپ سے۔"

اس نے سر ہلایا:

"نہیں، اس وقت نہیں آ سکتا۔ اس وقت تو میں مصروف ہوں۔ ایک ڈوبی ہوئی لاش کا معائنہ کرنے گاؤں میں جا رہا ہوں۔"

لیکن میں اس کی کمزوری سے واقف تھا۔ چنانچہ میں نے بظاہر بڑی لاپرواہی سے کہا ''ارے یہ تو بہت برا ہوا۔ ورنہ میں نے تو کاؤنٹ وارٹزل کی جاگیر سے بڑی نفیس شراب کی دو بوتلیں حاصل کی ہیں۔ میں نے سوچا کہ...''

''نہیں، بھائی میں نہیں آ سکتا، آپ جانتے ہی ہیں — فرض ہے!''

''ابھی میں نے اپنے ایک جاننے والے سے خریدی ہے۔ وہ حضرت اسے خاندانی خزانے کی طرح اپنے تہہ خانے میں چھپائے بیٹھے تھے۔ ارے بھائی، ہو سکے تو تھوڑی دیر کو تو آ ہی جائیں۔ کہئے تو آپ کے گھوڑے کے آگے جو ڈلواؤں۔''

''بھائی، اتنا اصرار نہ کریئے'' اس نے کہا۔ ''آپ جانتے ہی ہیں اولین چیز ہے فرض؟ اور ہاں یہ تو بتائیے کہ ان بوتلوں میں ہے کیا۔ آلوچے کی برانڈی ہے؟''

''آلوچے کی برانڈی کی بھی ایک ہی رہی! ارے میاں، پرانی وادکا ہے جناب، کیا سمجھ رکھا ہے آپ نے!''

''بھئی، بات یہ ہے کہ میں تھوڑی سی پی کے چلا تھا'' اس نے افسوس سے گال کھجاتے ہوئے کہا۔

''ہو سکتا ہے کمبخت جھوٹ بول رہا ہو'' میں نے پہلے کی طرح بظاہر بڑی بےپروائی سے کہا۔ ''لیکن بھائی، وہ قسمیں کھا رہا تھا کہ دو سو

سال پرانی شراب ہے۔ اصلی کونیاک کی سی خوشبو ہے اس میں، اور عنبر کی طرح زرد ہے۔،،

’’اف میرے خدا، آپ نے تو میرا حال خراب کر دیا!،، کس قدر مضحکہ‌خیز تھی اس کی پریشانی۔ ’’مگر یہ بتائیے کہ گھوڑے کی دیکھ بھال کون کرے گا؟،،

واقعی میرے پاس پرانی وادکا کی کئی بوتلیں پڑی تھیں، خیر اتنی قدیم تو نہیں تھی جتنا میں نے شیخی میں کہہ ڈالا تھا، لیکن مجھے یقین تھا کہ اس ترغیب میں اتنی طاقت ضرور ہے کہ وہ وادکا کی عمر چالیس پچاس سال بڑھا دے۔ بہرحال یہ وادکا واقعی نہایت عمدہ قسم کی اور تیز خانہ کشید وادکا تھی۔ دیوالیہ رئیسوں کے تہہ‌خانوں کی جان تھی یہ وادکا۔ (اریادنک پادری خاندان کا تھا۔ جیسے کہ اس نے سردی سے بچاؤ کے خیال سے جھٹ مجھ سے ایک بوتل مانگ لی۔) اور پھر ناشتے کا سامان یعنی تازہ مولی اور تازہ مکھن بھی بہت لذیذ تھا۔

’’ہاں تو بھئی، کیا کام ہے آپ کو؟،، اس نے پانچواں جام چڑھاتے ہوئے مجھ سے پوچھا اور آرام کرسی میں دھنس گیا۔ کرسی اس کے بوجھ تلے چرچرا اٹھی۔

میں نے دکھیاری بڑھیا کی مصیبتوں کا نقشہ کھینچا، اس کی مظلومی اور پریشانی کا ذکر کیا

اور باتوں باتوں میں غیرضروری کارروائی کا بھی ذکر کر دیا۔ وہ سر جھکائے میری بات سنتا رہا اور سخت سخت سرخ مولیوں کی جڑیں کاٹ کاٹ کر انتہائی ذوق و شوق سے کھاتا رہا۔ کبھی کبھی اس کی بےحس اور چندھی آنکھیں میرا جائزہ لینے لگتیں۔ ان چھوٹی چھوٹی آنکھوں کا رنگ نیلا تھا۔ وہ مجھے دیکھتا رہا لیکن نہ اس کے بڑے سے سرخ چہرے سے ہمدردی کا اظہار ہوا نہ خفگی اور احتجاج کا۔

”لیکن آخر آپ چاہتے کیا ھیں، بتائیے نا میں کیا کروں؟،، میرے رکتے ھی اس نے کہا۔

”کیا سے کیا مطلب ھے آپ کا؟،، میں نے جذباتی ھوکر کہا۔ ”آپ دیکھ نہیں رھیں کہ وہ کس مصیبت میں ھیں! دو غریب بالکل بےیار و مددگار ھیں۔،،

”یہی نہیں بلکہ ان میں سے ایک گلاب کی کلی کی طرح حسین بھی ھے،، اس نے طنز کیا۔

”عین ممکن ھے، بھرحال اس وقت اس کا کیا ذکر۔ میں چاھتا ھوں کہ اگر آپ نے ان سے ذرا سا مہربانی کا برتاؤ کر لیا تو کیا مصیبت آجائے گی۔ آپ لاکھ کوشش کریں مگر مجھے تو یقین آ نہیں سکتا کہ انہیں اتنی جلدی نکالنا اس قدر ضروری ھے؟ کم سے کم دو چار دن تو رک جاؤ تاکہ میں زمیندار سے ان کی سفارش کر سکوں۔

مہینہ ڈیڑھ مہینہ انتظار کرلینے میں کیا نقصان ہو جائے گا؟،،

''کیا نقصان ہو جائے گا؟،، وہ آرام کرسی سے اچھل پڑا۔ ''اجی اس میں تو مجھے بہت نقصان ہو جائے گا۔ اجی میری تو ملازمت خطرے میں پڑ جائے گی۔ خدا جانے نیا زمیندار الیاشیوچ کس ڈھنگ کا آدمی ہے۔ کون جانے ایسا چلتا پرزہ ہو کہ ذرا سی گڑبڑ دیکھتے ہی فوراً پیٹرسبرگ چٹھی دوڑا دے۔ خود ہمارے ہاں اس قسم کے لوگ موجود ہیں۔،،

میں نے اریادنک کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

''ارے چھوڑیں بھی، ایپسیخی افریکانووچ، آپ ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رہے ہیں اور اگر خطرہ، خطرہ ہو بھی تو کیا، شکرگذاری تو شکرگذاری ہی ہے۔،،

''پھو!،، اس نے چوڑی چکلی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ٹھونس لئے۔ ''انعام کی بات کرتے ہو! آپ سمجھتے ہیں میں پچیس روبل کی حقیر رقم کے لئے اپنی نوکری خطرے میں ڈال دوں گا؟ نہیں، صاحب، آپ کا خیال غلط ہے۔ آپ مجھے قطعی نہیں سمجھ سکے، جناب۔،،

''گرم کیوں ہو رہے ہیں آپ، ایپسیخی افریکانووچ، سوال روپے کا نہیں ہے۔ گھڑی دو گھڑی کو

اپنا عہدہ بھول کر، محض ایک انسانیت کے ناطے...،،

''انسانیت کے ناطے!،، اس نے ایک ایک حرف پر زور دے کر طنزیہ انداز سے دوہرایا۔ ''میں نے اتنی دفعہ ان جیسوں کے ساتھ انسانیت کا سلوک کیا ہے کہ یہ میرے سر پر بیٹھی ہے! ،،

اس نے انتہائی جوش سے تنبیائی ہوئی موٹی گدی پر ہاتھ مارا، گنجی گردن کے گوشت کی چکنی تہیں کالر پر جھول رہی تھیں۔

''ایپسیخی افریکانووچ، یار، آپ مبالغہ سے کام لے رہے ہیں۔ ،،

''بالکل نہیں، جناب۔ مشہور قصہ گو کری‌لوف صاحب کے قول کے مطابق 'یہ اس علاقے کی لعنت ہیں!' یہ ہی ہیں وہ دو عورتیں۔ آپ نے جناب شہزادہ اوروسوف کی دلچسپ کتاب ''پولیس افسر،، پڑھی ہے؟،،

''نہیں، میں نے نہیں پڑھی۔ ،،

''اوھو، یہ تو آپ کی بڑی بدقسمتی ہے، جناب۔ بہترین کتاب ہے، اخلاقی چیز ہے، نہایت اخلاقی۔ کبھی فرصت ملے تو ضرور پڑھئے۔ ،،

''ہاں، ہاں، ضرور پڑھوں گا۔ لیکن میں سمجھ نہیں سکا کہ اس کتاب کا ان دو دکھیاری عورتوں سے کیا واسطہ۔ ،،

''اس کا ان سے کیا واسطہ؟ بہت گہرا تعلق ہے، جناب۔ نمبر ایک،، اس نے بائیں ہاتھ کی بالوں

بھری انگلی جھکائی۔ ''اریادنک اس چیز کی نگرانی کرتے ھیں کہ ھر شخص جی لگاکر باقاعدگی سے خانہ خدا جاتا ھے یا نہیں۔ اس فرض کو کبھی بھول کر بھی بوجھ نہ سمجھو۔ میں آپ سے پوچھتا ھوں کہ وہ عورت... کیا کہتے ھیں آپ اسے... مانوئلیخا، ھیں نا؟ ھاں تو کیا وہ عورت گرجا جاتی ھے؟''

گفتگو نے کچھ ایسا غیرمتوقع رخ اختیار کیا کہ میں بالکل بھونچکا رہ گیا اور مجھ سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ اس نے بڑی فاتحانہ نظر سے مجھے دیکھکر درمیانی انگلی جھکائی۔

''نمبر دو: 'کہیں جاکر غلط پیش گویاں کرنا اور الہام کی باتیں بتانا قانوناً منع ھے...' دیکھا، جناب، آپ نے؟ اور اب نمبر تین لے لیجئے: 'خود کو جادوگر اور ساحر ظاھر کرنے اور اس قسم کی پرفریب حرکتیں کرنے کی سخت ممانعت ھے'۔ کہئے اس بارے میں کیا کہتے ھیں آپ؟ ذرا سوچئے اگر اچانک یہ ساری باتیں کھل جائیں یا کسی طرح حکام کے کانوں تک پہنچ جائیں تب؟ جواب دہ کون ھوگا؟ میں۔ ساری مصیبت کس کے سر آئیگی؟ میرے۔ تو یہ بات ھے۔''

وہ بیٹھ گیا۔ اس کی خالی نظریں دیوار پر دوڑ رھی تھیں اور انگلیاں میز پر زور زور سے طبلہ بجا رھی تھیں۔

''ایپسیخی افریکانووچ، لیکن اگر میں آپ سے درخواست کروں تب؟'' میں نے بڑے پراثر انداز سے کہا۔ ''میں جانتا ہوں آپ کے کندھوں پر ایک سے ایک تکلیف‌ده فرائض کا بوجھ ہے۔ لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ کے سینے میں ایک مہربان اور لاجواب دل دھڑک رہا ہے۔ کہئے وعدہ کرتے ہیں، ان عورتوں کو تنگ نہیں کروگے؟''

اریادنک کی نظریں میرے سر کے اوپر کہیں جمی ہوئی تھیں۔

''آپ کی بندوق بہت عمدہ ہے'' اس نے طبلہ بجاتے بجاتے یونہی ایک بات کہہ دی۔ ''لاجواب بندوق ہے، پچھلی دفعہ میں یہاں آیا تو آپ گھر پر نہیں تھے۔ میں بڑی دیر تک اس بندوق کو سراهتا رہا۔ بہترین بندوق ہے!''

میں نے بندوق دیکھنے کے لئے سر موڑا۔

''هاں، اچھی چیز ہے'' میں نے تعریفاً کہا۔ ''بہت پرانی بندوق ہے، یورپ کی ہے۔ پچھلے سال میں نے اس کی مرمت کروائی تھی۔ مرکزی فائر کرنےوالی گن بنوا لیا۔ ذرا نالیں دیکھئے!''

''جی هاں، میری نظریں اس وقت سے مستقل اس کی نالوں پر ٹکی ہوئی ہیں۔ بڑی کمیاب چیز ہے۔ میں تو کہتا ہوں خزانہ ہے۔''

ہماری نگاہیں چار ہوئیں اور میں نے دیکھا کہ اس کے ہونٹوں کے کونوں پر ہلکی سی معنی‌خیز

مسکراہٹ تڑپ گئی۔ میں اٹھا، دیوار سے بندوق اتاری اور اس کے پاس پہنچا۔

"چرکیسوں کے ہاں ایک دلکش رواج ہے، اگر ان کے مہمان کو کوئی چیز پسند آ جائے تو وہ فوراً اسے تحفے میں دے دیتے ہیں" میں نے لطف و محبت سے کہا۔ "ایپسیخی افریکانووچ، میں اور آپ چرکیس نہیں ہیں، پھر بھی، بھائی، میرا تحفہ قبول کریئے۔"

وہ بظاہر جھینپ سا گیا۔

"نہیں، نہیں، بھائی، چھوڑیں بھی، بھلا ایسی لاجواب چیز آپ کیسے دے دیں گے! نہیں، بھئی، یہ رواج ہمیں نہیں جچا، ذرا زیادہ ہی فیاضی ہو جاتی ہے!"

مجھے زیادہ اصرار نہ کرنا پڑا۔ اس نے بندوق قبول کر لی۔ اسے بڑی احتیاط سے اپنے گھٹنوں کے بیچ میں کھڑا کیا اور ایک صاف رومال سے لبلبی کی گرد پوچھنے لگا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ میری بندوق کسی صاحب ذوق کے ہاتھ میں پہنچ گئی ہے۔ بندوق کی ملکیت منتقل ہوتے ہی اریادنک اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے جانے کی جلدی تھی۔

"ادھر ضروری کام پڑے ہیں، ادھر میں یہاں بیٹھا گپ کر رہا ہوں" اس نے گالوشی پہننے کے لئے زمین پر پاؤں مارتے ہوئے کہا۔ "کبھی ہماری طرف گزر ہو تو شوق سے میرے گھر آئیے۔"

"تو پھر مانوئلیخا کے متعلق کیا کہتے ہیں؟"
میں نے موقع دیکھ کر یاد دھانی کر دی۔
"دیکھیں گے" اس نے وعدہ نہیں کیا، یونہی چبا چبا کے بات کرتا رہا۔ "ہاں، آپ سے ایک چیز کے بارے میں پوچھنا تو بھول ہی گیا۔ بھئی، آپ کے ہاں مولیاں بڑی نفیس ہیں۔"
"میں نے خود اگائی ہیں۔"
"بہترین مولی ہے۔ جانتے ہیں میری شریک حیات کو ترکاریوں سے عشق ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ آپ، میرا مطلب ہے بس ایک گڈی۔"
"بڑی خوشی سے، ایپسیخی افریکانووچ، یہ تو میری خوش قسمتی ہے، صاحب۔ میں آج ہی ہرکارے کے ساتھ ٹوکری بھر کے بھجوا دوں گا۔ آپ کو اعتراض نہ ہو تو تھوڑا سا مکھن بھی بھجوا دوں۔ میرے ہاں بہت اعلیٰ درجے کا مکھن ہے۔"
"اچھا خیر، مکھن بھی سہی" وہ تیار ہو گیا۔ "تو آپ ان عورتوں سے کہہ دیجئے کہ فی الحال کچھ عرصہ میں خاموش رہوں گا مگر یہ کہہ دینا کہ ذرا ہمارا خیال رکھیں" اچانک اس نے آواز بلند کرتے ہوئے کہا۔ "خالی خولی شکریے سے کام نہیں چلے گا۔ اچھا خدا حافظ۔ تحفے اور دعوت کا مکرر شکریہ۔"
اس نے فوجی انداز میں ایڑیاں کھڑکھڑائیں اور کھاتے پیتے اور اہم شخص کے انداز میں بھاری

بھرکم چال سے گاڑی کی طرف چلا گیا جہاں سوتسکی*، مکھیا اور یرمولا ٹوپیاں ہاتھ میں لئے نہایت ادب سے کھڑے تھے۔

۹

اریادنک بات کا پکا تھا۔ فی‌الحال اس نے جنگل کی جھونپڑی کے باسیوں کا پیچھا چھوڑ دیا۔ لیکن اس دن سے میرے اور اولیسیا کے تعلقات میں اچانک بڑی خوفناک تبدیلی آ گئی۔ اس کے رویے میں اب اس پہلے والے بھروسے اور بھولی بھالی محبت کا شائبہ بھی نہ تھا۔ اس کے انداز میں اس شگفتہ مزاجی کا نشان بھی نہ رہا جس میں حسیناؤں کی عشوہ‌گری کا رنگ بھی تھا اور چلبلے لڑکوں کا کھلنڈراپن۔ ہماری بات‌چیت میں بڑی رکاوٹ اور جھجک پیدا ہو گئی۔ اولیسیا بڑی انکساری سے ہر اس خوشگوار موضوع سے گریز کر جاتی جس نے کبھی ہمارے تجسس کے افق کو اس قدر وسیع بنا دیا تھا۔

میری موجودگی میں وہ انتہائی توجہ اور لگن کے ساتھ اپنے کام پر جھک جاتی لیکن اکثر میں دیکھتا کہ اس کے ہاتھ بےجان ہوکر زانوؤں پر آ گرتے اور نگاہیں زمین کو گھورنے لگتیں۔ ایسے

---

* دیہی پولسمین۔ (ایڈیٹر)

لمحے میں اگر میں اس کا نام لیکر پکارتا یا اس سے کچھ پوچھتا تو وہ چونک جاتی اور خوفزدہ سی نگاھوں سے مجھے دیکھنے لگتی۔ ان نگاھوں سے ظاھر تھا کہ وہ میری بات سمجھنے کی شدید کوشش کر رھی ھے۔ کبھی کبھی تو مجھے ایسا محسوس ھوتا کہ میری موجودگی اس کے لئے ایک بوجھ، ایک وبال بن گئی ھے لیکن کل تک میرے منہ سے نکلی ھوئی ھر بات، ھر لفظ اسے اتنا عزیز تھا، اور اس نے میری ھر ھر بات میں اتنی گھری دلچسپی لے لی‌تھی کہ اب یہ سوچنا ناممکن تھا۔ میں لاکھ سوچتا مگر اس کے سوا سمجھ میں اور کچھ نہ آتا کہ وہ اس بات کو نہ بھلا سکتی ھے نہ معاف کر سکتی ھے کہ میں نے اریادنک سے ان کی سفارش کی ھے۔ اس قسم کی سرپرستی اس کے احساس آزادی پر یقیناً بار گزری ھوگی۔ لیکن یہ خیال میرے دل کو تسلی نہ دے سکا۔ مجھے یہ بات بےتکی سی لگی کہ جنگلوں میں پلی ھوئی ایک معمولی لڑکی اور اس قدر تنک مزاج، اس قدر مغرور؟

ضرورت اس کی تھی کہ ھم کھل کے بات کریں لیکن اولیسیا ھر ایسے موقع سے بھاگتی تھی جب کھل کے بات کرنا ممکن تھا۔ شام کی سیریں ختم ھو گئیں۔ روز رخصت ھونے سے پہلے میں منت بھری، محبت کی نظر سے اس کی طرف دیکھتا مگر بےسود — وہ یہ ظاھر کرتی جیسے کچھ سمجھ ھی

نہیں رہی۔ دوسری طرف بڑھیا کی موجودگی بھی مجھے بہت کھلتی تھی حالانکہ وہ بچاری بہری تھی۔

بعض دفعہ تو مجھے اپنے اوپر غصہ آنے اکتا کہ مجھ میں اتنی طاقت بھی نہیں ہے کہ روز روز اولیسیا کے ہاں جانے کی عادت پر قابو پا سکوں۔ مجھے ان اٹوٹ بندھنوں کا ذرا بھی اندازہ نہ تھا جو میرے دل میں پوشیدہ تھے اور جنھوں نے میرے دل کو اس دلربا اور بےمثل لڑکی سے اتنا قریب کر دیا تھا۔ میرے دل میں آج تک محبت کا خیال بھی نہیں آیا تھا مگر میں اس بے چینی، اس خلش کا شکار تھا جو محبت سے پہلے محسوس ہوتی ہے۔ یہ دور دھندلے دھندلے اور انتہائی کربناک اور اداس احساسات سے پر ہوتا ہے۔ میں کہیں بھی ہوں اور دھیان بٹانے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کروں، مگر میرے دل و دماغ میں اولیسیا کا خیال بسا رہتا، میرا پورا وجود اس کے لئے بےقرار رہتا، اور اس کی باتوں، ہاں معمولی سے معمولی باتوں، اس کے اشاروں اور اس کی مسکراہٹ کی یاد سے میرے دل میں بڑا سہانا اور میٹھا میٹھا سا درد ہوتا رہتا۔ اور پھر شام کا اندھیرا پھیل جاتا اور میں گھنٹوں ڈگمگاتے ہوئے نیچے بنچ پر اس کے پہلو میں بیٹھا رہتا، مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت اور الجھن ہوتی کہ جھجک و شرم اور گھبراہٹ و پریشانی اور بھی بڑھ گئی ہے۔

ایک مرتبہ تو میں پورے دن اسی طرح اولیسیا کے پاس بیٹھا رہا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے تکلیف کیا ھے مگر صبح سے طبیعت گری گری سی تھی اور شام ہوتے ہوتے زیادہ خراب ہو گئی۔ میرا سر بھاری ہو رہا تھا، کانوں میں مسلسل جھنجھناھٹ ہو رہی تھی اور گدی میں دبا دبا سا درد محسوس ہونے لگا، لگ رہا تھا جیسے کوئی نرم مگر مضبوط ھاتھوں سے اسے بھینچ رہا ہو۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا اور پورے بدن پر ایسی الکسی، پژمردگی اور کمزوری چھائی ہوئی تھی کہ دل چاہ رہا تھا مستقل انگڑائیاں۔ جمائیاں لئے جاؤں، آنکھوں میں ایسا بلا کا درد تھا کہ جیسے کسی انتہائی چمکیلی چیز نے آنکھوں کو چندھیا دیا ہو۔

اس دن بڑی رات گئے گھر واپس جاتے ہوئے اچانک میں کانپنے لگا۔ میں شرابیوں کی طرح گرتا پڑتا نہ جانے کس طرف بڑھتا رہا اور میرے دانت زور زور سے بجتے رہے۔

مجھے آج تک پتہ نہیں چلا کہ مجھے کون اور کیسے گھر لایا... چھه دن تک بخار میں تپتا رہا۔ دن کے وقت بیماری کچھ دب جاتی اور مجھے ہوش سا آ جاتا۔ بیماری نے مجھے انتہائی کمزور اور بدحال کر رکھا تھا۔ میں کمرے میں آھستہ آھستہ کھسکنے کی کوشش کرتا رہتا، میرے

گھٹنے بالکل بےجان ہو گئے تھے، ان میں ہر وقت درد ہوتا رہتا اور اگر میں ذرا زور سے چلنے کی کوشش کرتا تو خون کی دھکتی ہوئی لہریں میرے سر کی طرف دوڑنے لگتیں اور میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا۔ رات ہوتے ہوتے، تقریباً سات بجے کے قریب بیماری دوبارہ مجھ پر حملہ کر دیتی اور رات عجیب کرب کے عالم میں گزرتی۔ اف یہ راتیں صدیوں کی طرح طویل ہو جاتی تھیں۔ رات بھر کبھی لحاف میں سردی سے ٹھٹھرتا اور کبھی انتہائی ناقابل برداشت تپش کی وجہ سے جلتا رہتا۔ ذرا سی آنکھ جھپکتی اور عجیب تکلیف‌دہ اور ڈراؤنے خواب نظر آنے لگتے۔ یہ اوٹ پٹانگ اور پاگل‌پن کے خواب میرے تپتے ہوئے دماغ کو جھنجھوڑ کے رکھ دیتے۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات آتیں اور گڈمڈ ہوکر اس طرح ایک دوسرے میں ملتیں کہ انتہائی گندی اور ہنگامہ‌خیز بن جاتیں۔ میں دیکھتا کہ میں عجیب و غریب قسم کے رنگا رنگ ڈبے الگ الگ کر رہا ہوں، بڑے بڑے ڈبوں سے چھوٹے ڈبے نکالتا اور ان چھوٹے ڈبوں سے ان سے بھی چھوٹے ڈبے نکلتے۔ یہ بیکراں کام کسی طرح ختم ہی نہ ہوتا، بوجھل تھا یہ کام! اور پھر آنکھوں کے آگے دیوار کے کاغذوں کی لمبی لمبی اور رنگین دھاریوں کے دھندلے دھندلے نقوش انتہائی تیزی سے تیرنے لگتے۔ کاغذوں کے مختلف نقوش

ونگار کے بجائے مجھے بڑی وضاحت سے انسانی چہرے نظر آنے لگتے، یہ چہرے رنگارنگ ہار کی شکل میں پرے ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ چہرے حسین اور مہربان تھے اور ان پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی، اور کچھ بڑے خوفناک اور مسخ تھے۔ وہ زبانیں نکالتے، منہ چڑاتے اور آنکھوں کے بڑے بڑے خوفناک ڈھیلے گھمانے لگتے۔ اور پھر میرے اور یرمولا کے درمیان بڑی الجھی ہوئی، خیالی اور پیچیدہ لڑائی ہونے لگتی اور ہم گتھ جاتے۔ ہماری دلیلوں میں روزبروز زیادہ سے زیادہ مکاری کا رنگ پیدا ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی بعض الفاظ بلکہ حروف عجیب پراسرار اور ناقابل‌فہم صورت اختیار کر لیتے، اور مجھے کسی نامعلوم اور پراسرار طاقت کا خوف گھیر لیتا، یہ طاقت میرے دماغ میں عجیب گندے گندے اور صوفیانہ خیالات کو جنم دیتی اور میں لاکھ کوشش پر بھی اس ناقابل برداشت ذھنی کشمکش کو ختم نہ کر سکتا۔

یہ سمجھئے کہ انسانی اور حیوانی خاکوں، رنگارنگ منظروں، عجیب عجیب رنگوں اور انوکھی چیزوں اور مبہم الفاظ اور محاوروں کا ایک خوفناک بگولہ تھا جو دماغ میں چکر کاٹتا رہتا۔ لیکن عجیب بات یہ ھے کہ ساتھ ھی مجھے روشنی کا ایک چمکدار دائرہ بھی نظر آتا رہتا جو جلتے ہوئے لیمپ کی اوٹ سے چھت پر پڑتا تھا۔ اور نہ جانے

وہ کونسی طاقت تھی جس نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ اس سکون‌خیز دائرے اور اس کے دھندلے دھندلے کناروں میں ایک خاموش، پراسرار اور خوفناک زندگی تیر رہی ہے جو میرے منتشر خوابوں کے پاگل پن سے بھی کہیں زیادہ دھشتناک اور افسردہ کن ہے۔

اور پھر اچانک میں دیکھتا کہ میں جاگ رہا ہوں۔ مجھے ہوش آتا اور اندازہ ہوتا کہ میں پلنگ پر بیمار پڑا تھا اور ابھی تھوڑی دیر پہلے ہزیان کے عالم میں تھا لیکن پھر میری نظر تاریک چھت پر چمکتے ہوئے دائرے پر پڑتی اور میں سہم جاتا۔ مجھے ایسا لگتا جیسے اس دائرے کی گود میں کوئی بڑا بھیانک، بڑا منحوس خطرہ چھپا ہوا ہے۔ میں نقاہت سے گھڑی اٹھاتا اور یہ دیکھ کر مجھے انتہائی دحشت اور الجھن ہوتی کہ میرے خوفناک خوابوں کا لامحدود سلسلہ صرف دو تین منٹ چلا تھا۔ ”اف میرے خدا، دن کی روشنی کب نظر آئے گی؟“، میں مایوس ہوکر سوچتا اور تپتے ہوئے تکیوں پر سر پٹکنے لگتا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ میرا پھولا ہوا سانس لبوں کو جھلس کے رکھ دے گا۔ ایک دفعہ پھر مجھے نیند کا ھلکا سا جھونکا آتا اور میرا دماغ ایک دفعہ پھر طرح طرح کے الجھے ہوئے اور خوفناک خوابوں کا اڈا

بن جاتا۔ دو تین منٹ بعد پھر آنکھ کھلتی، اور میں پھر انتہائی کرب کا شکار ہو جاتا۔

چھہ دن بعد میری مضبوط قوی فطرت کونین اور جڑی بوٹیوں کی مدد سے بیماری پر حاوی ہو گئی۔ میں پلنگ سے اٹھا تو انتہائی کمزور اور نڈھال ہو چکا تھا مگر تیزی سے صحت‌یاب ہونے لگا۔ میرے دماغ کو چھہ دن کے بخار اور ہزیان نے بالکل جھنجھوڑ دیا تھا۔ اب وہ انتہائی تھکا ہوا اور خیالات سے خالی تھا۔ کیسی دلچسپ تھی یہ کیفیت! میری بھوک ہمیشہ سے دو گنی ہو گئی، اور لمحہ بہ لمحہ بدن میں طاقت آتی چلی گئی۔ رگ رگ میں زندگی کی مسرت بھری ہوئی تھی اور دل میں دوبارہ یہ خواہش جاگ رہی تھی کہ کسی طرح جنگل کی اس خاموش اور خمیدہ جھونپڑی میں پہنچ جاؤں۔ بیماری کے بعد اعصاب ابھی تک قابو میں نہیں آئے تھے۔ جب کبھی اولیسیا کا چہرہ یا اس کی سہانی آواز یاد آتی تو دل میں محبت کا ایسا طوفان اٹھتا کہ میں رویا رویا سا ہو جاتا۔

۱۰

پانچ دن اور گزرے اور میرے جسم میں اتنی طاقت آ گئی کہ مزے میں جادوگرنی کی جھونپڑی تک پہنچ جاؤں۔ جیسے جیسے میں دہلیز کے قریب

پہنچا ویسے ویسے میرا دل خوف سے دھڑکنے لگا۔ تقریباً پندرہ دن سے میں نے اولیسیا کو نہیں دیکھا تھا اور اب مجھے پوری طرح اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ مجھے کتنی محبوب ہے۔ میں چند لمحے ہینڈل پر ہاتھ رکھے، سانس روکے متذبذب کھڑا رہا۔ ذہنی کشمکش کی وجہ سے ذرا سی دیر کو میری آنکھیں بند ہوگئیں۔

میں داخل ہوا تو جس انداز سے میرا خیرمقدم ہوا اس کی تصویر کھینچنی بہت مشکل ہے۔ وہ الفاظ بھلا کون یاد رکھ سکتا ہے جو ماں بیٹے، شوہر اور بیوی یا عاشق و معشوق کی ملاقات کے وقت پہلے چند لمحوں میں کہے جاتے ہیں؟ یہ الفاظ بالکل معمولی ہوتے ہیں۔ اگر آپ انہیں لکھ دیجئے تو بڑے مضحکہ خیز معلوم ہوں گے۔ لیکن اس ملاقات کا ہر ہر بول انتہائی نپا تلا اور مناسب ہوتا ہے اور یہ الفاظ انسان کی نظر میں انتہائی قیمتی اور کمیاب ہوتے ہیں، کیونکہ انہیں ادا کرنے والی آواز انسان کی نظر میں سب سے زیادہ دلکش اور پیاری آواز ہے۔

مجھے یاد ہے، اچھی طرح یاد ہے، اولیسیا نے تیزی سے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اس کا رنگ فق تھا۔ مجھے یاد ہے، اس دلربا چہرے سے یکے بعد دیگرے حیرت، خوف اور محبت جھلکنے لگی،

اف کیسا انوکھا لگ رہا تھا یہ مکھڑا۔ بڑی بی گھسٹتی ہوئی میرے پاس آئیں اور منہ ھی منہ میں کچھ بدبدائیں، لیکن میں نے ان کی دعائیں نہیں سنیں۔ اولیسیا کی آواز رسیلے نغمے کی طرح میرے کانوں میں گونج گئی۔

''ارے آپ کو کیا ہوا؟ بیمار تھے کیا؟ اف میری جان، آپ کتنے دبلے ہو گئے۔ ،،

بڑی دیر تک میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ ہم ایک دوسرے کا ھاتھ ھاتھ میں لئے ایک دوسرے کے سامنے خاموش کھڑے رہے اور نظروں ھی نظروں میں ایک دوسرے پر خوشی و مسرت کی بارش کرتے رہے۔ وہ چند خاموش لمحے میری زندگی کے سب سے زیادہ پرمسرت، سب سے زیادہ حسین لمحے ھیں۔ مجھے نہ اس سے پہلے کبھی ایسے پاک، مکمل اور بھرپور انبساط کا احساس ہوا تھا، نہ اس کے بعد کبھی ہوا۔ اولیسیا کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں نے مجھے نجانے کیا کیا فسانے سنائے۔ ان نگاھوں میں ملاقات پر خوشی کے جذبات کا اظہار بھی تھا، اتنی دیر غائب رھنے کا شکوہ بھی تھا اور انتہائی جوش و ولولے کے ساتھ اقرار محبت بھی تھا... مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ان نگاھوں کے ساتھ ساتھ اس نے بڑی خوشی سے بلاجھجک، اپنا پورا وجود بھی میرے حوالے کر دیا ہے۔

اس نے آهسته سے نظروں هی نظروں میں مانوئلیخا کی طرف اشاره کرکے آخر خاموشی توڑی۔ هم برابر برابر بیٹھ گئے، وه مجھ سے میری بیماری کے بارے میں پوچھتی رهتی، میں نے کیا کیا دوائیں استعمال کیں اور ڈاکٹر نے کیا کہا، وغیره وغیره (ڈاکٹر دو دفعه مجھے دیکھنے شہر سے آیا تھا)۔ اس نے بار بار ڈاکٹر کے آنے کا قصه سنا، میں نے دیکھا که کبھی کبھی اس کے هونٹوں پر طنزیه مسکراهٹ تڑپنے لگتی۔

''کاش مجھے پته چل جاتا که آپ بیمار هیں!،، اس نے دکھ بھری آواز میں کہا۔ ''میں ایک دن میں آپ کو آپ کے پاؤں پر کھڑا کر دیتی۔ ان لوگوں پر کیسے بھروسه کیا جا سکتا هے بھلا جو کچھ جانتے هی نہیں۔ کچھ نہیں جانتے وه! مجھے کیوں نہیں بلوایا آپ نے؟،،

میں هچکچایا۔

''اولیسیا، اصل میں بیماری نے کچھ ایسا اچانک حمله کیا که میں بوکھلا گیا اور پھر همت نہیں پڑی که تمهیں پریشان کروں۔ پچھلے دنوں میرے ساتھ تمهارا رویه کچھ ایسا عجیب سا تھا جیسے تم مجھ سے خفا هو یا عاجز آ چکی هو۔ اولیسیا،، میں نے آواز نیچی کرکے کہا۔ ''همیں بہت سی باتیں کرنی هیں، تنہائی میں۔ تم میرا مطلب سمجھتی هو نا؟،،

اس نے رضامندی کے ساتھ نظریں جھکا لیں، پھر بڑی منت سے نانی کی طرف دیکھا اور تیزی سے سرگوشی کی:

"میں بھی باتیں کرنا چاہتی ہوں، مگر ابھی نہیں... بعد میں..."

سورج غروب ہوتے ہی وہ اصرار کرنے لگی کہ اب آپ گھر جائیں۔

"چلیں، جلدی کریں، اٹھ کر تیار ہوں" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر بنچ سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ایسے میں اگر آپ کو سردی لگ گئی تو بیماری فوراً عود کر آئیگی۔"

"کہاں جا رہی ہو، اولیسیا؟" مانوئلیخا نے دیکھا کہ اس کی نواسی تیزی سے اونی چادر اوڑھ رہی ہے۔

"تھوڑی دور تک ان کے ساتھ جاؤں‌گی ذرا" اولیسیا نے جواب دیا۔

اس نے مانوئلیخا کے بجائے کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے بظاہر بہت لاپرواہی سے کہا تھا لیکن اس کی آواز میں مجھے غصے کی ہلکی سی جھلک محسوس ہوئی۔

"تو آخر تم جا ہی رہی ہو؟" بڑی بی نے زور دے کر کہا۔

اولیسیا نے مانوئلیخا کو دیکھا تو اس کی آنکھیں دھک اٹھیں۔

"ہاں، جا رہی ہوں!"، اس نے تیزی سے جواب دیا۔ "ہم اس سلسلے میں کافی بات کر چکے ہیں۔ یہ میرا سوال ہے اور میں اس کے نتائج بھگتنے کو تیار ہوں۔"

"ہوں، سمجھی!"، مانوئیلخا خفگی اور جھنجھلاہٹ کے عالم میں چلا اٹھی۔

وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی لیکن ناامیدی سے ہاتھ جھٹک کر ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے کونے میں گئی اور بیٹھ کر ٹوکری بننے لگی۔

میں سمجھ گیا کہ یہ تیز تیز اور خفگی بھری باتیں جھگڑے کے ایک پورے سلسلے کی کڑی ہیں۔

"تمھاری نانی نہیں چاہتیں کہ تم میرے ساتھ باہر جاؤ، کیوں؟"، جنگل میں اترتے ہوئے میں نے اولیسیا سے پوچھا۔

اس نے الجھ کر کندھے جھٹکے۔

"اونھ پرواہ نہ کریئے۔ ہاں، وہ نہیں چاہتیں، مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ ظاہر ہے مجھے پوری آزادی ہے، جو چاہوں کروں!"

اچانک میرا دل چاہا کہ میں پچھلے دنوں کی رکھائی پر اسے خوب ڈانٹوں۔

"میری بیماری سے پہلے بھی تم میرے ساتھ باہر جا سکتی تھیں، لیکن تمھارا دل ہی نہیں چاہتا۔ اولیسیا، کاش تمھیں معلوم ہوتا تم نے مجھے کتنا دکھ دیا ہے! ہر شام مجھے یہ امید رہتی تھی کہ

تم میرے ساتھ ٹہلنے چلوگی لیکن تم اس قدر سرد، خفا خفا اور بیزار رہتیں، ایسی رکھائی سے پیش آتیں کہ اف اوہ، اولیسیا — کتنا دکھ دیا ہے تم نے مجھے!،،

''ختم کریں یہ قصہ، پیارے۔ بھول جائیں، سب کچھ بھول جائیں!،، اس نے منت کی۔ اس کی سہانی آواز سے معافی کا رنگ جھلک رہا تھا۔

''نہیں، میں تمھیں الزام نہیں دے رہا۔ میں نے تو بس یوں ہی کہہ دیا۔ اب تو میں سب کچھ سمجھ گیا، لیکن پہلے ضرور یہ خیال ہوتا تھا کہ — کہ تم اریادنک کی وجہ سے مجھ سے خفا ہو۔ اب تو یہ واقعی سوچ کر بھی ہنسی آتی ہے۔ اف اس خیال سے مجھے کتنا دکھ ہوتا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ تم مجھے اجنبی اور غیر سمجھتی ہو۔ جبھی تو میری ایک چھوٹی سی دوستانہ مدد بھی تمھارے اوپر بار ہے۔ اس خیال سے میں اتنا اداس ہو گیا تھا کہ کیا بتاؤں۔ جانتی ہو مجھے دور دور تک یہ خیال نہیں تھا کہ یہ سب نانی کی وجہ سے ہوا...،،

اچانک اولیسیا سرخ انگارہ ہوگئی۔

''نہیں۔ ان کی وجہ سے نہیں ہوا، بس میں خود ہی نہیں چاہتی تھی!،، وہ سرکشی سے چلائی۔

میں نے کنکھیوں سے اسے دیکھا۔ اس کے ہلکے سے جھکے ہوئے سر اور چہرے کی پاک اور

نازک نازک سی یک‌رخی جھلک نظر آ رھی تھی۔ اچانک مجھے اندازہ ھوا کہ وہ خود بھی بہت دبلی ھو گئی ھے، اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے سے پڑے ھوئے تھے۔ وہ سمجھ گئی کہ میں اسے دیکھ رھا ھوں۔ اس نے نظر اٹھاکر دیکھا مگر فوراً ھی پھر نظریں جھکا لیں اور شرمائی شرمائی مسکراھٹ کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگی۔

''کیوں نہیں چاھتی تھیں تم، اولیسیا؟ کیوں؟،، میں نے اس سے پوچھا۔ جذبات کی شدت سے میری آواز بھرا رھی تھی۔ میں نے ھاتھ پکڑکر اسے روک لیا۔

ھم تیر کی طرح سیدھی، لمبی اور تنگ پگڈنڈی کے بیچوں بیچ کھڑے تھے۔ ھمارے دونوں طرف صنوبر کے سرو قد درختوں کی قطاریں تھیں، اور خوشبودار شاخوں نے سر پر شامیانہ سا منڈھ دیا تھا، یہ راستہ دور تک اسی طرح دوڑتا چلا گیا تھا۔ ڈوبتے سورج کی سرخ شعاعیں ننگے تنوں پر تیر رھی تھیں۔

''کیوں، اولیسیا؟ کیوں؟،، میں بار بار اس سے سرگوشی کر رھا تھا اور میرے ھاتھ کی گرفت سخت ھوتی جا رھی تھی۔

''میں کامیاب نہ ھو سکی۔ میں ڈرتی تھی!،، اس نے زیرلب کہا۔ ''میں سمجھتی تھی میں تقدیر کے لکھے سے بچ سکوں‌گی۔ لیکن اب...،،

وہ شاید سانس لینے کے لئے رکی۔ اور اچانک اس نے پوری شدت سے میری گردن میں بازو حمائل کر دئیے۔ مجھے اپنے لبوں پر اس کی تیز اور کانپتی ہوئی مدھم مدھم سرگوشی کی تپش اور لطافت محسوس ہوئی۔

''اب مجھے کسی چیز کی پرواہ نہیں، ھاں بالکل نہیں! مجھے تم سے محبت ھے، میرے پیارے، میرے اپنے، میرے سب کچھ، مجھے تم سے عشق ھے!''

وہ اور بھی زیادہ سختی سے مجھ سے لپٹ گئی، اس کا قوی اور گرم جسم میرے بازوؤں میں کانپ رہا تھا اور میرے سینے پر اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ جذبات اور محبت میں ڈوبے ہوئے بوسے میرے سر میں تیز شراب کی طرح اترتے چلے گئے۔ ابھی تک بیماری سے کمزور تو تھا ھی بےقابو ہوگیا۔

''اولیسیا، خدا کے لئے، اولیسیا، چھوڑ دو۔ چھوڑ دو مجھے'' میں نے اس کی گرفت سے الگ ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ڈر لگ رہا ھے۔ مجھے اپنے آپ سے خوف آ رہا ھے... مجھے جانے دو، اولیسیا۔''

اس نے مڑکر دیکھا اور اس کے چہرے پر اداس مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ڈرو نہیں، میری جان'' اس نے کہا۔ اس کی نظروں سے ناقابل بیان محبت اور بےجگری ٹپک

رہی تھی۔ ”میں تمھیں کبھی برا نہیں کہوں‌گی، کبھی رشک و حسد کی آگ میں نہیں جلوں‌گی۔ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تمھیں مجھ سے محبت ہے یا نہیں۔“

”اولیسیا پیاری، میں مدت سے تیرے عشق میں گرفتار ہوں۔ مجھے تم سے دلی محبت ہے لیکن خدا کے لئے اب اور پیار نہ کرو، مجھے بہت کمزوری ہو رہی ہے، چکر آ رہے ہیں، اس وقت مجھے اپنے اوپر قابو نہیں ہے...“

اس کے لبوں نے ایک دفعہ پھر میرے لبوں کو ایک طویل اور ترستے ہوئے بوسے میں اسیر کر لیا۔ میں نے سننے سے زیادہ محسوس کیا کہ وہ کہہ رہی ہے: ”ڈرو نہیں، بیکار باتوں پر سر نہ کھپاؤ۔ آج ہمارا دن ہے۔ یہ پرمسرت لمحے ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔“

. . . .

اور وہ رات ایک سحرخیز و پرمسرت طلسماتی کہانی میں مدغم ہو گئی۔ چاند نکل آیا۔ اس نے جنگل پر عجیب و غریب اور پراسرار رنگوں کے گل ڈال دئے۔ ناہموار تنوں، خمیدہ شاخوں اور کائی کے نرم اور مخملین قالین پر روشنی کے ہلکے نیلے دھبے بکھر گئے۔ برچ کے نازک سفید تنے الگ الگ سے نظر آ رہے تھے۔ ان کی چھدری چھدری پتیاں چاندنی کی نازک سی جالی میں لپٹی ہوئی تھیں، کہیں کہیں جہاں چاندنی چیڑ کی شاخوں کے شامیانے

کو چیر کر اندر نہیں آسکی تھی، وہاں تاریکی کا راج تھا۔ روشنی کی ایک کرن کو بھی اندر آنے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن جھنڈ کے بیچوں بیچ ایک کومل کرن نجانے کہاں سے پھسلتی ہوئی سی آئی اور درختوں کی لمبی لمبی قطاروں کو چمکاتی چلی گئی۔ اس کومل کرن نے دھرتی پر سیدھی اور تنگ سی روش بنا دی — جگمگاتی ہوئی، دلکش اور سجی سجائی روش۔ سڑک کیا تھی پرستان کے بونوں کی سجائی ہوئی روش تھی جو بڑھ کر اوبی‌رون اور تی‌تانیا کے قدم چومنے کو بے تاب تھی۔ ہم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اس زندہ جاوید اور مسکراتی ہوئی داستان کے درمیان ٹہلتے رہے۔ ہم دونوں اپنی خوشی و مسرت اور جنگل کی پراسرار خاموشی سے متاثر ہوکر بالکل خاموش تھے۔

"ارے جان، میں تو بالکل بھول گئی کہ تمھیں جلد از جلد گھر پہنچنا چاہئے،" اچانک اولیسیا نے کہا۔ "اف کس قدر خودغرض ہوں میں! تم ابھی بیماری سے اٹھے ہو اور میں نے اتنی دیر سے تمھیں جنگل میں روک رکھا ہے۔"

میں نے اسے پیار کیا اور اس کے گھنے اور سیاہ بالوں سے رومال ہٹا دیا۔

"افسردہ تو نہیں ہو، اولیسیا؟ کیوں؟" میں نے اس کے کان پر جھکتے ہوئے محبت سے پوچھا۔ "پچھتا تو نہیں رہیں؟"

اس نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔
''نہیں، چاہے کچھ بھی ہو میں ہرگز دکھی نہیں ہوں گی۔ اف میں کس قدر خوش ہوں...''
''کچھ ہونا ضروری ہے کیا؟''
اس کی آنکھوں میں پراسرار خوف کی جھلک نظر آئی۔
''ہاں، ضروری ہے۔ یاد ہے میں نے تمھیں چڑی کی ملکہ کے بارے میں کیا بتایا تھا؟ وہ ملکہ میں ہوں، تاش کی بتائی ہوئی بدقسمتی کا شکار مجھے ہونا ہے۔ جانتے ہو میں سوچ رہی تھی تمھیں یہاں آنے کو منع کر دوں۔ مگر ٹھیک اسی وقت تم بیمار پڑ گئے، پندرہ دن میں نے تمھیں نہیں دیکھا اور میں اتنی اداس ہو گئی کہ کیا بتاؤں، مجھے ایسی تنہائی محسوس ہوتی تھی کہ میں نے سوچا، اگر لمحے بھر کو تمھارے قرب کے بدلے مجھے دنیا کی ہر چیز قربان کرنی پڑے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اور میں نے فیصلہ کر لیا۔ جو ہو، سو ہو، میں نے سوچا۔ میں کسی کی خاطر اپنی مسرتوں کا گلا نہیں گھونٹونگی۔''
''تمھارا فیصلہ بالکل ٹھیک ہے، اولیسیا۔ میں بھی یہی سوچتا ہوں،'' میں نے لبوں سے اس کی کنپٹی چھوتے ہوئے کہا۔ ''جب تک تم سے جدا نہیں ہوا تھا تب تک مجھے احساس نہیں تھا کہ مجھے تم سے اتنی محبت ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے،

جدائی شعلۂ عشق کے لئے وہی کام کرتی ہے جو ہوا آگ کے لئے کرتی ہے۔ ہلکی پھلکی محبت کی چنگاری ہو تو جدائی اسے بجھا دےگی لیکن سچی محبت کی چنگاری کو ہوا دے کر شعلہ بنا دےگی۔،،

''کیا، کیا کہاوت ہے؟ پھر سے بتا دو،، اولیسیا نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

میں نے وہ کہاوت دوھرائی۔ اولیسیا سوچ میں پڑ گئی اور میں اس کے ہونٹوں کو لرزتے دیکھ کر سمجھ گیا کہ وہ میرے الفاظ دوھرا رہی ہے۔

میں نے اس کے اوپر کو اٹھے ہوئے زرد چہرے اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کو غور سے دیکھا جن میں چاندنی تھرک رہی تھی، اچانک منڈلاتی ہوئی بدقسمتی کے دھندلے سے احساس نے دل میں سر اٹھایا اور میں کانپ گیا۔

۱۱

ہماری محبت کی سادہ اور دلربا کہانی تقریباً مہینے بھر رقم ہوتی رہی۔ اولیسیا کے دلکش پیکر کے ساتھ ساتھ بیتے دنوں کی یادیں بھی میری یاد کے افق پر اور میری روح میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئیں، نظر میں آج بھی ڈوبتے سورج کا پگھلایا ہوا سونا ہے اور اوس میں نہائی اور شہد اور پھولوں کے رس میں بسی ہوئی وہ گھڑیاں

ھیں جن کی گود میں تازگی اور شگفتگی انگڑائیاں لے رھی تھی، جن میں چڑیوں کے چہچہوں کی جھنکار تھی۔ جون کے وہ بےجان اور گرم دن آج بھی میری نظروں میں پھر رھے ھیں جن میں ایک عجیب سستی اور کاھلی کا رنگ تھا۔ اس پورے زمانے میں پل بھر کو بھی دل میں تھکن اور بیزاری کے احساس نے سر نہیں اٹھایا، لمحہ بھر کو بھی صحرانوردی کی ابدی خواھش نے انگڑائی نہیں لی۔ میں قدیم دیوتاؤں کی طرح یا شباب کے نشے میں چور طاقتور مخلوق کی طرح زندگی کی مسرتوں، روشنی اور گرمی کی آغوش میں رنگ‌رلیاں مناتا اور پرسکون اور جاگتی ھوئی والہانہ محبت کے سائے میں سانس لیتا رھا۔

میرے تندرست ھوتے ھی مانوئلیخا انتہائی چڑچڑی ھو گئی، وہ مجھ سے ظاھر بظاھر نفرت سے ملتی۔ جتنی دیر میں جھونپڑی میں بیٹھا رھتا اتنی دیر زور زور سے چولہے پر برتن رکھتی رھتی۔ یہاں تک کہ میں اور اولیسیا جنگل میں ملنے کو ترجیح دینے لگے۔ پس‌منظر میں پھیلے ھوئے سرسبز جنگل کا شاندار حسن ھماری پرسکون محبت کو چار چاند لگا دیتا۔

جنگلوں میں پلی ھوئی ان‌پڑھ اولیسیا، بعض دفعہ ایسی سمجھداری، نزاکت و لطافت اور ایسی غیرمعمولی صلاحیتوں کا ثبوت دیتی کہ میں حیران

رہ جاتا۔ عشق و محبت کے شہوانی پہلو پر نظر ڈالیئے تو آپ کو تصویر کا تاریک رخ نظر آئیگا۔ یہ وہ رخ ہے جو اعصابی اور شاعرانہ مزاج والوں کے لئے بڑی تکلیف اور شرم کا باعث بن جاتا ہے۔ لیکن اولیسیا جانتی تھی کہ ان پہلوؤں سے کس طرح پہلو بچانا چاہئے، وہ یہ سب کچھ اس سادگی اور پاکیزگی سے کرتی کہ ہمارے تعلقات کو کبھی کسی گھناونے خیال یا ناگوار لمحے نے داغدار نہیں بنایا۔

اور اب وہ دن قریب آ رہا تھا جب مجھے کوچ کرنا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ پریبروڈ میں میرا سرکاری کام ختم ہو چکا تھا اور میں جان بوجھ کر شہر جانا ٹال رہا تھا۔ اب تک میں نے اولیسیا سے اس بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ میں تو یہ سوچ سوچ کر گھبرا رہا تھا کہ میری رخصت کی خبر سن کر اس کا کیا حال ہوگا۔ عجیب الجھن تھی۔ میں اولیسیا کا ایسا عادی ہو گیا تھا کہ ایک دن بھی اسے دیکھے بغیر، اس کی دلکش آواز اور نقرئی ہنسی سنے بنا اور اس کی محبت کی دلربائی اور نزاکتوں میں کھوئے بنا جینا ناممکن تھا۔ اگر کسی دن بارش ہماری ملاقات میں رکاوٹ بن جاتی تو میں انتہائی تنہائی محسوس کرنے لگتا تھا کہ میری زندگی کی سب سے زیادہ ضروری شے مجھ سے چھن گئی ہے۔ ہر کام بیکار اور غیردلچسپ

لگتا، اور میرا وجود ان جنگلوں، اس روشنی اور گرمی اور اپنی اولیسیا کی جانی بوجھی اور دلکش صورت کے لئے بےقرار ہو جاتا۔ اس سے شادی کرنے کا خیال میرے دماغ میں جڑ پکڑ چکا تھا۔ پہلے تو سحض کبھی کبھی خیال آتا۔ میں سوچتا، ہمارے تعلقات کا مناسب اور سچا حل یہی ہو سکتا ھے۔ لیکن ایک چیز میری راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ میں تو اس خیال ھی سے سہم جاتا تھا: میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ فیشن‌ایبل لباس میں ملبوس اور میرے ڈرائنگ روم میں میرے دوستوں اور ملنےوالوں کی بیویوں سے بات کرتی ہوئی اولیسیا کیسی لگےگی۔ ایسی اولیسیا کا تصور ناممکن تھا جو قدیم اور پراسرار جنگل کی دلکش اور داستانی فضا سے کٹ گئی ہو۔

لیکن جیسے جیسے جدائی کا دن قریب آیا، مجھے اداسی اور ھجر کے خوف نے گھیر لیا۔ اولیسیا سے شادی کرنے کا ارادہ دن بدن زیادہ اٹل ہوتا چلا گیا۔ اب شادی کا خیال آتے ھی مجھے یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ میں سماج کے منہ پر ایک بےباک اور گستاخ تھپڑ مار رہا ہوں۔ ”ایسے پڑھے لکھے اور معقول لوگوں کی دنیا میں کمی تو نہیں ھے نا جو درزنوں اور ملازماؤں سے شادی کر لیتے ھیں؟“ میں دل کو تسلی دیتا۔ ”وہ کتنی ھنسی خوشی ایک دوسرے کے ساتھ

زندگی بتاتے ہیں۔ وہ مرتے دم تک تقدیر کا گن گان کرتے ہیں جس نے انہیں ایسا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ مجھے یقین ہے میری قسمت بھی ان سے بری نہیں رہے گی۔ ''

وسط جون میں ایک شام میں حسب معمول تنگ سی جنگلی پگڈنڈی کے موڑ پر اولیسیا کا انتظار کر رہا تھا۔ پگڈنڈی آگے جا کر پھولوں سے لدی ہوئی جھاڑیوں کے جھنڈ میں کھو گئی تھی۔ میں نے دور ہی سے اس کے سبک اور ہلکے پھلکے قدموں کو پہچان لیا۔

''شام کا پیار، پیارے!'' اولیسیا نے میری گردن میں باہیں ڈال دیں۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ ''میں نے بہت دیر انتظار کرایا؟ بڑی مشکل سے نکل کے آئی ہوں، نانی سے جھگڑا ہو گیا۔''

''وہ اب تک اپنی بات پر اڑی ہوئی ہیں؟''

''اوہ، بالکل! کہتی ہیں 'وہ تمہیں تباہ کر دیگا، دل بھرکے تمہارے حسن کے مزے لوٹے گا اور پھر تمہیں دھتکار دے گا۔' کہتی ہیں 'اس کو تم سے ذرا محبت نہیں ہے'...''

''یعنی مجھے، ہیں؟''

''ہاں، پیارے۔ لیکن مجھے ان کی کسی بات کا یقین نہیں ہے۔''

''انہیں سب کچھ معلوم ہے کیا؟''

''یقین سے نہیں کہہ سکتی، میرے خیال

میں جانتی ہوں‌گی۔ میں نے اس بارے میں ان سے کبھی بات نہیں کی۔ خود ہی قیاس آرائیاں کر رہی ہیں۔ اوہ، چھوڑو، ہم کیوں پریشان ہوں۔ آؤ چلیں۔ ''

اس نے ایک خاردار جھاڑی کی ڈال توڑی جو سفید پھولوں کے گچھوں سے لدی ہوئی تھی اور اسے اپنے سر میں لگا لیا۔ ہم خراماں خراماں پگڈنڈی پر چلنے لگے جیسے شام کے سورج نے گلابی سا بنا دیا تھا۔

میں نے پچھلی رات طے کر لیا تھا کہ میں ہر صورت میں آج شام بات کر لوں‌گا۔ لیکن ایک عجیب سے بودے‌پن نے جیسے میری زبان بند کر دی۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں نے اولیسیا کو اپنے کوچ کے بارے میں بتایا اور اس سے کہا کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو نجانے اسے یقین آئیگا کہ نہیں۔ ہو سکتا ہے وہ میری درخواست سن کر یہ سوچے کہ میں اس کو ایک زخم دے رہا ہوں اور یہ محض اس زخم کی پہلی ٹیس کو ہلکا کرنے کی ایک کوشش ہے، اور بس؟ ''میپل کے چھلے ہوئے درخت کے پاس پہنچتے ہی بات شروع کر دوں‌گا،، میں نے دل ہی دل میں کہا اور ہم اس کے قریب پہنچ گئے۔ گھبراہٹ کے مارے میرا رنگ فق تھا۔ بولنے سے پہلے میں نے گہرا سانس لیا لیکن میری توقع کے خلاف ہمت نے جواب دے

دیا - دل میں بےچینی کی لہر سی اٹھی اور وہ زور زور سے دھک دھک کرنے لگا - میری زبان جیسے گنگ ہو گئی - ''ستائیس کا ھندسہ میرے لئے بہت نیک ھے،، چند لمحے بعد میں نے سوچا - ''میں ستائیس تک گنوں گا اور پھر ...،، اور میں دل ھی دل میں گنتی گننے لگا، لیکن ستائیس پر پہنچ کر مجھے ایسا محسوس ھوا جیسے میرا فیصلہ ابھی تک پختہ نہیں ھوا ھے - ''نہیں،، میں نے سوچا - ''میں ساٹھ تک گنوں گا - اس طرح پورا ایک منٹ ھو جائیگا - اور پھر میں ضرور بات شروع کر دوں گا - ،،

''کیا بات ھے، پیارے؟،، اچانک اولیسیا نے مجھ سے پوچھا - ''کوئی بری بات ھے کیا - بتاؤ نا - کیا ھے؟،،

اور میں نے سب کچھ کہہ دیا لیکن ایسے لہجے اور ایسے انداز سے کہا جو خود میرے لئے قابل نفرت تھا، میرا لہجہ انتہائی بنا ھوا اور غیرفطری تھا اور انداز میں ایسی بےپرواھی تھی جیسے کسی نہایت غیراھم سوال پر بات کر رھا ھوں -

''ھاں، اولیسیا، تمھارا خیال ٹھیک ھے - خاصی بری بات ھے - جانتی ھو، میرا کام ختم ھو چکا ھے، میرے حکام چاھتے ھیں کہ میں جلد از جلد شہر پہنچ جاؤں - ،،

میں نے کنکھیوں سے اولیسیا کی طرف دیکھا - اس کے چہرے کا رنگ اڑا ھوا تھا اور ھونٹ کانپ

رہے تھے۔ لیکن اس نے جواب میں کچھ بھی نہ کہا۔ چند لمحے میں اس کے ساتھ چلتا رہا۔ ٹڈے زور زور سے چیخ رہے تھے اور کہیں دور سے کسی چڑیا کے کھٹ کھٹ کی بےسری صدا آ رہی تھی۔

''ظاہر ہے، اولیسیا، تم خود ہی سمجھتی ہو،، میں نے پھر کہنا شروع کیا ''کہ اب یہاں ٹھیرنا میرے لئے مناسب نہیں ہے۔ اس کے علاوہ میرے پاس ٹھیرنے کا کوئی ٹھکانا بھی تو نہیں ہے، اور پھر فرائض سے آنکھیں بند کرنا بھی غلط ہے۔،،

''نہیں، نہیں، میرے خیال میں فرائض سے غافل نہیں ہونا چاہئے... یہ تو بالکل صاف بات ہے،، اس نے بظاہر بڑی پرسکون مگر بےجان اور سرد آواز میں جواب دیا۔ اور میں ایکدم خوفزدہ سا ہو گیا۔ ''تمھارا فرض پکار رہا ہے تو تمھیں جانا چاہئے... ہاں بالکل۔،،

اس نے ایک درخت کے قریب رک کر تنے سے ٹیک لگا لی۔ اس کا رنگ لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا اور بازو بالکل بےجان چیز کی طرح پہلو میں لٹکے ہوئے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر درد و غم سے بھری ہوئی اور مصیبت‌زدہ سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ میں اس کی طرف دوڑا اور اس کے ہاتھ تھام لئے۔

''اولیسیا! کیا ہوا، اولیسیا، پیاری؟،،

''کوئی بات نہیں... معاف کرنا... ابھی ٹھیک ہو جاؤں گی۔ ذرا چکر سا آ گیا تھا۔ ''

وہ بڑی کوشش سے ایک قدم آگے بڑھی۔ مگر اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔

''اولیسیا، ابھی تم نے میرے بارے میں نجانے کتنی بری بری باتیں سوچی ہوں گی''، میں نے ملامت بھرے لہجے میں کہا۔ ''شرم آنی چاہئے، اولیسیا! تم بھی یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہیں چھوڑ کر جا سکتا ہوں؟ نہیں، میری جان، نہیں! بات یہ ہے کہ میں نے تو یہ بات چھیڑی ہی اس لئے کہ میں آج ہی تمہاری نانی سے بات کروں گا۔ اولیسیا، تم میری بیوی بنوگی۔ ''

میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ سن کر اسے ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی۔

''تمہاری بیوی؟''، اس نے آہستگی اور اداسی سے سر ہلایا۔ ''نہیں، وانیا پیارے، یہ ناممکن ہے!''

''لیکن کیوں، اولیسیا؟ کیوں؟''

''نہیں، نہیں، تم جانتے ہی ہو۔ ایسی باتیں سوچنا حماقت ہے۔ میں کیا خاک بیوی بنوں گی؟ تم صاحب آدمی ہو، سمجھدار اور پڑھے لکھے اور میں؟ میں تو پڑھ بھی نہیں سکتی، محفل میں اٹھنے بیٹھنے کی تمیز بھی نہیں ہے۔ میری وجہ سے تمہیں شرمندگی اٹھانی پڑیگی۔ ''

''کیا بکواس ہے، اولیسیا!''، میں نے تیز آواز

میں کہا۔ ''آج سے چھہ ماہ بعد تم اپنے آپ کو پہچان بھی نہیں سکوگی۔ تمھیں کوئی اندازہ نہیں تم کتنی ذھین، کتنی تیز، کتنی ظریف ھو۔ اولیسیا، ھم ساتھ مل کر اچھی اچھی کتابیں پڑھیں گے، اچھے اور سمجھدار لوگوں سے ملیں گے، اور اس وسیع و عریض دنیا میں گھومیں گے۔ ھم زندگی بھر اس طرح ساتھ رھیں گے جیسے اس وقت ھیں۔ تمھاری وجہ سے شرمندہ ھونے کا کیا سوال۔ مجھے تم پر فخر ھوگا اور میں ھمیشہ ھمیشہ تمھارا شکرگزار رھوں گا!''

میری جذباتی تقریر کے جواب میں اس نے میرا ھاتھ دبایا مگر اپنی بات پر جمی رھی۔

''لیکن یہی تو سب کچھ نہیں ھے نا! شاید تم نہیں جانتے۔ ایک بات تو میں نے تمھیں کبھی بتائی ھی نہیں۔ جانتے ھو، میں بے باپ کی ھوں۔ ناجائز اولاد!''

''چپ رھو، اولیسیا! مجھے اس کی ذرہ برابر پرواہ نہیں۔ تم مجھے اپنے ماں باپ سے، ساری دنیا سے زیادہ عزیز ھو۔ تو پھر مجھے تمھارے عزیزوں رشتےداروں سے کیا مطلب؟ بکواس ھے یہ، بیکار کی احمقانہ دلیلیں نہ دو!''

وہ بڑی محبت اور پیار سے میرے قریب کھسک آئی۔

''پیارے! کاش تم یہ موضوع نہ چھیڑتے۔ تم جوان اور آزاد ھو۔ میں زندگی بھر کے لئے تمھارے

پاؤں میں زنجیر کیسے ڈال سکتی ہوں بھلا؟ بعد میں تمھیں کسی اور عورت سے محبت ہو گئی تب؟ تب تمھیں میری صورت سے نفرت ہو جائے گی، تم اس گھڑی پر لعنت بھیجوگے جب میں تم سے شادی کرنے پر تیار ہو گئی تھی! دیکھو، خفا نہ ہو، پیارے!،، اس نے میرے چہرے پر دکھ کے آثار دیکھ کر منت کی۔ ''میں دل نہیں دکھاتی تمھارا! میں تو تمھاری خوشی کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ اور نانی کے بارے میں بھول ہی گئے تم۔ تمھیں بتاؤ۔ انھیں تنہا چھوڑنا کہاں تک ٹھیک ہے؟،،

''مگر ہم ان کے رہنے کا انتظام کر دیں گے۔،، واقعہ یہ ہے کہ یہ خیال میرے لئے خاصہ تکلیف دہ تھا۔ ''اور اگر وہ ہمارے ساتھ نہ رہنا چاہیں تو ہر شہر میں ایسے خیرات گھر موجود ہیں جہاں ان جیسی بڑھیوں کی پوری پوری دیکھ بھال ہوتی ہے، ان کی ہر ضرورت پوری کی جاتی ہے۔،،

''نہیں، نہیں، یہ ناممکن ہے، وہ جنگل سے نہیں جائیں گی۔ وہ انسانوں سے ڈرتی ہیں۔،،

''تو اولیسیا، پھر تم ہی بتاؤ، اس کا بہترین حل کیا ہو سکتا ہے۔ تمھیں ہم دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ لیکن اولیسیا، میں سچ کہتا ہوں تمھارے بغیر میری زندگی کانٹوں کا بچھونا بن جائے گی۔،،

"میرے محبوب!"، اس نے انتہائی محبت سے زیرلب کہا۔ "تمھاری باتوں ھی کا بہت بہت شکریہ۔ آج تم نے میرا دل رکھ لیا۔ لیکن میں تم سے شادی نہیں کروں‌گی۔ تم چاھو تو میں اس طرح تمھارے ساتھ جا سکتی ھوں، خدا کے لئے ذرا ٹھیرو۔ مجھے مجبور نہ کرو۔ چند دن سوچنے کا موقع تو دو، پیارے۔ نانی سے بھی بات کرنی پڑےگی۔"

"اولیسیا"، میرے دماغ میں اچانک ایک نیا خیال آیا۔ "کہیں تم گرجا سے تو نہیں ڈر رھیں؟"

دراصل مجھے اسی نقطے سے بات شروع کرنی چاھئے تھی۔ میں روزانہ اولیسیا سے بحث کرتا اور اسے یقین دلاتا کہ نہ اس کے خاندان‌والوں پر خدا کا قہر ھے نہ انھیں جادو سحر آتا ھے۔ دراصل روس کا ھر دانا تھوڑا بہت پرچارک بھی ھوتا ھے۔ ھمارے خون میں ھے یہ خصوصیت۔ پچھلے عرصے کے روسی تخلیقی ادب نے ھمارے خون میں پرچارک کی خصوصیات رچا دی ھیں۔ اولیسیا بےتحاشہ مذھبی ھوتی، باقاعدگی سے روزے رکھتی اور بلاناغہ گرجا جاتی تو شاید میں اس کا مذاق اڑاتا (بس تھوڑا سا مذاق اڑاتا کیونکہ میں خود بھی ھمیشہ سے خاصا مذھبی ھوں)۔ میں اس کی مذھبیت کا مذاق اڑاتا اور اس کی تنقیدی صلاحیتوں کو ترقی دینے کی کوشش کرتا۔ مگر وھاں تو مصیبت ھی کچھ اور تھی۔ وہ انتہائی سادگی مگر یقین کامل کے ساتھ

باطل کی قوتوں سے اپنے قرب اور خدا سے دوری کو مانتی تھی۔ وہ تو خدا کا نام تک لینے سے گھبراتی۔

اس کی توہمات پرستی کو ختم کرنے کے سلسلے میں میری تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔ میری تمام دلیلیں، ہر ممکن طنز اور مذاق، ہاں، سخت سے سخت مذاق بھی، اولیسیا کے اس یقین سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گیا۔ اولیسیا کا یہ یقین کتنا پختہ، کس قدر اٹوٹ تھا کہ تقدیر نے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پراسرار قوتوں کے بندھن میں جکڑ رکھا ہے۔

''اولیسیا، گرجا سے ڈرتی ہو کیا؟،، میں نے پھر پوچھا۔

اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

''تم سمجھتی ہو خدا تمھیں قبول نہیں کرے گا؟،، میں دل میں ابھرتے ہوئے جذبات کی رو میں کہتا چلا گیا۔ ''تم سوچتی ہو وہ تم پر رحم نہیں کھائے گا؟ وہ، جو لاکھوں کروڑوں فرشتوں کا آقا ہے، پھر بھی اس فرش خاک پر اترا اور انسانیت کی نجات کی خاطر انتہائی تکلیف‌دہ اور شرمناک موت کا شکار ہو گیا؟ وہ، جس نے دنیا کی سب سے زیادہ گئی گزری اور گری ہوئی عورت کی معذرت کو بھی حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا، جس نے ایک ڈاکو سے، ایک قاتل سے وعدہ کیا کہ میں تم سے جنت میں ملوں گا؟،،

یہ دلیلیں اولیسیا کے لئے نئی نہ تھیں۔ ہم پہلے بھی اس سلسلے میں بات کر چکے تھے۔ لیکن آج تو اس نے میری بات سرے سے سنی ھی نہیں۔ اس نے بڑی پھرتی سے رومال اتارا اور اسے موڑ توڑ کر میرے چہرے پر پھینک دیا۔ ہم دونوں کے درمیان کھینچا تانی شروع ھو گئی۔ میں نے اس کے پھول نوچنے کی کوشش کی اور اس کھینچاتانی میں وہ گر پڑی۔ اس نے گرتے گرتے مجھے بھی کھینچ لیا۔ فضا میں اس کی ھنسی کی گھنٹیاں بجنے لگیں اور اس کے بھیگے بھیگے دلکش ھونٹ میرے ھونٹوں کے قریب آ گئے۔ اس کا سانس چڑھا ھوا تھا اور لب وا تھے۔

بڑی رات گئے ہم ایک دوسرے سے رخصت ھوئے۔ ہم ایک دوسرے سے کافی دور جا چکے تھے کہ اچانک میں نے اولیسیا کو پکارتے سنا۔

"وانیا! ذرا ٹھیرنا، تمھیں ایک بات بتانا چاھتی ھوں!"

میں اس سے ملنے کو پلٹ گیا۔ وہ بھاگ کر میرے پاس آئی۔ آسمان پر نئے چاند کا نازک سا سیمیں ھلال چمک رھا تھا اور اس کی مدھم روشنی میں میں نے دیکھا کہ اولیسیا کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیر رھے تھے۔

"کیا ھے، اولیسیا؟" میں نے بےتابی سے پوچھا۔

اس نے میرے ھاتھ پکڑ لئے اور بےتابی سے انھیں چومنے لگی۔

”جان! تم کتنے اچھے ہو! کتنے پیارے!“
اس نے تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ابھی ابھی میں سوچ رہی تھی کہ تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو۔ جانتے ہو، میں تمھارے لئے کوئی اچھا، بہت اچھا کام کرنے کو بے تاب ہوں۔“

”اولیسیا، میری پیاری اولیسیا، اپنے دل کو ڈھارس دو!“

”ایک بات بتاؤ“، وہ کہہ رہی تھی۔ ”اگر میں کسی دن گرجا جاؤں تو تمھیں بہت خوشی ہوگی؟ دیکھو سچ سچ بتانا۔ بالکل سچ۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ مجھے عجیب وہم سا آیا۔ اس طرح ہماری تقدیر پر کوئی برا سایہ نہ پڑ جائے؟

”کچھ کہو، بولتے کیوں نہیں، وانیا؟ بتاؤ، جلدی بتاؤ، تمھیں بہت خوشی ہوگی یا نہیں؟“

”میں کیا بتاؤں، اولیسیا؟“، میں ہکلایا۔
”ہاں، میرے خیال میں مجھے خوشی تو ہوگی۔ میں تو تم سے نجانے کتنی دفعہ کہہ چکا ہوں کہ مرد کا یقین محکم نہ ہو، وہ شبہ بھی کرے، یہاں تک کہ مذاق بھی اڑا لے تو کچھ نہیں لیکن عورت کو... عورت کو بالکل پاک ہونا چاہئے۔ میں تو ہمیشہ سے سوچتا ہوں کہ عورت جس سادگی، دلکشی، بھروسے اور بھرپور یقین کے ساتھ خود کو

خدا کو سونپتی ہے اس میں ایک عجیب نسوانی، دلکش اور حسین ادا پنہاں ہے۔''

میں خاموش ہو گیا۔ اولیسیا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ میرے سینے پر سر رکھے جھوم رہی تھی۔

''لیکن تم نے یہ سوال کیوں کیا؟'' میں نے متجسس ہوکر پوچھا۔

وہ چونک گئی۔

''اوہ، بس یوں ہی، بس پوچھنا چاہتی تھی۔ خیر چھوڑو، بھول جاؤ۔ اچھا پیارے، خدا حافظ، کل ضرور آنا!''

وہ جا چکی تھی۔ میں بڑی دیر تک تاریکی میں کھڑا اس کے دور ہوتے ہوئے تیز تیز قدموں کی چاپ سنتا رہا۔ اچانک دل میں ایک خوفناک خیال نے سر اٹھایا۔ میں نے چاہا کہ لپک کر اولیسیا کو جالوں، میں چاہتا تھا کہ اس کے پاس جاکر اس سے درخواست کروں، منت کروں، اسے حکم دوں کہ گرجا نہ جانا۔ لیکن میں نے اپنی اس خواہش کا گلا گھونٹ دیا اور گھر کی طرف مڑتے ہوئے باآواز بلند کہا:

''وانیا، میرے یار، معلوم ہوتا ہے تم بھی توہمات میں گھرتے جا رہے ہو۔''

یا خدا! اس وقت میں نے دل کی اس دبی دبی اور مبہم سی خواہش کے آگے سر کیوں نہیں جھکایا۔ اب تو مجھے یقین ہے کہ انسان کا دل کبھی غلطی نہیں کرتا۔

۱۲

اگلے دن ترینیتی اتوار تھا۔ اس سال یہ تہوار تیموفئی شہید کے دن پڑا تھا جب عام روایت کے مطابق فصل تباہ ہونے کی علامات ظاہر ہوتی ہیں۔ پریبروڈ گاؤں میں ایک گرجا تو تھا مگر پادری نہ تھا۔ اکا دکا عبادتوں (یعنی ایسٹر سے پہلے کے چلے یا خاص خاص تہوار) کے موقعوں پر وولچی گاؤں سے پادری مہمان آتا تھا۔

اس دن مجھے ضروری کام سے قریب کے قصبے میں جانا تھا۔ میں صبح آٹھ بجے کے قریب گھوڑے پر سوار ہوکر چل پڑا۔ فضا میں ابھی خاصی خنکی تھی۔ میں نے کافی عرصے پہلے ایک چھوٹا سا چھہ سات سالہ گھوڑا خرید لیا تھا تاکہ دورہ کرنے میں آسانی رہے۔ گھوڑا معمولی نسل کا تھا لیکن اس کے سابقہ مالک نے اس کی خوب دیکھ بھال کی تھی۔ گھوڑے کا نام تاران‌چیک تھا۔ مجھے مضبوط اور سڈول ٹانگوں، جھبری ایال، انگارے جیسی چمکتی ہوئی، خفا خفا اور چوکنا آنکھوں اور سختی سے بھنچے ہوئے ہونٹوں‌والا یہ گھوڑا پسند آ گیا تھا۔ اس کا رنگ خاصا نایاب اور دلچسپ تھا۔ کچھ چوہے کا سا خاکستری جسم تھا لیکن اس کے پچھلے حصے پر سفید اور سیاہ دھبے پڑے ہوئے تھے۔

مجھے گاؤں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانا پڑا۔ گرجا اور شراب خانے کے بیچ میں پھیلا ہوا بڑا سا سرسبز چوک گاڑیوں کی لمبی لمبی قطاروں سے گھرا ہوا تھا۔ قریب کے دیہاتوں، والوشاء زولنا اور پیچالوفکا کے کسان اپنے بیوی بچوں کے ساتھ تہوار منانے آئے ہوئے تھے۔ گاڑیوں کے چاروں طرف لوگ گھوم رہے تھے۔ ابھی سویرا ھی تھا لیکن انتہائی سخت مخالفت کے باوجود اکثر لوگ شراب کے نشے میں مدھوش تھے (چھٹی کے دنوں اور راتوں کو ذرا چالاکی سے کام لو تو سابقہ شراب فروش سرول سے وادکا حاصل کرنا کچھ ایسا مشکل نہ تھا)۔ صبح خاموش اور گھٹی ہوئی تھی۔ ہوا میں نمی تھی اور آثار کہہ رہے تھے کہ دن ناقابل برداشت حد تک گرم ہوگا۔ جیسے کہ سفید گرد میں اٹے ہوئے گرم آسمان پر دور دور بادل کا نام و نشان نہ تھا۔

میں نے قصبے میں کام ختم کیا اور سرائے میں جا کر جلدی جلدی یہودیوں کے طریقہ سے پکی ہوئی مچھلی نہایت مکروہ قسم کی مٹیالی بیئر کو حلق سے نیچے اتارا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیکن لوھار کی دوکان کے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ تاران‌چیک کی اگلی طرف کی بائیں نعل کچھ ڈھیلی سی ہو رہی ہے۔ چنانچہ میں اس کی مرمت کرانے کے لئے رک گیا۔ اس میں

گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اور لگ گیا، اور میں پریبروڈ پہنچا تو شام کے چار پانچ بج رہے تھے۔

چوک میں ہنگامہ پرور شرابیوں کا ہجوم تھا۔ شراب کے رسیا ایک دوسرے کو کچل رہے تھے اور دھکے دے رہے تھے۔ مختصر یہ کہ شراب خانے کے صحن اور برساتی میں طوفان مچا ہوا تھا۔ پریبروڈ کے کسان برابر کے دیہاتوں سے آئے ہوئے کسانوں میں مل گئے تھے۔ وہ سب گاڑیوں کی آڑ میں گھاس پر بیٹھے تھے۔ جدھر دیکھو ادھر سر پیچھے کو جھکتے اور بوتلیں ہوا میں بلند ہوتی نظر آتیں۔ ایک آدمی بھی ایسا نہ تھا جو اپنے ہوش میں ہو۔ کسانوں کی مدھوشی نے ان حدوں کو چھو لیا تھا جب وہ بڑے جوش و خروش اور فخر کے ساتھ اپنی مدھوشی کا مبالغہ آمیز اظہار کرنے لگتے ہیں۔ ایسے میں وہ بڑے بےجان ڈھیلے ڈھالے اور بوجھل انداز میں ہاتھ پاؤں مارتے ہیں، سر ہلانے کے بجائے جگہ سے اٹھ کر دھپ سے بیٹھتے ہیں، گھٹنے موڑتے ہیں اور اچانک اپنا توازن کھو بیٹھتے ہیں اور پھر وہ دور آتا ہے جب وہ انتہائی بےچارگی کے عالم میں پیچھے گر پڑتے ہیں۔ گھوڑے چارہ کھا رہے تھے اور بچے ان کی ٹانگوں کے قریب اچھل کود رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ ایک جگہ بعض عورت بین کر رہی تھی، گالیاں دے رہی تھی اور اپنے مدھوش شوہر کو گھر لیجانے

کی کوشش میں اس کی آستین میں لٹکی ہوئی تھی۔ مرد بدحال اور بدمست تھا، اور عورت بھی خاصی مدھوش نظر آ رہی تھی۔ باڑھ کے سائے میں بیس ایک کسان مرد اور عورتیں ایک اندھے مغنی کو گھیرے کھڑے تھے۔ گائیک کی تھرتھراتی ہوئی گنگنی آواز، ساز کی بےرنگ بھنبھناھٹ میں مدغم ہوکر مجمع کے شور کو دباتی ہوئی بلند ہو رہی تھی۔ مجھے دور سے یوکرینی لوک گیت کے جانے بوجھے الفاظ سنائی دئے:

شام کا سورج ڈوب چلا ھے
رات اندھیری پھیل رہی ھے
ترکی کے بنجاروں نے مل کر چھاپہ مارا
بنجارے ھیں یہ یا کالا بادل

اس گیت میں یہ داستان قلمبند ھے کہ جب ترکی فوجیں تلوار کے زور سے پوچائیف خانقاہ نہ لے سکیں تو حیلے بہانوں پر اتر آئیں۔ انھوں نے ایک بڑی سی شمع خانقاہ کو تحفے میں بھیجی مگر اس شمع میں بارود بھرا ھوا تھا۔ شمع اتنی بڑی تھی کہ اسے جس گاڑی پر لادکر یہاں پہنچایا گیا تھا اس میں بارہ جوڑی بیل جتے ہوئے تھے۔ پوچائیف کے شادل و فرحاں راھب کنواری مریم کی تصویر کے سامنے شمع جلانےوالے تھے لیکن خدا نے انھیں اس خوفناک جرم سے باز رکھا۔

پادری نے اک جلوہ دیکھا۔
اس کو خدا نے آگاہ کیا
شمع کو جلدی جنگل پہنچاؤ
واں پہ اس کے ٹکڑے کردو

چنانچہ راہبوں نے یہی کیا۔

شمع کو جب کھیت میں لائے،
اور اس کے ٹکڑے بکھرائے
اس کے اندر سے نکلے
گولیاں اور بارود کے گولے۔

تپتی ہوئی ہوا میں وادکا، پیاز، بھیڑ کی کھال کے کوٹوں، گھریلو قسم کے تیز تمباکو اور پسینے کی گندی بو کا ایسا مرکب بسا ہوا تھا کہ طبیعت متلانے لگی۔ میں بڑی مشکل سے بےقرار تاران‌چیک کو قابو میں کئے احتیاط سے اس مجمع کے درمیان راستہ بناتا ہوا بڑھتا رہا۔ ہر طرف سے لوگ بڑی بےادبی اور گستاخی اور تجسس بھری نظر سے مجھے دیکھ رہے تھے، کتنی انوکھی تھیں ان کی یہ غیردوستانہ نظریں۔ عجیب بات ہے وہ سب جیسے ٹوپی اتارنے کی رسم تو بھول ہی گئے تھے۔ بہرحال میرے پہنچنے پر شوروغل کچھ دب سا گیا۔ اچانک مجمع کے درمیان کہیں سے ایک مدھوش اور بوجھل للکار ابھری۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ

کیا کہہ رہا ہے۔ لیکن اس کے جواب میں چاروں طرف دبی دبی ہنسی ابھر آئی۔ کوئی خوفزدہ عورت شاید للکارنےوالے کو منع کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"چپ رہ، گدھے! کیا بک بک لگا رکھی ہے؟ اگر اس نے سن لیا تو..."

"سن لیا تو کیا؟" مرد بہادری سے چلایا۔ "سالا میرا حاکم ہے کیا؟ جنگل میں اپنی..."

ایک گندا، خوفناک اور طویل جملہ ہوا کو چیرتا چلا گیا، ساتھ ہی خوفناک قہقہوں کا طوفان ابل پڑا۔ میں نے تیزی سے گھوڑا موڑا، ہنٹر کو مضبوطی سے پکڑا اور میرے سر پر ایسا جنون سوار ہوا کہ ہر چیز کی طرف سے آنکھیں بند ہو گئیں اور سوچنے سمجھنے اور کسی چیز سے ڈرنے کی صلاحیت ختم ہو گئی۔ اچانک میرے دماغ میں ایک عجیب دردانگیز خیال آیا: "یہ سب تو میرے ساتھ پہلے بھی ہو چکا ہے، برسوں پہلے۔ اس دن بھی سورج اسی قدر گرم تھا۔ وسیع و عریض چوک میں آج ہی کی طرح پرشور اور پرجوش لوگوں کا مجمع تھا۔ میں آج ہی کی طرح جنون اور غصے کے عالم میں پلٹتا تھا۔ لیکن یہ سب کہاں اور کب ہوا تھا؟" میں نے ہنٹر جھکایا اور گھوڑا دوڑا کر گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

یرمولا آهسته سے باورچی خانے سے نکلا۔ اس نے گھوڑے کی لگام تھام لی اور سختی سے کہا "مالک، مارینوفکا جاگیر کا مختار کمرے میں آپ کا انتظار کر رہا ھے۔"

مجھے شک ہوا کہ وہ کچھ اور بھی کہنا چاھتا ھے۔ شاید کوئی ایسی بات جو میرے لئے بہت اهم اور بہت ناخوشگوار ھے۔ بلکه مجھے تو لگا که پل بھر کو اس کے چہرے پر شیطانی مسکراهٹ بھی تڑپی تھی۔ میں جان بوجھ کر دروازے میں کھڑا ھوا خفگی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ لیکن اب اس کا منه دوسری طرف تھا۔ وہ گھوڑے کی لگام کھینچ رہا تھا اور گھوڑا گردن بڑھائے بڑی سعادت مندی سے اس کی ایک ایک بات مان رہا تھا۔

همسایه جاگیر کا کلرک نکیتا مشچینکو میرے کمرے میں بیٹھا تھا۔ اس کے سرمئی کوٹ پر سرخ دھاریاں پڑی ھوئی تھیں، تنگ پتلون شوخ نیلے رنگ کی تھی اور ٹائی دھکتی ھوئی سرخ۔ تیل میں چپڑے ھوئے بالوں کے بیچوں بیچ مانگ نکلی ھوئی تھی اور اس کے کپڑوں سے ایرانی سرین کی خوشبوئیں چھوٹ رھی تھیں۔ مجھے دیکھتے ھی وہ اچھل کر کھڑا ھوا اور تعظیماً جھکنے لگا۔ جھکنے کے بجائے اس نے کمر دوھری کر لی تھی اور اس طرح کھیسیں نکالے کھڑا تھا که دونوں جبڑوں کے بے رنگ مسوڑھوں کی نمائش ھونے لگی۔

''آداب عرض ہے،، اس نے نیازمندی سے کہا۔ ''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ عبادت کے بعد سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ آپ سے ملے ایک عرصہ ہو گیا تھا، سوچا ذرا ملتا چلوں۔ کبھی ہماری طرف کیوں نہیں آتے آپ؟ نوجوان خواتین آپ کا مذاق اڑاتی ہیں۔ ،،

اور اچانک کچھ یاد کرکے وہ ہنسی سے بےقابو ہو گیا۔

''ارے آج بڑا دلچسپ ہنگامہ رہا۔ میں تو بھول ہی گیا تھا!،، وہ ہنسی سے بےقابو ہوکر چلایا۔ ''ہا۔ ہا۔ ہا... میری تو پسلیاں ٹوٹی جا رہی ہیں!،،

''کیا کہہ رہے ہو؟ کیسا ہنگامہ؟،، میں نے خفگی چھپانے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی، سختی سے اس کی بات کاٹ دی۔

''ارے آج عبادت کے بعد بڑا ہنگامہ ہو گیا،، اس نے کہنا شروع کیا اور بیچ بیچ میں بے تحاشہ ہنسنے لگا۔ ''پریبروڈ کی کچھ لڑکیوں نے... اف اللہ، میں نہیں سنا سکتا! ہاں تو پریبروڈ کی کچھ لڑکیوں نے چوک میں ایک جادوگرنی کو پکڑ لیا۔ میرا مطلب ہے یہ جاہل گنوار لوگ اپنی جہالت میں اسے جادوگرنی سمجھتے ہیں۔ ہاں تو انھوں نے جادوگرنی کی اچھی طرح سرمت کر ڈالی! وہ تو کمبخت پر تارکول پھینکنا چاہتی تھیں

مگر جادوگرنی تڑپی اور اچانک بھاگ نکلی۔ ''
اچانک میرے دل میں ایک خوفناک شبہ پیدا ھوا۔ میں کلرک کی طرف جھپٹا اور غصے سے بدحواس ھوکر میں نے اس کا شانہ پکڑ لیا۔
''کس کے بارے میں بک رہے ھو؟'' میں جنون کے عالم میں چنگھاڑا۔ ''بند کرو یہ کھی کھی، لعنتی، بند کرو! کون جادوگرنی، کیا بک رہے ھو؟''
اس کی ھنسی بند ھو گئی۔ اس نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ خوف سے اس کی آنکھیں نکلی ھوئی تھیں۔
''اے۔ رے۔ واہ، جناب، مجھے کچھ نہیں معلوم''، وہ گھبراھٹ میں ھکلانے لگا۔ ''میرے خیال میں اس کا نام ساموئلیخا یا مانوئلیخا ھے۔ نہیں نہیں، شاید وہ کسی مانوئلیخا کی بیٹی ھے۔ کسان اس بارے میں کچھ باتیں کر رہے تھے مگر سچ کہتا ھوں میں بھول گیا کہ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ ''
میں نے اسے مجبور کیا کہ وہ آنکھوں دیکھا پورا قصہ کہہ سنائے۔ وہ بہت احمقانہ اور بے ربط انداز میں بات کر رھا تھا، اس نے مختلف تفصیلات کو گڈمڈ کر دیا تھا۔ میں انتہائی جذباتی ھو رھا تھا اور بار بار بےتابی سے سوال کر کر کے اسے ٹوک رھا تھا۔ دو چار بار تو میں غصے میں گالی گلوچ پر اتر آیا۔ اس کی سنائی ھوئی داستان

"آداب عرض ہے،، اس نے نیازمندی سے کہا۔
"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ عبادت کے بعد سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ آپ سے ملے ایک عرصہ ہو گیا تھا، سوچا ذرا ملتا چلوں۔ کبھی ہماری طرف کیوں نہیں آتے آپ؟ نوجوان خواتین آپ کا مذاق اڑاتی ہیں۔ ،،

اور اچانک کچھ یاد کرکے وہ ہنسی سے بےقابو ہو گیا۔

"ارے آج بڑا دلچسپ ہنگامہ رہا۔ میں تو بھول ہی گیا تھا!،، وہ ہنسی سے بےقابو ہو کر چلایا۔ "ہا۔ ہا۔ ہا... میری تو پسلیاں ٹوٹی جا رہی ہیں!،،

"کیا کہہ رہے ہو؟ کیسا ہنگامہ؟،، میں نے خفگی چھپانے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی، سختی سے اس کی بات کاٹ دی۔

"ارے آج عبادت کے بعد بڑا ہنگامہ ہو گیا،، اس نے کہنا شروع کیا اور بیچ بیچ میں بے تحاشہ ہنسنے لگا۔ "پریبروڈ کی کچھ لڑکیوں نے... اف اللہ، میں نہیں سنا سکتا! ہاں تو پریبروڈ کی کچھ لڑکیوں نے چوک میں ایک جادوگرنی کو پکڑ لیا۔ میرا مطلب ہے یہ جاہل گنوار لوگ اپنی جہالت میں اسے جادوگرنی سمجھتے ہیں۔ ہاں تو انہوں نے جادوگرنی کی اچھی طرح مرمت کر ڈالی! وہ تو کمبخت پر تارکول پھینکنا چاہتی تھیں

مگر جادوگرنی تڑپی اور اچانک بھاگ نکلی۔ ،،

اچانک میرے دل میں ایک خوفناک شبہ پیدا ہوا۔ میں کلرک کی طرف جھپٹا اور غصے سے بدحواس ہوکر میں نے اس کا شانہ پکڑ لیا۔

''کس کے بارے میں بک رہے ہو؟،، میں جنون کے عالم میں چنگھاڑا۔ ''بند کرو یہ کھی کھی، لعنتی، بند کرو! کون جادوگرنی، کیا بک رہے ہو؟،،

اس کی ہنسی بند ہو گئی۔ اس نے گھبرا کر میری طرف دیکھا۔ خوف سے اس کی آنکھیں نکلی ہوئی تھیں۔

''اے۔ رے۔ واہ، جناب، مجھے کچھ نہیں معلوم،، وہ گھبراہٹ میں ہکلانے لگا۔ ''میرے خیال میں اس کا نام ساموئلیخا یا مانوئلیخا ہے۔ نہیں نہیں، شاید وہ کسی مانوئلیخا کی بیٹی ہے۔ کسان اس بارے میں کچھ باتیں کر رہے تھے مگر سچ کہتا ہوں میں بھول گیا کہ وہ کیا کہہ رہے تھے۔ ،،

میں نے اسے مجبور کیا کہ وہ آنکھوں دیکھا پورا قصہ کہہ سنائے۔ وہ بہت احمقانہ اور بے ربط انداز میں بات کر رہا تھا، اس نے مختلف تفصیلات کو گڈمڈ کر دیا تھا۔ میں انتہائی جذباتی ہو رہا تھا اور بار بار بےتابی سے سوال کر کر کے اسے ٹوک رہا تھا۔ دو چار بار تو میں غصے میں گالی گلوچ پر اتر آیا۔ اس کی سنائی ہوئی داستان

میرے بہت کم پلے پڑی۔ اس منحوس واقعے کی تمام تفصیلات تو مجھے دو مہینے بعد جنگل کے رکھووالے کی بیوی سے معلوم ہوئیں جو اُس دن عبادت میں موجود تھی۔

میرا شبہ غلط نہیں تھا۔ اولیسیا کسی نہ کسی طرح اپنے خوف پر قابو پا کر گرجا پہنچ گئی تھی۔ وہ پہنچی تو آدھی عبادت ختم ہو چکی تھی۔ وہ گرجا کی ڈیوڑھی میں کھڑی ہو گئی۔ لیکن گرجا میں جتنے کسان تھے انھوں نے فوراً اسے دیکھ لیا۔ عبادت کے دوران میں عورتیں کھسر پھسر کرتی اور مڑ مڑکر دیکھتی رہیں۔

پھر بھی اولیسیا نے ہمت نہ ہاری۔ وہ عبادت ختم ہونے تک گرجا میں ڈٹی رہی۔ شاید وہ ان خونی نظروں کا مطلب نہ سمجھ سکی یا غرور اور خودی کی وجہ سے ان کو نظر انداز کرتی رہی۔ لیکن جب وہ گرجا سے باہر نکلی تو باڑھ کے قریب عورتوں کے ایک جھرمٹ نے اسے گھیر لیا۔ ان کی تعداد لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی اور وہ اس کے قریب کھسکتی جا رہی تھیں۔ شروع میں انھوں نے اس بےسہارا لڑکی کو صرف اپنی غضبناک نظروں کا نشانہ بنایا جو گھبرائی گھبرائی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے بعد کڑوی کڑوی باتوں، بے ہودہ پھبتیوں، گالی کوسنوں اور ہنسی قہقہوں کا طوفان پھٹ پڑا۔ مختلف آوازیں ابھریں

اور ایسا شور ہوا کہ کان کے پردے پھٹنے لگے اور اس ہنگامے نے عورتوں کے غصے کو اور بھی ہوا دی۔ اولیسیا نے اس غضبناک اور جیتے جاگتے حلقے کو توڑنے کی لاکھ کوشش کی مگر اسے ہر بار گھیرے کے بیچ میں دھکیل دیا جاتا۔ اچانک مجمع کے پیچھے سے کسی بڑھیا کی چیخ گونجی: "تارکول مل دو چڑیل کو!" (یوکرین میں اگر کسی ایسے گھر کے دروازے پر بھی تارکول مل دیا جائے جس میں کوئی لڑکی رہتی ہو، تو یہ اس لڑکی کے لئے انتہائی بےعزتی کی بات سمجھی جاتی ہے)۔ دیکھتے دیکھتے کول تار کا پیپا اور برش چنگھاڑتی ہوئی عورتوں کے سر پر سے ہوتا ہوا ہاتھوں ہاتھ اندر پہنچ گیا۔

اور تب اولیسیا انتہائی غصے، خوف اور ناامیدی کے عالم میں پوری طاقت سے ایک ظالم عورت پر جھپٹی اور وہ عورت لڑکھڑا کر گر پڑی۔ پھر تو ہر طرف دھکا پیل شروع ہو گئی۔ درجنوں عورتیں ایک دوسرے سے گتھ گئیں اور لڑتی جھگڑتی زمین پر ڈھیر ہو گئیں۔ اور سمجھو کہ بس معجزہ ہوا اور اولیسیا اس ہنگامے سے نکلے بھاگی۔ وہ سڑک پر بھاگ رہی تھی اور اس کا رومال غائب تھا، لباس تار تار تھا اور جگہ جگہ سے ننگا بدن جھانک رہا تھا۔ مجمع اسے کوسنے دے رہا تھا، ہنس رہا تھا، مذاق اڑا رہا تھا اور اس پر

میرے بہت کم پلے پڑی۔ اس منحوس واقعے کی تمام تفصیلات تو مجھے دو مہینے بعد جنگل کے رکھووالے کی بیوی سے معلوم ہوئیں جو اس دن عبادت میں موجود تھی۔

میرا شبہ غلط نہیں تھا۔ اولیسیا کسی نہ کسی طرح اپنے خوف پر قابو پا کر گرجا پہنچ گئی تھی۔ وہ پہنچی تو آدھی عبادت ختم ہو چکی تھی۔ وہ گرجا کی ڈیوڑھی میں کھڑی ہو گئی۔ لیکن گرجا میں جتنے کسان تھے انھوں نے فوراً اسے دیکھ لیا۔ عبادت کے دوران میں عورتیں کھسر پھسر کرتی اور مڑ مڑکر دیکھتی رہیں۔

پھر بھی اولیسیا نے ہمت نہ ہاری۔ وہ عبادت ختم ہونے تک گرجا میں ڈٹی رہی۔ شاید وہ ان خونی نظروں کا مطلب نہ سمجھ سکی یا غرور اور خودی کی وجہ سے ان کو نظر انداز کرتی رہی۔ لیکن جب وہ گرجا سے باہر نکلی تو باڑھ کے قریب عورتوں کے ایک جھرمٹ نے اسے گھیر لیا۔ ان کی تعداد لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی اور وہ اس کے قریب کھسکتی جا رہی تھیں۔ شروع میں انھوں نے اس بےسہارا لڑکی کو صرف اپنی غضبناک نظروں کا نشانہ بنایا جو گھبرائی گھبرائی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے بعد کڑوی کڑوی باتوں، بے ہودہ پھبتیوں، گالی کوسنوں اور ہنسی قہقہوں کا طوفان پھٹ پڑا۔ مختلف آوازیں ابھریں

اور ایسا شور ہوا کہ کان کے پردے پھٹنے لگے اور اس ہنگامے نے عورتوں کے غصے کو اور بھی ہوا دی۔ اولیسیا نے اس غضبناک اور جیتے جاگتے حلقے کو توڑنے کی لاکھ کوشش کی مگر اسے ہر بار گھیرے کے بیچ میں دھکیل دیا جاتا۔ اچانک مجمع کے پیچھے سے کسی بڑھیا کی چیخ گونجی: ''تارکول مل دو چڑیل کو!'' (یوکرین میں اگر کسی ایسے گھر کے دروازے پر بھی تارکول مل دیا جائے جس میں کوئی لڑکی رہتی ہو، تو یہ اس لڑکی کے لئے انتہائی بےعزتی کی بات سمجھی جاتی ہے)۔ دیکھتے دیکھتے کول تار کا پیپا اور برش چنگھاڑتی ہوئی عورتوں کے سر پر سے ہوتا ہوا ہاتھوں ہاتھ اندر پہنچ گیا۔

اور تب اولیسیا انتہائی غصے، خوف اور ناامیدی کے عالم میں پوری طاقت سے ایک ظالم عورت پر جھپٹی اور وہ عورت لڑکھڑا کر گر پڑی۔ پھر تو ہر طرف دھکا پیل شروع ہو گئی۔ درجنوں عورتیں ایک دوسرے سے گتھ گئیں اور لڑتی جھگڑتی زمین پر ڈھیر ہو گئیں۔ اور سمجھو کہ بس معجزہ ہوا اور اولیسیا اس ہنگامے سے نکلے بھاگی۔ وہ سڑک پر بھاگ رہی تھی اور اس کا رومال غائب تھا، لباس تار تار تھا اور جگہ جگہ سے ننگا بدن جھانک رہا تھا۔ مجمع اسے کوسنے دے رہا تھا، ہنس رہا تھا، مذاق اڑا رہا تھا اور اس پر

پتھروں کی بارش کر رہا تھا۔ چند ایک نے اس کا پیچھا بھی کیا لیکن بہت جلد وہ سب پیچھے رہ گئے۔ پچاس پچپن قدم بھاگنے کے بعد اولیسیا رکی۔ اس نے خون میں تر اور زخمی منہ اس ظالم مجمع کی طرف کیا اور ایسی زور سے چلائی کہ اس کا ہر ہر لفظ چوک تک گونجتا چلا گیا: "اچھا خیر، یاد رکھو ساری عمر روؤگے! روتے روتے تمہاری آنکھوں کی بینائی ختم ہو جائیگی!"

آنکھوں دیکھا حال کہنے والی اس عورت کا بیان ہے کہ اولیسیا نے اس قدر دلی نفرت اور ایسے یقین کے ساتھ دھمکی دی تھی اور اس کے انداز میں ایسی پیغمبرانہ شان تھی کہ لمحے بھر کے لئے پورا مجمع خوف سے سن ہو گیا۔ لیکن یہ کیفیت صرف لمحے بھر رہی، پل بھر بعد گالی کوسنوں کا نیا طوفان ابل پڑا۔

میں ایک دفعہ پھر یاد دہانی کرنا چاہتا ہوں کہ اس واقعے کی بہت سی تفصیلات تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوئیں۔ مجھ میں اتنی طاقت اور اتنا صبر کہاں تھا کہ مشچینکو کی داستان آخر تک سن سکوں۔ میں نے سوچا، ہو سکتا ہے یرسولا نے ابھی تک گھوڑے کی زین وغیرہ نہ کھولی ہو۔ میں نے مشچینکو سے ایک لفظ بھی نہ کہا، اسے یونہی حیران و پریشان چھوڑ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ میرا خیال ٹھیک تھا، یرسولا ابھی تک

تارانچیک کو باڑھ کے پاس ادھر سے ادھر ٹہلا رہا تھا۔ میں تیزی سے پرپیچ راستے سے جنگل کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ مدھوش مجمع سے ٹکر نہ ہو۔ میرا گھوڑا سرپٹ دوڑ رہا تھا۔

۱۳

عجیب ہیجان کا وقت تھا اور میری حالت ناقابل بیان تھی۔ بعض بعض لمحے تو ایسے آئے کہ میں بالکل بھول گیا، میں کہاں اور کیوں جا رہا ہوں۔ بس ایک دھندلا سا خیال تھا کہ کوئی بہت ہی خوفناک اور بےہودہ بات ہو گئی ہے، میں محسوس کر رہا تھا کہ بات کچھ ایسی بگڑی ہے کہ بنائے نہ بنے۔ یہ سمجھئے کہ بس کچھ ایسی حالت تھی جیسی بعض دفعہ کسی خوفناک خواب کے دوران میں انتہائی پریشانی کا غلبہ ہونے سے ہو جاتی ہے۔ عجیب بات ہے، گھوڑے کی تھپ تھپ کے ساتھ میرے کانوں میں اندھے گائیک کی تھرتھراتی ہوئی گنگنی آواز بھی گونجتی رہی:

ترکی کے بنجاروں نے مل کر چھاپہ مارا
بنجارے ہیں یا کالے بادل

میں اس تنگ راستے پر پہنچ گیا جو سیدھا مانوئلیخا کی جھونپڑی تک جاتا تھا، میں تارانچیک

سے اترا اور اس کی لگام پکڑ کر آگے بڑھنے لگا۔ ساز کے نیچے دبی ہوئی کھال پر جھاگ دار پسینہ تیر رہا تھا۔ دن بھر کی شدید تپش اور گھوڑ دوڑ کی وجہ سے خون کے دوران کا یہ عالم تھا جیسے سر میں کوئی بڑی بےدردی سے مسلسل بڑا سا پمپ دھونک رہا ہو۔

میں گھوڑے کو باڑہ سے باندھ کر جھونپڑی میں داخل ہوا۔ ایک دم تو مجھے ایسا لگا کہ اولیسیا وہاں نہیں ہے۔ اس خیال سے میں خوف و دہشت سے سرد پڑ گیا۔ لیکن لمحے بھر بعد میری نظر پڑی، وہ پلنگ پر لیٹی تھی۔ اس کا منہ دیوار کی طرف تھا اور سر تکیوں میں دھنسا ہوا۔ دروازہ کھلنے پر اس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

مانوئلیخا پلنگ کے برابر زمین پر بیٹھی تھی، وہ لڑکھڑاتی ہوئی اٹھی اور میری طرف بازو کر کے ہاتھ ہلایا۔

"خاموش، نکل جاؤ، لعنتی، نکل جاؤ" اس نے دھمکاتے ہوئے سرگوشی کی اور قدم بڑھا کر بالکل میرے قریب آ گئی۔ وہ اپنی بجھی بجھی سرد آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال کر غصے میں بڑبڑائی: "ہوں؟ دیکھ لیا، کمبخت، تو نے ہماری کیا درگت کر دی؟"

"بات سنو، نانی" میں نے سختی سے جواب دیا۔ "یہ جھگڑے چکانے اور ایک دوسرے پر الزام لگانے کا وقت نہیں ہے۔ اولیسیا کیسی ہے؟"

''ھشت! چپ! ھوتی کیسی، بےھوش پڑی ھے، کاش لوگ دوسروں کی باتوں میں ٹانگ نہ اڑائیں، تم نے لڑکی کو طرح طرح کی احمقانہ باتیں نہ بتائی ھوتیں تو آج کو یہ دن تو نہ دیکھنا پڑتا۔ میں، پاگل بڑھیا، یہ سب دیکھتی رھی اور آنکھیں بند کئے بیٹھی رھی۔ میں جانتی تھی مصیبت سر پر منڈلا رھی ھے۔ میں تو اس دن سے سمجھ رھی تھی جس دن تم زبردستی اس جھونپڑی میں آ گھسے تھے۔ کیا؟ تم یہ کہنا چاھتے ھو کہ تم نے گرجا جانے کو نہیں کہا تھا؟،، اچانک وہ پھٹ پڑی، اس کا چہرہ نفرت کی وجہ سے مسخ ھو رھا تھا۔ ''تمھارے نہیں، تو کس کے ھیں یہ کرتوت، لعنتی آوارہ، کہو نا؟ جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کرو، مکار لومڑی کی طرح باتیں بنانے سے کام نہیں چلے گا، بےشرم بےھودہ! آخر تم پر ایسی مصیبت کیا تھی اسے گرجا لیجانے کی؟،،

''میں نہیں لے گیا، نانی، بخدا میں نہیں لے گیا۔ وہ خود چاھتی تھی۔ ،،

''اف، میرے خدا!،، اس نے بےتابی سے ھاتھ جھٹکے۔ ''نا مراد واپس آئی تو چہرے کا عجیب عالم تھا، بلاؤز کے چیتھڑے لٹک رھے تھے اور سر سے رومال غائب تھا۔ مجھے قصہ سناتے ھوئے تو کبھی ھنستی کبھی روتی، جانو پاگل ھو۔ اور پھر پلنگ پر گرکے روتی، سبکتی رھی، اور میں سمجھی کہ وہ

اونگھ سی گئی ہے۔ میں بڑھاپے میں بالکل سٹھیا
گئی ہوں، میں خوش تھی کہ چلو سوکے اس کی
طبیعت ھلکی ہوگی اور حالت ذرا بہتر ہو جائے گی۔
پھر میں نے دیکھا کہ اس کا بازو نیچے لٹکا ہوا
ہے، سوچا: لاؤ بازو ٹھیک کر دوں، ورنہ سن ہو
جائے گا۔ مگر ہاتھ لگانا غضب ہو گیا۔ آگ کی
طرح تپ رہا تھا۔ میری غریب بچی بخار میں پڑی
ہے۔ گھنٹے بھر تک ان تھک ایسی دردناک آواز
میں بین کئے ھیں کہ کلیجہ منہ کو آ گیا میرا!
ابھی پل بھر پہلے خاموش ہوئی ہے نامردا۔ دیکھو،
ارے دیکھو، یہ تم نے کیا کر دیا؟ کمبخت، یہ
کیا کر دیا تو نے، میری بچی کو؟ ،، وہ غصے
اور ناامیدی کے عالم میں پھر چلانے لگی۔

اور اچانک اس کا چہرہ بگڑکر انتہائی
وحشت ناک اور خوفناک ہو گیا، وہ پھوٹ کر
رو رھی تھی۔ اس کے ھونٹ پھیل گئے اور ان
کے کونے لٹک گئے، چہرے کے پٹھے اکڑ کر
کانپنے لگے، بھویں تن گئیں، پیشانی پر انتہائی
گہری شکنیں پڑگئیں۔ اور آنکھوں سے چنے برابر
آنسو ٹپاٹپ گرنے لگے۔ اس نے میز پر کہنیاں ٹکا کر
دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ اس کا پورا جسم
تھراتھرا کر آگے پیچھے جھوم رہا تھا۔

”ہائے میری چھو۔ و۔ وٹی سی بچی!،، وہ
تڑپی۔ ”میری پیا۔ ا۔ اری، میری ننھی سی بچ۔

20*

چی! ہائے میرے دل پہ کیسے گھونسے پڑ رہے ہیں!"

"بڑی بی، بند کرو یہ ہائے واویلا"، میں نے سختی سے اسے روک دیا۔ "اس کی نیند خراب ہو جائیگی!"

یہ سن کر وہ خاموش ہو گئی مگر اسی طرح آگے پیچھے جھومتی رہی، اس کا چہرہ ابھی تک بگڑا ہوا تھا اور بڑے بڑے آنسو میز پر گر رہے تھے۔ اس عالم میں تقریباً دس منٹ گزر گئے۔ میں مانوئلیخا کے قریب بیٹھا ایک مکھی جھٹکے کے ساتھ کھڑکی کے شیشے سے ٹکراتے دیکھ رہا تھا اور اس کی بھنبھناہٹ سن رہا تھا۔

"نانی!"، اچانک اولیسیا نے زیرلب پکارا۔ "نانی، کون ہے یہ؟"

مانوئلیخا لڑکھڑاتی ہوئی تیزی سے پلنگ کے پاس پہنچی اور فوراً بین کرنے لگی:

"ہائے، میری پیاری بچی، میرے دل کا ٹکڑا! ہائے، میں کیسی بدنصیب ہوں، ہائے، کیسی مصیبت پڑ گئی ہم پر!"

"چپ رہو، نانی!"، اولیسیا نے انتہائی دردناک آواز میں منت کی۔ "یہاں جھونپڑی میں اور کون ہے؟"

میں دبے پاؤں پلنگ کے پاس پہنچا۔ مجھے اپنی تندرستی اور اناڑی‌پن پر غصہ بھی تھا، کوفت

بھی اور بے چینی بھی — بیمار آدمی کے پاس بیٹھ کر ہمیشہ اسی قسم کا احساس ہوتا ہے۔

"میں ہوں، اولیسیا"، میں نے آواز نیچی کرکے کہا۔ "ابھی گاؤں سے آیا ہوں۔ میں تو دن بھر شہر میں رہا۔ کیا بہت تکلیف ہے، اولیسیا؟"

اس نے تکیوں سے منہ ہٹائے بنا ننگا بازو پھیلا دیا جیسے ہوا میں کچھ پکڑنے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں سمجھ گیا، میں نے اس کا تپتا ہوا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اس کی دودھ جیسی سفید کومل جلد پر دو بڑے نیل چمک رہے تھے، ایک کلائی سے ذرا اوپر اور دوسرا کہنی کے قریب۔

"پیارے"، اولیسیا نے کہنا شروع کیا، وہ بڑی مشکل سے بول رہی تھی۔ "میں تمھیں دیکھنا چاہتی ہوں لیکن کیسے دیکھوں، انھوں نے میرا چہرہ بالکل ناس کر دیا۔ یاد ہے، تمھیں میرا چہرہ کتنا پسند تھا۔ ہیں نا پیارے؟ مجھے اس خیال سے کتنی خوشی ہوتی تھی کہ تمھیں میری صورت پسند ہے... لیکن اب، اب مجھے دیکھ کر... تمھیں کراہیت آ جائے گی۔ میں... نہیں چاہتی کہ تم..."

"مجھے معاف کر دو، اولیسیا"، میں نے اس کے کان کے قریب جھک کر سرگوشی کی۔

وہ بڑی دیر تک میرا ہاتھ اپنے تپتے ہوئے ہاتھ میں تھامے رہی۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا کہہ رہے

20—1348

ہو، جان؟ ایسی باتیں کرتے شرم نہیں آتی؟ اس میں تمہاری کیا غلطی ہے بھلا؟ میری اپنی حماقت ہے، میں نے خود اپنے ہاتھوں اپنے سر مصیبت مول لے لی... نجانے میں نے یہ سب کیوں کیا؟ نہیں، جان، خود کو الزام نہ دو...،،

''اولیسیا، ایک بات کہوں، مانوگی۔ لیکن پہلے وعدہ کرو کہ میں جو کہوں گا وہ کروگی۔ ،،

''وعدہ کرتی ہوں، پیارے، تم جو کہوگے وہی کروں گی...،،

''اولیسیا، میں ڈاکٹر کو بلانا چاہتا ہوں۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں، اولیسیا، تم چاہو تو اس کی کسی ہدایت پر عمل نہ کرنا۔ مگر میری خاطر ہاں کر دو، اولیسیا۔ ،،

''اوہ پیارے! تم نے مجھے کس طرح پھنسا لیا، وانیا! نہیں، وانیا، خدا کے لئے نہیں، میں اپنا وعدہ پورا نہیں کر سکتی۔ میں سچ مچ بیمار ہو جاؤں اور مرنے لگوں تب بھی ڈاکٹر کو قریب نہیں آنے دوں گی۔ اور اب تو میں کوئی ایسی بیمار بھی نہیں ہوں۔ بس ذرا سہم گئی تھی، رات تک سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اور اگر رات تک ٹھیک نہ ہوئی تو نانی مجھے لاندش کا جوشاندہ پلا دیں گی۔ چائے میں رس بھری ڈال کر دے دیں گی۔ ڈاکٹر کو بلانے کی کیا ضرورت ہے بھلا؟ میرے مسیح تو تم ہو۔ تم آ گئے اور بس، میری طبیعت بہت بہتر

ہو گئی۔ بس ایک بات کا دکھ ہے: میں تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں، وانیا۔ صرف ایک نظر لیکن مجھے ڈر لگتا ہے۔''

میں نے انتہائی محبت سے اس کا سر اٹھایا۔ اس کا چہرہ بخار کی شدت سے تپ رہا تھا، سیاہ آنکھوں میں ایک عجیب غیرقدرتی چمک پیدا ہو گئی تھی اور سوکھے ہوئے لب کانپ رہے تھے۔ اس کے چہرے اور گردن پر لمبی لمبی سرخ بدھیاں پڑی ہوئی تھیں اور پیشانی پر اور آنکھوں کے نیچے گہرے نیل پڑ گئے تھے۔

''خدا کے لئے، وانیا، میری طرف نہ دیکھو، نہیں نہیں! میں بےحد بدصورت ہو گئی ہوں،'' اس نے زیرلب کہا اور ہاتھوں سے میری آنکھیں بند کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

میرے دل میں رحم کا طوفان ابل پڑا۔ میں کمبل کی طرف جھکا اور اس کے بےجان ہاتھوں پر ہونٹ رکھ کر انہیں بےتحاشہ چومنے لگا۔ میں نے پہلے بھی اس کے ہاتھ چومے تھے۔ مگر وہ ہمیشہ جیسے سہم کر اور شرما کر ہاتھ کھینچ لیتی تھی۔ لیکن آج اس نے میرے پیار سے بھاگنے کی کوشش نہیں کی بلکہ دوسرے ہاتھ سے میرے بالوں سے کھیلتی رہی۔

''تمہیں سب کچھ معلوم ہے کیا؟'' اس نے سرگوشی کی۔

میں نے سر سے اشارہ کیا۔ مشچینکو کی بات سے میرے پلے کچھ بھی نہیں پڑا تھا لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ اولیسیا صبح کا واقعہ یاد کرکے ہلکان ہو۔ اس کے ساتھ جو ظلم ہوا تھا اس کا خیال کرکے میں غصے سے پاگل ہوگیا۔

''کاش اس وقت میں وہاں ہوتا!،، میں نے تن کر مٹھیاں بھینچ لیں۔ ''میں تو... میں تو...،،

''چھوڑو، میری جان، اتنا خفا ہونے کی کیا بات ہے بھلا۔ بھول جاؤ، پیارے،، اولیسیا نے کمزور آواز میں مجھے روک دیا۔

اب میں ان آنسوؤں کو اور زیادہ نہ روک سکا جنھوں نے میری آنکھوں میں آگ لگا رکھی تھی، جن کی وجہ سے میرا گلا رندھا جا رہا تھا۔ میں اولیسیا کے کندھے پر سر رکھ کر خاموشی سے تلخ آنسو بہانے لگا۔ میرا پورا بدن کانپ رہا تھا۔

''تم رو رہے ہو، وانیا؟،، اس کی آواز میں حیرت، محبت اور دردمندی کی جھنکار تھی۔ ''خدا کے لئے رونا بند کرو، پیارے، خود کو اس طرح ہلکان نہ کرو، پیارے۔ میں تو تم سے بہت خوش ہوں۔ چھوڑو، وانیا، ہم دونوں ساتھ ہیں تو بھلا آنسو کیوں؟ آؤ، ان آخری چند دنوں کو خوشیوں میں ڈبو دیں، پھر ہم دونوں کے لئے جدائی اتنی تکلیف دہ نہیں رہے گی۔،،

میں نے حیرت سے سر اٹھایا۔ دل میں ایک

عجیب موہوم سا شبہ پیدا ہوا اور جیسے کوئی دل مسوسنے لگا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو، اولیسیا؟ آخری چند دن کیسے؟ ہم جدا کیوں ہوں گے بھلا؟''

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ چند سیکنڈ وہ بالکل خاموش رہی۔

''وانیا، ہمیں جدا ہونا ہی پڑے گا''، اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''میری طبیعت سنبھلتے ہی ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ اب اور زیادہ دن یہاں نہیں رہ سکتے۔''

''کسی بات سے ڈر رہی ہو کیا؟''

''نہیں، پیارے، جو کچھ ہونا ہی ہے وہ تو ہوگا ہی۔ میں کسی بات سے نہیں ڈرتی۔ لیکن ہم لوگوں کو گناہ کرنے پر کیوں اکسائیں؟ تم نہیں جانتے، وانیا، وہاں پریبروڈ میں میں نے انہیں دھمکی دی ہے۔ اس وقت میں اتنی خفا تھی، اور مجھے ایسی شرم آ رہی تھی کہ کیا بتاؤں۔ اب شہر میں جو کچھ بھی ہوگا اس کا الزام ہم پر آئیگا۔ کوئی ڈھور مرے یا کسی گھر میں آگ لگے، مجرم ہم بنیں گے۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا، نانی؟''، اس نے آواز بڑھا کر پوچھا۔

''کیا کہہ رہی ہے، میری بچی؟ میں نے سنا نہیں''، مانوئلیخا قریب آ گئی اور کان پر ہاتھ رکھ کر بدبدانے لگی۔

"میں کہہ رہی تھی کہ اب پریبروڈ میں جو کچھ بھی برائی ہوگی اس کا الزام ہم پر آئیگا نا۔"

"ہاں ظاہر ہے، میری بچی۔ دنیا کی ہر برائی کا الزام ہم دکھیاروں پر آئے گا۔ اب ہمیں چین کا سانس نصیب نہیں ہو سکتا۔ کمبخت ہمیں تباہ کرکے دم لیں گے۔ ارے پچھلی دفعہ مجھے گاؤں سے کیوں نکالا گیا؟ یہی تو ہوا تھا نا؟ ایک بار میں نے غصے میں کسی بدھو عورت کو دھمکی دے دی تھی، اور اس کا بچہ مر گیا تھا۔ خدا جانتا ہے میرا اس میں کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ لیکن ان کمبخت لعنتیوں نے مجھے ادھ موا کر دیا تھا۔ میں بھاگی تو انھوں نے مجھ پر پتھر برسائے، مجھے تو بس ایک فکر تھی، میری بچی، کہ کسی طرح تیرے اوپر آنچ نہ آنے پائے۔ ننھی سی جان تھی اس وقت تو! میں سوچ رہی تھی کہ کمبخت مجھے مار لیں، لیکن ننھی سی معصوم جان پر تو ہاتھ نہ اٹھائیں؟ اف کتنے جنگلی اور وحشی ہیں یہ لوگ۔ کافر کہیں کے، میرا بس چلے تو کمبختوں کو پھانسی پر لٹکا دوں، یہی حشر ہونا چاہئے ان کا!"

"لیکن تم جاؤگی کہاں؟ تمھارے تو نہ کوئی عزیز ہے نہ رشتےدار، اور پھر نئی جگہ گھر بسانے کے لئے روپیے بھی تو چاہئے۔"

"کچھ نہ کچھ صورت نکال ہی لیں گے"، اولیسیا نے بےپرواہی سے کہا۔ "نانی کے پاس بھی کچھ

روپیہ نکل آئے گا۔ انھوں نے کچھ جمع جوڑ رکھی ہے۔"

"اسے روپیہ کہتی ہے تو؟" مانوئلیخا نے بستر کے پاس سے ہٹتے ہوئے خفگی سے کہا۔ "آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے چند بیکار اور ذلیل کوپک ہیں کمبخت اور بس۔"

"اور میرا کیا ہوگا، اولیسیا؟ مجھے بھول گئیں تم!" میں نے دکھی ہوکر ملامت کی۔

وہ بستر سے ذرا سا اٹھی اور بڑھیا کی موجودگی کی پرواہ کئے بنا میرا سر ہاتھوں میں تھام کر میری پیشانی اور گالوں کو چومنے لگی۔

"میری جان، تمھیں بھولوں گی؟ دنیا کی ہر چیز سے زیادہ فکر مجھے تمھاری ہے۔ لیکن ہماری قسمت میں یہی لکھا ہے کہ ہم ایک نہ ہو سکیں۔ یاد ہے میں نے تمھارے لئے تاش پھیلائے تھے؟ تاشوں کی بتائی ہوئی ہر بات حرف بحرف صحیح ثابت ہو رہی ہے۔ قسمت کو یہ منظور ہی نہیں کہ ہم تم ایک ساتھ ہنسی خوشی زندگی بتا سکیں۔ ورنہ میں دنیا کی کسی طاقت سے ڈرنے والی تھی بھلا؟"

"پھر وہی تقدیر کا رونا!" میں بے صبری سے چلایا۔ "مجھے ذرا اعتقاد نہیں ہے ان باتوں میں۔ نہ ہے نہ ہو سکتا ہے۔"

"اوہ، نہیں، ایسا نہ کہو، جان" اس نے خوفزدہ ہوکر آہستہ سے کہا۔ "میں اپنی وجہ سے نہیں

ڈرتی، پیارے، تمھاری وجہ سے ڈرتی ہوں۔ تم اس بارے میں بات نہ کرو تو اچھا ہو۔ ،،

میں نے اسے سمجھانے کی لاکھ کوشش کی، اس کے سامنے بے پناہ خوشیوں کی تصویر کھینچی جسے نہ تقدیر تباہ کر سکتی ہے، نہ یہ جاہل اور ظالم لوگ۔ لیکن بات نہ بنی۔ اولیسیا نے سر ہلا کر میرے ہاتھوں کو چوم لیا۔

''نہیں، وانیا، نہیں... میں جانتی ہوں۔ میں سب کچھ صاف دیکھ سکتی ہوں،، وہ مصر تھی۔ ''ھمیں رنج وغم کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوگا، کچھ نہیں۔ ،،

میں اس کی توہم پرستی اور اندھے اعتقاد سے گھبرا گیا، آخر میں نے مضطرب ہو کر پوچھا:
''کم سے کم اتنا تو بتا دو، اولیسیا، کہ تم کب جا رہی ہو؟،،

وہ سوچ میں پڑ گئی اور پھر پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔

''تمھیں ایک کہانی سناؤں۔ ایک دن جنگل میں ایک بھیڑیا دوڑ رہا تھا۔ اسے ایک خرگوش نظر آیا۔ اس نے خرگوش سے کہا کہ 'میں تمھیں کھا جاؤں گا!'، خرگوش گڑگڑایا 'مجھ پر رحم کر، بھیڑئیے، میں زندہ رہنا چاہتا ہوں، میرے ننھے گھر پر میری راہ دیکھ رہے ہیں۔'، مگر بھیڑیے نے اس کی ایک نہ سنی، آخر خرگوش نے کہا 'اچھا

کم سے کم تین دن کی مہلت تو دو، پھر کھا لینا۔ اس طرح موت کچھ آسان ہو جائےگی۔ ، خیر بھیڑئے نے اسے تین دن کی مہلت دے دی۔ اسے کھایا نہیں مگر اس پر نظر رکھی۔ ایک دن گزرا، پھر دوسرا، اور آخر تیسرا دن آ گیا اور بھیڑئے نے کہا کہ 'لو اب تیار ہو جاؤ، اب میں تمھیں نوالہ بناؤنگا۔ ، اور خرگوش تڑپ تڑپ کر رونے لگا۔ 'بھیڑئے، تو نے مجھے یہ تین دن دئے ھی کیوں! ارے جیسے ھی دیکھا تھا ھڑپ کر لیا ھوتا۔ یہ تین دن تو میرے لئے موت سے بدتر ھو گئے!'، خرگوش ٹھیک ھی کہتا تھا، جان۔ کیوں، کیا خیال ھے تمھارا؟،،

میں خاموش رھا۔ آنےوالی تنہائی اور ھجر کے دردناک خیال سے میرا دل بھر آیا۔ اچانک اولیسیا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے سے بلا کا خلوص اور جوش ٹپک رھا تھا۔

''وانیا، ایک بات بتاؤ،، اس نے زور دےکر پوچھا۔ ''ھم دونوں ساتھ تھے تو تم خوش تھے نا؟،،

''اولیسیا، یہ تم کیا پوچھ رھی ھو؟،،

''تمھیں اس کا افسوس تو نہیں تھا کہ تم مجھ سے کیوں ملے؟ میرے ساتھ رھنے میں تم نے کبھی کسی اور عورت کے متعلق سوچا تھا؟،،

''کبھی نہیں، ایک پل کے لئے بھی نہیں! نہ تمھاری موجودگی میں سوچا نہ تنہائی میں، میں نے

تمھارے سوا کسی کے بارے میں نہیں سوچا۔ ،،

’’کبھی دل میں حسد کا جذبہ تو نہیں ابھرا تھا؟ کبھی مجھ سے خفا ہوئے تھے؟ میری صحبت میں کبھی کبھی بیزاری محسوس نہیں ہوتی تھی تمھیں؟،،

’’کبھی نہیں، اولیسیا، کبھی نہیں!،،

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دئے اور انتہائی محبت بھری نظروں سے میری آنکھوں کو دیکھنے لگی۔

’’اس کا مطلب یہ ہے، پیارے، کہ میری یاد کے ساتھ تمھارے دل میں کبھی غصے کا طوفان نہیں ابلے گا، تم مجھے کبھی برا نہیں کہوگے،، اس نے اس قدر یقین کے ساتھ کہا جیسے وہ میری آنکھوں میں میرا مستقبل پڑھ رہی ہو۔ ’’جدائی کے بعد شروع شروع میں تم بہت اداس اور دکھی رہوگے، بے حد اداس! تم دن رات آنسو بہاؤگے، کسی کل چین نہیں پڑے گا۔ اور پھر یہ طوفان گزر جائے گا، یہ داستان بیتے دنوں کی داستان بن جائے گی۔ اور تب میری یاد تمھیں دکھی نہیں کرے گی۔ تم بڑی خوشی اور بڑے چاؤ سے میرے بارے میں سوچا کروگے۔،،

اس نے پھر سر تکیے پر رکھ دیا۔

’’اچھا، اب جاؤ، پیارے،، اس نے کمزور سی آواز میں کہا۔ ’’جاؤ، جان، اب گھر جاؤ۔ میں

ذرا تھک گئی ہوں۔ نہیں، ٹھیرو۔ مجھے پیار تو کر لو پہلے۔ نانی سے نہ ڈرو، وہ کچھ نہیں کہیں گی۔ کیوں، نانی، کوئی اعتراض تو نہیں آپ کو؟،،

''اچھا، خیر چل، اچھی طرح خدا حافظ کہہ لے،، مانوئلیخا نے خفگی سے جواب دیا۔ ''مجھ سے چھپانے سے کیا فائدہ؟ میں تو بہت دن سب کچھ سمجھتی ہوں۔ ،،

''یہاں، یہاں اور یہاں پیار کرو، وانیا،، اولیسیا نے آنکھوں، رخسار اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا۔

''اولیسیا! تم تو اس طرح رخصت ہو رہی ہو جیسے ہم اب کبھی ملیں گے ہی نہیں!،، میں نے گھبرا کر کہا۔

''کون جانے، پیارے۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ اچھا، جاؤ، اب اطمینان سے چلے جاؤ۔ نہیں، ایک سیکنڈ ٹھیرو! میرے منہ کے پاس کان لاؤ۔ جانتے ہو مجھے ایک بات کا دکھ ہے، وانیا؟،، اس نے سرگوشی کی۔ اس کے لب میرے گالوں کو چھو رہے تھے۔ ''مجھے دکھ ہے کہ میں تمھارے بچے کی ماں نہ بن سکی۔ اگر ایسا ہوتا تو کتنی خوشی حاصل ہوتی!،،

میں مانوئلیخا کے ساتھ باہر نکل گیا۔ آدھے آسمان پر سیاہ بادل چھایا ہوا تھا جس کے مڑے تڑے اور تیز کنارے چمک رہے تھے۔ لیکن مغرب میں

ڈوبتا ہوا سورج ابھی تک چمک رہا تھا۔ روشنی اور بڑھتی ہوئی تاریکی کے اس امتزاج میں بڑی نحوست، بڑا اسرار تھا۔ بڑھیا نے ہاتھ سے آنکھوں پر سایہ کرکے اوپر دیکھا اور بڑے معنیٰ خیز انداز میں اپنا سر ہلایا۔

"آج پریبروڈ میں بارش کا طوفان آئیگا"، اس نے وثوق سے کہا۔ "خدا پناہ میں رکھے۔ کون جانے اولے بھی پڑیں۔"

۱۴

میں پریبروڈ کے قریب پہنچ چکا تھا کہ اچانک بگولوں نے سڑک پر گرد کے بادل اٹھا لئے اور انھیں چکر دیا۔ بارش کی موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔

مانوئلیخا ٹھیک ہی کہتی تھی۔ پریبروڈ پر بارش کا طوفان پھٹ پڑا۔ یہ طوفان تپش اور گھٹن کے سر پر چوبیس گھنٹے سے منڈلا رہا تھا۔ بجلی چمک رہی تھی اور میری کھڑکی کے شیشے اس کڑک گرج سے تھرا تھرا کر بج رہے تھے۔ رات کو آٹھ بجے کے قریب چند لمحے کے لئے طوفان تھما لیکن پھر دوگنی طاقت کے ساتھ شروع ہو گیا۔ اچانک اس قدیم گھر کی چھت اور دیواروں پر اتنی زور کے دھماکے ہونے لگے کہ کان پھٹے جا

رہے تھے۔ میں کھڑکی کی طرف بھاگا۔ اخروٹ جتنے بڑے اولے برس برس کر زمین پر اچھل رہے تھے۔ میں نے گھر کے قریب اگے ہوئے شہتوت کے درخت کو دیکھا۔ وہ بالکل ننگا کھڑا تھا۔ اس کی ایک ایک پتی ان خوفناک اولوں کی نذر ہو چکی تھی۔ کھڑکی کے نیچے تاریکی میں مجھے یرمولا کا سیاہ جسم نظر آیا۔ وہ جھلملیاں بند کرنے کے لئے کوٹ میں سر چھپائے ابھی باورچی خانے سے بھاگا تھا۔ لیکن چڑیا اڑ چکی تھی۔ برف کا ایک بڑا سا ڈھیلا اس قدر زور سے ایک شیشے سے ٹکرایا کہ شیشہ چور چور ہو گیا اور اس کی کرچیں میرے کمرے کے فرش پر بکھر گئیں۔

میں انتہائی تھکا ہوا تھا چنانچہ کپڑے اتارے بغیر یوں ہی پلنگ پر گر پڑا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اس رات میں پلک بھی نہ جھپکا سکوں گا، میں نے سوچا کہ صبح تک یونہی اضطراب اور درد کے عالم میں کروٹیں بدلنی ہیں تو کپڑے اتار کر کیا کروں گا۔ یونہی سو جاؤں تاکہ تھوڑی دیر بعد نیند نہ آنے پر کمرے کے چکر لگا لگا کر خود کو تھکا سکوں۔ اور پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے صرف لمحے بھر کو آنکھیں بند کی تھیں لیکن جب دوبارہ آنکھیں کھولیں تو جھلملیوں کی درازوں سے سورج کی چمکدار کرنیں ترچھی ترچھی کمرے میں

آ رہی تھیں، اور ان کی روشنی میں گرد کے ان گنت ذرے تیر رہے تھے۔

یرمولا میرے سرہانے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے سے انتہائی پریشانی، بےچینی اور انتظار کی کیفیت عیاں تھی۔ شاید وہ دیر سے میرے جاگنے کا انتظار کر رہا تھا۔

"مالک"، اس نے بڑی گھبرائی ہوئی سی آواز میں کہا۔ "مالک، فوراً یہاں سے نکل جائیں۔"

میں نے پاؤں نیچے لٹکا کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"نکل جاؤں؟ کہاں؟ کیوں؟ کچھ پاگل تو نہیں ہو گئے، یرمولا؟"

"نہیں، مالک، میں پاگل نہیں ہوں"، وہ غرایا۔ "معلوم ہے کل رات اولوں نے کیا حال کر دیا؟ آدھی فصل مانو کسی نے روند کے رکھ دی ہو۔ کانے مکسیم، کوزیل، موت، پروکوپچوک اور گوردی اولی‌فر کے کھیت بالکل تباہ ہو گئے۔ آخر اس لعنتی جادوگرنی کو قحر نازل کرا کے ہی چین آیا! خدا غارت کرے اسے!"

میرے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح یہ خیال آیا کہ کل کیا ہوا تھا۔ اور یاد آیا کہ اولیسیا نے گرجا کے قریب شہریوں کو دھمکی دی تھی، اور پھر مجھے اس کے خوف اور اندیشوں کا خیال آیا۔

''ساری بستی اکٹھی ہو رہی ہے،، یرمولا کہہ رہا تھا۔ ''صبح سے یار لوگ شراب چڑھا رہے ہیں، اجی اب تو چیخ پکار کی نوبت آ گئی ہے۔ مالک، لوگ آپ کے متعلق بھی اول‌فول بک رہے ہیں، آپ تو جانتے ہیں ہمارے گاؤں‌والے کس قماش کے ہیں؟ ان جادوگرنیوں سے بدلا لیا تو خیر ٹھیک اور مناسب، لیکن مالک، آپ سے میں یہی کہوں‌گا کہ آپ جلدی سے جلدی یہاں سے نکل بھاگیں۔،،

تو اولیسیا کے اندیشے صحیح ثابت ہوئے۔ اسے اور مانوئلیخا کو فوراً اس نئے خطرے سے آگاہ کرنا ضروری تھا جس کی تلوار اس وقت ان کے سروں پر لٹک رہی تھی۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے، منہ پر ایک آدھ پانی کا چھپکا مارا اور آدھے گھنٹے بعد گھوڑے پر سوار ہوکر ''گوشۂ‌شیطان،، کی طرف روانہ ہوگیا۔

جیسے جیسے میں جادوگرنی کی جھونپڑی سے قریب ہو رہا تھا ویسے ویسے میری بےسبب اور درد بھری پریشانی بڑھ رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ میرے اوپر یک نئی اور بالکل غیرمتوقع مصیبت پڑنےوالی ہے۔

میں ریتیلی ڈھلان پر پھیلے ہوئے راستے پر بھاگ رہا تھا۔ جھونپڑی کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور دروازہ چوپٹ پڑا تھا۔

"اف میرے خدا! یہ کیا ہو گیا یہاں؟"
میں نے زیرلب کہا۔ اندر گھستے ہوئے میرا دل ڈوبنے لگا۔

جھونپڑی خالی پڑی تھی۔ اندر وہ اداس بےترتیبی پھیلی ہوئی تھی جو عجلت کی رخصتی کی خصوصیت ہے۔ زمین پر کوڑے کباڑ اور چیتھڑوں کے ڈھیر پڑے تھے اور پلنگ کا لکڑی کا ڈھانچہ اپنے مخصوص کونے میں ننگا کھڑا تھا۔

میرا دل اداس تھا اور آنکھوں میں آنسو چلے آ رہے تھے۔ میں باہر نکل رہا تھا کہ اچانک میری نظر ایک چمکدار سی چیز پر پڑی جو کھڑکی کے چوکھٹے کے کونے میں لٹکی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے یہ چیز جان بوجھ کر وہاں لٹکائی گئی تھی۔ اولیسیا اور اس کی دلکش اور وسیع محبت کی یہ آخری اور واحد نشانی — یہ ان سستے سرخ دانوں کی ایک لڑی تھی جنھیں پولیسئے میں مونگا کہا جاتا ہے۔

۱۸۹۸ء

سفید پوڈل

۱

کرائمیا کے جنوبی ساحل کی تنگ پہاڑی پگڈنڈیاں خانہ‌بدوشوں کی اس چھوٹی سی ٹولی کو بنگلوں کی اگلی بستی کی طرف لے جا رہی تھیں۔ ننھا سا سفید پوڈل* آرتو ہمیشہ آگے رہتا — اس کے بال شیر کے انداز میں کٹے ہوئے تھے۔ وہ دوڑ رہا تھا اور اس کی لمبی سی سرخ زبان ایک طرف کو لٹکی ہوئی تھی۔ نکڑ پر پہنچ کر وہ رکتا، دم ہلاتا اور مڑکر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگتا۔ نجانے راہ کے وہ کونسے نشان تھے جو اس کے سوا کسی کو بھی نظر نہ آتے، وہ ہمیشہ صحیح راستہ بھانپ لیتا، چنچل مخملیں کان ہلاتا اور چھلانگیں مارتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ کتے کے پیچھے پیچھے بارہ سالہ سرگئی بائیں بغل میں نمدہ دبائے بھاگا جا رہا تھا۔ اسی نمدے پر دنیا جہان کے کرتب دکھائے جاتے تھے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں سنہرے پروں‌والی چڑیا کا گندہ سا تنگ پنجرہ تھا۔ چڑیا کا کام تھا چھوٹے سے ڈبے سے قسمت بتانے‌والے رنگین کاغذ

---

* لمبے اور گھنگھریالے بالوں‌والا کتا۔ (ایڈیٹر)

نکالنا ۔ سب سے آخر میں ٹولی کا سردار بدحال اور بوڑھا دادا مارتین لودیژکن ہانپتا کانپتا بڑھ رہا تھا ۔ بوڑھے کی دوھری کمر پر شرمانکا (ایک باجا) لدا ہوا تھا ۔

باجا بہت پرانا تھا ۔ اس کی طویل زندگی نے مرمت کے نجانے کتنے مرحلے طے کئے تھے اور اب وہ ہر وقت کھانستا کھنکھارتا رہتا تھا ۔ اس سے دو راگ نکلتے تھے ۔ کبھی لاؤنیر کے اداس جرمن والز کی دھنیں نکلتیں اور کبھی ''سفر چین،، کی ایک چلتی ہوئی دھن نکلنے لگتی ۔ یہ دونوں دھنیں آج سے تیس چالیس برس پہلے بہت مقبول تھیں لیکن اب بالکل بھلائی جا چکی تھیں ۔ اس کے علاوہ ساز میں دو بدحال نلکیاں تھیں ۔ ایک نلکی تو بالکل ھی بے کار ہو چکی تھی ۔ اس کی باری آتے ھی راگ ٹھٹھکتا، لنگڑاتا اور آخر تھرتھراکے رہ جاتا ۔ دوسری نلکی سے بڑے مدھم مدھم راگ نکلتے، مگر مصیبت یہ تھی کہ اس کی کنجی فوراً بند نہ ہوتی، ایک دفعہ راگ چھڑ جاتا تو وھی ایک کھرج، وھی ایک راگ مسلسل نکلتا رہتا ۔ راگ نکلتا اور دوسری آوازوں سے ٹکراتا تو کبھی ان پر چھاتا چلا جاتا ۔ اور پھر اچانک آواز بند ہو جاتی ۔ ساز کی ایک ایک کمزوری پر بڑے میاں کی نظر تھی، کبھی کبھی وہ بھپتی کستے اور ان کی آواز سے دبی دبی سی اداسی جھلکنے لگتی :

''کیا کریں، بھائی، دقیانوسی زمانے کا ساز ہے۔ نزلہ زکام ہو گیا بچارے کو، میں نے کوئی راگ چھیڑا نہیں کہ بنگلےوالے بھڑک اٹھے۔ 'تھو، کیا کباڑ ہے!'، کبھی میرے راگ بڑے چلتے ہوئے، بڑے اچھے جانے جاتے تھے اور آج یہ زمانہ آن لگا ہے کہ صاحب لوگوں کو میری موسیقی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ انھیں تو ''جاپانی رقاصہ'' چاھئیے، ''دو سروں‌والے عقاب کے سائے میں'' اور ''چڑیوں کا سوداگر'' کا والز چاھئیے۔ اور پھر نلکیوں کا یہ رنگ ہے! میں ساز مرمت کرانے لے گیا مگر مرمت سرمت کہیں سے کچھ کام نہیں بننے کا، مستری بولا: 'نئی ڈالواؤ، بابا، نلکیاں نئی۔ بلکہ میری مانو تو اپنے اس کوڑے جیسے کباڑ کو کسی عجائب گھر کی زینت بنا دو۔ جانو تبرک رکھا ہے...'، واہ صاحب واہ، خوب کہی! نجانے کب سے میرے اور تیرے پیٹ کا دوزخ بھررھا ہے، کیوں سرگئی، اور اللہ نے چاھا تو کچھ دن اور ساتھ دے جائیگا!''

بڑے میاں باجے پر اس طرح جان دیتے تھے جیسے وہ کوئی قریبی عزیز رشتےدار بلکہ کلیجے کا ٹکڑا ہو۔ خانہ‌بدوشی کی اس طویل اور کٹھن زندگی میں باجے نے کبھی اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اور اب تو وہ بڑے میاں کے لئے جیتا جاگتا رفیق بن چکا تھا۔ کبھی کبھی انھیں کسی گندی سرائے

کے احاطے میں رات بتانی پڑتی۔ ایسے میں باجا ہمیشہ بڑے میاں کے سرھانے زمین پر دھرا رھتا، کبھی کبھی اچانک اس سے ایک کمزور اداس اور تھرتھراتی ھوئی سی آواز پیدا ھوتی جیسے کوئی بےیار و مددگار بوڑھا کراہ رھا ھو۔ لودیڑکن اس کے نقشین پہلو کو تھپک کر محبت بھری آواز میں سرگوشی کرتا:

''زندگی پھولوں کی سیج نہیں ھے، میرے دوست! ..
پرواہ نہیں، تو جی برا نہ کر، میرے یار!،،

بڑے میاں کو اپنی صحرا نوردی کے ننھے ساتھیوں پوڈل اور ننھے سرگئی سے بھی اتنا ھی لگاؤ تھا جتنا باجے سے بلکہ شاید اس سے بھی کچھ زیادہ۔ آج سے پانچ سال پہلے بڑے میاں نے ایک شرابی رنڈوے موچی سے یہ لڑکا ''کرائے،، پر لیا تھا۔ لڑکے کا کرایہ کوئی دو روبل مہینہ طے پایا۔ لیکن رنڈوا موچی جلد ھی مر گیا۔ زندگی کے تقاضوں اور محبت کے بندھنوں نے بڑے میاں اور سرگئی کو ھمیشہ کے لئے ایک کر دیا۔

۲

پگڈنڈی بلند اور ڈھلوان ساحل کے ساتھ ساتھ دوڑ رھی تھی، زیتون کے صدیوں پرانے جھنڈ کے سائے تلے پہنچ کر بل کھاتی چلی گئی تھی۔ کبھی

کبھی درختوں کے جھنڈ سے سمندر کی ایک جھلک نظر آتی اور حد نظر تک ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر ایک پرسکون اور بلند دیوار کی طرح ابھرتا ہوا معلوم ہوتا۔ چاندی کی طرح جھلملاتے ہوئے سبز پتوں کے رنگارنگ جھروکوں سے اس کا رنگ اور زیادہ گہرا اور زیادہ نیلا معلوم ہونے لگتا۔ گھاس کے تختوں، قزل کی جھاڑیوں، جنگلی گلابوں، انگور کے باغیچوں اور درختوں کے جھنڈوں میں ٹڈے تیز آواز میں شور مچا رہے تھے۔ ان کی ایک سری اور گونجدار جھنکار سے ہوا جیسے تھرتھرا رہی تھی۔ دن بہت گھٹا گھٹا سا تھا۔ ہوا کا نام و نشان نہ تھا اور تپتی ہوئی زمین پاؤں کو جھلس رہی تھی۔

سرگئی حسب معمول بڑے میاں کے آگے آگے چل رہا تھا، اچانک وہ رک کر بڑے میاں کے قریب پہنچنے کا انتظار کرنے لگا۔

''کیوں، سرگئی، رکا کیوں؟،، بڑے میاں نے پوچھا۔

''بڑی سخت گرمی ہے، دادا، اب تو سہا نہیں جاتا! ذرا ایک آدھ غوطہ لگا لیتے!،،

بڑے میاں نے چلتے چلتے عادتاً باجا کمر پر ٹھیک طرح جمایا اور آستین سے چہرے کا پسینہ پونچھا۔

''واہ کیا بات کہی ہے!،، انھوں نے سرد آہ بھرکر کہا اور بڑے شوق سے ٹھنڈے ٹھنڈے

نیلگوں سمندر کو تکنے لگے۔ ''مگر، بیٹا، دوچار ڈبکیاں لگانے کے بعد تو گرمی بالکل ھی نڈھال کر دے‌گی۔ میرا ایک ملنے‌والا چھوٹا ڈاکٹر تھا، وہ کہے تھا کہ یہ نمک آدمی کو کھوکھلا کر دیتا ھے۔ ابے ساگر کا نمک ھے، کوئی مذاق نہیں ھے!..''

''کون جانے جھوٹ بولتا ھو''، سرگئی نے بےیقینی سے کہا۔

''جھوٹ کی ایک ھی رھی، لو اور سنو، جھوٹ کیوں بولےگا بھلا؟ بڑا بھلا آدمی ھے، بچارا شراب کباب سے دور ھی دور رھتا ھے، سیواستوپول میں چھوٹا سا گھر ھے اس کا۔ یوں بھی یہاں سے سمندر تک جانے کا کوئی راستہ بھی نظر نہیں آ رھا۔ سیسخور پہنچنے تک دم لے۔ وھاں پہنچتے ھی اپنے گنہگار جسم دھو لیں‌گے۔ دن کو کھانے سے پہلے ایک آدھ ڈبکی لگا لیں تو بڑا اچھا رھتا ھے... نہایا کھایا اور پھر ذرا کی ذرا کمر سیدھی کرلی۔ واہ کیا کہنے!''

آرتو کو پیچھے سے باتوں کی آواز آئی تو وہ مڑا اور بھاگتا ھوا ادھر آ گیا۔ چمکتی ھوئی دھوپ میں اس کی نرم نرم ھلکی نیلی آنکھیں جھپکنے لگیں، نگاھوں میں بڑی گھلاوٹ پیدا ھو گئی، سانس پھول گیا اور لٹکی ھوئی زبان تھرتھرانے لگی۔

”کیوں بے لڈو، کیوں؟ بڑی گرمی ہے کیا؟“ بڑے میاں نے کہا۔

کتے نے زبان موڑ کر لمبی سی جمائی لی، اس کا ننھا سا بدن تھرتھرایا اور وہ باریک سی آواز میں رو دیا۔

”کیا کریں، یار، کچھ بس نہیں چلتا ان کا۔ کیوں جی، وہ کیا کہاوت ہے مکھڑا پسینے میں بھیگا ہوا، بدن نڈھال“، لودیڑکن تو اچانک وعظ کرنے لگا۔ ”ارے تجھ سے بات کرتے ہوئے مکھڑا نہ کہا تھوتھنی کہہ دیا، مگر بات تو وہی ہے، میاں!.. اچھا اچھا، چلو اب آگے بڑھو، چلو دوڑو یوں مڑگشتی کرنے سے کام نہیں چلنے کا۔ سچی بات یہ ہے، سرگئی، کہ مجھے تو یہ گرمی بڑی بھاوے ہے۔ بس ذرا یہ باجہ کمر توڑے ہے۔ روزی کمانے کا جھنجھٹ نہ ہوتا تو میں تو یہیں کسی درخت کے سائے تلے گھاس پر پڑ کر اور یونہیں پڑا رہتا۔ ہماری بوڑھی ہڈیوں کے لئے تو جانو دھوپ ہی سب کچھ ہے۔“

پگڈنڈی نیچے گہرائی کی طرف دوڑ رہی تھی۔ پتھر جیسی سخت کشادہ اور جھلملاتی ہوئی سفید سڑک کے قریب پہنچ کر پگڈنڈی جیسے اچانک کھو گئی تھی۔ اس سے آگے کسی کاؤنٹ کا بوڑھا باغ پھیلا ہوا تھا۔ باغ کی ہریالی میں چاروں طرف دلکش بنگلے، رنگا رنگ کیاریاں، ہرے بھرے سے

پودے گھر اور خوبصورت فوارے بکھرے ہوئے تھے۔ لودیژکن ان جگہوں سے خوب اچھی طرح واقف تھا، سال کے سال انگور کی فصل کٹتی تو کرائمیا بھر میں خوش پوش دولت مند اور منچلے بانکوں چھیلوں کا زور رھتا۔ اس زمانے میں بڑے میاں بستی بستی گھوما کرتے تھے۔ جنوبی علاقوں کی شان و شوکت اور رنگینی بڑے میاں کے دل کے تاروں کو چھیڑنے میں ناکام رہتی، مگر سرگئی نے پہلی دفعہ اس دھرتی پر قدم رکھا تو فطرت کے حسن کو دیکھ کر قدم قدم پر جھوم اٹھا۔ میگنولیا اور اس کے کھردرے اور چمکدار پتے، جن پر قدرت کے ھاتھوں نے روغن سا کر رکھا تھا، رکابی جتنے بڑے بڑے سفید پھول، انگور کے بڑے بڑے خوشوں کے بوجھ تلے جھکی ہوئی بیلوں سے ڈھکے ہوئے سرسبز کنج، صدیوں پرانے چھتنار چنار، ان کے تناور تنے اور سیمیں چھال، تمباکو کے کھیت، چشمے اور جھرنے اور سرسبز کیاریوں، باڑھ اور بنگلوں کی دیواروں پر لہلہاتے اور مہکتے ہوئے خوش رنگ اور حسین گلاب — غرض کہ دھکتی اور مہکتی ہوئی اس زندگی کے حسن نے لڑکے کی سیدھی سادھی روح میں وجدانی کیفیت پیدا کر دی۔ وہ گھڑی گھڑی بڑے میاں کی آستین پکڑ پکڑ کر کھینچتا:

”دادا، ائے دادا، ذرا دیکھو تو سہی اس فوارے کی مچھلیاں سونے کی ھیں، سونے کی! خدا قسم،

دادا، کھرا سونا ہے، جھوٹ نکلے تو کھڑے کھڑے سر کاٹ لو!،، لڑکا باغ کی آہنی باڑھ میں سر گھسا کر چلایا جس کے بیچوں بیچ ایک بڑا سا تالاب تھا۔
''ارے، دادا، آڑو آڑو! دادا، ارے، دادا، کتنے بہت سے ہیں! ایک درخت پر!،،
''چل بے بدھو چل، یہاں کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے،، بڑے میاں ہنستے ہوئے اسے دھکیلتے۔ ''ابھی کیا ہے، ابھی تو ہم نوواروسیسک جائیں گے اور پھر دوبارہ جنوب کی طرف چل پڑیں گے۔ وہ ہے زوردار جگہ — دیکھنے کی چیز ہے، دیکھنے کی۔ ابھی کیا ہے، ابھی تو ہم سوچی جائیں گے، آدلیر اور توآپسے جائیں گے۔ اور پھر سوخومی اور باتومی۔ دیکھ کر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ تو ٹھیر تو سہی، بیٹا۔ ارے کھجور کے درخت ہی کو لے لو۔ کیا لاجواب چیز ہے! روئیں دار تنا، نمدے جیسا سمجھ لو اور ایک ایک پتا اتنا بڑا کہ ہم دونوں کو ڈھک لے۔،،
''اللہ قسم؟،، سرگئی نے خوشی اور حیرت سے کہا۔
''ارے تو ٹھیر تو سہی۔ خود اپنی آنکھ سے دیکھ لیجو! ایک کیا، ہزاروں چیزیں ہیں وہاں تو! نارنگیاں ہیں، لیمو ہیں، دوکانوں میں دیکھا ہے نا تو نے؟،،
''ہاں۔،،

''تو وہ بھی دیکھے گا تو۔ ہوا چاہئے نارنگی کو، تازہ ہوا۔ سیدھے درخت میں پھلتی ہے، جانو اپنے ہاں کے سیب ناشپاتیوں کی طرح۔ اور وہاں بھیا، ان علاقوں کے باسی بھی بالکل جنگلی ہیں: ترک ہیں، ایرانی ہیں اور بھانت بھانت کے چرکیشیائی۔ سب کے سب لبادے پہنے خنجر لٹکائے۔ باپ رے باپ، بڑے کٹھور لوگ ہیں! اجی کبھی کبھی تو کالے بھجنگ حبشی بھی نظر آ جاتے ہیں۔ باتومی میں تو جب جاؤ جبھی دیکھ لو۔''

''حبشی! جانتا ہوں، جانتا ہوں، ارے وہی نا جن کے سینگ ہوتے ہیں''، سرگئی نے یقین سے کہا۔

''نہیں، بکواس ہے، رے یہ سینگ وینگ کبھی نہیں ہوتے ان کے! ہاں، رنگ ان کے جوتے سے زیادہ کالے ہوں ہیں، اجی بڑی چمک ہو ہے ان کے رنگوں میں، یہ موٹے موٹے سرخ ہونٹ، بڑی بڑی سفید آنکھیں اور کالی بھیڑ کے سے گھنگھریالے بال۔''

''بڑے ڈراؤنے دکھتے ہوں گے، یہ حبشی تو!''

''کیا بتاؤں تجھے؟ نظر عادی نہ ہو تو سچی بات ہے آدمی سہم جاوے ہے پر جب دیکھیں ہیں کہ دنیا زمانے کے اور دوسرے لوگ نہیں ڈرتے تو اپنی بھی ذرا ہمت بندھتی ہے... ارے بیٹا، بھانت بھانت کی چیزیں ہیں وہاں تو۔ خود اپنی آنکھ سے دیکھ لیجو۔ بس ایک جھنجھٹ ہے، بخار کی مصیبت ہے۔ کمبخت۔ ہر طرف دلدل ہی

دلدل ھیں، گندگی ھے اور پھر گرمی کس بلا کی ھے۔ وھاں‌والوں کو تو، بھیا، پتہ بھی نہیں چلتا، اثر ھی نہیں ھوتا ان پر مگر ھمارے جیسے بدیسوں کی جان پر بن جائے ھے۔ ھوں، سرگئی، چاھے کچھ بھی ھو، میاں سرگئی، ھمیں تمھیں تو زبان کے جوھر دکھانے ھی پڑیں‌گے۔ ابے آ، اس چھوٹے پھاٹک سے اندر آ جا۔ اس بنگلے میں بڑے نیک صاحب لوگ رھتے ھیں۔ ارے میں کیا نہیں جانتا، میرے بھیا۔ مجھ سے پوچھ — کیا پوچھنا ھے تجھے!،،

مگر آج کے دن تو جیسے بدبختی ان کی تاک میں بیٹھی تھی۔ کہیں دور ھی سے دھتکارے گئے، کہیں باجے کے خرخراتے ھوئے بھنچے بھنچے سر سنکر صاحب لوگوں کی تیوری چڑھ گئی، اور بالکونیوں سے اشارے کر کرکے انھیں بھگا دیا گیا۔ کہیں کہیں ملازموں نے بتایا کہ ''مالک ابھی نہیں آئے۔،، دو بنگلوں میں تماشہ دکھانے میں کامیاب بھی ھوئے تو انعام واجبی ھی واجبی ملا۔ مگر سچی بات ھے بڑے میاں چھوٹے سے چھوٹے انعام پر بھی کبھی منہ نہ بناتے۔ سڑک پر نکلتے ھوئے انھوں نے بڑی خوشی اور اطمینان سے جیب میں تانبے کے سکے کھنکھنائے:

''دو اور پانچ کتنے ھوئے بھلا، سات کوپک،، وہ ھنس کر کہتے۔ ''کیوں، بھائی سرگئی، یہ بھی بڑی دولت ھے، میاں۔ سات ضرب سات کتنے ھوئے —

آدھے روبل برابر تو ہو ہی گئے۔ تو جی سمجھو ہم تینوں کے لئے پیٹ بھرنے اور رات کو پڑ رہنے کا ٹھکانا تو ہو ہی گیا، بڈھے اور بدحال لودیژکن کو گھونٹ دو گھونٹ شراب بھی چاھئے، کیا کریں، بھائی، چھٹتی نہیں ھے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی! ھائے مگر ان صاحب لوگوں کو کون سمجھائے! بیس کوپک تو ھاتھ سے چھٹ نہیں سکتے، اور پانچ کوپک دینا شان کے خلاف ھے۔ بس جی دورھی سے نکالو نکالو ہو جائے ھے! خالی ھاتھ لوٹانے سے بہتر ھے، بھائی، تین کوپک ھی تھما دو۔ میں بگڑتا تو نہیں، چندا میرے، اجی چھوڑو بھی، بگڑنے کی کیا بات ھے بھلا۔ ،،

یوں بھی لودیژکن خاموش طبیعت آدمی تھا، دھکے دے دے کر نکال دو تب بھی اف نہیں کرےگا۔ لیکن آج تو ایک موٹی تازی، خوبصورت اور بظاھر بڑی نیکدل خاتون نے اس کے سکون کو چکنا چور کر دیا۔ یہ عورت پھولوں کے باغیچوں سے گھرے ہوئے خوبصورت بنگلے کی مالکہ تھی۔ اس نے بڑی توجہ سے راگ سنا اور اس سے بھی زیادہ توجہ سے سرگئی کے کرتب اور آرتو کے دلچسپ تماشے دیکھتی رھی۔ پھر وہ بڑی دیر تک لڑکے سے اس کا نام اور عمر پوچھتی رھی اور یہ پوچھتی رھی کہ اس نے یہ کرتب کہاں سیکھے، بوڑھا اس کا کیا لگتا ھے، اس کے ماں باپ کیا کرتے تھے

وغیرہ وغیرہ۔ پھر اس نے انھیں رکنے کو کہا اور خود اندر چلی گئی۔

دس منٹ گزرے اور پھر شاید پندرہ منٹ بیتے، اور وہ باہر نہ نکلی، وقت گزرتا رہا اور فن کاروں کی موہوم امیدیں بڑھتی چلی گئیں، بڑے میاں نے تو احتیاطاً ہاتھ سے منہ چھپا کر چھوکرے سے سرگوشیوں میں یہاں تک کہہ ڈالا:

"لے لے، سرگئی۔ قسمت کھل گئی اپنی تو۔ میں جانتا ہوں، بیٹے، سب کچھ جانتا ہوں، وہ ضرور ہمیں جوتے یا کپڑے دے گی، پکی بات ہے!"

آخر خاتون بالکونی میں آئی، سرگئی کی ٹوپی میں چھوٹا سا روپہلی سکہ ڈالا اور تیزی سے اندر چلی گئی۔ یہ سکہ ایک بہت پرانا دس کوپک کا سکہ تھا جو دونوں طرف سے گھسا ہوا تھا، یہی نہیں بلکہ اس میں چھید بھی ہو گیا تھا۔ بڑے میاں بڑی دیر تک حیران و پریشان کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ اور پھر وہ سڑک پر نکل آئے۔ مگر بنگلے سے بہت دور پہنچنے پر بھی سکہ اسی طرح بڑے میاں کی ہتیلی پر دھرا تھا جیسے بڑے میاں اسے تول رہے ہوں۔

"اونہہ... اف... گھٹیا!" اچانک وہ رکتے ہوئے بڑبڑایا۔ "اتنا تو میں ضرور کہوں گا — اور ہم تینوں احمق جی جان سے اسے خوش کرنے کی

کوشش کر رہے تھے۔ اس سے تو کمبخت کوئی بٹن وٹن ہی دے دیتی۔ بلا سے کہیں ٹانک ہی لیتے۔ اس کباڑ کا کیا کروں گا میں؟ بی بی جی سوچتی ہوگی بوڑھا رات برات کو چالاکی سے کسی کو دے دلا دیگا۔ نہیں، بی بی جی، نہیں، تم نے بوڑھے کو سمجھنے میں غلطی کی، بوڑھا لودیژکن ایسی حرکت نہیں کرنے کا! کیا سمجھیں! لو یہ لو اپنی دولت، لو اپنے دس کوپک! لیجاؤ!،،

اس نے بڑے غرور اور نفرت سے سکہ پھینکا اور وہ ہلکی سی جھنکار کے ساتھ سڑک کی سفید گرد میں دفن ہوگیا۔

سو بڑے میاں، لڑکے اور کتے نے اس ڈھنگ سے سارے بنگلوں کا چکر لگا ڈالا اور اب وہ ساحل کی طرف جانے والے تھے۔ بس ایک بنگلہ باقی تھا، بائیں ہاتھ والا آخری بنگلہ، احاطے کی اونچی سی سفید دیوار نے بنگلے کو نظروں سے اوجھل کر رکھا تھا۔ دیوار کے دوسری طرف گرد میں اٹے ہوئے نازک اندام سرو کی قطار سر بلند تھی جیسے بہت سی لمبی اور سیاہ سیاہ سی سلائیاں کھڑی ہوں۔ لیکن فولاد کے چوڑے چکلے نقشین پھاٹک سے، سرسبز و شاداب مخملیں لان کا ایک حصہ اور دائرہ نما کیاریاں نظر آ رہی تھیں۔ دور پس منظر میں انگور کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی ایک روش کی ہلکی سی جھلک نظر

آرہی تھی۔ لان کے بیچوں بیچ مالی کھڑا ہوا لمبے نلکے سے گلاب میں پانی دے رہا تھا۔ اس نے نلکی کے منہ پر انگلی جمائی اور سورج نے پانی کی پھواروں کو دھنک کے تمام رنگوں سے مالا مال کر دیا۔

بڑے میاں نے چلتے چلتے ذرا کی ذرا پھاٹک سے جھانک کر دیکھا تو حیران کھڑے رہ گئے۔

"ذرا ٹھیر تو سہی، سرگئی"، اس نے لڑکے کو آواز دی۔ "میں جانوں اندر کچھ لوگ گھوم پھر رہے ہیں۔ عجیب بات ہے، بھائی! نجانے کتنی دفعہ یہاں سے گزر ہوا ہے میرا۔ مگر کبھی کوئی متنفس نظر نہیں آیا۔ سرگئی، میرے بیٹے، ذرا بتانا تو سہی کیا لکھا ہے!"

" "بنگلہ' دوستی"، اندر آنا منع ہے"، سرگئی نے پھاٹک کے ستون پر لٹکا ہوا خوبصورت کتبہ پڑھا۔

"دوستی؟"، انپڑھ بڑے میاں نے آواز میں آواز ملائی۔ "وہ مارا! کیسا سندر نام ہے — دوستی! دن بھر تقدیر خراب رہی، بس اب ساری کمی پوری ہو جائیگی۔ میں تو شکاری کتے کی طرح دور ہی سے بو سونگھ لیتا ہوں، بیٹا۔ تت، تت، تت، آرتو، آرتو! چل بے، سرگئی، اللہ کا نام لے کر چل۔ ارے تو مجھ سے پوچھا کر سجھ سے۔ اجی میں سب جانتا ہوں، بھائی!"

22*

باغ کی روشوں پر بچھی ہوئی بجری کی موٹی تہہ قدموں کے نیچے چرچرا رہی تھی۔ روشوں کے دونوں طرف گلابی گھونگھوں کی گوٹ لگی ہوئی تھی۔ کیاریوں میں گھاس کے رنگا رنگ قالین پر اور صدرنگ پھول مسکرا مسکرا کر ہوا میں بھینی بھینی خوشبو بسا رہے تھے۔ فواروں میں دودھ جیسے اجلے پانی کی صاف شفاف پھواریں کلیلیں کر رہی تھیں۔ درختوں میں لٹکے ہوئے خوبصورت گملوں میں ہری بھری بیلوں کے ہار جھول رہے تھے۔ مکان کے سامنے سنگ مرمر کے ستونوں میں گیند جیسے دو آئینے جگمگا رہے تھے۔ ان کے سامنے پہنچتے ہی بڑے میاں، سرگئی اور کتا اچانک سر نیچے، ٹانگیں اوپر کھڑے نظر آئے۔ ان کے چہرے کھینچ کر لمبے ہو گئے تھے اور صورتیں بگڑی ہوئی تھیں۔

سرگئی نے بالکونی کے سامنے کی صاف ستھری اور ہموار زمین پر نمدہ بچھایا، بڑے میاں نے باجہ جمایا اور ہینڈل گھمایا چاہتے تھے کہ اچانک ایسی گڑبڑ مچی کہ سب اپنا کام چھوڑ چھاڑ ادھر متوجہ ہو گئے۔

آٹھ دس سال کا ایک لڑکا گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختا ہوا اس تیزی سے برآمدے میں آیا کہ اچانک فضا میں بم سا پھٹ پڑا۔ اس کے جسم پر ہلکا پھلکا

جہازی کا سوٹ تھا، بازو اور ٹانگیں ننگی تھیں ۔ اس کے گھنگھریالے سنہری بالوں کی کاکلیں شانوں پر بکھر گئیں، چھہ آدمی بچے کے پیچھے پیچھے بھاگے ۔ آگے آگے اپرن میں ملبوس دو عورتیں تھیں، ان کے پیچھے اردلی تھا، لمبے لمبے سنہری گل‌مچھوں‌والے بوڑھے اردلی کا چہرہ داڑھی مونچھ کی قید سے آزاد تھا اور اس کے موٹے جسم پر کالا کوٹ منڈھا ہوا تھا ۔ لال ناک اور لال بالوں‌والی سوکھی ماری لڑکی چارخانے‌دار نیلے فراک میں ملبوس تھی، اس کے بعد جالی کے ہلکے نیلے ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس کمزور اور نڈھال نوجوان حسینہ بدحال نظر آئی ۔ حسینہ کے پیچھے پیچھے سنہری عینک‌والا گنجا اور موٹا شخص تھا ۔ یہ حضرت سنئی کپڑے کے سوٹ میں ملبوس تھے ۔ وہ سب گھبرا گھبرا کر ہاتھ چلا رہے تھے، زور زور سے چیخ کر ایک دوسرے سے ٹکرائے جا رہے تھے ۔ ظاہر ہے ان کی اس بدحواسی اور گھبراہٹ کا سبب یہ لڑکا تھا جو یوں اچانک بم کے گولے کی طرح پھٹ پڑا تھا ۔

اور اس پورے وقت میں اس ہنگامے کے بانی کی چیخیں پل بھر کو بھی کم نہ ہوئیں ۔ وہ بھاگتے بھاگتے پختۂ فرش پر اوندھے منہ گرا، تڑپ کر سیدھا ہوا اور نہایت زور زور سے ہوا میں ہاتھ پاؤں مارنے لگا ۔ باقی لوگ اس کے اردگرد دوڑ دھوپ کر رہے تھے ۔ بوڑھا اردلی منت سماجت کر

رہا تھا۔ اس کے گل‌مچھے پھڑک رہے تھے اور وہ بار بار بکلف قمیص میں چھپے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کر بڑی عاجزی اور خوشامد سے کہہ رہا تھا:

''مائی باپ، سرکار، نیکولائی اپولونووچ! امی کو ہلکان نہ کیجئے، مالک۔ اٹھ جائیے... میں ہاتھ جوڑتا ہوں، دوا پی لیجئے، مالک، بہت میٹھی دوائی ہے، بیٹا، شربت ہے شربت۔ خدا کے لئے اٹھیئے، سرکار...،،

اپرن‌والی عورتیں کف افسوس مل رہی تھیں اور گھبرائی گھبرائی سی خوشامدی آواز میں کچھ بک رہی تھیں۔ لال ناک‌والی لڑکی انتہائی المیہ چہرہ بنائے بہت دردناک آواز میں کچھ چیخ رہی تھی لیکن وہ نجانے کس دیس کی زبان میں چیخ رہی تھی کہ کچھ بھی پلے نہ پڑ سکا۔ سنہری عینک‌والا آدمی جنگلی‌پن سے سر ہلا رہا تھا اور بڑی سنجیدگی سے ہاتھ اٹھا اٹھا کر گرجدار اور گمبھیر آواز میں لڑکے کو نصیحت کر رہا تھا۔ نڈھال حسینہ برابر جالی کے نفیس رومال سے آنسو پونچھ رہی تھی اور انتہائی دردناک آواز میں بین کر رہی تھیں۔

''آہ، ٹریلی، اف میرے خدا! ہاتھ جوڑتی ہوں، میرے ننھے فرشتے۔ سنو تو سہی دیکھو تو امی کتنے پیار سے کہہ رہی ہیں۔ لو پیو، دوا پی لو، تمھیں فوراً آرام آ جائیگا۔ پیٹ کی تکلیف بھی

جاتی رہےگی اور سر کا درد بھی۔ لو میری خاطر پی لو، میرے چاند! ٹریلی، تو کیا چاھتا ھے، اسی تیرے پاؤں پکڑ لے، بیٹے؟ اچھا لو میں تمھارے پاؤں پکڑتی ھوں۔ اشرفی لےگا میرا لال؟ بول! بولو، ٹریلی، دو اشرفیاں لوگے یا پانچ؟ ڈھیچوں ڈھیچوں کرنےوالا چھوٹا سا گدھا لوگے؟ بچھیرا منگواؤں تیرے لئے؟ ڈاکٹر، اسے سمجھاؤ، ڈاکٹر!،،

''ٹریلی، دیکھئے مرد بنئے، ٹریلی،، سنہری عینک‌والے موٹے شخص کی بھاری بھرکم آواز ابھری۔

''آوئی۔ ئی۔ آوئی۔ ئی،، لڑکا برآمدے میں تڑپنے اور جنونیوں کی طرح لاتیں چلا چلاکر چلانے لگا۔

وہ انتہائی پریشان تھا، اسے سخت تکلیف ھو رھی تھی، مگر کچھ بھی ھو، وہ کھڑے بیٹھے سب کے پیٹ اور ٹانگوں پر لاتیں مار رھا تھا لیکن ان سب کے سر نیاز خم تھے۔

سرگئی بہت دیر سے بڑے تجسس اور حیرت سے اس ھنگامے کو دیکھ رھا تھا، آخر اس سے رھا نہ گیا، اس نے آھستہ سے بڑے میاں کی پسلیوں میں کہنی ماری۔

''دادا، کیا ھو گیا اسے، دادا؟،، اس نے آھستہ سے پوچھا۔ ''کوڑے ماریں‌گے کیا اس بچارے کو؟،،

''لو اور سنو ضرور ماریں‌گے کوڑے! اجی وہ تو خود ھی ان سب کی مرمت کرکے رکھ دےگا۔

لاڈوں میں بگاڑ رکھا ہے لونڈے کو۔ کچھ جی برا ہو گیا ہے شاید۔ ''

''پاگل ہو گیا؟''

''ابے تو مجھے کیا معلوم؟ ابے چپ!''

''اوہے۔ اوہے۔'' لڑکا اور زیادہ زور سے چلانے لگا۔ ''سور! گدھے!''

''چل بے، سرگئی، شروع کر، میں خوب جانتا ہوں!'' اچانک لودیژکن نے حکم دیا اور بڑے زور و شور سے باجے کا پردہ ٹھیک کرنے لگے۔

باغ میں پرانے ساز کی منمنی سی خرخر گونج اٹھی۔ برآمدے میں کھڑے ہوئے لوگ چونکے اور پل بھر کو تو لڑکا بھی چپ ہو گیا۔

''یا اللہ، میرے بچے بچارے کو پریشان کرنے کہاں سے آ گئے یہ کمبخت!'' نیلے ڈریسنگ گاؤن‌والی خاتون دردناک آواز میں چلائیں۔ ''ارے انھیں نکالو، نکالو فوراً ان کمبختوں کو! اور ان کے اس گندے پلیت کتے کو بھی بھگاؤ۔ ان کتوں کمبختوں کو ہمیشہ بڑی خطرناک بیماریاں ہوتی ہیں۔ ارے بت کیا بنے کھڑے ہو، ایوان!''

اس نے انتہائی بیزاری اور نفرت سے رومال ہلایا کہ ان تینوں کو فوراً نکال دیا جائے۔ لال ناک‌والی لڑکی نے آنکھیں نکال کر انھیں گھورا اور ہجوم میں سے کوئی جھن جھن کرکے چیخا۔ کوٹ‌والا اردلی بڑی پھرتی سے زینے سے اترا اور دراتا ہوا

بڑے میاں کے پاس پہنچا۔ اس کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی اور بازو بڑی خفگی سے ہوا میں لہرا رہے تھے۔

''ا۔ ابے یہ کیا بےہودگی ہے، بڈھے؟'' وہ انتہائی بھاری اور گھٹی گھٹی سی آواز میں غرایا۔ اس کی آواز سے دھمکانے کا انداز بھی جھلک رہا تھا اور خوف کے جذبات بھی۔ ''کس کی اجازت سے اندر قدم رکھا؟ بن بلائے چلے آ رہے ہیں؟ دور ہو جا! بھاگ جا!''

باجے سے بےسری سی کراہ نکلی اور وہ خاموش ہو گیا۔

''اجی، بھلے آدمی، تم بات تو سنو میری'' بوڑھے لودیژکن نے بڑی شرافت سے کہا۔

''بات کی ایسی کی تیسی! دور ہو جا!'' اردلی چلایا اور اس کے حلق سے عجیب سی سیٹی نکلتی چلی گئی۔

لمحے بھر میں اس کا تھل تھلا چہرہ لال انگارہ ہو گیا اور آنکھیں پھیل گئیں، جیسے اب نکلیں تب نکلیں۔ اس کی بھیانک صورت دیکھ کر بڑے میاں بےاختیار دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔

''چل بھی، سر کٹی، سمیٹ سامان'' اس نے تیزی سے باجا کندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''چل!''

لیکن وہ چند قدم بھی نہ گئے تھے کہ برآمدے میں پھر ایسی چیخیں ابھریں کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔

"آوں ۔ ھو ۔ ں ۔ ں، مجھے دو ! میں چاھتا ھوں، بلاؤ، مجھے دو ! میں سنوں گا!"

"مگر، ٹریلی! اف میرے مولا، ٹریلی! ارے جلدی کرو، واپس بلاؤ اب کمبختوں کو!" اختلاجی طبیعت کی عورت کراھی ۔ "ایسی لعنت ھے، کیسے نا کارہ ھیں سب کے سب! ایوان، سنا نہیں میں کیا کہہ رھی ھوں؟ واپس بلاؤ ان بھکاریوں کو!"

"ھو ۔ و ۔ و ۔ ا اجی اور سنا ذرا! اے سنو ! اجی کیا نام ھے تمھارا، باجےوالوں! لوٹ آؤ، جلدی کرو!" برآمدے سے بہت سی آوازیں ابھریں ۔

موٹا اردلی ربڑ کی بڑی گیند کی طرح گدے کھاتا ھوا مداریوں کے پیچھے دوڑ رھا تھا اور اس کے گل مچھے ھوا میں اڑ رھے تھے ۔

"ٹھیرو جی، گائیکوں! ٹھیرو، سنو تو سہی!" وہ ھانپ رھا تھا اور ھاتھ ھلا کر چلا رھا تھا ۔ "اچھے اجی بھلے آدمی، اجی او بڑے میاں!" آخر اس نے بڑے میاں کی آستین پکڑ لی ۔ "چلو واپس چلو ! صاحب لوگ تمھارا تماشہ دیکھنا چاھتے ھیں ۔ جلدی کرو !"

"واہ جی واہ، خوب رھا!" یوں تو بڑے میاں نے غصے سے سر ھلا کر ٹھنڈا سانس لیا لیکن دیکھتے دیکھتے برآمدے میں واپس آ پہنچے ۔ کندھے سے باجا

اتار کر اپنے سامنے رکھا، اور ناچ گیت کے وہی بول بجانے لگے جن پر پہنچ کر پچھلی دفعہ رکنا پڑا تھا۔

برآمدے کا ہنگامہ ختم ہو گیا۔ خاتون، لڑکا اور سنہری عینک والے صاحب کٹھرے کے قریب آ گئے۔ باقی لوگ تعظیماً پیچھے کھڑے رہے۔ مالی بھی اپنے اپرن سمیت بڑے میاں سے تھوڑی دور پر کھڑا ہو گیا۔ دربان بھی اچانک نجانے کہاں سے آ کر مالی کے پیچھے کھڑا ہو گیا — لمبا چوڑا جسم، گھنی ڈاڑھی اور چیچک کے نشان، تنگ پیشانی اور اداس چہرہ۔ اس کے نئے کورے گلابی قمیص پر گہری سیاہ بندکیوں کی آڑی آڑی دھاریاں پڑی ہوئی تھیں۔

ناچ کی دھن کی تھرتھراتی ہوئی خرخراہٹ کے ساتھ سرگئی نے زمین پر نمدہ پھیلایا اور کینوس کی پتلون اتار پھینکی (پرانی بوری سے بنائی ہوئی پتلون سیں ٹھیک بیٹھنے کی جگہ کارخانے کا نشان چمک رہا تھا)، اس کے بعد سرگئی نے پرانی صدری اتاری اور اب اس کے جسم پر بنے ہوئے پھٹے پرانے نیکر کے سوا کچھ نہ تھا۔ نیکر مرمت کی نجانے کتنی منزلوں سے گزرنے کے باوجود اس کے دبلے پتلے، مضبوط اور لچکیلے جسم پر بڑا جچ رہا تھا۔ اس نے بڑے آدمیوں کی نقل کر کرکے ماہر نٹوں کے تمام گر، تمام انداز سیکھ لئے تھے۔ وہ نمدے کی طرف لپکا، لبوں پر ہاتھ

رکھے اور پھر بازو پھیلا دئے جیسے دو چنچل بوسے تماشائیوں کی طرف پھینک رہا ہو۔

بڑے میاں ایک ہاتھ سے باجے کا پردہ ہلا ہلا کر کھانستا کھنکارتا اور خرخراتا ہوا اداس نغمہ پیدا کر رہے تھے اور دوسرے ہاتھ سے لڑکے کی طرف مختلف چیزیں اچھال رہے تھے، لڑکا بڑی پھرتی سے فضا ہی میں ان چیزوں کو پکڑ لیتا۔ سرگئی کے تماشوں کا ذخیرہ تھوڑا تھا لیکن کھیل دکھانے کا ڈھنگ بہت اچھا تھا۔ بقول نٹوں کے وہ اپنا کام خوب کرتا تھا اور پورے جوش سے کرتا تھا۔ پہلے اس نے بیئر کی خالی بوتل اچھالی۔ بوتل سیدھی الٹی ہوکر ہوا میں اچھلتی رہی اور پھر اچانک اس نے اس بوتل کو پلیٹ کے کنارے پر الٹا ٹکا لیا اور کئی سکنڈ تک اسی طرح ٹکائے رہا۔ پھر ہاتھی دانت کی چار گیندوں اور دو شمعوں سے کرتب دکھائے۔ وہ ایکدم شمعیں اچھالتا اور انہیں لپک کر شمع‌دان پر روک لیتا۔ اور پھر تین قسم کی چیزوں کا کرتب دکھایا — پنکھا، ایک لکڑی کا سگار اور چھتری۔ یہ سب چیزیں ہوا میں اچھلتی اور گرتی رہیں لیکن ایک دفعہ بھی زمین تک نہ پہنچنے پائیں اور پھر اچانک چھتری اس کے سر پر تھی، سگار منہ میں اور پنکھا انتہائی مغرور تھرتھراہٹ کے ساتھ اس کے چہرے کو ہوا دے رہا تھا۔ آخر میں سرگئی نے نمدے پر کئی قلابازیاں کھائیں، ''مینڈک،، دکھایا، ''امریکی

گانٹھ،، کیا اور ہاتھوں پر چلا۔ اپنے کرتبوں کا خزانہ لٹانے کے بعد اس نے تماشائیوں کی طرف دو بوسے اور اڑائے، ہانپتا کانپتا بوڑھے کے پاس گیا اور باجا لے بیٹھا۔

اور اب آرتو کی باری تھی۔ کتا بھانپ گیا، اور پہلے ہی سے گھبرا گھبرا کر بھونکنے اور اچھل اچھل کر بڑے میاں کی طرف لپکنے لگا۔ کون جانے یہ چلتا پرزہ یہ کہنا چاہتا ہو کہ جب سائے تک میں تپش کا یہ حال ہو، تھرمامیٹر کی سوئی ۳۲ ڈگری سے اوپر پہنچ رہی ہو تو یہ سب کرتب دکھانا کہاں کی عقل مندی ہے۔ لیکن بوڑھے دادا نے بڑی چالاکی سے پیٹھ پیچھے سے پتلا سا چابک نکالا۔ ''میں پہلے ہی جانتا تھا!،، آرتو آخری دفعہ خفگی سے بھونکا اور بے دلی سے اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ اس کی جھپکتی ہوئی نگاہیں مالک کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''چل بے، آرتو! شاباش!،، بڑے میاں نے پوڈل کے سر پر چابک کڑکاتے ہوئے کہا۔ ''مڑ جاؤ... ایسے شاباش، مڑمڑ اور مڑیاں اور، اور، اور مڑ — ایک دفعہ پھر۔ اور اب ناچ، میرے یار، ناچ، اب بیٹھ جا! کیا؟ بیٹھے گا نہیں؟ بیٹھ، کہہ رہا ہوں بیٹھ۔ ہا۔ کیا کیا! خبردار! اور اب خواتین اور حضرات سے کہو 'مزاج شریف، اے بول، آرتو!،، بڑے میاں نے بلند آواز میں دھمکایا۔

''وھو۔ ھو۔ و۔ و !،، پوڈل نفرت سے بھونکا۔ پھر اس نے اپنے مالک کی طرف دیکھا اور اداس نگاھیں جھپکا کر دو دفعہ اور بھونکا۔

''ارے، بڑے میاں، تم ذرا بھی نہیں سمجھتے مجھے !،، اس کی اداس بھوں بھوں کہہ رھی تھی۔

''اچھا چھوڑو۔ مگر، بھائی، اول سلام پیچھے کلام اور آؤ اب تھوڑا لے، بھئی، اب ذرا اچھل کود ھو جائے !،، بڑے میاں نے زمین پر ھنٹر گھما گھما کر کہا۔ ''آلے، زبان نہ نکال، اے، ھاؤپ! یہ بات، واہ رے، میرے کتے، گھر پر پھر میں گاجر دوں گا تجھے۔ ارے ھاں مگر تجھے تو گاجر پسند ھی نہیں؟ لو میں تو بھول ھی گیا، اچھا لے، اب میرا ھیٹ لے اور صاحب لوگوں سے بخشش مانگ۔ کون جانے انھیں تجھ پر رحم آجائے، اور کوئی بڑھیا چیز مل جائے۔،،

بڑے میاں نے کتے کو پچھلی ٹانگوں پر کھڑا کیا اور پھٹی پرانی اور تیل چپڑی ھوئی ٹوپی اس کے منہ میں ٹھونس دی، اس ٹوپی کو انھوں نے مذاقاً ھیٹ کا نام دیا تھا۔ آرتو نے ٹوپی دانتوں میں دبا لی اور بڑی شائستگی سے برآمدے کی طرف گیا۔ زرد رو خاتون کے ھاتھ میں سیپی کا چھوٹا سا بٹوہ چمکا۔ کھڑے بیٹھے لوگ بڑے معنی‌خیز انداز میں مسکرائے۔

''دیکھا؟ میں نہ کہتا تھا؟،، بڑے میاں مگن ھو کر سرگئی کی طرف جھکتے ھوئے بدبدائے۔ ''اجی

تم مجھ سے پوچھو۔ وہ کون سی چیز ہے جو اپن نہیں جانتے۔ روبل نہ ملا تو نام بدل دیجو میرا۔ ،،

عین اسی وقت برآمدے میں بڑی بھیانک چیخ بلند ہوئی۔ چیخ اتنی تیز، اتنی دلخراش تھی کہ آرتو ٹوپی چھوڑچھاڑ برآمدے سے کود کر اپنے مالک کے پاس بھاگا، وہ گھبرا گھبرا کر پیچھے دیکھ رہا تھا اور اس کی دم ٹانگوں کے بیچ میں دبی ہوئی تھی۔

''میں یہ لوں گا۔ ا۔ ا۔ ا!،، گھنگھریالے بالوں والا لڑکا پاؤں پٹخ پٹخ کر چلایا۔ ''میں کتا لوں گا۔ ا۔ ا۔ ا! ٹریلی کتا لے۔ لے۔ لے گا۔ ا۔ ا!،،

''یا اللہ خیر! ھائے، ارے نیکولائی اپولونووچ! مائی باپ، مالک، دم لو، ٹریلی، خدا کے لئے دم لو!،، برآمدے میں پھر شور قیامت مچ گیا۔

''کتا! کتا لاؤ! مجھے کتا چاھئے، جنگلی، الو، گدھے!،، لڑکا دھاڑا۔

''مگر تو ھلکان تو نہ ہو، میری جان!،، نیلے ڈریسنگ گاؤن والی خاتون گڑگڑائیں۔ ''کتے کو پیار کرنا چاہتے ہو نا تم؟ اچھا، میرے لال، اچھا، ابھی لو منٹ بھر میں! ڈاکٹر، آپ کیا کہتے ھیں ٹریلی اس کتے کو تھپک لے تو کوئی حرج تو نہیں، ڈاکٹر؟،،

''میں تو کبھی اس کی اجازت نہ دیتا،، ڈاکٹر نے انکار میں ھاتھ ھلائے۔ ''لیکن کیڑے مارنے والی دوا، مثلاً بورک ایسڈ یا کاربالک ایسڈ کے ھلکے سے

پانی سے صاف کرنے کے بعد تو میں سمجھتا ہوں کہ — ایر۔ ‘‘

’’کتا۔ ا۔ ا!‘‘

’’ابھی لو، میرے ھیرا لالا، ابھی لو۔ تو پھر، ڈاکٹر، اسے بورک ایسڈ سے نہلانے کا حکم دوں، اور پھر... مگر، ٹریلی بیٹے، تو اتنا ھلکان تو نہ ہو، چاند! بڑے میاں، کتے کو یہاں لاؤ۔ ڈرو نہیں، بڈھے، ہم تمھیں خوش کر دیں گے۔ سنو کوئی روگ تو نہیں ھے اسے؟ میرا مطلب ھے پاگل تو نہیں ھے نا؟ کھجلی وجلی تو نہیں ھے کمبخت کو؟‘‘

’’تھپکوں گا نہیں، میں نہیں تھپکتا!‘‘ ٹریلی دھاڑا۔ اس کے منہ اور ناک سے بلبلے نکل رہے تھے۔ ’’میں تو بالکل لوں گا! الو کے پٹھے، گدھے! میں تو بالکل لوں گا! اس کے ساتھ کھیلوں گا، روز روز کھیلوں گا!‘‘

’’سنو، بڑے میاں، ادھر آؤ، بات سنو‘‘ خاتون نے لڑکے کی چیخوں کے باوجود اپنی آواز سنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ’’آو، ٹریلی، تمھاری چیخیں مار ڈالیں گی امی کو۔ آخر کس کمبخت نے گھسا لیا ان مداریوں کو۔ قریب آؤ، اور قریب — ھاں ایسے۔ ٹریلی، میری جان، غصہ نہ کرو، امی تمھاری ہر بات پوری کریں گی۔ خدا کے لئے رو نہیں۔ مس، بچے کو چپ کراؤ! ڈاکٹر، خدا کے لئے... بول کیا لے گا رے بڈھے؟‘‘

بڑے میاں نے ٹوپی اتاری، ان کے چہرے سے انتہائی تباہ حالی ٹپک رہی تھی۔

"کرم کیجئے، عالی جاہ، جتنی آپ کی مرضی، بیگم صاحب، ہم غریب آدمی ہیں، ہمارے لئے چھوٹے سے چھوٹی بخشش بھی بہت ہے... بوڑھے پر دیا کرو، بی بی جی۔"

"اف، کیسا بےوقوف بڈھا ہے! ٹریلی، بیٹے، گلا دکھنے لگے گا تمھارا! بھئی، بات سمجھنے کی کوشش کرو، کتا میرا نہیں، تمھارا ہے، بولو کتنا لوگے؟ دس؟ پندرہ؟ بیس؟"

"اوں، ں۔ں، اوں، دو نہ کتا، دو مجھے۔ کت۔ تا!"، لڑکے نے اردلی کے مٹکے سے پیٹ پر لات جماتے ہوئے چیخ ماری۔

"یہ بات ہے...، معاف کیجئے سرکار"، لودیژکن ہکلایا۔ "میں بڈھا آدمی ہوں، جاہل گنوار فوراً تو کوئی بات پلے ہی نہیں پڑتی۔ اور پھر ذرا اونچا سنتا ہوں۔ ہاں تو... آپ نے کیا دینا ہے سرکار؟ کتے کی قیمت؟.."

"اف میرے خدا! بڈھا تو جان بوجھ کر انجان بن رہا ہے!"، خاتون برس پڑیں۔ "ٹریلی کو ایک گلاس پانی دو، نرس۔ جلدی! سیدھی سی بات پوچھ رہی ہوں تم سے، کتنے میں بیچوگے کتا؟ سمجھے یا نہیں؟ کتا۔ کتا!"

''کتا! کت۔ تا!،، لڑکا زیادہ زور سے اونچی آواز میں چنگھاڑا۔

لودیژکن بگڑ گیا، اس نے جلدی سے ٹوپی سر پر رکھ لی۔

''میں کتوں کا کاروبار نہیں کرتا، بیگم صاحب،، اس نے بڑے سکون اور وقار کے ساتھ کہا۔ ''اور یہ کتا تو، بیگم صاحب، ہم دونوں کا پیٹ پالتا ہے، سرکار،، اس نے ہاتھ سے پیچھے بیٹھے ہوئے سرگئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کو بیچنا ناممکن ہے۔،،

ٹریلی ریل کے انجن کی سیٹی کی طرح مسلسل دھاڑ رہا تھا۔ نرس اس کے لئے گلاس میں پانی دے دی لیکن اس نے جھلجھلا کر گلاس کا گلاس نرس کے منہ پر دے مارا۔

''ارے، احمق بڈھے، میری بات تو سن۔ دنیا کی کون سی شے ایسی ہے جسے روپیے سے خریدا نہ جا سکے،، خاتون نے کنپٹیاں دباتے ہوئے اصرار کیا۔ ''مس، جلدی کرو، چہرہ پونچھو، میری دوا لاؤ، تو کیا سو روبل کا ہے تمہارا کتا؟ دو سو کا ہے؟ تین سو کا ہے؟ جواب دو نا، گدھے! ڈاکٹر، خدا کے لئے اس سے کچھ کہو!،،

''چل، بھائی سرگئی، چل!،، لودیژکن بڑبڑایا۔ ''گدھے... چلو، میرے آرتو، چل ادھر!،،

''اے، ذرا ٹھیر تو سہی، بھلے آدمی،، سنہری عینک‌والے موٹو مل نے افسرانہ لہجہ میں کہا۔ ''میری

بات مانو، ضد نہ کرو، بھائی میرے، تیرے اور تیرے کتے کے بدلے دس روبل بھی مل جائیں تو غنیمت جانو، ارے سوچ تو سہی، گدھے، کتنا بہت مل رہا ہے تجھے۔ ''

''ہاتھ جوڑتا ہوں، سرکار، شکریہ، مالک، لیکن...''
لودیژکن نے ایک کراہ کے ساتھ باجے کو اپنے کندھے پر لاد لیا۔ ''مگر یہ نہیں ہو سکتا، کتا بیچنا ناممکن ہے۔ کہیں اور ڈھونڈو، مالک، اللہ رحم! چل، سرگئی، چل آگے آگے۔ ''

''پاسپورٹ بھی ہے تیرے پاس کہ نہیں؟''
اچانک ڈاکٹر گرجا۔ ''ارے تم جیسے آوارہ گرد کی تو رگ رگ سے واقف ہوں میں!''

''دربان! سیمیون، نکالو انہیں!'' غصے کے مارے خاتون کا چہرہ بگڑ گیا۔

گلابی قمیص والا اداس صورت دربان انتہائی منحوس شکل بنا کر آگے بڑھا۔ برآمدے میں قیامت کبری مچ گئی۔ ٹریلی پوری قوت سے دھاڑ رہا تھا، اس کی ماں بین کر رہی تھی، نرس اور انا عجیب سی بولی میں بک بک کر رہی تھیں۔ اور ڈاکٹر شہد کی مکھی کی طرح خفگی سے بھن بھن کر رہا تھا۔ مگر بڑے میاں اور سرگئی کے پاس بھلا اتنا وقت کہاں تھا کہ اس قیامت کا انجام دیکھ سکیں۔ وہ خوف اور دہشت سے کانپتے ہوئے پوڈل کے پیچھے پیچھے پھاٹک کی طرف لپکے۔ دربان پیچھے سے انہیں ہنکا رہا تھا

اور بڑے میاں کی کمر پر لدے ہوئے باجے کو ٹھوکے دے رہا تھا۔

''یہاں مٹر گشتی کریں گے، آوارہ گرد!،، اس نے دھمکایا۔ ''خدا کا شکر ادا کر، لعنتی گنوار، کہ سر سلامت رہ گیا۔ اگلی دفعہ ادھر کا رخ کیا تو یاد رکھئیو میں لاجے شرمے خاموش ہونے والا نہیں ہوں۔ جھونٹے کھینچتا ہوا سیدھا کوتوال کے پاس لے جاؤنگا، نکمے!،،

بڑی دیر تک بڑے میاں اور لڑکا بالکل خاموش رہے۔ اور پھر اچانک انھوں نے کچھ اس طرح ایک دوسرے کو دیکھا جیسے پہلے سے طے کر رکھا ہو اور اچانک ہنس پڑے، سرگئی کے قہقہے کی گونج پر اس کی دیکھا دیکھی بڑے میاں بھی ذرا کھسیائے کھسیائے سے مسکرا دئے۔

''کیوں، دادا؟ تم تو سب جانتے ہو، نا؟،، سرگئی نے مکاری سے اسے چھیڑا۔

''ھا۔ا۔ں، بیٹا۔ آج تو ہم تم مصیبت میں پھنس گئے تھے،، بڑے میاں نے سر ھلایا۔ ''مگر کیسا بدتمیز چھوکرا ہے، دھت تیرے کی، کیسی بری تربیت ہے لونڈے کی، ذرا سوچو تو سہی پچیس آدمی اس کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ میرا بس چلتا تو مزہ چکھا دیتا سالے کو۔ لو اور سنو، کتا لیں گے اور کل کو کہے گا کہ آسمان سے چاند تارے توڑ

لاؤ۔ تب؟ آجا، رے آرتو، آ میرے کتے۔ واہ، صاحب، واہ کیا لاجواب دن ہے آج!،،

’’ہاں جی، اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے،، سرگئی نے طنز کیا۔ ’’ایک بیگم صاحب نے کپڑے دئے، دوسری نے روبل بخشے۔ سچ، دادا، تمھیں تو سب کچھ جوتے کے تلے میں نظر آجاتا ہے۔،،

’’ابے بک بک بند کر، رے کل کے چھوکرے،، بڑے میاں نے ہنس کر پیار سے ڈانٹا۔ ’’اور دربان سے بچ کر کیا بھاگا ہے تو؟ میں نے تو سوچا کہ بڑے میاں اس کی تو گرد کو بھی نہیں پا سکتے۔ بڑا بھاری بھرکم آدمی ہے یہ دربان۔،،

وہ تینوں باغیچے سے نکلے اور ٹوٹی پھوٹی ڈھلواں پگڈنڈی سے ساحل کی طرف اترنے لگے۔ ساحل کے قریب چٹانیں ذرا پیچھے کو دبی ہوئی تھیں۔ تنگ، اور ہموار سا کنارہ بن گیا تھا۔ یہاں سمندر کی لہریں چکنے کنکروں سے گھرے ہوئے ساحل سے اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔ ساحل سے تقریباً پانچ سو گز کے فاصلے پر ڈولپھن مچھلیاں پانی میں قلابازیاں کھا رہی تھیں، تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان کی گول اور چمکدار پیٹھ کی جھلک نظر آتی اور وہ پھر غائب ہو جاتیں۔ دور افق کے قریب، ریشمی اور نیلگوں سمندر میں گہری نیلی مخملیں گوٹ ٹنکی ہوئی تھی۔ اس گوٹ کے کنارے کنارے مچھلی پکڑنے والی کشتیوں کے

23—1348

بادبان بڑے سلیقے سے سجے ہوئے تھے۔ سورج کی کرنوں نے بادبانوں کو ہلکا گلابی لباس پہنا دیا تھا۔

''دادا، آؤ یہیں نہالیں،، سرگئی نے فیصلہ کن انداز سے کہا۔ اس نے چلتے چلتے کبھی ایک کبھی دوسری ٹانگ پر کود کود کر پہلے ہی پتلون اتار لیا تھا۔ ''میں تمھاری پیٹھ سے ساز اتار دوں۔،،

اس نے تیزی سے کپڑے اتارے، ننگے جسم پر ایک دھپ جمایا اور پانی میں کود پڑا۔ اس کی کھال دھوپ میں تپ تپ کر بھوری ہو گئی تھی۔ سرگئی کے کودتے ہی پانی میں لہریں اٹھیں اور ان پر جھاگ تڑپنے لگے۔

بڑے میاں نے اطمینان سے کپڑے اتارے، دھوپ سے بچنے کے لئے مچی مچی سی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر سرگئی کی طرف دیکھا اور بڑی محبت سے مسکرائے۔

''لونڈا زوردار نکل رہا ہے،، انھوں نے سوچا۔ ''ذرا دبلا تو ضرور ہے۔ ساری پسلیاں گن لو۔ مگر کچھ بھی ہو بڑا تگڑا جوان نکلے گا۔،،

''سرگئی، میں نے کہا بہت دور تک نہ تیریو، سمندری سور لے ڈوبے ہے کمبخت!،،

''ابھی میں دم پکڑ کر ایسا جھٹکا دوں گا کہ...،، سرگئی دور سے للکارا۔

بڑے میاں خاصی دیر تک دھوپ میں کھڑے بغلیں کھجاتے رہے، پھر پھونک پھونک کر قدم

رکھتے ہوئے پانی میں اترے۔ غوطہ لگانے سے پہلے گنجا اور سرخ سر ڈبویا اور سوکھی ماری پسلیاں بھگوئیں ۔ اس کا بے رنگ بدن بہت ہڈیالا اور کمزور تھا ، ٹانگیں بے حد دبلی اور شانے کی ہڈیاں نمایاں۔ برسوں سے باجے کے بوجھ تلے جھکے جھکے کمر دوہری ہو گئی تھی۔

''دادا، دیکھو، دیکھو،، سرگئی نے پکارا اور تیزی سے پانی میں قلابازی کھائی۔ بڑے میاں کمر کمر پانی میں کھڑے ہوئے مزے سے چھوٹی چھوٹی ڈبکیاں لگا رہے تھے۔ وہ گھبرا کر چیخے :

''اترانا بند کر، بے سور کے بچے، خبردار مزا چکھا دوں گا...،،

آرتو گھبرا گھبرا کر بھونکتا ہوا ساحل پر ادھر سے ادھر دوڑ رہا تھا ۔ لو بھلا کتا گھبرائے کیسے نہیں، لڑکا تیرتے تیرتے اتنی دور جو نکل گیا۔ ''یہ جواں مردی کسی اور کو دکھانا،، پوڈل کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ ''زمین موجود ہے، بھیا، یہاں مزے میں گھومو پھرو ! یہیں زیادہ مزہ آئے گا۔ ،،

بلکہ وہ دوڑتا دوڑتا اتنی دور نکل گیا کہ لہریں اس کے پیٹ کو چھونے لگیں ۔ اس نے زبان نکال کر ذرا سا پانی پیا۔ مگر یہ نمکین پانی اسے ذرا نہ بھایا۔ ساحل کی ریت سے کلیلیں کرتی ہوئی چھوٹی چھوٹی لہروں کو دیکھ کر تو اس کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ جلدی سے ساحل پر چلا گیا اور سرگئی کو دیکھ

دیکھ کر بھونکنے لگا۔ ''کیا ضرورت ہے آخر ان احمقانہ کرتبوں کی؟ آؤ بڑے میاں کے پاس مزے میں ساحل پر بیٹھیں؟ یہ لونڈا ساتھ ہو تو بس دھڑکا ہی دھڑکا لگا رہے ہے!''

''ابے لو، سرگئی، ابے نکلتا ہے کہ نہیں، بس بہت ہو لیا!'' بڑے میاں نے آواز لگائی۔

''بس ابھی لو، دادا، ایک منٹ اور'' لڑکے نے جواب دیا۔ ''دیکھو کیسے مزے میں مرغابی کی طرح تیرتا ہوں۔ غڑا۔ ا۔ اپ!''

آخر کار وہ تیرتا ہوا ساحل تک آیا۔ لیکن کپڑے پہننے سے پہلے اس نے جلدی سے آرتو کو گھسیٹا اور کتے کو اٹھائے اٹھائے غڑاپ سے پانی میں گیا اور اسے دور پانی میں اچھال دیا۔ کتا ھاتھ پاؤں مارتا ہوا تیزی سے ساحل کی طرف لپکا۔ چھوٹی سی ناک اور دو کان پانی پر تیر رہے تھے۔ وہ بڑی خفگی سے بھونک رہا تھا۔ باھر نکل کر پوڈل تھرتھرایا، اور بڑے میاں اور سرگئی پر ننھی ننھی بوندوں کی پھوار پڑنے لگی۔

''سرگئی، دیکھ تو سہی ھماری طرف تو نہیں آ رہا یہ آدمی'' لودیژکن نے پہاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کوئی ھاتھ ھلا ھلا کر کچھ چیختا ہوا تیزی سے نیچے اتر رہا تھا۔ یہ وھی اداس صورت دربان تھا جو کالی بندکیوں والی گلابی قمیص پہنے ہوئے تھا اور

جس نے پندرہ منٹ پہلے دھکے دے دے کر انھیں بنگلے سے نکالا تھا۔

''کیا چاہتا ہے یہ؟،، بڑے میاں نے الجھ کر پوچھا۔

۸

دربان کچھ چیختا ہوا بڑے بھدے‌پن سے بھاگ رہا تھا، اس کی آستینیں ہوا میں جھول رہی تھیں اور گریبان و دامن بادبان کی طرح اڑ رہا تھا۔

''اے، ہو۔و۔و۔و! پل بھر رکنا، بھائی!،،

''ابے اب کونسا پہاڑ ٹوٹ پڑا تجھ پر!،، لودیژکن جھلا کر بڑبڑایا۔ ''ضرور وہی آرتو کا جھگڑا ہوگا۔،،

''آؤ، دادا، مار بھگائیں اسے،، سرگئی نے بہادری سے کہا۔

''اپنے جامے میں رہ، لڑکے۔ کیسے عجیب ہیں یہ لوگ، میرا مطلب ہے صاحب لوگ!،،

''تم سنو تو یہی،، دربان دور ہی سے چیخا، اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ ''بولو بیچوگے پلا؟ چھوٹے سرکار کسی طرح قابو میں نہیں آ رہے، چھری تلے تڑپتے ہوئے بچھڑے کی طرح ایک ساتھ چلا رہے ہیں 'دو، جلدی دو، مجھے، کتا۔ تا۔ا دو!، مالکن نے مجھے دوڑایا ہے، کہنے لگیں کسی بھی قیمت پر کتا خرید کے لا!،،

''بس بہت ہو چکا، حماقت ہے تمہاری مالکن کی!،، لودیژکن کا پارہ چڑھ گیا۔ بنگلے کی نسبت یہاں ساحل پر اس کی ہمت بڑھ گئی تھی۔ ''اس جیسی کو یہاں گردانتا ہی کون ہے، تمہارے لئے ہوگی مالکن، میں تو تھوکتا بھی نہیں ایسے ایسوں پر اور بھائی، تو اللہ کے لئے ہمارا پیچھا چھوڑو، چلتے پھرتے نظر آؤ۔،،

لیکن دربان پر ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ وہ بڑے میاں کے قریب پتھر پر بیٹھ گیا اور بڑے بے تکے ڈھنگ سے انگلی گھما کر کہنے لگا:

''ابے ذرا سوچ تو سہی، گدھے!،،

''گدھا ہوگا تو!،، بڑے میاں نے سکون سے جواب دیا۔

''پل بھر دم لو... ارے بھائی، یہ مطلب نہیں تھا میرا... کیسا نک چڑھا بڈھا ہے۔ انھی توبہ، ذرا سوچو سہی، تمہارے کس کام کا بھلا یہ نکوڑا کتا۔ اجی کوئی دوسرا پلا پکڑ لیجو اور اسے یہ اٹھک بیٹھک سکھا دیجئو، لو بن گیا تمہارا کام۔ کیوں؟ کچھ غلط کہہ رہا ہوں کیا؟،،

بڑے میاں نے آہستہ آہستہ پتلون کے گرد پٹی کسی اور دربان کے مسلسل سوالوں کے جواب میں بڑے کاروباری ڈھنگ سے بولے:

''کہے جاؤ، کہے جاؤ، تمھیں جو کچھ کہنا ہے کہہ چکو تو میں اپنی کہوں۔،،

"تو بھائی، میرے ذرا کی ذرا میں تیری جھولی بھر جائے گی"، دربان تیز تیز بول رہا تھا۔ "دو تین سو روبل ادھار ودھار نہیں نقد! اس بھاگ دوڑ کے صلے میں میری بھی جیب ذرا گرم ہو ہی جائے گی، کیوں؟ ذرا سوچ تو سہی تین سو روبل نقد! اجی تم تو مزے میں پنساری کی دوکان کھول لیجئو۔"

باتیں کرتے کرتے دربان نے جیب سے گوشت کا ٹکڑا نکال کر پوڈل کی طرف اچھال دیا۔ آرتو نے فضا ہی میں گوشت جھپٹا اور ایک نوالے میں نگل گیا۔ اور پھر خوش ہوکر دم ہلانے لگا۔

"کہہ چکے؟"، لودیژکن نے دو لفظوں میں پوچھا۔

"بس جی بس، کوئی بھی چوڑی بات تو طے کرنی نہیں۔ کتا لاؤ اور پیسے لو۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ اور بس!"

"تو یہ بات ہے!"، بڑے میاں نے چوٹ کی۔ "تو کتا بیچ دوں؟"

"اجی فوراً بیچ دو، اور کیا چاہئے بھلا تمھیں؟ اجی مشکل یہ ہے کہ ہمارے چھوٹے سرکار بڑے ہٹی ہیں، کسی چیز کا سودا سر میں سمایا نہیں کہ سارا گھر سر پہ اٹھا لیں ہیں۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے مگر ان کی مرضی پوری ہونی چاہئے۔ اور یہ تو جب کی بات ہے جب باوا گھر پر نہ ہوں، اگر وہ بھی رہے تب تو ہم سب کو ناکوں چنے چبوا دیں

ھیں سرکار - بڑے سرکار انجنیر ھیں - اجی تم نے تو ضرور نام سنا ہوگا — مسٹر اوبلیانی‌نوف - دیس بھر میں ریلوں کا جال بچھا دیں ھیں، کروڑپتی ھیں، کروڑپتی! اور یہ لڑکا ان کا اکلوتا بیٹا ھے - بس جی جب دیکھو تب کوئی نیا شگوفہ کھلاوے‌گا چلتا پھرتا ٹٹو لوں گا، لو جی ٹٹو حاضر ھے، مجھے کشتی دو، بس جی اچھی سے اچھی کشتی حاضر ھے - جو بات منہ سے نکل گئی — پوری ہوکے رہے‌گی - ،،

"اور چاند؟،،

"ھیں جی، کیا کہا جی تم نے؟،،

"میں نے کہا آسمان سے چاند توڑنے کی بات کبھی نہیں کی اس نے؟،،

"واہ جی واہ - کیا بات کرو ھو تم بھی!،، دربان کچھ پریشان سا ھو گیا - "تو کیا کہتے ھو بھائی؟ سودا طے ھو گیا؟،،

اتنی دیر میں بڑے میاں بھوری صدری پہن چکے تھے جو سیونوں کے قریب سے ھری ھری سی ھو گئی تھی - وہ بڑے غرور سے تن کر کھڑے ھوئے اور ان کی جھکی ھوئی کمر نے جہاں تک اجازت دی، اکڑتا چلا گیا -

"ایک بات کہوں، میرے بھائی،، انھوں نے بڑی سنجیدگی سے کہنا شروع کیا - "تمھارا کوئی بھائی بند ھو، یا کوئی ایسا دوست ھو، جس کا تمھارا بچپن سے ساتھ رھا ھو... روک کے، بھائی، روک کے، کتے

پر بیکار گوشت برباد نہ کرو — اجی تم خود ہی کھا لو، اس رشوت سے تمھارا کام نہیں بننے کا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اگر کوئی تمھارا بچپن کا مخلص دوست ہو، تو تم اسے کتنی قیمت پر بیچ دوگے؟،،

''واہ کیا مقابلہ ہے!،،

''تمھیں نے یہ کہنے پر مجبور کیا، ہاں تو اپنے مالک سے ہی کہہ دیجئو جو ریلیں بناتا ہے،، بڑے میاں کی آواز تیز ہو گئی۔ ''کہ ہر چیز کا سودا نہیں ہوتا، سمجھے! اور میرے کتے کو چمکارنا بند کرو، یہ ہت کنڈے بیکار ہیں، بھائی۔ ادھر آ بسے پلے، ابے او آرتو، میں تجھے۔ ے۔ ے! سرگئی چل، تیار ہو جا۔،،

''بڈھے، تم نرے گدھے ہو، بالکل گدھے،، آخرکار دربان پھٹ پڑا۔

''خیر میں تو گدھا ہوں مگر تم... پاجی تم تو کمینے ذلیل، غدار ہو،، لودیژکن نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''اپنی بیگم صاحب سے ہم غریبوں کا عاجزانہ سلام کہہ دیجئو۔ سرگئی، نمدہ لپیٹ! اف میری کمر، میری دکھیا کمر، چلو چلیں۔،،

''اچھی بات ہے!،، دربان نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''بالکل یہی جواب ہے!،، بڑے میاں نے جواب دیا۔

وہ تینوں اسی ساحلی سڑک پر چل پڑے، سرگئی نے اتفاقاً پلٹ کر دیکھا کہ دربان وہیں کھڑا انھیں تک رہا تھا۔ وہ سوچ میں ڈوبا ہوا اور فکرمند نظر آ رہا تھا۔ وہ آنکھوں پر جھکی ہوئی ٹوپی کے اندر پانچوں انگلیاں گھسیڑے لال بالوں بھری گدی کھجا رہا تھا۔

■

بوڑھا لودیژکن مدتوں سے جانتا تھا کہ میسخور اور الوپکا کے درمیان شاہراہ سے ذرا ہٹ کے ایک ایسا کنج عافیت ہے جہاں بیٹھ کر مزے سے کھانا کھایا جا سکتا ہے۔ سو وہ اپنے ساتھیوں کو وہیں لے گیا۔ شاہ بلوط کے خمیدہ درختوں اور گھنی جھاڑیوں کے سائے میں زمین سے پانی کی دھارا ابل ابل کر لپک رہی تھی۔ قریب ہی گدلے پانی کے ایک بےچین اور مضطرب پہاڑی چشمے پر چھوٹا سا پل تھا۔ پانی کی اس دھارا نے زمین میں ایک اتھلا سا گڑھا بنا لیا تھا اور وہاں سے تنگ سے بل کھائے ہوئے راستے سے گزرتی ہوئی چشمے کی طرف بہہ رہی تھی، گھاس میں بہتی ہوئی یہ دھار پارے کی طرح جھلملا رہی تھی۔ روزانہ صبح شام چشمے پر مذہبی ترکوں کا ہجوم نظر آتا، وہ پانی پینے اور وضو نماز میں مصروف ہو جاتے۔

''ہمارے گناہ بہت بوجھل اور کھانا بہت ہلکا ہے،، بڑے میاں نے جھاڑیوں کے ٹھنڈے سائے

میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''لے، سرگئی، یا اللہ تیرا شکر ہے!''

انھوں نے کینوس کے تھیلے سے روٹی کا ٹکڑا، درجن بھر ٹماٹر، بیسارابیائی پنیر کا ایک ٹکڑا اور زیتون کے تیل کی بوتل نکالی۔ ایک چھوٹے سے چیتھڑے کے کنارے میں نمک بندھا ہوا تھا۔ اس چیتھڑے کی صفائی پر یقین کرنا مشکل ہی تھا۔ کھانا شروع کرنے سے پہلے بڑے میاں نے اپنے اوپر صلیب کا نشان بنایا اور بڑی دیر تک کچھ بڑبڑاتے رہے۔ پھر روٹی کے تین بڑے چھوٹے ٹکڑے کئے۔ ان میں سے سب سے بڑا سرگئی کی طرف بڑھایا۔ (لڑکے کے بڑھنے کا زمانہ ہے، اسے اچھی طرح کھلانا پلانا چاہئے)، دوسرا ذرا چھوٹا ٹکڑا پوڈل کے لئے رکھا اور سب سے چھوٹا اپنے آپ لے لیا۔

''خدا اور اس کے بیٹے کے نام پر۔ اے رحیم و کریم، ہم گناہ‌گاروں کی نظریں تجھ پر لگی ہوئی ہیں!'' انھوں نے نہایت اہتمام کے ساتھ کھانا بانٹ کر اس پر تیل چھڑکتے ہوئے زیرلب کہا۔ ''لے، سرگئی، کھا لے!''

تینوں نے دنیا زمانے کے مزدوروں کی طرح خاموشی اور آہستگی سے یہ غریبامؤ کھانا کھایا۔ فضا میں ان تینوں جبڑوں کی چپڑ چپڑ کے سوا اور کوئی آواز نہ تھی۔ آرتو تھوڑی دور پر پیٹ کے بل بیٹھا اگلے پنجوں میں روٹی دبائے اپنا حصہ کھا رہا تھا۔ بڑے

میاں اور سرگئی باری باری پکے ہوئے ٹماٹروں پر نمک لگاتے جاتے اور کھاتے جاتے۔ وہ ٹماٹر کو منہ مارتے اور ان کے ہونٹوں اور ہاتھوں پر خون جیسا لال رس بہنے لگتا۔ ٹماٹر کے بعد ہر دفعہ وہ روٹی اور پنیر کا لقمہ لیتے، پیٹ کی آگ بجھانے کے بعد انھوں نے ٹین کے ڈونگے سے پانی پیا جو انھوں نے بہتے چشمے سے بھرا تھا۔ پانی بالکل شیشے کی طرح صاف شفاف اور بے حد لذیذ تھا اور اس کی ٹھنڈک کا یہ عالم تھا کہ ڈونگے پر منے منے قطرے جم گئے۔ وہ صبح تڑکے ھی اٹھ گئے تھے اور دن بھر کی تپش اور اتنی لمبی دوڑ نے انھیں بالکل نڈھال کر دیا تھا۔ بڑے میاں کی تو آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ سرگئی بھی مسلسل جمائیاں اور انگڑائیاں لے رہا تھا۔

"کیوں بیٹے، ذرا سی دیر کمر سیدھی کر لیں نا؟" بڑے میاں نے پوچھا۔ "لا میرے بچے ایک گھونٹ پانی اور پی لوں! واہ کیا ذائقہ ھے!" انھوں نے لمبا سا سانس لے کر ڈونگے سے لب ہٹائے اور ان کی داڑھی مونچھ پر پانی کے شفاف قطرے بہنے لگے۔ "اگر میں زار ہوتا تو دن رات بس یہ پانی پیا کرتا۔ صبح سے رات گئے تک! اے آرتو، ادھر آ! ہوں، لے، بھئی، اللہ نے کھانا بھی دے دیا، کسی نے کبھی کا ھے کو دیکھا ہوگا ایسا کھانا اور دیکھا بھی ہو تو چکھنے کی نوبت تو کیا آئی ہوگی! اوھو، اوھو۔ ھو..."

بڑے میاں اور لڑکا پھٹی پرانی صدریاں سر کے نیچے رکھ کر گھاس پر برابر برابر لیٹ گئے۔ ہوا میں خم در خم اور ہرے بھرے شاہ بلوط کی سیاہ پتیاں سرسرا رہی تھیں اور اس چلمن کے پیچھے سے شاندار اور نیلا نیلا آسمان جھانک رہا تھا۔ ایک چٹان سے دوسری چٹان کی طرف لپکتے ہوئے چشمے کی یک رنگ اور سکون خیز کل کل جاری تھی جیسے وہ اپنی اس سادگی و پرکاری سے کسی کو مسحور کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ تھوڑی دیر تک بڑے میاں کروٹیں بدلتے اور کولتے کراہتے رہے۔ وہ آپ ہی آپ کچھ بڑبڑا رہے تھے، لیکن سرگئی کے کانوں میں یہ آواز دور، بہت دور کسی خواب آور اور نرم و نازک مقام سے آتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ اور بڑے میاں کے الفاظ اس کے لئے اتنے پراسرار ہو گئے تھے جیسے طلسماتی کہانی کے بول ہوں۔

"پہلی بات تو یہ کہ — تیرے لئے کپڑے خریدوں گا، سنہری کام کے ملینے کا گلابی لباس اور ساٹن کے گلابی جوتے، کیئف، خارکوف اور اودیسہ جیسے شہروں کی بات ہی کچھ اور ہے، اجی اس سرکس کی کیا بات ہے! ایک سے ایک کچلتی ہوئی روشنیاں، اجی ہر طرف بجلی کے قمقمے چمکتے ہیں... اور آدمی... اجی ایک ایک شو میں پانچ پانچ ہزار آدمی بیٹھتا ہے یا شاید اس سے بھی زیادہ — ٹھیک تو مجھے معلوم نہیں۔ تیرے لئے کوئی اچھا سا اطالوی نام سوچ

لیں گے۔ ایستی‌فیئف اور لودیژکن بھی کوئی نام ہوا؟ بالکل بکواس ہے — باریکی اور لطافت کا نام نہیں۔ اور ہم تیرے نام کا اشتہار لگائیں گے — انتونیو یا اینریکو یا الفونسو۔ واہ کیا بڑھیا نام ہیں۔ ،،

اور اس کے بعد لڑکے نے کچھ بھی نہ سنا۔ اس پر میٹھی میٹھی سی لطیف نیند چھاتی چلی گئی اور اس کا بدن کمزور اور نڈھال سا ہو گیا۔ ہر کھانے کے بعد، سرکس اور سرگئی کی قسمت کا چمکتا ہوا ستارہ بڑے میاں کے خیالات کا موضوع بن جاتا، اچانک ان تصورات کا بندھن ٹوٹ گیا اور بڑے میاں بےخبر سو گئے۔ سوتے میں ایک مرتبہ انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے آرتو کسی پر بھونک رہا ہو، نیند میں ڈوبے ہوئے ذہن میں گلابی قمیص‌والے دربان کی دھندلی سی یاد ابھری، لیکن نیند، تھکن اور گرمی نے انھیں اس قدر بےدم کر دیا تھا کہ ان سے اٹھا نہ گیا۔ البتہ آنکھیں بند کئے کئے انھوں نے کاھلی سے کتے کو آواز دی:

”آبے، آرتو، کہاں چلا... ہت تیرے کی، بدمعاش!،،

مگر پل بھر بعد ان کے تصورات نے الجھکر بہت ہی بےڈھنگی اور بوجھل صورت اختیار کر لی۔

اچانک بڑے میاں سرگئی کی آواز سے چونک اٹھے۔ لڑکا چشمے کے اس پار ادھر سے ادھر بھاگ رہا تھا، گھبرا گھبرا کر سیٹی بجا رہا تھا اور انتہائی

اضطراب اور خوف کے عالم میں چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا:

''اے آرتو، واپس آجا! ھو۔ و۔ و۔ و، ھو۔ و۔ و۔ و! واپس آ جا، آرتو!''

''سرکٹی، کیوں گلا پھاڑ رہا ہے بے؟'' لودیژکن نے بمشکل اپنا سویا ھوا بےجان بازو پھیلاتے ہوئے خفگی سے کہا۔

''ھوتا کیا، ھم سوئے رہ گئے اور کتا ھاتھ سے نکل گیا!'' لڑکے نے الجھ کر کانپتی ھوئی آواز میں کہا۔ ''کتا غائب ہے۔''

اس نے تیزی سے سیٹی بجائی اور پھر چیخ کر پکارا:

''آرتو۔ و۔ و۔ و!''

''کیا الٹی سلٹی سوچا کرے ہے! ابے واپس آ جائیگا،'' بڑے میاں نے کہنے کو تو کہہ دیا۔ مگر وہ تیزی سے اٹھے اور نیند میں ڈوبی ھوئی بھاری بھاری سی غصیلی اور تھرتھراتی ھوئی آواز میں پکارنے لگے:

''آرتو، ادھر آ، ابے او کتیا کے جنے ادھر آ!''

وہ چھوٹے چھوٹے اور ڈگمگاتے قدموں سے پل سے ھوتا ھوا شاھراہ کی طرف بھاگتا رھا اور کتے کو پکارتا رھا۔ نظر کے سامنے تقریباً پاؤ میل تک ھموار اور چمکتی ھوئی سفید سڑک بل کھا رھی تھی لیکن اس پر متنفس کوئی سایہ نہ تھا۔

''آرتو! میرے ننھے آرتو!'' بوڑھا انتہائی دردناک آواز میں کراہ اٹھا۔ اور پھر اچانک وہ رکا، جھک کر سڑک کی طرف دیکھا اور دھپ سے زمین پر بیٹھ گیا۔

''ہوں، تو یہ بات ہے!'' وہ عجیب مری مری آواز میں بڑبڑایا۔ ''بیٹا سرگئی! ذرا ادھر تو آ۔''

''اونہہ، آخر بات ہے کیا، دادا؟'' لڑکے نے گستاخی سے جواب دیا اور اس کی طرف بڑھا۔ ''گیا وقت ہاتھ لگ گیا کیا؟''

''یہ کیا ہے، سرگئی؟ ایسے یہ — یہ کیا ہے؟ کچھ سمجھا تو؟'' بڑے میاں نے زیرلب پوچھا۔

وہ بڑی درد بھری اور مضطرب نظروں سے لڑکے کو دیکھ رہا تھا۔ اور اس کا تھرتھراتا ہوا ہاتھ زمین کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

گوشت کا خاصہ بڑا سا بھنبھوڑا ہوا ایک ٹکڑا سفید ریت پر پڑا تھا اور اس کے چاروں طرف کتے کے پاؤں کے نشان تھے۔

''بدمعاش، دیکھا کمبخت کتے کو پھسلا کر لے گیا!'' بڈھے نے خوفزدہ ہو کر سرگوشی کی۔ وہ ابھی تک زمین پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ ''ظاہر ہے سولہ آنے وہی تھا۔ بات صاف ہے، یاد ہے نا، چوپاٹی پر بھی بدمعاش کتے کو گوشت کھلا رہا تھا؟''

''ظاہر ہے'' سرگئی نے خفگی اور اداسی سے دوہرایا۔

بڈھے کی پوری کھلی ہوئی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور وہ جلدی جلدی آنکھیں جھپکنے لگا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا۔

"اب ہم کیا کریں، بیٹا سرگئی؟ ہیں؟ کیا کریں اب ہم؟" بڈھے نے آگے پیچھے جھومتے ہوئے بڑی بےبسی سے کہا اور سسکنے لگا۔

"کیا کریں! کیا کریں!" سرگئی نے غصے سے جواب دیا۔ "اٹھو، لودیژکن دادا۔ آؤ، چلیں۔"

"چلو چلیں" دکھی بڑے میاں نے زمین سے اٹھتے ہوئے فوراً حامی بھری۔ "اچھا، چلو سرگئی، چلیں!"

سرگئی کا پارہ چڑھ گیا۔ اور وہ اس طرح بڑے میاں پر چیخنے لگا جیسے وہ ذرا سا بچہ ہوں۔

"بند کرو یہ ہائے واویلا! بس بہت ہو گئی حماقت۔ بھلا کسی کو کیا حق ہے دوسروں کے کتے اڑانے کا۔ کیا تک رہے ہو مجھے؟ کچھ غلط کہہ رہا ہوں کیا؟ ابھی سیدھے وہاں چلتے ہیں، ان سے صاف صاف کہیں گے کہ 'لاؤ ہمارا کتا!'، اور اگر نہ دیا تو ہم کچہری کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے، بس قصہ ختم!"

"کچہری۔ ہاں، ضرور، کچہری کا دروازہ خوب!" لودیژکن بڑبڑایا۔ اس کے ہونٹوں پر کھوکھلی اور تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ عجیب بےتکے پن اور شرمندگی سے نظریں بچانے لگا۔ "کچہری

کا دروازہ، ہاں ضرور۔ لیکن ایک بات یاد رکھ، بیٹا سرگئی... ہم جیسوں کی رسائی نہیں ہوگی وہاں تک...''

''واہ، کیوں نہیں؟ قانون سب کے لئے ایک ہے۔ ہم کیوں دودھ کی مکھی کی طرح نکالے جائیں گے؟'' لڑکے نے بے تابی سے اس کی بات کاٹ دی۔

''سرگئی، خدا کے لئے مجھ پر تو نہ برس تو، اب وہ کتا کبھی بھی ہمارے پاس نہیں آ سکتا!'' اس نے بڑے پراسرار انداز سے آواز نیچی کر لی۔ ''مجھے تو پاسپورٹ کی وجہ سے دھڑکا لگ گیا۔ سنا نہیں تھا وہ صاحب کیا کہہ رہا تھا؟ بولا 'پاسپورٹ بھی ہے تمہارے پاس؟ تو یہ بات، بھائی میرے۔ اور میرے پاس—'' بڈھے کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی اور وہ زیرلب کہہ رہا تھا۔ ''سرگئی، پاسپورٹ جعلی ہے۔''

''کیوں، جعلی کیوں ہے؟''

''بس... جعلی ہے۔ میرا پاسپورٹ تگانروگ میں کھو گیا تھا یا کون جانے کسی نے چرا لیا ہو۔ اس کے بعد دو سال تک میں ادھر سے ادھر بھٹکتا اور چھپتا چھپاتا پھرا، رشوتیں دیں، درخواستیں لکھیں، اور آخر میں نے سوچا کہ اب اس طرح چوہے کے بل میں گھس کے تو نہیں رہ سکتا۔ ہر شخص کی طرف سے دھڑکا لگا ہوا ہے۔ نہ دن کا چین رہا نہ رات کا سکون اور پھر ایک دن اودیسہ کی ایک سرائے میں

ایک یونانی آپہنچا۔ 'اجی یہ تو بائیں ھاتھ کا کھیل ھے، اس نے کہا۔ 'لاؤ پچیس روبل نکالو، بڑے میاں، اس نے کہا۔ 'میں ابھی تمھارے لئے پاسپورٹ کا انتظام کر دوں گا جو زندگی بھر تمھارے کام آئیگا۔'، میں نے خوب سوچا۔ خیر جی، جو ھو سو ھو، میں نے سوچا۔ 'لاؤ یہ بھی سہی،' میں نے کہا۔ تو میرے بچے، اس دن سے میں کسی اور کا پاسپورٹ استعمال کر رھا ھوں۔"

"اوہ، دادا، دادا!"، سرگئی نے گہرا سانس لیا اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ "کتے کے لئے دل تڑپ رھا ھے! اور کتنا بھلا کتا تھا!"

"سرگئی، میرے پیارے بچے!"، بڑے میاں نے اپنے کانپتے ھوئے بازو پھیلا دئے۔ "اگر میرے پاس اصلی پاسپورٹ ھوتا تو میری جوتی کو بھی پروا نہ ھوتی کہ جنرل ھیں کہ لاٹ، گردن دبا دیتا میں سالوں کی! 'یہ کیا حرکت ھے، میں کہتا۔ 'دوسروں کے کتے پر ھاتھ صاف کرنے کا کیا حق ھے تمھیں؟ یہ کہاں کا قانون ھے بھلا!، مگر، سرگئی، اب تو ھمارے ھاتھ کٹ گئے۔ پولیس چوکی جاؤں گا تو پہلی بات یہ ھوگی کہ پاسپورٹ دکھاؤ! 'تو تم ساسارا کے مارتین لودیژکن ھو؟، 'جی ھاں، سرکار۔، لیکن، بھائی، میں تو نہ لودیژکن ھوں نہ متوسط طبقے کا شہری۔ میں تو کسان ھوں، کسان ایوان دودکن۔ اللہ جانے وہ لودیژکن کون تھا کون نہیں تھا۔ ارے مجھے کیا

معلوم ہو سکتا ہے کوئی چور اچکا ہو، کوئی بھاگا ہوا مجرم ہو، یا پھر قاتل ہو۔ نہیں، سرگئی، ہم کچھ نہیں کر سکتے، بیٹے... کچھ نہیں...،،

بڑے میاں کی آواز بھرا گئی، سورج میں جھلسے ہوئے جھریوں بھرے چہرے پر گرم گرم آنسو پھسلنے لگے۔ سرگئی بالکل خاموشی سے تباہ حال بڑے میاں کی باتیں سن رہا تھا، اس کی بھوویں تنی ہوئی تھیں اور چہرہ جذبات کی وجہ سے زرد تھا۔ اچانک اس نے بڑے میاں کی بغلوں میں ہاتھ دے کر سہارے سے انھیں اٹھایا۔

''آؤ، دادا، آؤ چلیں،، اس نے دوستانہ انداز میں حکم دیا۔ ''بھاڑ میں جائے پاسپورٹ۔ آؤ چلیں! یہاں اس سڑک پر تو رات بسر کرنے سے رہے۔،،

''میرے بیٹے، میرے لال!،، بڑے میاں سر سے پاؤں تک کانپتے ہوئے بڑبڑائے۔ ''کتنا تیز تھا ہمارا کتا، ہمارا پیارا آرتو۔ اب کہاں ملے گا ویسا کتا!،،

''اچھا، چھوڑو، چھوڑو چلے اب اٹھو،، سرگئی نے حکم دیا۔ ''آؤ، تمھارے کپڑوں کی گرد جھاڑ دوں، دادا۔ تم تو بالکل ہی جی ہار بیٹھے، دادا!،،

اس دن فنکاروں نے کرتب نہیں دکھائے۔ سرگئی ابھی بچہ ہی تھا لیکن وہ اس خوفناک لفظ ''پاسپورٹ،، کا مطلب خوب سمجھتا تھا۔ اس لئے پھر اس نے نہ آرتو کو تلاش کرنے کی بات کی نہ منصف کے پاس

جانے یا کوئی اس سے بھی زیادہ سخت قدم اٹھانے پر اصرار کیا، وہ خاموشی سے بڑے میاں کے ساتھ سرائے کی طرف چل دیا۔ مگر اس کے چہرے پر سختی اور کرختگی کی یہ نئی جھلک ابھی تک قائم تھی، ایسا لگ رہا تھا، جیسے وہ کسی بہت بڑی بے حد اہم چیز کا منصوبہ بنا رہا ہو۔

اس سوال پر کوئی بات نہ ہوئی، لیکن شاید دونوں کے دلوں میں ایک ہی خواہش چھپی ہوئی تھی، وہ بے اختیار بل دار راستے پر ہو لئے تا کہ ''دوستی،، بنگلے کی ایک جھلک اور دیکھ لیں۔ وہ لمحے بھر پھاٹک پر ٹھٹکے، انہیں دھندلی سی امید تھی کہ شاید آرتو نظر آ جائے یا کم سے کم اس کی آواز ہی سن لیں۔

لیکن شاندار بنگلے کا آہنی پھاٹک اچھی طرح بند تھا۔ اور سرو کے نازک اور اداس درختوں کی چھاؤں میں پھیلے ہوئے سر سبز و سایہ دار باغ پر بلا کی خاموشی اور پروقار سکون چھایا ہوا تھا۔

''شریف بنتے ہیں!،، بڈھا بڑبڑایا۔ اس کے دل کی تمام تلخی، تمام زہر اس ایک جملے میں سمٹ آیا۔

''بس ختم کرو۔ آؤ چلیں،، لڑکے نے سنجیدگی سے حکم دیا اور اپنے ساتھی کی آستین پکڑ کر کھینچنے لگا۔

''سرگئی، ہو سکتا ہے ہمارا آرتو ان کے یہاں

سے بھاگ نکلے؟،، بڈھے نے سسکی بھری۔ ''کیا خیال ہے تیرا، میرے بیٹے؟،،

لیکن لڑکے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بڑی ثابت قدمی سے آگے آگے چل رہا تھا، اس کی نگاھیں سڑک پر جمی ہوئی تھیں اور باریک بھویں غصے میں تنی ہوئی۔

٦

وہ خاموشی سے الوپکا پہنچے۔ راستے بھر بڈھا کولتا کراھتا رھا اور سرگئی کے چہرے سے وھی غصہ، وھی استقلال جھلکتا رھا۔ رات بسر کرنے کے لئے وہ گندے سے ترکی قہوہ خانے میں ٹھیر گئے جس کو ''یلدیز،، یا ''ستارہ،، جیسے شاندار نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ رات کو یونانی سنگ تراش، زمین کھودنے والے ترکی مزدور، طرح طرح کے اوٹ پٹانگ کام کرکے جسم و جان کا رشتہ قائم رکھنے والے چند روسی محنت کش، اور بھانت بھانت کے آوارہ گرد ان کے ساتھ تھے، جنوبی روس میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ جیسے ھی وقت مقررہ پر قہوہ خانہ بند ھوا وہ سب دیواروں سے لگے ہوئے بنچوں اور زمین پر لیٹ گئے۔ ان میں سے جو زیادہ تجربہ‌کار تھے انھوں نے احتیاطاً اپنے کپڑے اور دوسری قیمتی چیزیں اپنے سروں کے نیچے رکھ لیں۔

آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی، سرگئی بڈھے کے قریب ھی زمین پر لیٹا تھا۔ وہ آھستہ سے اٹھا اور کپڑے پہننے لگا۔ کشادہ کھڑکیوں سے پھیکی پھیکی چاندنی چھن رھی تھی، زمین پر مچلتی ھوئی آڑی ترچھی کرنیں سوئے ھوئے لوگوں کے چہروں کو بڑا کربناک اور بےجان سا بنائے دے رھی تھیں۔

''لڑکے، اس رات میں کہاں جا رھے ھو؟،، قہوہ خانے کے نوجوان ترک مالک ابراھیم نے نیند میں سرگئی کو پکارا۔

''مجھے جانے دو، میرا جانا ضروری ھے!،، سرگئی نے کرخت اور کاروباری انداز میں جواب دیا۔ ''اٹھ بے، ترکی بانس، اٹھتا ھے کہ نہیں!،،

ابراھیم نے دوچار جمائیاں انگڑائیاں لیں اور غصے سے زبان چٹخاتے ھوئے دروازہ کھول دیا۔ تاتاری بازار کی تنگ گلیاں گھرے نیلے سائے میں کھوئی ھوئی تھیں۔ ان کنگورے دار سایوں نے بڑھ کر دوسری طرف‌والے مکانوں کے قدم چوم لئے۔ مکانوں کی چھوٹی چھوٹی دیواریں چاندنی میں چاندی کی طرح دمک رھی تھیں۔ شہر کے دوسرے سرے پر کتے بھونک رھے تھے اور سڑک سے کسی سبک رفتار گھوڑے کی ٹھپ ٹھپ کی گونج سنائی دے رھی تھی۔

لڑکا پیاز جیسے گول ھرے گنبدوالی سفید مسجد کے قریب سے گزرا جو سیاہ سرو کے خاموش جھنڈ میں گھری کھڑی تھی، وہ ایک تنگ اور پرپیچ گلی

سے ہوتا ہوا کھلی سڑک پر آ گیا۔ سرگئی نے نٹوں کے تنگ لباس کے سوا اور کچھ نہیں پہنا تھا تاکہ دوڑنے بھاگنے میں آسانی رہے۔ اس کی پشت کے پیچھے چاند چمک رہا تھا اور اس کا کالا کالا ننھا سا سایہ آگے آگے دوڑ رہا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف اگی ہوئی سیاہ اور پرپیچ جھاڑیوں میں کوئی پرندہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد باریک سی سریلی آواز میں چیخ رہا تھا: ''سوتا ہوں! سوتا ہوں!،، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ رات کی اس خاموشی میں بڑی فرماں برداری سے کسی اداس راز کی نگہبانی کر رہا ہو۔ وہ شاید نیند اور تھکن پر قابو پانے کی ناکام کوشش میں ناامیدی سے فریاد کر رہا تھا۔ ''سوتا ہوں! سوتا ہوں!،، سیاہ جھاڑیوں اور کہیں دور پھیلے ہوئے جنگلوں کی نیلی نیلی سی چوٹیوں کے اوپر آئی پیتری کی چوٹی کی جڑواں نوکیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں، رات کی اس تاریکی میں وہ اس قدر ہلکی، اس قدر نمایاں اور اس قدر خیالی لگ رہی تھیں جیسے کسی سیمیں دفتی کے بڑے سے ٹکڑے سے بنائی گئی ہوں۔

اس آسمانی خاموشی اور سکوت نے سرگئی کے بدن میں جھرجھری سی پیدا کر دی — وہ انتہائی تیزی اور دلیری سے قدم اٹھا رہا تھا۔ اور اس کا دل ایک عجیب سراسیمگی اور خوشگوار جرأت سے سرشار تھا۔ سڑک مڑی تو نگاہوں کے سامنے سمندر موجیں

مارنے لگا۔ یہ خاموش اور وسیع سمندر بڑے سکون اور وقار کے ساتھ سانس لے رہا تھا۔ افق سے ساحل تک چمکدار اور لہراتا ہوا تنگ راستہ پھیلا ہوا تھا۔ یہ تنگ پگڈنڈی آگے چل کر سمندر میں غائب ہو گئی تھی۔ البتہ کہیں کہیں پگڈنڈی کی ریت ستارہ کی طرح چمکتی اور پھر اچانک دھرتی کے قریب پگھلتی ہوئی چمکدار اور لرزاں دھات کی طرح پھیل کر جیسے پورے ساحل کو اپنی لپیٹ میں لیتی اور گوٹ سی لگا دیتی۔

سرگئی چوبی چور دروازے سے دبے پاؤں باغیچہ میں داخل ہو گیا۔ گھنے درختوں کے جھنڈ میں اندھیرا گھپ تھا۔ کہیں دور کوئی بے چین چشمہ کل کل کر رہا تھا اور اس کی بھیگی بھیگی سی سرد ہوا یہاں تک محسوس ہو رہی تھی۔ سرگئی کے قدموں کے نیچے پل کے تختے چرچرا اٹھے۔ پل کے نیچے بہتے ہوئے پانی کی تہہ بالکل کالی اور انتہائی خوفناک معلوم ہو رہی تھی۔ اور آخر وہ اونچا سا آھنی پھاٹک آ گیا جس پر بیل بوٹے بنے ہوئے تھے اور جس سے چنبیلی کی بیلیں بغلگیر تھیں۔ درختوں کی شاخوں سے چاندنی چھن چھن کر ان نقش و نگار پر پھسل رہی تھی اور اس پر ننھے ننھے سے ضوفگن شرارے برسا رہی تھی۔ اور اس سے آگے تاریکی کا راج تھا اور شرمائی شرمائی مگر چوکنا سی خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔

چند لمحے سرگئی جھجھکا۔ وہ کچھ سہما ہوا اور خوفزدہ تھا۔ لیکن اس نے جلد ہی ان جذبات پر قابو پا لیا اور زیرلب بولا:

"کچھ بھی ہو، میں تو جاؤں گا! میری بلا سے آگے جو ہوسو ہو!"

پھاٹک پر چڑھنا اس کے لئے ذرا بھی مشکل نہ تھا۔ نقش و نگار کی نازک آہنی سلاخیں اس کے قوی ہاتھوں اور چھوٹے چھوٹے سڈول پاؤں کے لئے مضبوط سہارا بن گئیں۔ پھاٹک کے اوپر خاصی بلندی پر ایک چوڑی سی فولادی محراب تاج کی طرح سر اٹھائے کھڑی تھی۔ سرگئی کھسکتا ہوا اس تک پہنچا اور پیٹ کے بل لیٹ کر دوسری طرف پاؤں لٹکا دئے۔ اب وہ اپنے پورے جسم کو نیچے کی طرف کھینچ رہا تھا اور پاؤں سے سہارا ڈھونڈ رہا تھا۔ اور آخر وہ محراب کے ساتھ ہوا میں لٹک گیا، اس کی انگلیاں ہی محراب کے سرے میں پیوست تھیں۔ لیکن اس کے پاؤں کو اب تک سہارا نہیں ملا تھا۔ اسنے تو سوچا ہی نہ تھا کہ پھاٹک کے اوپروالی محراب باہر کی نسبت اندر کی طرف بہت گہری ہے۔ آخر اس کے ہاتھ سن ہونے لگے اور نڈھال بدن بھاری پڑنے لگا۔ اس کا دل خوف سے لرز اٹھا۔

اور آخر وہ بےقابو ہو گیا، محراب کی کگر انگلیوں کی گرفت سے نکل گئی اور وہ نیچے آ رہا۔

اسے اپنے بوجھ تلے سخت اور کھردری بجری کے چرچرانے کی آواز آئی اور اس کے گھٹنوں میں درد کی تیز ٹیس اٹھی۔ وہ گرنے کی وجہ سے بوکھلایا ہوا چند سیکنڈ یوں ھی چاروں ھاتھ پاؤں پر کھڑا رہا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ پل بھر میں بنگلے میں جاگ ہو جائیگی، گلابی قمیص‌والا اداس صورت دربان بھاگا ہوا آئیگا، شور ہنگامہ ہوگا اور ہر طرف افراتفری پھیل جائیگی۔ لیکن چمن میں اب بھی وھی پہلے کی سی خاموشی اور سناٹا تھا۔ باغ کی فضا پر چھائی ہوئی دھیمی اور موھوم سی سرسراھٹ کے سوا دور دور تک اور کوئی آواز نہ تھی۔

''ژوں... ژوں... ژوں...،،

''اونہہ، یوں ھی کان بج رہے ھیں میرے،، اس نے سوچا اور جھٹ سے اٹھ کھڑا ھوا۔ تاریکی میں تپا ھوا چمن بڑا بھیانک و پراسرار اور بلا کا حسین لگ رہا تھا، ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی فضا میں معطر معطر سے خواب بکھرے ہوئے ھوں۔ اندھیرے میں کھوئے ھوئے پھولوں کے دھندلے دھندلے پیکر بڑی نزاکت سے کیاریوں میں جھوم رہے تھے۔ پھولوں کی ڈالیاں ایک عجیب مبہم سے اضطراب کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف جھکتیں جیسے سرگوشی کر رھی ھوں، جیسے نظروں ھی نظروں میں سرگئی کا تعاقب کر رھی ھوں۔ سرو کے مہکتے ھوئے نازک اندام درختوں کی تیز اور نوکیلی چوٹیاں جھوم اٹھیں، جیسے

زبان‌خاموشی سرگئی کو تنبیہہ کر رہی ہوں۔ چشمے کے اس پار گھنی جھاڑیوں میں چھپا ہوا نڈھال سا ننھا پرندہ ابھی تک تھکے تھکے انداز میں سیٹی بجا رہا تھا اور اداسی سے فریاد کر رہا تھا:

"سوتا ہوں! سوتا ہوں! سوتا!"

رات کی سیاہی اور روش پر پھیلے ہوئے پرپیچ سایوں کے درمیان سرگئی اس جگہ کو نہ پہچان سکا۔ وہ مکان تک پہنچنے کی کوششوں میں بڑی دیر تک چرچراتی ہوئی بجری پر بھٹکتا رہا۔

سرگئی نے آج تک کبھی ایسے دکھ نہیں سہے تھے، اسے آج سے پہلے کبھی بےبسی، لاچارگی اور تنہائی کا ایسا احساس نہیں ہوا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے گھر میں بہت سے ظالم بےدرد دشمن دبکے ہوئے ہوں اور تاریک کھڑکیوں سے چوری چوری اس چھوٹے سے ناتواں لڑکے کی ہر ہر حرکت کو دیکھ رہے ہوں۔ یہ خیالی دشمن ایک ہلکے سے اشارے، غصے میں بھرے ہوئے ایک ظالمانہ حکم کے منتظر تھے اور بڑی شیطنت اور خباثت سے مسکرا رہے تھے۔

"گھر میں تو ہرگز نہیں ہوگا — نہیں، وہ گھر میں نہیں ہو سکتا"، لڑکا خواب کے سے عالم میں بڑبڑایا۔ "گھر میں تو وہ بھونک بھونک کر سب کی زندگی اجیرن کر دیتا۔"

اس نے بنگلے کا چکر کاٹا۔ بنگلے کے عقب کے کشادہ احاطے میں کئی مکان نظر آئے جو بڑے مکان

کے مقابلے میں کہیں گھٹیا تھے۔ یہ مکان شاید نوکروں کے لئے ہوں‌گے۔ بڑے مکان کی طرح یہ کھڑکیاں بھی تاریک تھیں۔ البتہ ان کے تاریک شیشوں پر پھیکی پھیکی سی چاندنی دھوپ چھاؤں کھیل رہی تھی۔ ''میں کبھی یہاں سے نہیں نکل پاؤں‌گا۔ کبھی نہیں!،، سرگئی نے مایوسی سے سوچا۔ پل بھر کو اسے لودیژکن کا خیال آیا، ننھا سا پرانا باجا یاد آیا، قہوہ خانے میں گزاری ہوئی راتیں یاد آئیں اور سرد چشموں کے کنارے بیٹھ کر کھانا کھانے کا خیال آیا۔ ''یہ سب اب کبھی نہ ہوگا، کبھی نہیں!،، اس نے دکھی ہوکر سوچا۔ جیسے جیسے نااسیدی بڑھی ویسے ویسے اس کے دل میں خوف کی جگہ ایک عجیب گہری پرسکون اور بےدرد اداسی گھر کرتی چلی گئی۔

اچانک ایک باریک سی کراہ کی آواز سن کر اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ سرگئی دم سادھ کر پنجوں کے بل کھڑا ہو گیا، اس کے جسم میں ایک عجیب تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ کراہ کی آواز دوبارہ ابھری، شاید یہ آواز اس پختہ تہہ‌خانے سے آ رہی ھے جس کے قریب سرگئی کھڑا تھا۔ دیوار میں بنے ہوئے چند چھوٹے چھوٹے چوکور موکھے شیشے کی قید سے آزاد تھے۔ سرگئی پھولوں کا تختہ پھلانگتا ھوا تیزی سے دیوار کے پاس پہنچا اور ان موکھوں میں سے ایک کے پاس منہ لیجاکر سیٹی بجائی۔ کہیں نیچے سے ہلکی سی دبی آواز آئی مگر فوراً ھی غائب ھوگئی۔

''آرتو، آرتو!،، سرگئی نے تھرتھرائی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔

اچانک کتے کی جنونی اور فریادکن چیخیں ابھریں اور باغ کے کونے کونے میں گونج گئیں، ان چیخوں میں شکایت بھی تھی، غصہ بھی تھا، دکھ بھی تھا اور ساتھ ہی سواگت کی خوشی بھی۔ کتا تاریک تہہ‌خانے میں کھینچا تانی کرنے لگا۔ وہ اپنے بندھنوں کو توڑنے کی جان توڑ کوشش کر رہا تھا۔

''آرتو، میرے ننھے کتے! آرتو!،، لڑکے نے درد بھری آواز میں پکارا۔

''خاموش رہ، لعنتی!،، اندر سے وحشیانہ بھاری چیخ ابھری۔ ''لعنتی، وبال جان!،،

تہہ خانے میں کچھ شور سا ہوا اور کتے کی دبی دبی سی طویل چیخ سنائی دی۔

''خبردار، اس پر ہاتھ اٹھایا تو اچھا نہیں ہوگا! ارے کمبخت، کتے کو ہاتھ نہ لگا!،، سرگئی جنون کے عالم میں چلایا، اور ناخنوں سے پتھریلی دیوار کو کھرچنے لگا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ سرگئی کو بہت دھندلا دھندلا سا یاد ہے، جیسے وہ نیم بے‌ہوشی کے عالم میں ہو۔ تہہ‌خانے کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور دربان دراتا ہوا باہر نکلا، اس کے پاؤں ننگے تھے اور بدن پر صرف ایک نیکر تھا۔ اس کی داڑھی مونچھ اور چہرہ چاند کی سیدھی کرنوں کی روشنی میں پیلے

پہلے سے نظر آ رہے تھے۔ سرگئی کو ایسا لگا جیسے کوئی دیو، کوئی خونخوار جن نکل آیا ہو۔

''کون ہے بے؟ گولی سے اڑا دوں گا تجھے!،، باغ میں اس کی آواز گرجی۔ ''چور، چور، دوڑو، پکڑو!،،

مگر عین اسی وقت آرتو بھونکتا اور سفید گیند کی طرح اچھلتا ہوا تاریک دروازے سے نکلا۔ اس کی گردن میں رسی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا لٹک رہا تھا۔

مگر اب سرگئی کو کتے کا ہوش نہ تھا۔ دربان کی خوفناک اور بھیانک صورت دیکھتے ھی اس پر ایک عجیب غیر مرئی سا خوف چھا گیا۔ اس کے پاؤں جیسے زمین میں گڑ گئے اور چھوٹا سا تنا ہوا جسم سن ہو گیا۔ خیر شکر ہے کہ بدحواسی اور مدھوشی کی یہ کیفیت زیادہ دیر قائم نہ رہی۔ سرگئی نے تقریباً نیم بےھوشی کے عالم میں ایک دلدوز اور دلخراش چیخ ماری اور خوف کی وجہ سے بدحواس اور پاگل سا اندھا دھند تہہ‌خانے سے دور بھاگنے لگا۔

اس کے قوی اور سبک پاؤں زمین کو روند رہے تھے اور وہ خرگوش کی طرح ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کی آہنی ٹانگوں کی طاقت اچانک لوٹ آئی تھی۔ آرتو خوشی سے بھونکتا ہوا اس کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ دربان جھنجھلا جھنجھلا کر گالیاں بک رہا تھا اور بھاری بھاری قدموں سے ان کا پیچھا کر رہا تھا۔

سرگئی بھاگتا بھاگتا پھاٹک تک پہنچ گیا، سوچنے سمجھنے کا موقع نہ تھا لیکن سرگئی نے پلک جھپکتے میں تاڑ لیا کہ وھاں سے نکلنے کا کوئی امکان نہیں ھے۔ پتھر کی سفید دیوار اور اس کے قریب اگے ھوئے سرو کے درختوں کی قطار کے درمیان ایک تاریک اور تنگ سی پگڈنڈی دوڑ رھی تھی۔ وہ بلا سوچے سمجھے خوف و دھشت کا ستایا ھوا سیدھا اس طرف گھسا اور دیوار کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ سرو کی خوشبو میں بسی ھوئی سوئی جیسی نوکیلی پتیاں اس کے چہرے پر تھپڑ مار رھی تھیں، کئی دفعہ وہ درختوں کی جڑوں سے ٹکرا کر گرا اور اس کے ھاتھوں پر خراشیں پڑ گئیں لیکن ھر دفعہ وہ اٹھتا اور پھر بھاگ کھڑا ھوتا۔ اسے تو جیسے درد کا احساس ھی نہ تھا، وہ خود اپنی چیخوں سے بےخبر جھکا جھکا سا بھاگتا رھا۔ آرتو تیر کی طرح اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

وہ ایک وسیع و عریض جال میں پھنسے ھوئے ننھے سے پرندے کی طرح خوفزدہ سا اس تنگ راستے پر بےتحاشہ بھاگ رھا تھا جس کے ایک طرف دیوار اور دوسری طرف قطار در قطار سرو سربلند تھے۔ اس کا منہ سوکھ گیا اور ھر سانس کے ساتھ سینے میں ھزاروں سوئیاں چبھنے لگیں۔ دربان کے قدموں کی آوازیں کبھی دائیں اور کبھی بائیں طرف سے آ رھی تھیں۔ لڑکا پاگل سا ھوکر کبھی آگے دوڑتا اور

کبھی پھر پیچھے پلٹ جاتا۔ کئی بار پھاٹک کے پاس سے گزرا اور پھر اسی تاریک اور تنگ پگڈنڈی پر دوڑنے لگا۔

آخر اس کی ٹانگوں نے جواب دے دیا۔ وہ انتہائی خوفزدہ تھا، مگر پھر بھی دل پر یاس و ناامیدی کے بادل چھانے لگے اور وہ اور خطروں کی طرف سے کچھ بے نیاز سا ہو گیا۔ اب وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھا تھا، اس کے تھکے ہوئے نڈھال جسم نے تنے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ دشمن کے بھاری قدموں کی اور قدموں تلے چرچراتی ہوئی ریت کی آواز قریب اور قریب آرہی تھی، آرتو کی ناک سرگئی کے گھٹنے پر ٹکی ہوئی تھی اور وہ آہستہ آہستہ بھونک رہا تھا۔

لڑکے سے گز دو گز کے فاصلے پر پھیلی ہوئی شاخیں یکبارگی سرسرا کر ہٹ گئیں، اس نے بے خیالی میں نظر اٹھائی اور اچانک خوشی سے دیوانہ سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اب تک دیکھا ہی نہ تھا کہ وہ جس جگہ بیٹھا ہے وہاں دیوار تین ساڑھے تین فٹ سے زیادہ اونچی نہیں ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ منڈیر پر بوتل کی کرچیں چونے میں جڑی ہوئی تھیں۔ مگر سرگئی نے اس کی ذرا بھی پروا نہ کی۔ پلک جھپکتے میں اس نے آرتو کو اٹھایا اور اسے اگلی ٹانگوں کے سہارے دیوار کی منڈیر پر بٹھا دیا۔ ہوشیار کتا اس کے ہر ہر اشارے کو سمجھ گیا۔

وہ اچھلا اور دم ھلا ھلا کر نہایت فاتحانہ انداز میں بھونکنے لگا۔

ایک ھانپتا کانپتا سیاہ ھیولا سرو کی شاخیں ھٹا کر اس جگہ نمودار ھوا۔ ٹھیک اسی وقت سرگئی بھی کتے کے پیچھے پیچھے دیوار پر چڑھا، دو چست و چالاک پیکر بڑی سبک رفتاری سے سڑک پر کود گئے۔ ان کے پیچھے وحشیانہ اور گندی گالیوں کا طوفان سا پھٹ پڑا۔

شاید دربان ان دو دوستوں کے مقابلے میں سست رفتار تھا یا باغ میں ان کا تعاقب کرتے کرتے تھک کر چور ھو چکا تھا یا شاید ان فرارشدہ مجرموں تک پہنچنے کی امید ختم ھو چکی تھی، بھرحال جو بھی ھو اس نے ان کا پیچھا کرنا چھوڑ دیا۔ پھر بھی وہ دونوں بڑی دیر تک دم لئے بنا بھاگتے چلے گئے۔ دونوں طاقت‌ور اور پھرتیلے تھے اور آزادی کی خوشی میں ھوا سے باتیں کر رھے تھے۔ جلد ھی پوڈل کی شوخی اور کھلنڈراپن عود کر آیا۔ سرگئی اب بھی کبھی کبھی خوفزدہ نظروں سے پیچھے دیکھ لیتا۔ لیکن آرتو شرارت سے اس پر جھپٹ رھا تھا، خوش ھوکر کان اور رسی کا ٹکڑا ھلا رھا تھا اور لڑکے کا منہ چاٹنے کے لئے سو سو جتن کر رھا تھا۔

البتہ اس چشمے پر پہنچ کر سرگئی کے دم میں دم آیا جہاں انہوں نے کل کھانا کھایا تھا۔ لڑکے اور کتے نے ٹھنڈے ٹھنڈے چشمے سے منہ لگا

دیا، اور بڑی دیر تک بے تابی سے اس کا تازہ اور خوش ذائقہ پانی پیتے رہے۔ وہ ایک دوسرے کو پرے دھکیلتے، لمحے بھر کو سانس لینے کے لئے منہ اوپر اٹھاتے، ان کے ہونٹوں سے پانی ٹپکنے لگتا اور پھر ان کی پیاس چمک اٹھتی اور وہ پھر پانی کی دھارا پر جھک جاتے، لاکھ کوشش پر بھی پانی سے منہ ہٹانا مشکل تھا، آخر وہ بمشکل وہاں سے چلے تو ان کے مشک جیسے بھرے ہوئے پیٹوں میں پانی چھلک چھلک کر بج اٹھا۔

خطرہ گزر چکا تھا۔ رات کے بھیانک واقعات قصہ پارینہ ہو چکے تھے اور اب وہ دونوں بڑے مزے میں تاریک جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی اور چاندنی میں نہائی ہوئی سفید سڑک پر لپک رہے تھے۔ صبح کی شبنم نے جھاڑیوں کے منہ دھلا دئے تھے اور ان کی تازہ دم پتیوں سے صبح کی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔

قہوہخانے ''یلدیز،، میں ابراھیم نے ملامت بھر سرگوشی سے سرگئی کا سواگت کیا:

''یوں آوارہ پھرنے کا کیا مطلب ھے، لڑکے؟ کیا مطلب ھے؟ تم نے بوھت برا کام کیا۔ بہت برا۔،،

سرگئی بڈھے کو بےچین کرنے کو تیار نہ تھا لیکن آرتو نے نہایت مستعدی سے یہ کام کر ڈالا، اس نے پل بھر میں زمین پر سکڑے ہوئے لوگوں کے درمیان بڑے میاں کو ڈھونڈ نکالا۔ ابھی لودیژکن

کو ہوش بھی نہ آیا تھا کہ کتا خوشی سے چپڑ چپڑ کرکے اس کے پورے منہ کو چاٹ گیا۔ بڈھا جاگ اٹھا، اس نے پوڈل کی گردن میں بندھی ہوئی رسی دیکھی، گرد میں اٹے ہوئے لڑکے کو قریب لیٹے ہوئے دیکھا اور پل بھر میں سب کچھ سمجھ گیا۔ وہ سرگشی سے پوچھ گچھ کرنے کے لئے اس کی طرف متوجہ ہوا مگر لڑکا بےخبر سو رہا تھا۔ اس کے بازو پھیلے ہوئے تھے اور منہ کھلا ہوا۔

۱۹۰۴ء

میں ایکٹر کیسے بنا

یہ المناک اور مضحکہ خیز کہانی، جو مضحکہ‌خیز کم اور غمگین زیادہ ہے، مجھے ایک ایسے دوست نے سنائی جس کی زندگی بہت رنگین تھی اور جو بقول شخصے گھوڑا بھی تھا اور گھوڑے پر سوار بھی۔ قسمت کے وحشیانہ تھپڑوں کے باوجود اس کا دل دردمند اور دماغ روشن رہا۔ البتہ اس کہانی کے واقعات نے اس پر کچھ عجیب اثر ڈالا، اور اس کے بعد منت وسماجت کے باوجود اس نے پھر کبھی تھیٹر کا رخ نہیں کیا۔

میں اس کی کہانی سنانے کی کوشش کروں گا۔ اگرچہ مجھے ڈر ہے کہ شاید میں اس سادگی سے اور اس نرم اور گرم طنز کے ساتھ یہ کہانی نہیں سنا سکوں گا جو اس کی داستان کی جان ہے۔

۱

اچھا، سنیئے۔ کہئے، کیا آپ ایک چھوٹے اور ٹوٹے پھوٹے سے جنوبی شہر کا تصور کر سکتے

هیں؟ شہر کے مرکز میں ایک بہت بڑا سا گڑھا ہے، جہاں دیہات کے خوخول * کمر کمر تک کیچڑ میں اٹے ہوئے، اپنے ٹھیلوں پر کھیرا اور آلو بیچتے نظر آتے ہیں۔ یہ بازار ہے۔ اس کے ایک طرف ایک گرجا اور ظاہر ہے گرجا کو جانےوالی سڑک ہے۔ دوسری طرف ایک پبلک باغ ہے، تیسری طرف سائبانوں کی قطار ہے، جن سے زرد زرد پلاستر جھڑ رہا ہے اور جن کی چھتوں اور کارنسوں پر کبوتر بیٹھے ہوئے ہیں۔ چوتھی طرف بڑی سڑک بازار کی طرف دوڑتی نظر آتی ہے جس کے کنارے کسی بینک کی شاخ کا دفتر، ڈاک خانہ، رجسٹری کا دفتر اور ماسکو کے حجام تیودور کی دوکان ہے۔ ہر قسم کے زاسیلیاؤں، زاموستیاؤں اور زاریچیاؤں ** میں گاؤں کی سرحد کے قریب کوئی پیادہ دستہ پڑاؤ ڈالے رہتا ہے۔ شہر کے مرکز میں سوار دستہ، پبلک باغ میں ایک تھیٹر ہے اور بس۔

یہاں میں اتنا ضرور کہہ دوں کہ "الف"، قصبہ، اس کا دوما ***، اسکول، پبلک باغ اور تھیٹر اور بڑی سڑک کے ترشے ہوئے پتھر، یہ سب مقامی کروڑپتی شکرساز خاری‌تونینکو کے دم کا ظہورہ ہے۔

---

* یوکرینی۔ (ایڈیٹر)

** ضلعوں کے نام۔ (ایڈیٹر)

*** ٹاؤن ہال۔ (ایڈیٹر)

۲

میں اس قصبے میں کس طرح آیا اور رہا اس کی تفصیل بتانے میں تو بہت وقت لگے گا۔ اس لئے میں صرف چند لفظوں میں کہوں گا۔ مجھے وہاں اپنے ایک دوست سے ملنا تھا — خدا اسے غریق رحمت کرے — ایک سچا دوست جس کی شادی ایک ایسی عورت سے ہوئی تھی جو تمام سچے دوستوں کی بیویوں کی طرح مجھے برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ دوست کے اور میرے پاس الگ الگ کئی کئی ہزار روبل تھے جو ہمارے خون پسینے کی کمائی تھے۔ وہ کئی سال سے معلم تھا، ساتھ ھی بیمہ کمپنی کا ایجنٹ بھی۔ میری قسمت کا ستارہ سال بھر سے تاش کی بدولت چمک رہا تھا۔ ایک مرتبہ جنوبی بھیڑوں کے کاروبار میں ہمیں ایک بہت ھی اچھا کام ھاتھ لگ گیا، ہم نے سوچا کہ آزما کے دیکھنا چاھئے۔ پہلے میں روانہ ھوا۔ اسے دو تین دن بعد پہنچنا تھا۔ ایک زمانے سے میرے بھلکڑپن اور خود فراموشی کی شہرت تھی۔ چنانچہ ھمارا تمام روپیہ دو الگ الگ تھیلیوں میں اس کے پاس رکھا گیا کیونکہ وہ جرمنوں کی طرح چوکس تھا۔

اور یہ تھا بدقسمتی کا آغاز۔ میں خارخوف اسٹیشن پر ٹھنڈی مچھلی اور پرووانسل چٹنی کھا

رہا تھا کہ جیب سے بٹوہ غائب۔ میں اس شہر ''س،، میں پہنچا (جس کے بارے میں میں آپ کو بتا رہا ہوں) تو میرے بٹوے میں صرف ریزگاری پڑی تھی۔ میرے پاس ایک انگریزی بھورا لال سوٹ کیس تھا جو دیکھنے میں بہت اچھا تھا۔ میں ہوٹل میں ٹھیر گیا — اس کا نام ''سینٹ پیٹرسبرگ،، تھا — اور میں نے تار پر تار روانہ کرنے شروع کئے۔ مجھے موت کی سی خاموشی کے سوا کوئی جواب نہ ملا۔ ہاں ''موت کی سی،، خاموشی کہنا بالکل مناسب ہے کیونکہ ٹھیک اس وقت جب چور میرا بٹوہ پار کر رہا تھا — ذرا سوچو تو قسمت ہمارے ساتھ کیا کیا کھیل کھیلتی ہے! — میرا دوست اور ساتھی گاڑی میں سفر کرتے ہوئے اچانک دل بیٹھنے سے مر گیا۔ اس کے تمام سامان اور روپئے پر مہر لگا دی گئی اور کسی نامعقول سبب کی بنا پر عدالتی بحث مباحثہ چھ ہفتے تک کھنچتا چلا گیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ غم کی ماری بیوہ کو میرے روپے کا علم تھا یا نہیں، سچ تو یہ ہے کہ اسے میرے تمام تار ملے، لیکن گھٹیا اور حاسد عورتوں کے جذبۂ انتقام کے تحت وہ اس پر بضد رہی کہ ان کا جواب نہ دے۔ یہ سچ ہے کہ بعد میں ان تاروں نے میرا بہت ساتھ دیا۔ جب مہر توڑی گئی تو میرے تاروں پر اتفاق سے ایک بیرسٹر کی نظر پڑی۔ بیرسٹر وراثت کے سلسلے میں پیروی کر رہا تھا اور

مجھ سے بالکل ناواقف تھا۔ اس نے بیوہ کو برا بھلا کہا اور اپنی ذمہ‌داری پر اس میں سے پانچ سو روبل تھیٹر کی معرفت مجھے بھیج دئے۔ یہ بات کچھ زیادہ حیرت‌انگیز نہیں تھی کیونکہ وہ تار معمولی تار نہیں تھے، وہ تو میری روح کی درد بھری اور المناک فریادیں تھیں۔ ان میں سے ہر ایک فریاد بیس یا تیس الفاظ پر مبنی تھی۔

۳

ہوٹل ''سینٹ پیٹرسبرگ،، میں میرا تیسرا دن تھا۔ میری روح کی درد بھری فریادوں نے میرا بٹوہ بالکل خالی کر دیا تھا۔ ہوٹل کا مالک سنجیدہ اور سوئی سوئی سی صورت کا خوخول تھا اور خونی دکھائی دیتا تھا۔ اسے میری باتوں پر ذرہ برابر یقین نہ آتا تھا۔ میں نے اسے بعض خطوط اور کاغذات دکھائے اور کہا کہ ان سے اندازہ ہو جائیگا کہ — وغیرہ وغیرہ لیکن وہ خفگی سے منہ موڑکر پھنکارنے لگتا۔ آخرکار ایک ملازم میرا کھانا لایا اور اس نے کہا ''مالک نے کہا ہے کہ یہ آخری بار ہے۔،،

ایک دن ایسا آیا جب میری جیب میں بیس کوپک کے ایک گھسےپٹے اور بےبس سکے کے سوا کچھ بھی نہ رہا۔ اس دن صبح کو مالک نے بڑی سختی سے مجھ سے کہا کہ اب وہ مجھے

کھانا اور رہنے کا ٹھکانہ نہیں دے سکتا، وہ یہ معاملہ پولیس تک لے جائیگا۔ مجھے اس کے لہجے سے اندازہ ہو گیا کہ یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے واقعی وہی کرے گا۔

دن‌بھر میں شہر میں بھٹکتا رہا۔ مجھے یاد ہے میں کام کی تلاش میں نقل و حمل کے دفتر میں گیا اور کئی اور جگہوں پر گیا، مگر جیسے ہی میں کچھ کہنے کو منہ کھولتا، انکار کر دیا جاتا۔ کبھی کبھی میں حور کے درازقد درختوں کی قطار کے بیچ میں دوڑتی ہوئی سڑک کے کنارے پڑے ہوئے سرسبز بنچ پر بیٹھ جاتا۔ بھوک سے میرا سر چکرا رہا تھا لیکن ایک لمحہ کو بھی میرے ذہن میں خودکشی کا خیال نہیں آیا۔ زندگی کی دشواریوں سے گزرتے ہوئے میں کئی دفعہ اس خیال سے کھیلا تھا۔ لیکن سال گزر جاتا یا کبھی کبھی ایک آدھ مہینہ یا چند ایک منٹ گزرتے اور اچانک پوری دنیا ہی بدل جاتی۔ میں پھر خوش‌قسمتی، مسرت اور خوشی کے ہنڈولے میں جھولنے لگتا۔ اس گرم اور سنسان شہر کی خاک چھانتے ہوئے میں برابر دل ہی دل میں کہہ رہا تھا ”پاول اندریوچ! عجیب مخمصے میں پھنس گئے، یار!“

میں بھوکا تھا۔ لیکن کوئی پراسرار اندیشہ مجھے اپنے آخری بیس کوپک خرچ کرنے سے روکے رہا۔ مجھے ایک باڑھ پر ایک سرخ اشتہار نظر

آیا۔ رات پھیل رہی تھی۔ مجھے کچھ کرنا تو تھا ہی نہیں۔ چنانچہ بے اختیار ایک سرخ اشتہار کی طرف بڑھا اور اسے پڑھنے لگا۔ لکھا تھا کہ رات کو پبلک باغ میں گوتزکوف کا المیہ ”یورئیل اکوسٹا،، دکھایا جائیگا۔ فلاں فلاں افراد اس میں کام کریں گے۔ دو ایکٹروں کے نام بڑے بڑے سیاہ حروف میں لکھے ہوئے تھے: ”پیٹرسبرگ اسٹیج پر کام کرنے والی ایکٹرس مس اندروسووا اور خارکوف کے مشہور ایکٹر مسٹر لارا — لارسکی،،۔ دوسرے چھوٹے کردار یہ تھے: ”مس ولوگودسکایا، میدویدوا، استرونینا — دولسکایا، مسٹر تیموفیئف — سومسکوئی، آکیمینکو، ساموئے لینکو، نیلیوبوف — اولگن اور دوخوسکوئی،،۔ چند نام جو سب سے چھوٹے حروف میں لکھے ہوئے تھے یہ ھیں: ”پیتروف، سرگیئف، سیدوروف، گری گورئیف، نکولائیف اور دوسرے۔،، اسٹیج ڈائریکٹر ”مسٹر ساموئے لینکو،، تھے اور انتظامی ڈائریکٹر ”مسٹر والیریانوف،،۔

اس سایوسی کے عالم میں اچانک ایک فیصلے نے میرے اندر نئی روح پھونک دی۔ میں سڑک پار کرکے بھاگتا ہوا ماسکو کے حجام تیودور کے ھاں پہنچا۔ اپنے آخری بیس کوپیک پیش کئے اور اس سے مونچھیں اور چھوٹی سی نوکیلی داڑھی بنانے کو کہا۔ یاخدا! آئینے میں کس قدر بے جان اور سوجا ہوا سا چہرہ جھانک رہا تھا! مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اگر خوبصورت نہیں تو

کم‌ازکم وضعدار قسم کے تیس سالہ نوجوان کے بجائے میرے سامنے آئینے میں ایک ایسا بوڑھا صوبائی رزمیہ کردار گردن تک چادر میں لپٹا نظر آیا جو دنیا کا سرد گرم جھیل چکا تھا۔ اس کے چہرے پر ہر قسم کی برائیوں کے نشانات موجود تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ بالکل شرابی معلوم ہو رہا تھا۔

"ہمارے تھیٹر میں کام کرنے جا رہے ہو؟" حجام کے اسسٹنٹ نے چادر جھاڑتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں" میں نے فخریہ جواب دیا۔ "لو یہ لو تمھاری اجرت۔"

▮

پبلک باغ کی طرف جاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا:

"ہر برائی میں کہیں تو اچھائی چھپی ہوتی ہے۔ وہ فوراً پہچان لیں‌گے کہ میں کس قدر تجربہ کار ہوں۔ موسم گرما کے یہ چھوٹے تھیٹر ہمیشہ ایک آدھ فالتو آدمی کو کھپا سکتے ہیں۔ میں شروع میں زیادہ نہیں مانگونگا۔ میرے خیال میں پچاس کہنا چاهئے۔ نہیں، چالیس روبل ماھانہ۔ پھر بعد میں دیکھا جائیگا۔ میں تنخواہ کے بیس روبل پیشگی مانگ لوں‌گا — نہیں، یہ تو بہت زیادہ ہے — دس روبل کے قریب ٹھیک ہے۔ سب سے پہلے تو میں ایک بہت سخت قسم کا تار بھیجوں‌گا — پانچ پنچیے

پچیس، صفر، برابر ہوا دو روبل پچاس کوپک اور فیس کے پندرہ کوپک — یہ ہوئے دو روبل پینسٹھ کوپک... جب تک ایلیا آئے، تب تک میں باقی سے کام چلا لوں گا۔ اگر وہ مجھ سے ایکٹنگ کرا کے دیکھنا چاہیں تو ضرور دیکھ لیں۔ میں کوئی نظم یا نثر پڑھ کر سنا دوں گا — مثلاً پیمین* کی خود کلامی۔ ''

اور میں گہری اور بھاری بھرکم آواز میں زیرلب گنگنانے لگا:

''میں ایک اور واقعہ بیان کروں گا۔ ''

ایک راہی گھبرا کر پرے ہٹ گیا۔ میں کھسیانہ سا ہو کر کھانسنے لگا۔ اب میں پبلک باغ کے قریب تھا۔ وہاں کوئی فوجی باجا بج رہا تھا۔ روشوں پر نازک نازک مقامی دوشیزائیں آبی اور گلابی لباسوں میں ملبوس ہیٹ اتارے ٹہل رہی تھیں۔ مقامی کلرک، تاروالے اور چنگی والے ایک ہاتھ کوٹ کے کالر میں دئے اور ٹوپیاں ترچھی کئے ان کے چاروں طرف منڈلا رہے تھے۔ وہ بےتحاشہ ہنسے جا رہے تھے۔

پھاٹک چوپٹ کھلا ہوا تھا۔ میں اندر چلا گیا۔ کسی نے مجھے ٹکٹ خریدنے کی دعوت دی لیکن

---

* ''بورس گودونوف'' سے از پوشکن۔ (ایڈیٹر)

میں نے بےپروائی سے پوچھا کہ مینیجر مسٹر والیریانوف کہاں ملیں گے۔ فوراً مجھے دو نوجوانوں کی طرف بھیجا گیا جن کی داڑھی مونچھ صاف تھی اور جو پھاٹک سے تھوڑی ھی دور ایک بنچ پر بیٹھے تھے۔ میں ان کی طرف بڑھا اور ان سے دو قدم کے فاصلے پر رک گیا۔

وہ اپنی باتوں میں اتنے محو تھے کہ نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ مجھے اس کا موقع مل گیا کہ انہیں اچھی طرح دیکھ لوں۔ ان میں سے ایک ہلکے سے پاناما ھیٹ اور فلالین کے دھاری‌دار نیلے سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کے چہرے مہرے سے بڑی مصنوعی شرافت، ھیرو کا وقار اور تکبر ٹپکتا تھا۔ وہ بےخیالی میں اپنی نازک سی چھڑی سے کھیل رہا تھا۔ دوسرا شخص بھورے سوٹ میں ملبوس تھا اور اس کی ٹانگیں اور بازو غیرمعمولی طور پر لمبے تھے۔ ایسا معلوم ھوتا تھا جیسے اس کے پیٹ ھے ھی نہیں، بس سینے کے بعد سیدھے ٹانگیں شروع ھو گئی ھوں، اس کے بازو کچھ نہیں تو کم‌ازکم اس کے گھٹنوں سے نیچے ضرور ھوں‌گے، یہ سب چیزیں مل کر ایک عجیب ٹیڑھی ترچھی چیز ابھرتی تھی، جس کے بجائے کوئی جوڑدار چھڑی بھی کام آ سکتی تھی۔ اس کا سر بہت چھوٹا تھا، چہرے پر جھریوں کا جال پھیلا ھوا تھا اور اس کی آنکھیں سیاہ اور بےچین تھیں۔

موقع محل دیکھ کر میں نے گلا صاف کیا۔ دونوں اصحاب مڑ کر میری طرف دیکھنے لگے۔

"کیا میں والیریانوف صاحب سے مل سکتا ہوں؟" میں نے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

"خاکسار ہی ہے" جھریوں والے شخص نے کہا۔ "کہئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"وہ بات یہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ..." میرا گلا رندھ گیا۔ "میں چاہتا ہوں کہ مزاحیہ کردار کی حیثیت سے یا کسی 'احمق' کی حیثیت سے اپنی خدمات پیش کروں۔ میں مختلف اہم کرداروں کی اداکاری بھی کر سکتا ہوں۔"

ہیرو اٹھا اور سیٹی بجاتا اور چھڑی گھماتا ہوا چلا گیا۔

"پہلے تم کہاں کام کرتے تھے؟" والیریانوف نے پوچھا۔

میں نے صرف ایک مرتبہ ایکٹنگ کی تھی، وہ بھی کسی شوقیہ ڈرامے میں کوئی مزاحیہ کردار۔ میں نے دماغ پر زور ڈال کر جواب دیا:

"سچ تو یہ ہے کہ میں نے کبھی آپ کی سی جمی جمائی کمپنی میں کام نہیں کیا۔ لیکن مجھے جنوب مغرب کی چھوٹی چھوٹی کمپنیوں میں کام کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ کمپنیاں جلد ہی

26*

ناکام ثابت هوئیں — ان میں سے چند یه هیں :
مارینیچ، سوکولوفسکی اور بعض اور کمپنیاں۔ ،،
''هوں، اور کیا تم شراب پیتے هو ؟،، اچانک والیریانوف نے کہا۔
''نہیں،، میں نے مستعدی سے جواب دیا۔
''میں کبھی کبھی کھانے سے پہلے یا کسی پارٹی وغیرہ میں تھوڑی سی پی لیتا هوں، لیکن بس چند قطرے۔ ،،
والیریانوف آنکھیں میچ کر نیچے ریت کی طرف دیکھنے لگا۔
''اچھا،، اس نے تھوڑی دیر سوچ کر کہا۔
''میں تمھیں رکھ لوں گا۔ تمھیں پچیس روبل ماهانه تنخواہ ملےگی، بعد میں پھر هم دیکھیں گے۔ هو سکتا هے آج رات هی تمھاری ضرورت پڑ جائے۔ جاؤ اسٹیج کی طرح جا کر اسسٹنٹ ڈائریکٹر دوخوسکوئی کو پوچھو — وہ تمھیں ڈائریکٹر سے ملوا دیں گے۔ ،،
میں اسٹیج کی طرف جاتے هوئے سوچ رها تھا که آخر اس نے میرا اسٹیج کا نام کیوں نہیں پوچھا۔ هو سکتا هے بھول گیا هو، یا اسے یه خیال هو که میرا ایسا کوئی نام هے هی نہیں۔ پھر بھی ٹہلتے ٹہلتے میں نے وقت بےوقت کے لئے اپنا خاندانی نام ایجاد کر لیا : اوسینین — بہت چمکدار نام تو نہیں هے لیکن اس کی آواز بہت آسان اور دلچسپ معلوم هوئی۔

دوخوسکوئی مجھے پردے کے پیچھے ملا، وہ بہت ھی بےچین طبیعت نوجوان تھا اور اس کے چہرے سے عرصہ ہوا تازگی رخصت ہو چکی تھی۔ اس نے ڈائریکٹر ساموئےلینکو سے میرا تعارف کرایا۔ ساموئےلینکو اس شام کسی سورما کا رول ادا کرنےوالا تھا۔ چنانچہ وہ سنہرے زرہ بکتر اور گھٹنوں تک لمبے جوتوں سے لیس تھا اور سرخی پوڈر نے اس کے چہرے کو کسی نوجوان محبوب کا سا بنا دیا تھا۔ لیکن اس پردے کے باوجود میں نے دیکھ لیا کہ وہ گول سول آدمی تھا۔ اس کا چہرہ چاند کی طرح گول تھا۔ آنکھیں سوئی کی نوک کی طرح تھیں اور ھونٹوں پر مستقل بڑی احمقانہ سی مسکراھٹ پھیلی رہتی تھی۔ اس نے نہایت تکبر سے میرا سواگت کیا اور مصافحہ کرنے سے انکار کر دیا۔ میں واپس پلٹنے ھی والا تھا کہ اس نے کہا ”ایک منٹ ٹھیرو۔ کیا نام بتایا تم نے؟ میں نے سنا نہیں۔“

”واسیلیئف!“ دوخوسکوئی نے خوشامدانہ انداز میں انتہائی پھرتی سے لقمہ دیا۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ میں اس کی غلطی صحیح کرنےوالا تھا۔ لیکن اب چڑیا ھاتھ سے نکل چکی تھی۔

”ھوں، تو سنو، واسیلیئف۔ آج تم یہاں ٹھیرو۔

26—1348

دوخوسکوئے، درزی سے کہو کہ واسیلیئف کو ایک کوٹ دے دے۔ ،،

اور اس طرح میں اوسینین کے بجائے واسیلیئف بن گیا اور ''پیتروف، ایوانوف، نکولائیف، گری گورئیف، سیدوروف اور دوسرے،، ناموں کے ساتھ ساتھ اپنی ڈرامائی زندگی کے آخر تک میرا یہی نام رہا۔ میں تو اس قدر نو گرفتار ایکٹر تھا کہ ہفتے بھر تک مجھے یہ اندازہ ہی نہیں ہوا کہ اشتہار میں شائع ہونےوالے تمام ناموں میں سے صرف میرا نام ایک زندہ سلامت آدمی کا نام تھا۔ اور یہ سب اس لعنت‌ماری تک‌بندی کا کیا دھرا تھا!

درزی اندر آیا۔ وہ لمبا، پتلا دبلا اور لنگڑا تھا۔ اس نے مجھے سیاہ رنگ کا ایک سوتی لبادہ سا پہنایا۔ اور اوپر سے نیچے تک موٹی موٹی سلائی کر دی۔ پھر حجام صاحب تشریف لائے، میں نے پہچان لیا یہ تیودور کے اسسٹنٹ تھے جس نے تھوڑی ہی دیر پہلے میری حجامت بنائی تھی۔ ہم نے دوستانہ مسکراہٹ سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اس نے میرے سر پر ایک سیاہ وگ رکھ دیا جس میں کاکلیں لٹکی ہوئی تھیں۔ اچانک دوخوسکوئی ڈریسنگ روم میں گھسا اور گرجا ''واسیلیئف، جلدی تیار ہو جاؤ!،، میں نے کسی کے رنگوں میں انگلی ڈالی۔ لیکن میرے بائیں ہاتھ والے ہمسائے نے، جو ایک سنجیدہ پیشانی‌والا تیز مزاج شخص تھا، مجھے فوراً ڈانٹا

"کسی اور کے بکس میں ہاتھ ڈالنے سے باز نہیں رہ سکتے کیا؟ عام استعمال کے رنگ ادھر ہیں۔"

مجھے ایک بڑا سا بکس نظر آیا جس میں منے منے خانے بنے ہوئے تھے۔ ہر خانے میں گندے رنگوں کا مربہ سا بھرا ہوا تھا۔ میں گھبرا گیا۔ دوخوسکوئی کے لئے چیخنا بہت آسان تھا "تیار ہو جاؤ!" لیکن آخر میں کس قسم کا روغن کروں؟ میں نے ہمت کرکے اپنی ناک کے اوپر ایک سفید لکیر کھینچی اور فوراً میری شکل مسخرے کی سی ہوگئی۔ پھر میں نے دو نہایت بھیانک بھویں بنائیں۔ آنکھوں کے نیچے دو نیلے دھبے ڈالے، اور سوچنے لگا کہ اور کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے پتلیاں گھمائیں اور بھوؤں کے درمیان دو متوازی بل ڈال لئے۔ اب تو میں سولہ آنے کمانچی* کے چیف کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔

"تیار، واسیلیئف!" اوپر سے آواز آئی۔

میں ڈریسنگ روم سے نکلا اور پچھلی دیوار کے قریب کپڑے کے دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ دوخوسکوئی میرا انتظار کر رہا تھا۔

"اب تمھاری باری ہے۔ اف خدا کیا چہرہ ہے! جیسے ہی تم سنو 'ہاں وہ واپس آئیگا'، ویسے ہی تمھیں اندر جانا ہے۔ تم اندر جاؤ اور کہو..."

---

* شمالی امریکن ریڈ انڈین قبیلہ۔ (ایڈیٹر)

اس نے کوئی نام لیا، مگر اب میں بھول بھال گیا ہوں... ’’ فلاں صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں، ۔ اور پھر واپس باہر آ جانا ۔ سب سمجھ میں آ گیا؟،،

’’ہاں ۔ ،،

’’ہاں، وہ واپس آئیگا،، میں نے کسی کو کہتے سنا ۔ میں دوخوسکوئی کو اپنی راہ سے دھکیل کر تیزی سے اسٹیج پر داخل ہوا ۔ خدا لعنت کرے، اس شخص کا کیا نام تھا؟ میں دو ایک لمحے کو بالکل گونگا سا ہو گیا ۔ حاضرین مجھے ایک متحرک سیاہ غار معلوم ہوئے ۔ لیمپ کی دمکتی ہوئی روشنی میں مجھے ٹھیک اپنے سامنے بری طرح پوڈر سرخی سے رنگے ہوئے اجنبی چہرے نظر آئے ۔ ہر شخص بڑے غور سے مجھے تک رہا تھا ۔ دوخوسکوئی نے پیچھے سے کھسر پھسر کی ۔ لیکن میرے پلے کچھ نہیں پڑا ۔ پھر اچانک میں نے بڑی سنجیدہ اور ملامت بھری آواز میں اعلان کیا :

’’ہاں وہ واپس آ گیا!،،

ساموئےلینکو، سنہری زرہ بکتر سے لیس، کسی طوفان کی طرح میرے پاس سے گزر گیا ۔ شکر ہے خدا کا! میں پھر پردے کے پیچھے کھسک گیا ۔

اس ڈرامے میں دو دفعہ اور میں اسٹیج پر گیا ۔ جس منظر میں اکوسٹا یہودی مذہبی رسوم کی مخالفت کرتا ہے اور پھر گر جاتا ہے، اس میں مجھے اکوسٹا کو اپنے بازوؤں میں سنبھال کر

اسٹیج سے باہر گھسیٹنا تھا۔ ایک فائرمین نے اس کام میں میری مدد کی۔ وہ بھی میری طرح ایک سیاہ لبادے میں ملبوس تھا (شاید حاضرین کی نظر میں وہ ''سیدوروف،، تھا) یورئیل اکوسٹا وھی ایکٹر نکلا جسے میں نے والیریانوف کے ساتھ بنچ پر بیٹھے دیکھا تھا یعنی ''خارکوف کا مشہور ایکٹر،، لارا لارسکی۔ ہم نے خاصے تھوھڑپن سے گھسیٹا ــ وہ بہت ھی گٹھیلا اور بھاری تھا۔ لیکن شکر ھے اسے گرایا نہیں، وہ اتنا تو ضرور بڑبڑایا ''لعنت ھو تم دونوں پر، احمق!،، بہرحال ہم کسی نہ کسی طرح اس کو تنگ دروازے سے نکالنے میں کامیاب ھو ھی گئے۔ البتہ اس کے بعد قدیم گرجا کی پچھلی دیوار بڑی دیر تک جھومتی رھی۔

تیسری دفعہ میں اسٹیج پر نمودار ھوا تو مجھے اکوسٹا کے مقدمے میں خاموش کھڑا ھونا تھا۔ ایک چھوٹا سا حادثہ ھو گیا۔ ھوا یہ کہ جب بن اقیبا داخل ھوا تو ھر شخص تعظیماً کھڑا ھو گیا۔ لیکن میں بےخیالی میں بیٹھا رہ گیا۔ کسی نے میری کہنی کے اوپر زور سے کچھ چبھویا اور غرایا:

''پاگل ھو گئے ھو! ارے بن اقیبا ھے! کھڑے ھو جاؤ!،،

میں جلدی سے کھڑا ھو گیا۔ لیکن واقعی مجھے معلوم ھی نہیں تھا کہ بن اقیبا یہی ھے۔ میں تو اسے کوئی معمولی سا بوڑھا سمجھا تھا۔

ڈرامے کے بعد ساموئےلینکو نے مجھ سے کہا:
''واسیلیئف، تمھیں کل صبح گیارہ بجے ریہرسل میں آنا ہے۔''

میں اپنے ہوٹل واپس پہنچا۔ لیکن ہوٹل کے مالک نے جیسے ہی میری آواز سنی دھڑ سے دروازہ بند کر لیا۔ میں نے سفیدے کے درختوں کے بیچ میں پڑے ہوئے ایک سبز بنچ پر رات بسر کی۔ رات گرم تھی۔ میں انتہائی شہرت کمانے کے خواب دیکھتا رہا۔ لیکن صبح کی خنک ہواؤں اور بھوک کی تپش نے مجھے صبح سویرے بیدار کر دیا۔

٦

ٹھیک ساڑھے دس بجے میں تھیٹر پہنچا۔ ابھی تک کوئی نہیں آیا تھا۔ باغ میں کہیں کہیں موسم گرما کے ریستوراں کے ملازم سفید اپرن پہنے مٹرگشت کر رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ابھی تک نیند کا خمار تھا۔ انگور کی بیلوں سے ڈھکے ہوئے جالی‌دار سرسبز و شاداب کنج میں کسی کو ناشتہ یا صبح کا قہوہ پیش کیا جانے‌والا تھا۔

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ تھیٹر کا مینیجر والیریانوف اور پینسٹھ سالہ بوڑھی ایکٹرس بلاتووا — چرنوگورسکایا، جو تھیٹر اور تھیٹر کے مینیجر دونوں کی کفیل تھی، روزانہ صبح کو اسی کنج میں ناشتہ کرتے تھے۔

میز پر ایک صاف ستھرا اور چمک‌دار میزپوش بچھا دیا گیا۔ اس پر دو سیٹ اور لگے ہوئے تھے۔ ایک رکابی میں ڈبل روٹی کے توسوں کی دو پہاڑیاں ابھری ہوئی تھیں۔

اب ایک دردناک حصہ آتا ہے۔ میں زندگی میں پہلی اور آخری مرتبہ چور بن گیا۔ جلدی سے ادھر ادھر نگاہ ڈال کر میں تیزی سے کنج میں گھس گیا اور روٹی کے کئی ٹکڑے جھپٹ لئے۔ اف کس قدر نرم تھے! لیکن تیزی سے باھر نکلتے ہوئے میں ایک ملازم سے ٹکرا گیا۔ شاید وہ کنج کے پیچھے سے نکلا تھا۔ اس کے ھاتھ میں سرکےدانی تھی جس میں سرسوں کی چٹنی، مرچیں اور سرکہ سجے ہوئے تھے۔ اس نے بڑی سختی سے میری طرف اور میرے ھاتھ کے توسوں کو دیکھا اور آھستہ سے پوچھا:

"اس کا کیا مطلب؟"

میرے دل میں دھکتے ہوئے اور نفرت بھرے وقار کا جذبہ ابھرا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اتنی ھی آھستگی سے جواب دیا:

"اس کا مطلب یہ ھے کہ پرسوں چار بجے سے ایک کھیل بھی اڑ کر میرے منہ میں نہیں گئی ھے۔"

وہ مڑا اور ایک لفظ کہے بغیر تیزی سے چلا گیا۔ میں نے توس جیب میں رکھ لئے اور سرا پا انتظار بن گیا۔ میں خوفزدہ بھی تھا اور خوش بھی۔

"خوب!،، میں نے سوچا۔ "پل بھر میں مالک یہاں ہوگا۔ سارے ملازم جمع ہو جائیں گے۔ پولیس بلانے کے لئے سیٹیاں بجائی جائیں گی — ایک ھنگامہ مچ جائیگا، خوب خوب گالی گلوچ ہوگی، دھکم دھکا ہوگی۔ اوہ، میں کس پھرتی سے ان کے سروں پر یہ پلیٹیں اور یہ سرکےدانیاں ماروں گا! انھیں کاٹ کے لہو لہان کر دوں گا!،،

لیکن ملازم بھاگتا ہوا واپس آیا — تنہا۔ اس کا سانس کچھ پھولا ھوا سا تھا۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر دبکا دبکا آیا۔ میں نے بھی پلٹ کر دیکھا، اور اچانک اس نے اپنے اپرن کے نیچے سے میرے ھاتھ میں گزشتہ رات کے ٹھنڈے گوشت کا ایک بڑا سا ٹکڑا تھما دیا۔ اس پر خوب نمک وغیرہ چھڑکا ھوا تھا۔ اس نے بڑی منت سے سرگوشی کی:

"لو یہ لے لو، بھائی۔ ،،

میں نے گوشت تھام لیا اور اسٹیج کے عقب میں چلا گیا۔ ایک ایسی جگہ چن لی جہاں ابھی تک خاصا اندھیرا تھا۔ وھاں کوڑے کباڑ کے درمیان بیٹھ کر میں بڑے چاؤ سے گوشت چبانے لگا۔ خوشی کے مارے آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

اس کے بعد تقریباً روز ھی اس شخص سے میری ملاقات ھوتی تھی۔ اس کا نام سرگئی تھا۔ جب قریب کوئی گاھک نہ ھوتا تو وہ دور ھی سے بڑی دوستانہ، مخلصانہ اور التجا بھری نظروں سے میری طرف دیکھتا۔

اگرچہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ بھوک سے پیٹ میں بل پڑتے رہے لیکن اس کی اور اپنی خاطر میں اس کی خوش فہمی کو ختم کرنے کو رضامند نہ ہوا۔

وہ چھوٹا، موٹا اور گنجا تھا۔ اس کی مونچھیں تل چٹے کی مونچھوں جیسی تھیں اور محبت بھری آنکھیں دو چھوٹے اور چمکدار نیم دائروں کی طرح۔ اسے ہمیشہ کسی نہ کسی کام کی جلدی رہتی اور ہلکا سا لنگ کھاتے ہوئے ادھر سے ادھر بھاگتا رہتا۔ آخر مجھے روپیہ مل گیا۔ اسٹیج کا معاہدہ کسی ڈراؤنے خواب کی طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا اور جب میری شمپین کی آغوش میں زمانے بھر کے لفنگے آ گئے اور میری خوشامدیں کرنے لگے تو مجھے اپنے پیارے مضحکہ خیز اور دردمند سرگئی کی کتنی یاد آئی! ظاہر ہے میں اسے روپیہ دینے کی تو ہمت کر ہی نہیں سکتا تھا، کیونکہ اس دردمندی کی، اس محبت کی قیمت بھلا روپیہ سے کیسے ادا ہو سکتی ہے؟ البتہ میں اسے کوئی یادگار دینا چاہتا تھا، کوئی چھوٹا موٹا زیور۔ یا اس کے بیوی بچوں کو کوئی تحفہ۔ اس کے بچوں کی پوری پلٹن کی پلٹن تھی، کبھی کبھی صبح کو وہ ننھی ننھی ابابیلوں کی طرح چیختے شور مچاتے بھاگے بھاگے اس کے پاس آیا کرتے تھے۔

لیکن میری زندگی کے اس معجزے سے ہفتے بھر پہلے سرگئی نکال دیا گیا تھا، اور میں جانتا ہوں

کیوں۔ کپتان فون براد کے سامنے گوشت کا ایک قتلہ پیش کیا گیا جو اسے پسند نہ آیا۔

''اس طرح تیار کرتے ھیں، بدمعاش؟،، وہ گرجا۔ ''تجھے نہیں معلوم کہ میں ھلکا تلا ھوا گوشت پسند کرتا ھوں؟،،

سرگئی نے ھمت کرکے کہا کہ اس میں اس کی کوئی غلطی نہیں ھے، غلطی باورچی کی ھے۔ اس نے کہا کہ ابھی بدل کر لاتا ھوں۔ پھر بہت عاجزی سے یہ بھی کہا:

''معاف کیجئے، صاحب۔،،

اس معافی نے افسر کو غصے سے پاگل کر دیا۔ اس نے سرگئی کے منہ پر گرم گرم گوشت دے مارا اور غصے میں لال انگارہ ھوکر چلایا:

''کیا۔ ا۔ ا؟ تو مجھے صاحب کہے گا؟ صاحب کہے گا؟ تو شہنشاہ عالم کے سوار دستے کے کپتان کو صاحب کہے گا! مالک! مالک کو بلاؤ! ایوان لوکیانیچ، اس گدھے کو آج ھی یہاں سے نکال دو! میں اسے یہاں نہیں دیکھنا چاھتا! اسے نکال باھر کرو، ورنہ میں کبھی تمھاری سرائے میں قدم نہیں رکھوں گا!،،

کپتان فون براد کے بہت دل کھول کے رنگ رلیاں منایا کرتا تھا، چنانچہ سرگئی کو فوراً نکال دیا گیا۔ مالک اس پوری شام افسر کو خوش کرنے میں لگا رھا۔ بڑی دیر تک، جب کبھی وقفے میں

تازہ ہوا کھانے باہر جاتا، تو مجھے کنج سے تھوڑی تھوڑی دیر پر حقارت‌آمیز آواز سنائی دیتی:
''ذرا اس بدمعاش کی باتیں تو سنو! کہتا ہے، صاحب! اگر خواتین موجود نہ ہوتیں تو میں اسے صاحب کہنے کا مزہ چکھاتا!''

۷

اس اثنا میں آہستہ آہستہ ایکٹر جمع ہوتے رہے۔ ساڑھے بارہ بجے ریہرسل شروع ہو گئی۔ ڈرامے کا عنوان تھا ''نئی دنیا''۔ یہ سینکیوچ کے ناول «Quo vadis» کا بہت ہی احمقانہ اور یکطرفہ چربہ تھا۔ دوخوسکوئی نے مجھے ایک کاغذ دیا جس پر میرا پارٹ چھپا ہوا تھا۔ مجھے بےنظیر مارکوس کے فوجی افسر کا رول ادا کرنا تھا۔ مجھے ایسے ایسے لاجواب جملے ادا کرنے تھے مثلاً ''اے مارکوس، تمام احکام عین میں اسی طرح پورے کر دئے گئے!'' یا ''اے مارکوس، پامپی کے بت کے قریب وہ تیرا انتظار کرےگی۔'' مجھے یہ پارٹ بہت پسند آیا اور میں دل ہی دل میں ایک محب وطن، سخت گیر، تجربہ کار اور آہن‌پیکر فوجی کی جری آواز میں اسے پڑھنے لگا۔

لیکن جیسے جیسے ریہرسل آگے بڑھی مجھ پر قیامت گزرتی چلی گئی۔ انتہائی غیرمتوقع طریقے سے

مجھ پر ایک کے بعد ایک چھوٹے چھوٹے رول نازل ہونے شروع ہو گئے۔ مثلاً ویرونیکا مغلانی نے اپنی بات ختم کی، تو ساموئیلینکو نے جو برابر عبارت دیکھتا جا رہا تھا، تالی بجا کر کہا:

"غلام داخل ہو!"

کوئی اندر نہیں آیا۔

"بھائیو، غلام کون ہے؟ دوخوسکوئی، ذرا دیکھو تو غلام کون ہے؟"

دوخوسکوئی نے تیزی سے کچھ کاغذات پر نظر دوڑائی، لیکن اسے کوئی غلام نہیں ملا۔

"ارے کاٹ دو اسے۔ بھلا ہم وقت کیوں برباد کریں!" بوئیف نے کاہلی سے رائے دی۔ یہ وہی گمبھیر صورت‌والا شخص تھا جس کے رنگوں میں ایک دن پہلے میری انگلی پڑ گئی تھی۔

لیکن اچانک مارکوس (لارا — لارسکی) بگڑ بیٹھا:

"اوہ، نہیں نہیں، یہیں تو میں اس قدر شان و شوکت سے داخل ہوتا ہوں۔ میں بغیر غلام کے یہ منظر نہیں ہونے دوں گا۔"

ساموئیلینکو کی نظریں اسٹیج پر گھومیں اور مجھ پر رک گئیں۔

"ایک منٹ ٹھیرو۔ واسیلیئف، کیا اس منظر میں تم کام کر رہے ہو؟"

میں نے اپنے کاغذ پر نظر ڈالی۔

"ہاں، بالکل آخر میں۔"

''اچھا تو لو، تمھارے لئے ایک پارٹ اور ہے — ویرونیکا کے غلام کا پارٹ، لو کتاب سے پڑھو،، اس نے تالی بجائی۔ ''حضرات و خواتین، خاموش رہئے! غلام داخل ہو۔ 'محترم خاتون، — زور سے، پہلی قطار تک بھی تمھاری آواز نہیں پہنچ رہی۔،،

چند لمحے بعد انھیں آسمانی حسینہ مرسیا (سینکیوچ کی لیگیا) کے لئے غلام نہیں مل رہا تھا، چنانچہ انھوں نے مجھ سے یہ کمی بھی پوری کرا دی۔ پھر منتظم خانہ کے پارٹ کے لئے کسی کی ضرورت تھی۔ نظر انتخاب پھر مجھ پر پڑی۔ اور اس طرح ریہرسل ختم ہوتے ہوتے میرے پاس افسر کے پارٹ کے علاوہ پانچ پارٹ اور ہوگئے۔

شروع میں مجھ سے کام اچھی طرح چلا نہیں، میں باہر جاتا اور اپنے الفاظ کہنا شروع کرتا:

''اے مارکوس...،،

ساموئیلینکو ٹانگیں چیر لیتا اور آگے کو جھک کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیتا۔

''کیا کہا؟ کیا بدبدا رہے ہو آخر؟ میری سمجھ میں ایک لفظ نہیں آ رہا۔،،

''اے مارکوس...،،

''معاف کرنا، مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا، اور زور سے!،، وہ میرے قریب آ جاتا۔ ''دیکھو، اس طرح کہنا چاہئے،، اور وہ بکرے جیسی آواز میں گاتا۔ پورے باغ میں اس کی آواز گونج جاتی:

''اے مارکوس، تیرے احکام!'' اس طرح کہتے ہیں۔ جوانو، روس کے ایک عظیم ایکٹر کا لازوال قول یاد رکھو 'اسٹیج پر آدمی بولتا نہیں ہے — چیختا ہے۔ چلتا نہیں ہے اکڑ کر آگے بڑھتا ہے۔''
اس نے گھٹیا نظر سے چاروں طرف دیکھا۔ ''چلو، پھر کہو۔''

میں نے کہا لیکن پہلے سے بھی بدتر۔ پھر انھوں نے باری باری مجھے سکھانا شروع کیا اور سب کے سب ریہرسل کے آخر تک مجھے سکھاتے رہے۔ مغرور لارا — لارسکی نے تیوری چڑھا کر نک‌چڑھے پن سے سکھایا، بوڑھے اور تھل تھل گنچاروف نے سکھایا جس کے سرخ سرخ رگوں‌والے پھولے ہوئے رخسار ٹھوڑی سے نیچے تک لٹکے ہوئے تھے، رنگوں کے سالک بوئیف نے، سیدھے سادے آکیمینکو نے جس نے احمق ایوان جیسا چہرہ بنانے کی کوشش کی تھی، غرض سب نے سمجھایا۔ میرا تو اس پٹے ہوئے گھوڑے کا سا حال تھا جس کے جسم سے بھاپ اٹھ رہی ہو اور جس کے گرد سڑک پر صلاح دینے‌والوں کا مجمع لگا ہوا ہو۔ یا کسی نئے طالب‌علم کا سا سمجھ لیجئے جو گھر اور خاندان کے نرم و گرم ماحول سے نکل کر تجربہ کار، شیطان اور ظالم لڑکوں کے پنجے میں پھنس گیا ہو۔

اس ریہرسل کے دوران میں ایک شخص میرا بہت ہی حقیر مگر بے‌رحم دشمن بن گیا۔ اس نے

بعد میں میری زندگی کے ایک ایک دن میں زہر بھر دیا۔ یہ واقعہ یوں ہوا۔

میں اپنی ایک لامحدود سطر پڑھ رہا تھا ''اے مارکوس،، کہ اچانک ساموئے لینکو میری طرف لپکا۔

''ٹھیرو، میرے دوست، ٹھیرو، یہ غلط ہے۔ تم کس سے بات کر رہے ہو؟ بے نظیر مارکوس سے، ہیں نا؟ ہاں، تو اس کا مطلب ہے تمھیں رتی بھر بھی اندازہ نہیں ہے کہ قدیم روم میں ماتحت اپنے کمانڈر اعلی سے کس طرح بات کرتے تھے۔ دیکھو اس طرح اشارہ کرنا چاہئے۔،،

اس نے اپنا دایاں قدم آگے رکھا، اپنے دھڑ کو آگے کو جھکا کر زاویہ قائمہ بنا لیا دایاں ہاتھ جھکا دیا اور ہتیلی کی کفگیر سی بنا لی۔

''دیکھا کس طرح کرنا چاہئے؟ چلو اب پھر سے کرو۔،،

میں نے کیا۔ مگر یہ انداز اس قدر احمقانہ اور بھونڈا معلوم ہوا کہ میں نے دھیرے سے احتجاج کرنے کی کوشش کی:

''معاف کیجئے گا، میرے خیال میں فوجی اطوار اس طرح جھکنے کی اجازت نہیں دیتے۔ یہاں لکھا گیا ہے کہ وہ زرہ بکتر سے لیس داخل ہوتا ہے۔ اور آپ ضرور اس بات کو مانیں گے کہ کوئی شخص جو زرہ بکتر پہنے ہو... ،،

''مہربانی سے خاموش رہو!'' ساموئیلینکو غصے میں چلایا اور لال انگارہ ہو گیا۔ ''اگر اسٹیج ڈائریکٹر تمھیں ایک ٹانگ، پر کھڑا ہونے اور زبان نکالنے کا حکم دے تو تمھارا فرض ہے کہ فرماں برداری سے اس کا حکم مانو۔ مہربانی سے پھر کہو۔''

میں نے کہا۔ مگر وہ پہلے سے بھی زیادہ گھناونا معلوم ہوا۔ لیکن اس دفعہ لارا — لارسکی نے میری حمایت کی۔

''چھوڑو بھی، بورس'' اس نے جھجھکتے جھجھکتے ساموئیلینکو سے کہا۔ ''دیکھو نا، وہ اس طرح نہیں کر سکتا اور پھر تم جانتے ہی ہو کہ اس سلسلے میں تاریخ ہمیں کوئی مخصوص بات نہیں بتاتی۔ یہ تو ایک... میرا مطلب ہے یہ بحث طلب تنازع ہے۔''

ساموئیلینکو نے میرا اور اس تاریخی اور کلاسیکی اشارے کا پیچھا چھوڑ دیا۔ لیکن اس دن سے اس نے مجھے نیچا دکھانے، مجھے طعنہ دینے اور دکھ پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ وہ انتہائی جلن کے ساتھ ہر اس موقع کی تاک میں رہتا جب میں کوئی غلطی کر جاؤں۔ وہ مجھ سے اس قدر دلی نفرت کرتا تھا کہ مجھے یقین ہے وہ مجھے ہر روز خواب میں دیکھتا ہوگا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے... تو دس سال گزر چکے ہیں لیکن آج تک اس آدمی کا خیال آتے ہی غصے سے میرا گلا رندھ جاتا ہے۔ ظاہر ہے، وہاں سے رخصت ہونے

سے پہلے — اچھا چھوڑو — یہ میں آخر میں بتاؤں گا، ورنہ میری داستان کا تسلسل ٹوٹ جائے گا۔

ریہرسل ختم ہونے سے ذرا سی دیر پہلے ایک درازقد لمبی ناک اور مونچھوں والا تیز مزاج شخص اچانک اسٹیج پر آ دھمکا۔ وہ ہیٹ لگائے ہوئے تھا۔ وہ جھوما اور پردوں سے ٹکرا گیا۔ اس کی آنکھیں ٹین کے دو بٹنوں کی طرح تھیں۔ ہر شخص نے حقارت سے اس کی طرف دیکھا لیکن کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

''کون ہے یہ؟'' میں نے دوخوسکوئی سے سرگوشی کی۔

''اوہ، ایک شرابی!'' اس نے بےپروائی سے جواب دیا۔ ''نیلیوبوف — اولگن، ہمارا منظرنگار۔ بہت صلاحیتوں کا آدمی ہے۔ کبھی کبھی آدمیت کی جون میں ہوتا ہے تو کوئی پارٹ بھی کر لیتا ہے۔ لیکن بہت ہی بےکار اور لاعلاج شرابی ہے۔ اور ہمارے پاس اس کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ اتنا کم پیسہ لیتا ہے اور اتنی تیزی سے منظر کی تصویر بنا دیتا ہے۔''

۸

ریہرسل ختم ہو گئی۔ ہم وہاں سے اٹھنے لگے۔ ایکٹر مرسیا کا نام لے لے کر ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ لارا — لارسکی نے بہت معنی‌خیز انداز

میں بوئیف سے اپنے ساتھ ''وهاں،، جانے کو کہا۔ میں نے دو رویه درختوں کے سائے میں ایک روش پر والیریانوف کو جا لیا اور بمشکل اس کے لمبے لمبے قدموں کا ساتھ دیتے ہوئے کہا:

''ویکتر ویکترووچ، کیا آپ مجھے تھوڑا سا روپیه پیشگی دے سکتے هیں، بہت تھوڑا سا؟،،

وہ ٹھیر گیا۔ حیرت کے مارے اس کی زبان بند هوگئی۔

''کیا؟ کیسا روپیه؟ کیوں؟ کس کے لئے؟،،

میں اسے اپنی درخواست کی وجه سمجھانے لگا۔ لیکن اس نے مجھے بات ختم کرنے کا موقع هی نه دیا۔ بےنیازی سے میری طرف سے منه موڑ کر چلتا هو گیا۔ پھر اچانک وہ رکا اور میرے پاس واپس آیا۔

''میں نے کہا، کیا نام ہے تمھارا — واسیلیئف۔ تم اس آدمی کے پاس جاؤ، اپنے هوٹل کے مالک کے پاس، اور اس سے کہو که آکے مجھ سے مل لے۔ میں تقریباً آدھے گھنٹے اور یہاں دفتر میں رهوں گا۔ میں اس سے بات کروں گا۔،،

میں بھاگتا هوا هوٹل پہنچا۔ خوخول نے کچھ بےیقینی اور خاموشی سے میری بات سنی لیکن بھوری صدری پہنی اور مٹکتا هوا تھیٹر کی طرف چل دیا۔ میں اس کا انتظار کرتا رها۔ وہ پاؤ گھنٹے میں واپس آ گیا۔ اس کا منه طوفانی بادل کی طرح هو رها تھا

اور اس کے سیدھے ہاتھ میں داخلے کے سرخ پاسوں کی ایک گڈی تھی۔ وہ پاس میری ناک میں گھسا کر گرجا:

"یہ دیکھئے! میں تو سمجھا تھا وہ مجھے کچھ روپیہ دے گا، لیکن اس کے بجائے یہ کاغذ کے ٹکڑے ہاتھ لگے۔ بھلا یہ میرے کس کام کے ہیں؟"

میں پریشان کھڑا تھا۔ لیکن کاغذ کے یہ ٹکڑے خاصے کارآمد ثابت ہوئے۔ بہت کچھ منت سماجت کے بعد مالک ایک بات پر تیار ہو گیا۔ میرا پیلے چمڑے کا بہترین نیا انگریزی سوٹ کیس ضمانت کے طور پر اس کو مل گیا۔ اور میرے کپڑے، پاسپورٹ اور میری سب سے عزیز چیز — یعنی میری نوٹ بکیں میرے پاس رہ گئیں۔ خدا حافظ کہنے سے پہلے اس نے پوچھا:

"وہاں بھی یہی حماقتیں کرنے کا ارادہ ہے کیا؟"

"ہاں" میں نے بڑے وقار کے ساتھ اس سے اتفاق کیا۔

"ہاں! ذرا دھیان رکھنا، میں تمہیں دیکھتے ہی چلاؤں گا، ہے۔۔۔ے۔۔۔ے میرے پچیس روبل کہاں ہیں؟"

تین دن تک میری ہمت نہیں پڑی کہ والیریانوف کو تنگ کروں، اور میں سامان کا بنڈل سر کے

نیچے رکھ کر ایک سبز بنچ پر راتیں بتانے لگا۔ خوش قسمتی سے دو راتیں کافی گرم تھیں۔ بلکہ میں بنچ پر لیٹتا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے دن بھر کی تپی ہوئی سڑک کے پتھریلے فرش سے خشک خشک گرمی اٹھ رہی ہے۔ لیکن تیسری رات بڑی دیر تک بوندا باندی ہوتی رہی۔ میں دروازوں میں پناہ لیتا رہا اور رات بھر آنکھ نہ جھپکا سکا۔ آٹھ بجے پبلک باغ کھل جاتا تھا۔ میں اسٹیج کے پیچھے دبک گیا اور ایک پرانے پردے پر لیٹ کر دو گھنٹے تک میٹھی نیند کے مزے لوٹتا رہا۔ لیکن ظاھر ہے ساموئےلینکو کی نظر مجھ پر پڑنے کی دیر تھی۔ اس نے موقع پاتے ھی انتہائی تیز تیز الفاظ میں مجھے سنانا شروع کیا کہ تھیٹر عام لوگوں کے سونے کا کمرہ، کسی کی خلوت‌گاہ یا کوئی سرائے نہیں ہے۔ تھیٹر تو آرٹ اور فن کا مندر ہے۔ پھر میں نے ایک دفعہ اور ھمت کرکے مینیجر کو باغ کی روش پر پکڑا اور اس سے کچھ روپیہ مانگا کیونکہ میرے پاس سونے کا بھی ٹھکانا نہ تھا۔

”مجھے افسوس ہے،، اس نے کہا۔ ”لیکن یہ میرا فرض نہیں ہے۔ تم اب کوئی نابالغ تو ھو نہیں، اور نہ ھی میں تمھاری آیا ھوں۔،،

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں دھوپ میں چمکتی ہوئی روش کی ریت پر پھسلتی رھیں۔ آخر اس نے آھستگی سے کہا:

”اچھا، میں تمھیں ایک ترکیب بتاتا ھوں۔ کیا تم تھیٹر میں سو سکتے ھو؟ میں نے دربان سے اس سلسلے میں بات کی تھی مگر وہ احمق ڈرتا ھے۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

”لیکن یاد رکھو۔ تھیٹر میں سگریٹ نہیں چلے گی۔ اگر سگریٹ پینا چاھو تو باھر باغ میں چلے جایا کرنا۔“

اس دن سے مجھے رات کے لئے کم سے کم سر پر ایک چھت کا تو یقین ھو ھی گیا۔ کبھی کبھی دن کے وقت میں دو میل پرے ایک چھوٹے سے چشمے پر چلا جاتا، ایک ڈھکے ھوئے سے کونے میں کپڑے دھوتا اور ساحل پر اگے ھوئے بید کی شاخوں پر ڈال کر سکھا لیتا۔ ان کپڑوں نے میری بہت مدد کی۔ کبھی کبھی میں کوئی قمیص یا کوئی اور چیز بیچنے بازار چلا جاتا۔ اس بکری سے مجھے جو بیس تیس کوپک ملتے وہ دو دن تک میرا پیٹ گرم رکھتے۔ میرے لئے حالات یقیناً سازگار ھوتے جا رھے تھے۔ ایک دن تو میں ایک مناسب موقع پر خوشامد درآمد کرکے والیریانوف سے ایک روبل لینے میں کامیاب ھو ھی گیا۔ میں نے فوراً ایلیا کو تار دیا:

”فاقہ کر رھا ھوں، فوراً تار سے روپیہ بھیجو لیونتووچ معرفت ’س‘ تھیٹر۔“

دوسری ریہرسل، ڈریس ریہرسل ہی تھی۔ اس موقع پر مجھے دو پارٹ اور عطا کر دئے گئے — قدیم زمانے کے ایک عیسائی معمر اور ٹیجیلینس کے پارٹ۔ میں نے بلا چون و چرا انہیں قبول کر لیا۔

ہمارا المیہ ایکٹر تیموفیئف — سومسکوئی بھی ریہرسل کے لئے پہنچ گیا۔ وہ چھ فٹ لمبا آدمی تھا، چوڑے چکلے شانے، ادھیڑ عمر، سرخ گھنگھریالے بال، بھری ہوئی آنکھیں، چیچک‌زدہ چہرہ — عین مین قصاب بلکہ جلاد۔ اس کی آواز اس سے بھی بڑی تھی، اور وہ دھاڑنے کے انداز میں پارٹ ادا کرتا تھا۔

اور کسی زخمی و مجروح درندے
کی طرح المیہ کردار گرجا۔

اسے اپنا پارٹ بالکل یاد نہیں تھا — وہ نیرو کا رول ادا کر رہا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے کسی بوڑھے آدمی کی طرح موٹے شیشوں کی عینک لگا کر اپنی کتاب سے پڑھا کرتا تھا۔ اگر کبھی کوئی کہتا کہ اسے اپنا پارٹ ذرا یاد کرنا چاہئے تو وہ آہستہ سے بڑبڑاتا:

''مجھے پرواہ نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں پرومپٹر کی بات کا دھیان رکھوں گا۔ یہ کوئی پہلا موقع تو ہے نہیں۔ اور بہرحال

تماشائی تو ایک لفظ بھی نہیں سمجھتے۔ تماشائی بڑے احمق ہیں۔ ،،

وہ میرے نام سے بے طرح الجھ رہا تھا۔ وہ ٹیجیلینس کا نام ادا نہیں کر سکتا تھا ــ کبھی ٹیجیلینش کہتا کبھی ٹنیجیلس۔ جب کبھی کوئی اس کو صحیح کرتا تو وہ جھلا اٹھتا:

"میں اس کی پروا نہیں کرتا، بکواس۔ میں اس قسم کی بکواس پر اپنا دماغ کیوں تھکاؤں؟،،

اگر کبھی کوئی مشکل جملہ آ جاتا، یا آگے پیچھے دوسری زبانوں کے الفاظ آ جاتے تو وہ اپنی کتاب پر نشان بنا دیتا اور کہتا:

"یہ میں کاٹ رہا ہوں۔ ،،

بہرحال اور سب بھی یہی کرتے تھے۔ ڈرامے کی دھجیاں اڑ جاتیں۔ ٹیجیلینس کی طویل تقریر کم ہوتے ہوتے ایک جملے کی رہ گئی۔

نیرو نے پوچھا:

"ٹیجیلینس، شیروں کی کیا حالت ہے؟،،

اور میں اس کے سامنے دوزانو ہو کر جواب دیتا:

"ائے آسمانی قیصر! روم نے اس سے پہلے کبھی ایسے جانور نہیں دیکھے۔ وہ بھوکے ہیں اور غصے میں پاگل۔ ،،

اور بس۔

آخر ڈرامہ دکھانے کا دن آ گیا۔ کھلے ہوئے ہال میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ باڑ کے باہر

بے ٹکٹ تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ میں کچھ گھبرایا ہوا سا تھا۔

اف خدا، سب نے کس قدر قابل نفرت ایکٹنگ کی ہے! شاید وہ پہلے ہی تیموفیئف کے ہم‌خیال ہو چکے تھے۔ "مجھے کوئی پرواہ نہیں، تماشائی احمق ہیں۔" ان کے ہر ہر لفظ، ہر ہر اشارے نے مجھے کسی خوفناک حد تک دقیانوسی چیز کی یاد دلا دی، کوئی ایسی چیز جس سے لوگ صدیوں پہلے عاجز آ چکے ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ فن کے ان تمام پرستاروں کے خزانے میں تقریباً بیس ایک جملے ہیں جو انہیں زبانی یاد ہیں، تیس ایک گھسے پٹے اشارے ہیں جو ساموئےلینکو نے مجھے سکھانے کی ناکام کوشش کی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ لوگ اخلاقی طور پر کس قدر گرے ہوں‌گے کہ ان کی آنکھ کا پانی یوں مر گیا۔

تیموفیئف — سومسکوئی لاجواب تھا۔ وہ اپنے تخت کی دائیں طرف جھک جاتا۔ اس کی بائیں ٹانگ آدھے اسٹیج پر پھیل جاتی۔ اس کا احمقانہ تاج سر پر ترچھا رکھا رہتا۔ وہ نظریں گھما کر پرومپٹر کرنےوالے کی جگہ کی طرف دیکھتا اور ایسی آواز میں گرجتا کہ باڑ پاروالے لڑکے مست ہو کر چیخنے لگتے۔ ظاہر ہے اسے میرا نام یاد نا رہتا۔ وہ ترکی حمام میں بیٹھے ہوئے کسی سوداگر کی طرح مجھ

پر چیختا: ''تلیانتن! میرے شیر اور چیتوں کو ادھر لاؤ، لعنتی!،،

میں نے نہایت خاکساری سے اپنے جملے گول کر دئے اور اسٹیج سے نکل آیا۔ بےنظیر مارکوس—یعنی لارا—لارسکی—سب سے ھی بدتر تھا۔ وہ تو سب سے زیادہ بےشرم، سب سے زیادہ بےقابو، سب سے زیادہ گندہ اور سب سے زیادہ خوداعتماد تھا۔ اس کے یہاں جذبات کے بجائے خالی خولی چیخ پکار نظر آتی۔ محبت کے پھول، دل اکتا دینےوالی ٹافی بن جاتے۔ جس طرح وہ روم کے جنگجو امرا کے تحکمانہ جملے ادا کرتا اس سے صاف ظاھر ھو جاتا کہ کوئی روسی فوجی بول رھا ھے۔ لیکن اندروسووا لاجواب تھی۔ اس کی ھر بات میں دلکشی تھی—چہرہ جسے دیکھ کر جسم میں نئی سنسنی دوڑ جائے، نرم و نازک ھاتھ، لوچدار اور سریلی آواز، اس کے لمبے لمبے لہرئےدار بال جنھیں وہ آخری منظر میں کھول دیتی تھی۔ وہ اس قدر فطری انداز میں اور اس قدر خوبصورتی سے اپنا پارٹ ادا کرتی جس اطمینان اور خوبصورتی سے پرندے چہچہاتے ھیں۔

کینوس کے پس‌منظر کے ننھے ننھے سوراخوں سے میں نہایت خلوص سے اور بڑی لطیف اور فنکارانہ مسرت کے ساتھ اسے دیکھتا رھا۔ کبھی کبھی میری آنکھیں ڈبڈبا جاتیں۔ لیکن مجھے دور دور بھی یہ

خیال نہیں تھا کہ چند منٹ بعد اسٹیج کے باہر وہ مجھے یوں اس قدر متاثر کرے‌گی۔

میں نے اس ڈرامے میں اتنی شکلیں بدلیں کہ منتظمین بڑے مزے میں اشتہار میں لکھے ہوئے ناموں پیتروف، سیدوروف، گری گورئیف، ایوانوف اور واسیلیئف کے ساتھ الیکساندروف اور دمتریئف اور جوڑ سکتے تھے۔ پہلے ایکٹ میں پہلے تو میں ایک بوڑھے کے روپ میں آیا، جسم پر ڈھیلا ڈھالا سفید لبادہ اور اس سے جڑی ہوئی ٹوپی سر پر۔ پھر میں اسٹیج کے عقب میں بھاگا اور لبادہ اتار پھینکا۔ اب میں خود اور زرہ بکتر سے لیس کھلی پنڈلیوں‌والا لباس پہنے فوجی افسر کے کردار میں نمودار ہوا۔ پھر میں دوبارہ غائب ہو گیا اور اب کی دفعہ ایک عیسائی معمر کا روپ دھارکر وارد ہوا۔ دوسرے ایکٹ میں میں فوجی افسر اور غلام بنا، تیسرے ایکٹ میں دو اور غلاموں کا روپ دھارا، چوتھے ایکٹ میں مجھے فوجی افسر اور مزید دو غلاموں کا پارٹ کرنا پڑا۔ آخر میں میں ٹیجیلینس بنا اور آخری منظر میں ایک خاموش فوجی جو نہایت شاہانہ انداز سے اشارہ کرتا ہے کہ مرسیا اور مارکوس کو شیروں کا لقمہ بنانے کے لئے میدان کار زار میں لیجایا جائے۔

حد ہے کہ سیدھے سادے آکیمینکو تک نے میرے شانے پر ھاتھ مارکر خوش طبعی سے کہا:

"بخدا! تمہیں تو نئے نئے روپ دھارنے میں کمال حاصل ہے۔"

لیکن مجھے اس تعریف کی بہت قیمت ادا کرنی پڑی۔ مجھ سے تھکن کی وجہ سے کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔

ڈرامہ ختم ہو گیا۔ دربان نے لیمپ بجھانے شروع کر دئیے۔ میں اس انتظار میں اسٹیج پر ٹہل رہا تھا کہ آخری ایکٹر بھی اپنا سرخی پوڈر پونچھ چکے تو میں تھیٹر کے پرانے صوفے پر دراز ہو سکوں۔ میں سرائے میں تلی ہوئی کلیجی کے اس ٹکڑے تک پہنچنے کو بھی بےتاب تھا جو گودام اور بڑے ڈریسنگ روم کے درمیان میرے کونے میں لٹکا ہوا تھا۔ (جب سے چوہوں نے میرے گوشت پر حملہ کیا تھا، تب سے میں اپنا کھانا کسی تار میں لٹکانے لگا تھا۔) اچانک پیچھے سے آواز آئی:

"آداب عرض، واسیلیئف۔"

میں مڑا۔ اندروسووا مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھائے کھڑی تھی۔ اس کا دلکش چہرہ تھکا تھکا سا معلوم ہو رہا تھا۔

عجیب بات ہے کہ کمپنی بھر میں صرف وہ ہی ایسی تھی — دو معمولی ممبروں — دوخوسکوئی اور نیلیوبوف — اولگن کے علاوہ جس نے مجھ سے مصافحہ کرنے کو ہاتھ بڑھایا۔ اور سب دور دور رہے۔ مجھے آج تک اس کے ہاتھوں کا لمس یاد ہے —

بیباک، نرم و نازک اور مضبوط — عورت کا مضبوط هاتھ۔ صحیح معنوں میں عورت کا، هاں، دوست هی کا مصافحه ایسا هو سکتا هے۔

میں نے اس کا هاتھ تھام لیا۔ اس نے غور سے مجھے دیکھ کر کہا:

''تم کچھ بیمار تو نہیں هو؟ تمھاری طبیعت گری گری معلوم هو رهی هے۔،، اور اس نے آواز نیچی کرکے کہا: ''شاید تمھیں روپیے کی دقت هے؟ هیں؟ میں تمھیں کچھ قرضه دے سکتی هوں۔،،

''اوه، نہیں، نہیں، شکریه!،، میں نے سنجیدگی سے اسے روک دیا، اور اچانک اس مسرت کو یاد کرکے جو مجھے ابھی ابھی حاصل هوئی تھی میں انتہائی جوش میں کہتا چلا گیا: ''اف، آج رات آپ نے کمال کر دیا!،،

شاید میری تعریف میں بلا کا خلوص تھا۔ وه خوشی سے گلنار هو گئی اور نظریں جھکا کر آهسته سے هنس دی۔

''مجھے خوشی هے تمھیں پسند آیا۔،،

میں نے احترام کے ساتھ اس کے هاتھ کو بوسه دیا۔ ٹھیک اسی وقت نیچے سے کسی عورت کی آواز آئی: ''اندروسووا! کہاں هو تم؟ نیچے آؤ، یه لوگ تمھیں کھانے پر لیجانے کے منتظر هیں۔،،

''شب بخیر، واسیلیئف''، اس نے دوستانہ سادگی سے کہا۔ اور پھر جاتے جاتے سر ہلایا اور زیرلب کہا: ''اف، غریب، غریب انسان...''

اس وقت میں کسی طرف سے خود کو غریب محسوس نہیں کر رہا تھا۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اگر رخصت ہونے سے پہلے وہ اپنے لبوں سے میری پیشانی چھو دیتی تو میں خوشی سے مر جاتا۔

۱۰

بہت جلد میں پوری کمپنی میں گھل مل گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس طرح بےارادہ ایکٹر بن جانے سے پہلے بھی صوبائی اسٹیج کے بارے میں میری رائے کبھی بہت بلند نہیں تھی۔ لیکن اوستروفسکی نے میرے تصور میں بظاہر گنوار اور بےڈھنگے مگر دراصل نازک، لطیف اور دریادل نیشچاستلیوتسیوں اور مسخرے ارکاشکاؤں کو بسا دیا تھا جو اپنے مخصوص انداز میں فن اور بھائی چارگی کے بڑے دلدادہ تھے۔ اور اب میں نے دیکھا کہ اسٹیج بےشرم مرد اور عورتوں سے بھرا ہوا ہے۔

وہ سب بےرحم تھے، ایک دوسرے کے لئے انتہائی تکلیف دہ۔ وہ ایک دوسرے سے رشک کی آگ میں جلتے رہتے تھے۔ انھیں تخلیقی کام کے حسن اور اس کی قوت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی — کمینے

اور تنگ نظر ۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ سب انتہائی جاہل تھے اور انہیں کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔ سب بے حد دنیا دار اور اختلاجی قسم کے جھوٹے اور مکار تھے ۔ ان کے آنسو دھوکا تھے اور آھیں فریب ۔ ان کی طبیعت نفرت‌خیز حد تک پس‌ماندہ اور غلامانہ تھی اور وہ ھمیشہ اپنے سرپرستوں اور حکام کے آگے پیچھے دوڑنے کو تیار رھتے ۔ چیخوف نے ٹھیک ھی کہا تھا : ''صرف پولیس افسر ایکٹر سے زیادہ اختلاجی ھوتا ھے، ذرا دیکھنا زار کی سالگرہ کے موقع پر وہ دونوں شربت کی دوکان پر کھڑے ھوئے کس طرح تقریریں کر رھے ھیں، کس طرح آنسو بہا رھے ھیں ۔ ''

لیکن تھیٹر کی خصوصیات جوں کی توں قائم تھیں ۔ ایک صاحب تھے میتروفانوف — کوزلوفسکی ۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اسٹیج پر جانے سے پہلے اپنے اوپر صلیب کا نشان بناتے تھے ۔ یہ انداز بہت رائج ھو گیا اور ھمارے خاص خاص ایکٹروں میں سے ھر ایک یہ کرتا اور یہ دیکھنے کے لئے آنکھ مارتا کہ دوسروں نے دیکھا یا نہیں ۔ اور اگر کسی نے دیکھا تو ضرور وہ یہ سمجھے گا کہ یہ ایکٹر کس قدر وھمی، کس قدر انوکھا ھے ۔

فن کے ان بیوپاریوں میں سے ایک شخص نے، جس کی آواز بکرے کی سی تھی اور جس کے کولھے بہت بھاری تھے، ایک مرتبہ ایک درزی کو اور

ایک مرتبہ ایک حجام کو ٹھونک دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ یہ بھی رواج بن گیا۔ میں نے اکثر لارا۔لارسکی کو اسٹیج پر پھنپھناتے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں لال انگارہ ہوتیں اور منہ سے جھاگ نکلنے لگتا اور وہ گرجتا:

"درزی کو ادھر لاؤ! میں اس درزی کو جان سے مار دوں گا!"

اور پھر درزی کو تھپڑ مارنے کے بعد اور دل ہی دل میں جواباً تھپڑ کھانے کے خیال سے گھبرا کر وہ پیچھے کی طرف بازو پھینک کر کانپتے ہوئے دھاڑتا:

"مجھے روکو! مجھے روکو! کہیں میں واقعی قاتل نہ بن جاؤں!"

"قابل احترام فن" اور اسٹیج کے بارے میں کس قدر اونچی بات چیت کرتے تھے۔ اس سلسلے میں مجھے جون کا ایک روشن اور شاداب دن یاد آگیا۔ ہم نے ابھی ریہرسل شروع نہیں کی تھی۔ اسٹیج پر ہلکی سی تاریکی اور خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ زیادہ اہم ایکٹروں میں لارا۔لارسکی اور اس کی ایکٹرس بیوی میدویدیوا پہنچ چکے تھے۔ چند نوجوان خواتین اور اسکول کے لڑکے اگلی نشستوں پر براجمان تھے۔ لارا۔لارسکی، چہرے پر پریشانی پیدا کئے ہوئے اسٹیج پر ادھر سے ادھر گھوم رہا

تھا۔ شاید وہ ذہنی طور پر کسی نئے اور عمیق کردار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ تب اس کی بیوی نے اس سے کہا:

''ساشا، ذرا سیٹی میں وہ اداس نغمہ تو بجا کر سنا دو جو کل رات ہم نے «Pagliacci» میں سنا تھا۔ ''

وہ ٹھیرگیا۔ اس نے نہایت معنی‌خیز انداز میں اوپر سے نیچے تک اسے دیکھا اور اگلی نشستوں کی طرف آنکھ مارکر نہایت مخملیں اور سریلی آواز میں کہا:

''سیٹی بجاؤں؟ اسٹیج پر؟ ہا ہا۔ ہا!'' اس نے ایکٹروں کے انداز میں تلخ قہقہہ مارا۔ ''کیا واقعی سچ کہہ رہی ہو؟ کیا تم نہیں جانتیں، اسٹیج ایک مندر ہے، ایک ایسا مندر ہے جہاں ہم اپنے بہترین خیالات، اپنی عزیزترین خواہشات جمع کرتے ہیں۔ سیٹی کی بھی خوب رہی! ہا۔ ہا۔ ہا!''

بہرحال، مقامی فوجی، خون چوسنےوالے امراء اور زمیندار اکثر اس مندر میں — خواتین کے ڈریسنگ روم میں — اسی انداز سے گھسے چلے جاتے جس طرح کوٹھوں پر جاتے تھے۔ ہم اس سلسلے میں بالکل دقیانوسی نہیں تھے۔ انگور کے کنج میں اکثر روشنی جھلملاتی نظر آتی، عورت کی ہنسی کی گھنٹیاں سی بجتیں، کسی کی مہمیز جھنجھناتی اور شراب

کے گلاس کھنکنے لگتے۔ ایکٹر شوہر سنتری کی طرح اس امید میں تاریک روش پر ٹہلتا رہتا کہ شاید وہ بھی اندر بلا لیا جائے۔ کوئی ملازم کشتی اٹھائے ہوئے گزرتا اور اسے کہنی سے دھکا دیتا ہوا آگے بڑھ جاتا اور جاتے جاتے رکھائی سے کہتا جاتا:

''معاف کیجیئے گا، جناب۔''

اور اگر وہ اندر بلا لیا جاتا تو بہت دور کی لیتا، سرکہ اور بیر ملا ہوا وادکا پیتا اور یہودیوں کے متعلق گھٹیا لطیفے سناتا۔

لیکن پھر بھی وہ بڑے فخر اور جوش کے ساتھ فن کی بات کرتے۔ تیموفیئف—سوسکوئی نے کئی دفعہ ''اسٹیج سے نکلنے کے کلاسیکی انداز'' پر تقریر کی جو آج ہمارے یہاں نظر نہیں آتا۔

''کلاسیکی المیہ کا انداز ختم ہو چکا''، وہ اداسی سے کہتا۔ ''پرانے زمانے میں ایکٹر کس طرح جاتا تھا؟ اس طرح!''، وہ تن کر کھڑا ہو جاتا اور سیدھا ہاتھ اٹھاتا۔ اس کی انگلیاں بھنچی ہوئی ہوتیں البتہ شہادت کی انگلی کانٹے کی طرح نکلی ہوئی ہوتی۔ ''دیکھا تم نے؟''، وہ نہایت بڑے اور آہستہ قدموں سے دروازے کی طرف بڑھتا۔ ''اس کو کہا جاتا تھا اسٹیج سے نکلنے کا کلاسیکی انداز، اور اب ہم کیا کرتے ہیں؟ پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے اور گھر چل دئے۔ لیجیئے، صاحب، ہو گیا۔''

کبھی کبھی انہیں کوئی انوکھی بات سوجھتی۔ وہ اسٹیج پر اپنی طرف سے کوئی چبھتا ہوا فقرہ کہہ جاتے۔ مثلاً لارا - لارسکی نے ہمیں بتایا کہ وہ خلیستاکوف* کا پارٹ اس طرح ادا کرتا ہے:

"دیکھو، اس گورنروالے منظر کا میں یہ مطلب سمجھتا ہوں۔ گورنر کہتا ہے کہ ہوٹل کا کمرہ ذرا تاریک ہے اور میں اس سے کہتا ہوں: 'ہاں، شاید آپ کچھ پڑھنا چاہیں — مثلاً میکسم گورکی — لیکن آپ نہیں پڑھ سکتے! یہاں اس قدر تاریکی ہے، اس قدر تاریکی!، اور ہمیشہ تالیوں سے میرا سواگت ہوتا ہے!"

کبھی کبھی پرانے لوگوں کی باتیں سننے میں بہت لطف آتا، خاص طور پر جب وہ ذرا ہلکے سے نشے میں ہوتے، مثلاً تیموفیئف - سوسکوئی اور گنچاروف۔

"ہاں، بھائی، فیدوتوشکا۔ اب وہ ایکٹر کہاں جو کبھی ہوتے تھے۔ نہیں، اب ویسے نہیں!"

"ٹھیک کہتے ہو، پیتروشا، وہ ایکٹر آج نہیں ہیں۔ تمھیں چارسکی اور لیوسکی یاد ہیں؟ وہ تھے صحیح معنوں میں ایکٹر!"

---

* گوگول کے ڈرامے "انسپکٹر جنرل" کا سب سے اہم کردار۔ (ایڈیٹر)

"اب تو نقطۂ نظر ہی بدل گیا۔"
"تم ٹھیک کہتے ہو، پیٹرسبرگ والے — یہ مختلف لوگ ہیں۔ اب فن کی صداقت اور پاکیزگی کی کوئی عزت نہیں رہی۔ کیوں نہ ہو، پیتروشا، میں اور تم تو فن کے پادری تھے۔ لیکن یہ لوگ — آہ! ارے چھوڑو، چلو جام اٹھاؤ، پیکاٹوریس!"
"اور بھائی فیدوتوشکا، ایوانوف — کوزیلسکی یاد ہے؟"
"بند کرو یہ باتیں، پیتروگراد، میرا دل ٹوٹا جا رہا ہے۔ پیو بھی، اٹھاؤ جام۔ آج کے ایکٹر اور اگلے وقتوں کے ایکٹروں میں زمین آسمان کا فرق ہے!"
"واقعی، زمین آسمان کا فرق، بالکل ٹھیک کہا!"
"ہاں بھائی، زمین آسمان کا!"
ایک طرف اندروسووا تھی۔ اس قدر پاک اور نازک، اس قدر حسین اور قابل۔ وہ اس گندگی، اس حماقت اور چالاکی، اس ٹھٹھ بازی اور شیخی‌خوری، اس جہالت اور عیاشی کے درمیان رہ کر بھی صحیح معنوں میں فن کی خدمت کر رہی تھی۔ اور آج جب میں دنیا دیکھ چکا ہوں تو میں سمجھ سکتا ہوں کہ وہ اس گندگی سے اسی طرح بےخبر تھی جس طرح کسی پھول کا دلکش اور سفید کاسۂ گل اس سیاہ دلدل سے بےخبر ہوتا ہے جو اس کی جڑوں کو غذا دیتی ہے۔

هم ایکسپرس ریل کی رفتار سے ایک کے بعد دوسرا ڈرامہ پیش کرتے چلے گئے۔ چھوٹے چھوٹے ڈرامے اور طربیہ ڈرامے تو ایک ہی ریہرسل کے بعد پیش کر دئے جاتے۔ ''ایوان خوفناک کی موت،، اور ''نئی دنیا،، دو ریہرسلوں کے بعد منظر عام پر آگئے۔ بخارین کے ڈرامے ''اسمائیل،، کے لئے تین ریہرسلوں کی ضرورت پڑی کیونکہ اس میں مقامی فوج، ھوم گارڈ اور فائر بریگیڈ وغیرہ کے لئے چالیس سے زیادہ ایکسٹرا ایکٹروں کی ضرورت تھی۔

ایک احمقانہ اور مضحکہ انگیز واقعہ کی وجہ سے ''ایوان خوفناک کی موت،، کا پیش کیا جانا مجھے خاص طور پر یاد ھے۔ ایوان کا پارٹ تیموفیئف — سومسکوئی ادا کر رہا تھا۔ زربفت کے لمبے لمبے لبادوں اور کتے کی کھال کی لمبی سی ٹوپی میں ملبوس ھوکر وہ ایک متحرک پہاڑ معلوم ھو رہا تھا۔ خوفناک زار کو اور زیادہ خونخوار بنانے کی کوشش میں اس نے اپنا نچلا جبڑا باھر کو نکال رکھا تھا اور موٹے موٹے ھونٹ لٹکا رکھے تھے۔ وہ برابر آنکھیں گھما رہا تھا۔ اس قدر زور سے گرج رہا تھا کہ پہلے کبھی اس طرح نہ گرجا ھوگا۔

ظاھر ھے اسے پارٹ یاد نہیں تھا۔ وہ اپنا پارٹ اس قدر لچر شعروں میں ادا کر رہا تھا کہ

وہ ایکٹر بھی پریشان ہو گئے جو مدتوں سے اس نقطہ نظر کے قائل تھے کہ تماشائی احمق ہیں — وہ کچھ نہیں سمجھتے۔ لیکن اس منظر میں تو وہ اور بھی زیادہ نمایاں ہو گیا جہاں ایوان پشیمانی کے عالم میں جاگیرداروں کے سامنے دوزانو ہوکر گر پڑتا ہے اور اقرار جرم کرتا ہے: ''میرے دماغ کو پھپھوندی لگ گئی تھی!'' وغیرہ وغیرہ۔

آخر وہ اس جملے پر پہنچتا ہے ''خارش زدہ کتے کی طرح''۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کی نظریں پرومپٹر کی جگہ پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ گرجا ''خارش'' اور چپ ہوگیا۔

''خارش زدہ کتے کی طرح...'' بتانے والے نے سرگوشی کی۔

''پارش!'' تیموفیئف دھاڑا۔

''خارش زدہ کتے کی...''

''کارش!''

''خارش زدہ کتے کی طرح!''

آخرکار اس نے کسی نہ کسی طرح یہ منزل طے کر لی۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کی پریشانی یا پشیمانی کا نشان بھی نہ تھا۔ میں اس وقت تخت شاہی کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ اچانک مجھ پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ واقعی ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ جب آدمی سوچتا ہے کہ اسے ہنسنا نہیں چاہئے ٹھیک اسی وقت اس قدر بے پناہ اور گھٹیا ہنسی کا دورہ

پڑ جاتا ہے کہ مت پوچھئے۔ میں نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ تخت کی اونچی سی پشت چھپنے کے لئے بہترین رہے گی۔ وہاں میں دل بھر کے ہنس سکتا ہوں۔ میں مڑا اور اکڑ کر چلنے لگا۔ ہنسی کا طوفان روکنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں تخت کے پیچھے چلا گیا۔ وہاں مجھے دو ایکٹرسیں نظر پڑیں، ولکووا اور بوگوچارسکایا۔ وہ تخت کی پشت سے لپٹی ہوئی بے آواز ہنسی سے بدحال ہوئی جا رہی تھیں۔ اب میرے لئے ناقابل برداشت ہو گیا۔ میں اسٹیج سے بھاگ آیا اور ایک صوفے پر یعنی اپنے صوفے پر گرکر ہنسی کے مارے لوٹنے لگا۔ ساموئیلینکو نے جو ہمیشہ میرے خلاف ادھار کھائے بیٹھا رہتا تھا مجھ پر پانچ روبل جرمانہ کر دیا۔

بہرحال وہ دن واقعات سے پر تھا۔ میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ ہمارے یہاں ایک ایکٹر تھا — رومانوف۔ بہت حسین، لحیم‌شحیم نوجوان جو دوسرے درجے کے شاہانہ پارٹ کے لئے بہت موزوں تھا۔ بدقسمتی سے اس کی بینائی بہت کمزور تھی۔ اسے مخصوص عینک لگانی پڑتی تھی۔ اپنی عینک کے بغیر اسٹیج پر ہمیشہ وہ چیزوں سے ٹکراتا، ستون ہلاتا، گلدانوں اور آرام کرسیوں کو الٹ دیتا اور قالین میں پاؤں الجھا کر اوندھے منہ گر جاتا۔ وہ ایک عرصے سے اس وقت سے مشہور تھا جب اس نے کسی اور شہر میں کسی اور کمپنی کے ساتھ

''طلسماتی شہزادے،، میں کسی نوجوان نائٹ کا پارٹ ادا کیا تھا۔ وہ اپنے ٹین کے زرہ بکتر سمیت لڑھکتا ہوا فٹ‌لائٹ تک پہنچ گیا تھا۔ اس کے زرہ‌بکتر کسی دیوہیکل سماوار کی طرح بج رہے تھے۔ لیکن ''ایوان خوفناک کی موت،، میں تو وہ بالکل ہی آپے سے باہر ہو گیا۔ وہ شوئسکی کے گھر میں، جہاں سازشی جمع تھے، اس قدر زور و شور سے گھسا کہ اس نے وہ بنچ ہی الٹ دیا جس پر سازشی جاگیردار بیٹھے تھے۔

یہ بھی عجیب چیز تھی۔ یہ سب نوجوان کرائیتی یہودیوں سے بھرتی کئے گئے تھے جو مقامی تمباکو فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ میں ہی انہیں اسٹیج پر لے گیا تھا۔ میں قد کا چھوٹا ہوں لیکن ان میں سے سب سے لمبا بھی میرے شانے تک آتا تھا۔ اور پھر ان اونچی نسل کے جاگیرداروں میں سے نصف قفقازی لبادوں میں ملبوس تھے اور باقی کو مقامی پادری کے گروپ سے مانگی ہوئی کفتانوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ ان کے بچکانے چہروں پر داڑھیاں چپکا دی گئی تھیں۔ ان کی سیاہ آنکھیں چمک رہی تھیں اور خوشی کے مارے منہ کھلے ہوئے تھے۔ وہ نہایت شرمیلی اور احمقانہ حرکتیں کر رہے تھے۔ تماشائیوں نے ہمارے نہایت سنجیدہ داخلے کا بے‌تحاشہ ہنسی کے ساتھ سواگت کیا۔

هم تقریباً روز نئے ڈرامے پیش کرتے تھے۔ ہمارا تھیٹر خاصہ مقبول ہو رہا تھا۔ افسر اور زمین‌دار لوگ تو ہماری ایکٹرسوں کی وجہ سے آتے تھے۔ کروڑپتی خاری‌تونینکو کے لئے روزانہ ایک بکس ریزرو کیا جاتا تھا۔ وہ بہت کم آتا تھا۔ اس دوران میں صرف دو تین دفعہ آیا ہوگا۔ ہر دفعہ وہ ہمیں سو روبل بھجواتا۔ تھیٹر کا کام برا نہیں چل رہا تھا۔ معمولی ایکٹروں کو تنخواہ نہ ملنے کی وجہ یہ تھی کہ والیریانوف اس کوچوان کی طرح مکار تھا جو اپنے بھوکے گھوڑے کو اور تیز دوڑانے کے لئے اس کے سامنے گھاس کا ایک گٹھا لٹکا دیتا ہے۔

۱۲

مجھے یاد نہیں کس وجہ سے ایک دن ڈرامہ نہیں ہوا۔ شاید موسم خراب تھا۔ دس بجے شام سے ہی میں اپنے صوفے پر دراز ہو گیا اور تاریکی میں چوبی چھت پر بارش کی بوندوں کی ٹپاٹپی سننے لگا۔

اچانک اسٹیج کے عقب میں کچھ آہٹ ہوئی، قدموں کی آواز آئی اور پھر کرسیوں کے گرنے اور ٹوٹنے کا شور ہوا۔ میں نے موم بتی کا ذرا سا ٹکڑا جلایا اور یہ دیکھنے کو چلا کہ یہ سب کیا ہے۔ نیلیوبوف — اولگن صاحب تھے، شراب کے نشے

میں دھت، نہایت مظلومی و مجبوری کے عالم میں پردے اور دیوار کے درمیان گھسٹ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ ڈرا نہیں، بلکہ اس کے چہرے سے بڑی پرسکون حیرت کا اظہار ہونے لگا:

"یہاں کیا بھاڑ جھونک رہے ہو تم؟"

میں نے چند لفظوں میں اسے بتایا۔ تھوڑی دیر تک پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ اپنی ایڑیوں اور پنجوں کے بل جھومتا رہا۔ پھر اس کے قدم ڈگمگا گئے، لیکن چند قدم آگے بڑھا کر اس نے اپنے اوپر قابو پا لیا اور کہنے لگا:

"لیکن آ۔ آخر تم میرے ھا۔ ا۔ ان کیوں نہیں آجاتے؟"

"میں تو تمھیں اچھی طرح جانتا بھی نہیں۔"

"ھش چلو، چلو۔"

اس نے میرا بازو تھام لیا اور ہم اس کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس وقت سے اپنی ایکٹر کی زندگی کے آخری لمحے تک میں اس کے چھوٹے سے تاریک کمرے میں اس کے ساتھ رہا۔ یہ کمرہ اس نے کسی پنشن یافتہ اسپراونیک* سے کرایے پر لیا تھا۔ وہ شرابی اور فسادی بھی تھا اور پوری کمپنی کی پرفریب نفرت کا مرکز بھی۔ پھر بھی وہ بہت شریف، خاموش طبیعت، حساس آدمی اور

---

* ضلع پولیس افسر۔ (ایڈیٹر)

لاجواب ساتھی ثابت ہوا۔ لیکن کسی عورت نے اس کی روح میں کوئی ایسا زخم لگایا تھا، اس کے دل کو کچھ ایسا دکھ پہنچایا تھا جو لاعلاج تھا۔ میں اس کی ناکام محبت کی داستان کو کبھی پوری طرح نہیں سمجھ سکا۔ جب کبھی وہ نشے میں ہوتا تو اپنی پٹاری سے کسی عورت کی تصویر نکالتا، نہ بہت خوبصورت نہ بدصورت۔ ذرا ہلکی سی بھینگی۔ اس کی چھوٹی سی ناک باغیانہ انداز میں اوپر کو اٹھی ہوئی تھی — اس میں ذرا دھقانی جھلک تھی۔ کبھی وہ تصویر کو چومتا، کبھی اسے زمین پر پھینک دیتا، کبھی سینے سے لگاتا تو کبھی اس پر تھوک دیتا اور کبھی کونے میں لگی ہوئی مقدس تصویروں کے پاس سجا دیتا اور کچھ دیر بعد اس پر شمع کا موم ڈالنے لگتا۔ مجھے یہ بھی پتہ نہیں چلا کہ ان میں سے کس نے کس کو چھوڑا تھا اور وہ کس کے بچوں کا ذکر کیا کرتا تھا، اپنے، اس کے یا کسی اور کے۔

روپیہ نہ اس کے پاس تھا، نہ میرے پاس۔ اس نے مدتوں پہلے ''اسکو،، بھیجنے کے لئے والیریانوف سے کافی روپیہ قرض لیا تھا۔ اور اب اس کی حالت کسی اسیر غلام کی سی تھی۔ وہ اپنی صداقت کی وجہ سے ان بندھنوں کو نہیں توڑ سکتا تھا۔ کبھی کبھی وہ کسی مقامی سائن بورڈ رنگنے والے کی مدد کرکے چند کوپک کما لیتا۔ لیکن یہ کمائی ایک

راز تھی جسے اس نے کمپنی سے چھپا رکھا تھا۔ لارا — لارسکی فن کی اس قدر توہین برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

ہمارا مالک مکان بہت ہی اچھی طبیعت کا آدمی تھا۔ موٹا جسم، لال لال گال اور دوہری ٹھوڑی۔ ہر روز صبح شام جب اس کا خاندان دل بھر کے چائے پی چکتا تو وہ اپنا سماوار بھروا کر اور چائے دان میں استعمال کی ہوئی چائے کی پتی ڈلوا کر ہمیں بھجوا دیتا۔ ساتھ ہی ہمارے لئے کافی کالی روٹی بھی بھیج دیتا۔ اس طرح ہمارا پیٹ بھر جایا کرتا۔

دوپہر کو تھوڑی دیر سونے کے بعد پنشن یافتہ اسپراونیک ڈریسنگ گاؤن میں باہر نکل جاتا اور پائپ سلگا کر گھر کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتا۔ تھیٹر جانے سے پہلے تھوڑی دیر ہم اس کے پاس بیٹھتے۔ ہم ہمیشہ ایک ہی موضوع پر بات کیا کرتے — فوجی ملازمت کے دوران میں اس کی بدقسمتی، اس کے حکام کا ناموزوں رویہ، اور اس کے دشمنوں کی قابل نفرت سازشیں۔ وہ ہمیشہ ہم سے مشورہ لیا کرتا کہ بڑے اخباروں میں اس قسم کا خط کیسے لکھا جائے کہ اس کی معصومیت ثابت ہو جائے اور گورنر اور ڈپٹی گورنر کو ان کی جگہوں سے نکال باہر کیا جائے اور موجودہ اسپراونیک اور اس بدمعاش اہلکار کا پتہ بھی کٹ جائے جس نے دوسرے ضلع کا کام سنبھال رکھا ہے اور جو اس کی بدبختی

کا سب سے بڑا سبب ہے۔ ہم اپنی بساط بھر اسے اچھے سے اچھا مشورہ دیتے۔ مگر وہ صرف ایک سرد آہ بھرتا اور منہ بگاڑ کر سر ہلا دیتا۔

''نہیں، میں یہ نہیں چاہتا،، وہ سختی سے کہتا۔ ''نہیں، یہ نہیں۔ کاش مجھے کوئی صاحب قلم مل جاتا! کاش میں قلم کی قوت آزما سکتا! تو میں کسی قیمت پر بھی اطمینان سے نہ بیٹھتا۔،،

واقعی اس بدمعاش کے پاس روپیہ بہت تھا۔ ایک دن اتفاق سے میں اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ بھائی سود کی ادائیگی کے پروانوں کی گڈی بنا رہے ہیں۔ وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ وہ کھڑا ہو گیا اور کاغذات اس نے اپنی پشت اور ڈریسنگ گاؤن کے دامنوں کے پیچھے چھپا لئے۔ مجھے یقین ہے کہ ملازمت کے دوران میں وہ اپنی حدود سے آگے نکل گیا ہوگا اور رشوت، لوٹ کھسوٹ اور اسی قسم کی دوسری زیادتیوں پر اتر آیا ہوگا۔

ڈرامے کے بعد رات کو میں اور نیلیوبوف کبھی کبھی باغ میں ٹہلنے لگتے۔ سرسبز پودوں کے سائے میں چاروں طرف چھوٹی چھوٹی سفید میزیں دعوت دیتی رہتیں۔ شیشے کی چمنیوں میں شمعوں کی لویں بڑے سکون سے چمک رہی تھیں۔ مرد اور عورتیں مسکراتے اور نہایت نمایاں طریقے سے ایک دوسرے کی طرف جھک جاتے۔ ان کے انداز میں بلا کا عشوہ

ہوتا اور نہایت واضح معنی پنہاں ہوتے۔ عورتوں کے سبک قدموں کے نیچے ریت چرچرا اٹھتی...

''کاش ہمارے چنگل میں بھی کوئی احمق پھنس جاتا!،، کبھی کبھی نیلیوبوف بھاری سی آواز میں کہتا اور ترچھی نظروں سے مجھے دیکھنے لگتا۔

شروع شروع میں یہ بات مجھے بہت ناگوار گزری۔ مجھے ہمیشہ سے پبلک ایکٹروں کی یہ عادت ناپسند تھی کہ وہ نہایت لالچی مگر بظاہر رئیسانہ انداز میں فوراً دوسروں کے کھانوں میں شریک ہونے کو تیار ہو جاتے تھے۔ مجھے وہ کتوں والی دوستانہ اور نم‌نم سی بھوکی نگاہیں بہت بری لگتیں۔ میز پر بیٹھ‌کر انتہائی غیرفطری انداز اور بڑی بھاری سی آواز میں اونچی اونچی باتیں بنانا، کھانے پینے کے سلسلے میں اپنی واقفیت کا بےتحاشہ اظہار کرنا بہت کھلتا، مجھے ان کی وہ بےتاب نظریں اور ملازمین کے ساتھ تحکمانہ جان پہچان کا اظہار کرنا بہت برا معلوم ہوتا۔ لیکن بعد میں جب میں نے نیلیوبوف کو زیادہ قریب سے دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا۔ حالانکہ وہ انوکھا شخص سا تھا لیکن اپنے مخصوص انداز میں بہت ہی خوددار تھا اور بہت لئے دئے رہتا تھا۔

لیکن ایک دفعہ جب ایک ''بےوقوف،، خود ہم دونوں تک پہنچ گیا تو ایک بہت ہی مضحکہ‌خیز اور ایک حد تک شرمناک واقعہ ہو گیا۔ ہوا یہ کہ

ایک دن شام کو ڈرامے کے بعد سب سے آخر میں ہم لوگ ڈریسنگ روم سے نکلے۔ اچانک کوئی مسٹر الٹشیلر نہایت تیزی سے اسٹیج کے عقب کی طرف آئے۔ وہ ایک مقامی روتھشیلڈ تھا، نوجوان مگر موٹا بھدا اور لال لال گالوں والا، نہایت بے تکلف قسم کا عیاش طبیعت یہودی جو انگوٹھیوں، زنجیروں اور زیورات سے جگمگاتا رہتا۔ وہ تیزی سے ہماری طرف بڑھا:

"اف میرے خدا! میں آدھے گھنٹے سے ادھر سے ادھر بھاگ رہا ہوں — تھک کر چور ہو گیا۔ خدا کے لئے، بھائی، ذرا بتاؤ تو تم نے ولکووا اور بوگوچارسکایا کو تو نہیں دیکھا؟"

ہم نے دونوں ایکٹرسوں کو ڈرامہ ختم ہوتے ہی کسی سوار دستے کے چند افسروں کے ساتھ ہواخوری کو جاتے دیکھا تھا۔ اور ہم نے نہایت ادب سے الٹشیلر کو اس واقعہ کی اطلاع دے دی۔ وہ اپنے بال نوچنے اور اضطراب میں اسٹیج پر ادھر سے ادھر دوڑنے لگا۔

"کس قدر ذلیل بات ہے! میں کھانا منگوا چکا ہوں! واقعی میں یہ برداشت نہیں کر سکتا! انہوں نے مجھ سے حامی بھری تھی، مجھ سے وعدہ کیا تھا! اور اب دیکھو، انہوں نے یہ کیا حرکت کی؟"

ہم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

تھوڑی دیر وہ اسٹیج کے چکر کاٹتا رہا۔ پھر رک گیا، کچھ ہکلایا، کچھ سر کھجایا اور بڑے

غور و فکر کے عالم میں ہونٹ چبانے لگا۔ اچانک اس نے نہایت قطیعت کے ساتھ کہا:

"صاحبان، میں نہایت انکسار سے آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ کھانا میرے ساتھ کھائیے۔"

ہم نے انکار کر دیا۔

لیکن اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وہ جونک کی طرح چمٹ گیا۔ کبھی ایک کی طرف دوڑتا کبھی دوسرے کی طرف، ہمارے ہاتھ دباتا، بڑی محبت سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا اور نہایت جوش سے احتجاج کرتا کہ وہ فن کا پجاری ہے۔ نیلیوبوف ڈھیلا پڑ گیا۔

"مارو گولی! آؤ چلیں بھی۔ کیا ہرج ہے؟"

فن کا سرپرست ہمیں بڑے چبوترے پر لے گیا اور کچھ بھاگ دوڑ سی کرنے لگا۔ اس نے سب سے اچھا مقام چنا اور ہمیں بٹھا دیا۔ پھر بار بار ملازم کو بلانے کے لئے اچھلنے اور ہاتھ گھمانے لگا۔ اور شراب کا ایک جام چڑھانے کے بعد تو وہ نہایت عیاش شرابی کے روپ میں نظر آنے لگا۔ اس نے اپنے آپ کو اور زیادہ البیلا اور زیادہ زندہ‌دل بنانے کو اپنا ہیٹ موڑ لیا۔

"اچار؟ اسے روسی میں کس طرح کہتے ہیں؟ اچار کے بغیر کسی کھانے میں لطف نہیں آتا — ہے نا؟ تھوڑی سی وادکا کیوں نہ ہو جائے؟ کھائیے، خدا کے لئے یہ سب کھائیے۔ آپ بھنا گوشت کھانا پسند

کریں گے؟ گوشت پکانے کا طریقہ تو یہاں لاجواب ہے۔ اے ویٹر!،،

گوشت کے ایک بڑے سے بھنے ہوئے ٹکڑے کو کھا کر مجھے اس قدر نشہ آیا جیسے وہ شراب ہو۔ میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ برآمدہ اور اس کی روشنیاں، تمباکو کا نیلا نیلا سا دھواں اور باتوں کی آوازیں تیرتی ہوئی سی مجھ سے دور ہٹتی چلی جا رہی تھیں اور میں خواب کے سے عالم میں سن رہا تھا:

''اور کھائیے، صاحبان، تکلف نہ کیجئے۔ اف میں کیا کروں، مجھے فن سے اس قدر عشق ہے!،،

۱۳

کہانی کا عروج قریب آ رہا تھا۔ چائے اور کالی روٹی کی غیر تسلی بخش خوراک نے مجھے بہت چڑچڑا بنا دیا تھا۔ اکثر مجھے اپنے غصے پر قابو پانے کے لئے باغ کے کسی دوردراز کونے میں بھاگنا پڑتا تھا۔ میرے تمام کپڑے بکے ہوئے مدتیں گزر چکی تھیں۔

ساموئیلینکو برابر چٹکیاں لیتا رہتا تھا۔ آپ کو اندازہ ہے، کبھی کبھی کسی بورڈنگ اسکول کا استاد کسی کمزور سے طالب علم سے کس طرح نفرت کرنے لگتا ہے — اس کے زرد چہرے سے، اس کے بڑے بڑے کانوں سے اور کندھے جھٹکانے کی لغو

عادت سے — اور یہ نفرت برسوں قائم رہتی ہے۔ ساموئیلینکو کے بھی میری طرف کچھ ایسے ہی جذبات تھے۔ وہ اب تک مجھ پر سب ملا کر پندرہ روبل جرمانہ کر چکا تھا اور ریہرسل کے دوران میں وہ مجھ سے اگر زیادہ نہیں تو ایسا برتاؤ تو کرتا ہی تھا جیسے کسی جیل کا جیلر اپنے قیدیوں سے کرتا ہے۔ کبھی کبھی اس کی سخت تنقید سن کر میں نظریں جھکا لیتا اور میری نگاہوں کے سامنے آگ کے گولے ناچنے لگتے۔ والیریانوف تو اب مجھ سے بات ہی نہیں کرتا تھا۔ مڈبھیڑ ہوتے ہی وہ شترمرغ کی سی تیزی سے کھسک جاتا۔ میں چھ ہفتے سے ملازم تھا مگر اب تک مجھے صرف ایک روبل ملا تھا۔

ایک دن صبح کو اٹھا تو سر میں درد تھا، منہ کا مزہ خراب معلوم ہو رہا تھا اور دل میں بےپناہ غصے کے بادل امنڈ رہے تھے۔ میں اسی حالت میں ریہرسل کے لئے گیا۔

مجھے یاد نہیں کہ کونسا کھیل پیش کر رہے تھے۔ لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ میرے ہاتھ میں ایک تہہ شدہ موٹی سی کاپی تھی۔ حسب معمول مجھے اپنا پارٹ اچھی طرح یاد تھا۔ اتفاقاً اس میں یہ الفاظ آتے تھے ”میں اس کا مستحق ہوں۔“

ریہرسل کے دوران میں میرے یہ کہنے کا وقت آیا۔

”میں اس کا مستحق ہوں“، میں نے کہا۔

لیکن ساسوئے لینکو میری طرف لپک کر گرجا:
''تم اسے روسی کہتے ہو؟ کون بولتا ہے ایسی روسی؟ 'میں اس کا مستحق ہوں'، — خوب! اس کو اس طرح کہنا چاہئے: 'میں اس کے لئے مستحق ہوں!'، جاہل!''

میرا رنگ زرد پڑ گیا اور میں نے اپنی کتاب اس کی طرف بڑھائی:

''ذرا مہربانی کرکے میری عبارت پڑھئے'' میں نے کہا۔

لیکن وہ گرجا:

''میری جوتی کو بھی پروا نہیں ہے تمھاری عبارت کی۔ میں خود عبارت ہوں! اگر تم کام کرنا پسند نہیں کرتے تو جہنم میں جاؤ!''

میں نے تیزی سے اوپر دیکھا۔ وہ فوراً سمجھ گیا۔ اس کا رنگ میری طرح فق ہو گیا اور وہ تیزی سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن چڑیا ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ میں نے بھاری سی تہہ شدہ کاپی سے اس کے بائیں گال پر زوردار ہاتھ مارا۔ پھر دائیں گال پر، پھر بائیں گال پر اور پھر دوبارہ دائیں گال پر۔ میں اسے مارتا چلا گیا۔ اس نے احتجاج نہیں کیا۔ اس نے تو بچ کر بھاگ نکلنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ البتہ کسی ایسے مسخرے کی طرح جو بھونچکا کھڑا کا کھڑا رہ جائے وہ ہر مار پر سر کو دائیں یا بائیں ذرا سا جھٹکا دے دیتا۔ آخرکار میں نے کتاب

اس کے منہ پر دے ماری اور اسٹیج سے اتر کر باغ میں چلا گیا۔ کسی نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔

اور واہ! عجیب معجزہ ھوا! باغ میں مجھے سب سے پہلے ایک پیغامبر لڑکا نظر پڑا جو دریا والگا اور کاما کے ساحل کے مقامی بینک سے آیا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ لیونتووچ کون ھے اور پانچ سو روبل کا ایک پروانہ میرے ھاتھ میں تھما دیا۔

گھنٹے بھر بعد میں اور نیلیوبوف پھر باغ میں موجود تھے۔ ھم نے وھاں نہایت پرتکلف کھانے کا حکم دیا۔ دو گھنٹے بعد پوری کمپنی میرے ساتھ شمپین چڑھا رھی تھی اور مجھے مبارکباد دے رھی تھی۔ یہ افواہ میں نے نہیں نیلیوبوف نے اڑائی تھی کہ مجھے ساٹھ ھزار روبل کا ورثہ ملا ھے۔ میں نے اس کی مخالفت نہیں کی۔ اس کے بعد والیریانوف نے قسمیں کھائیں کہ کمپنی کا دیوالہ پٹا جا رھا ھے اور میں نے اسے سو روبل دے دئے۔

شام کو پانچ بجے میں ریل میں سوار ھو رھا تھا۔ میری جیب میں ماسکو کے ٹکٹ کے علاوہ ستر روبل سے زیادہ نہ ھونگے لیکن میں خود کو بادشاہ محسوس کر رھا تھا۔ دوسری گھنٹی کے بعد میں اپنی گاڑی میں سوار ھو رھا تھا کہ ساموئیلینکو میرے قریب آیا — وہ ابھی تک مجھ سے دور ھی دور رھا تھا۔

''میں غصے میں پاگل ہو گیا تھا — معاف کر دیجئے،، اس نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

میں نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ دبایا اور بڑی عاجزی سے جواب دیا:

''آپ بھی میری اس حرکت کو معاف کر دیجئے۔،،

سب نے میری رخصتی پر تالیاں بجائیں۔ میں نے پھر نیلیوبوف کو خلوص اور محبت کی نظر سے دیکھا۔ ریل چل پڑی اور ہر چیز ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور ہٹتی چلی گئی۔ جب زاریچئے کی نیلی نیلی جھونپڑیوں کی آخری قطار نظروں سے اوجھل ہونے لگی اور سنسان اسٹیپی کی بےرنگ زردی نظر کے سامنے پھیلنے لگی تو میرے دل پر ایک عجیب اداسی چھا گئی۔ یوں سمجھ لیجئے کہ جہاں میں نے پریشانیاں اور دکھ جھیلے، بھوک اور ذلت برداشت کی، وہیں میرے دل کا ایک ٹکڑا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہ گیا۔

۱۹۰۶ء

گمبرنس

۱

جنوبی روس کے ایک پرشور ساحلی شہر کا یہ شراب خانہ بڑی چلتی ہوئی شاہراہ پر واقع تھا، لیکن زمین دوز ہونے کی وجہ سے اس کا کھوج لگانا مشکل تھا۔ کبھی کبھی تو یہ مشہور مقام ایسے ایسے مستقل گاھکوں کی نظروں سے چوک جاتا جنھیں گمبرنس میں سب جانتے تھے۔ دو تین دوکانیں آگے بڑھ جانے کے بعد انھیں اندازہ ہوتا اور وہ پلٹ کے آتے۔

دروازہ پر کسی قسم کا سائن بورڈ نہ تھا۔ گاھک تنگ دروازے تک پہنچتے جو ہمیشہ ان کے لئے وا رھتا تھا۔ دروازے سے تنگ زینہ نیچے اترتا تھا جس میں بیس ایک پتھریلی سیڑھیاں تھیں جو لاکھوں کروڑوں جوتوں تلے رندرند کر تباہ‌حال اور شکستہ ہو گئی تھیں۔ آخری سیڑھی کے سامنے‌والی دیوار پر بیئر بنانے‌والوں کے مشہور سربی شاہ گمبرنس کی دس فٹ لمبی اور ابھری ہوئی رنگین تصویر جھلملا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ بھدی تصویر اسپنج کے

سخت ٹکڑوں سے کاٹ کر بنائی گئی ہو۔ تصویر کیا تھی نوسیکھئے کا پہلا کارنامہ تھی۔ لیکن تصویر کی سرخ صدری، سمور کے لبادے اور سنہری تاج کو دیکھ کر اور اوپر کو اٹھے ہوئے کاسۂ شراب سے چھلکتے ہوئے جھاگ کو دیکھنے کے بعد شبہہ کی کوئی گنجائش نہ رہتی — بیئر بنانے والوں کے اس عظیم سربی کی جیتی جاگتی تصویر نظر کے سامنے تھی۔

شراب خانے میں لمبے لمبے مگر نیچی اور محرابی چھتوں کے دو کمرے تھے۔ پتھر کی دیواروں سے مسلسل نمی رستی رہتی، نمی کے یہ قطرے گیس کی روشنی میں جھلملا اٹھتے۔ یوں بھی کمروں میں روشن دان یا کھڑکی کا نام و نشان نہ تھا چنانچہ دن رات گیس جلتی رہتی تھی۔ اب بھی کہیں کہیں سے دیوار کے مضحکہ خیز نقش و نگار جھانک رہے تھے۔ ایک تصویر میں جرمن نوجوانوں کا ایک گروہ دکھایا گیا تھا۔ شراب کے نشے میں دھت، کھیل کود کی ہری صدریوں میں ملبوس، اور ہیٹوں پر جنگلی مرغ کے پر سجے ہوئے۔ ان کی شکاری بندوقیں کندھوں پر لٹکی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ کمرے کی طرف منہ کئے کاسۂ شراب سنبھالے ہر آنے والے کا سواگت کرنے کو تیار کھڑے ہیں۔ ان میں سے دو نوجوان دو گول مٹول اور چنچل لڑکیوں کی کمر میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھے۔ وہ دونوں گاؤں کی سرائے میں ملازم ہوں گی یا کسی کھاتے پیتے کسان کی

چشم و چراغ - اگلی تصویر اٹھارھویں صدی کے پہلے نصف دور کے اونچے طبقے کی ایک پک‌نک کی یاد تازہ کرا رہی تھی - رنگ برنگے لباسوں میں ملبوس بیگمات اور مصنوعی بالوں‌والے وائی‌کاؤنٹ چراگاھوں میں میمنوں سے کلیلیں کر رہے ھیں - قریب ھی بید کے جھنڈ کے سائے تلے تالاب میں خوبصورت ڈونگیوں میں چند خواتین اور ان کے عاشق بیٹھے بڑی نزاکت‌ونفاست سے ھنسوں کو کھلا پلا رہے ھیں - اگلی تصویر میں یوکرین کی ایک جھونپڑی کی زندگی نظر آتی ھے - من‌چلے دیہاتی ھاتھوں میں گوریلکا شراب کی بوتلیں لئے دیوانہ وار ''ھوپاک،، ناچ رہے ھیں - ذرا اور آگے ایک بڑا سا پیپا نہائت ٹھسے سے رکھا ھے اور اس پر لال لال چہروں اور موٹے ھونٹوں‌والے دو انتہائی موٹے ''کیوپڈ،، براجمان ھیں - انگور کے خوشوں اور ھاپ کی پتیوں نے بڑھ کر انھیں بالکل ڈھک لیا ھے - وہ کلچے جیسے گول مٹول ھاتھوں میں جام تھامے ایک دوسرے کے جام سے ٹکرا رہے ھیں اور شرمناک حد تک تیلیا نظروں سے تک رہے ھیں - دوسرے کمرے کو ایک محراب نے پہلے کمرے سے جدا کر دیا ھے - یہاں مینڈک کی زندگی کے مختلف منظر پیش کئے گئے ھیں - ایک سرسبز دلدل میں مینڈک پیٹر اڑا رہے ھیں، جھاڑیوں میں مختلف کیڑوں مکوڑوں کا تعاقب کر رہے ھیں، چوک سنگیت کی تانیں اڑا رہے ھیں، پٹا کھیل رہے ھیں اور نجانے کیا کیا کر

رہے ہیں۔ یہ تصویر جیسے پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ مجھے جنم دینےوالا فنکار بدیسی ہے۔

میز کی جگہ فرش پر شاہ بلوط کے بھاری پیپے رکھے ہوئے ہیں اور فرش پر برادے کی موٹی سی تہہ چڑھی ہوئی ہے۔ چھوٹے چھوٹے پیپے کرسیوں کا فرض انجام دے رہے ہیں۔ دروازے سے دائیں طرف نیچے ڈائس پر پیانو رکھا ہے۔ کمزور اور نڈھال یہودی موسیقار ساشکا نہ جانے کتنے سال سے تماشائیوں کی تفریح طبع کے لئے یہاں وائیلن بجایا کرتا تھا۔ ساشکا کی عمر کا پتہ چلانا ناممکن تھا۔ ساشکا بالکل ٹٹ پونجیا نقال دکھائی دیتا تھا، وہ ہمیشہ شراب کے نشے میں دھت اور مسرور نظر آتا۔ سال پر سال گزرتے رہے، چرمی دستانوںوالے نئے نئے ویٹر آتے رہے جاتے رہے، بیئر فراہم کرنے اور بیچنےوالوں کا بھی یہی حشر ہوا یہاں تک کہ خود گھر کے مالک بدل گئے لیکن ساشکا روزانہ ٹھیک چھہ بجے شام کو ڈائس پر بیٹھا نظر آتا — ہاتھ میں وائیلن اور گود میں چھوٹا سا سفید کتا۔ رات کے ایک بجے وہ گمبرنس سے نکلتا تو ننھے کتے بیلچکا کی صحبت میں پی ہوئی بیئر کے نشے سے مدھوش ہوتا۔

ہاں، ایک ہستی اور تھی جو اٹل حقیقت کی طرح ہمیشہ گمبرنس میں موجود رہتی — یہ تھی شراب خانے کی ملازمہ مادام ایوانووا۔ موٹی تھل تھل بڑی بی کے جسم میں خون کا نام و نشان نہ تھا۔ سیلے

ہوئے تہہ‌خانے میں زندگی گزارتے گزارتے وہ سمندری غاروں میں رہنےوالی کاہل اور زرد رو مچھلی سی ہو گئی تھی۔ وہ شراب خانے کے کاؤنٹر سے ویٹروں کو احکامات دیتی رہتی اور مسلسل سگریٹ کا دھواں اڑاتی رہتی۔ ایسا لگتا جیسے کوئی جہازی کپتان اپنے پل پر متمکن ہو۔ اس کے ہونٹوں کے دائیں کونے میں ہمیشہ سگریٹ دبی رہتی، وہ دھوئیں سے بچنے کے لئے دائیں آنکھ چندھیا لیتی تھی۔ اس کی آواز سننے کی سعادت کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ کبھی لوگ جھک کر اسے سلام کرتے تو وہ ایک مخصوص مرجھائی ہوئی سی مسکراہٹ پیش کرتی اور بس۔

۲

یہ وسیع و عریض بندرگاہ، دنیا کی عظیم‌ترین بندرگاہوں میں سے ایک تھی۔ یہاں ہمیشہ جہازوں کی ریل پیل رہتی۔ زنگ‌خوردہ سیاہ اور بڑے بڑے جنگی جہاز ہمیشہ لنگر انداز رہتے تھے۔ مشرق بعید جانےوالے دوبروولنی لائن کے موٹی چمنیوں‌والے دخانی جہاز سامان لا لا کر ڈھیر کرتے اور روزانہ سامان کی گاڑیوں اور ہزاروں قیدیوں کو نگل لیتے۔ خزاں یا بہار کا موسم آتا تو دنیا کے کونے کونے سے آئے ہوئے سینکڑوں جھنڈے ہوا میں لہرانے لگتے، اور صبح سے رات گئے تک، دنیا کی ہر ممکن زبان میں احکام

اور گالیاں گونجتی رہتیں۔ گودی مزدور ساحل سے جہاز تک جانےوالے ڈانواںڈول تختوں سے ہوتے ہوئے ان گنت گودام گھروں اور جہازوں کے درمیان دوڑتے نظر آتے: ان میں سے کچھ روسی آوارہ گرد تھے ــ تارتار لباس، نیم برہنہ جسم اور شرابیوں جیسے سوجے سوجے چہرے۔ اور کچھ سیاہ فام ترک تھے جو گندے صافے اور ڈھیلی ڈھیلی پتلونیں پہنتے تھے۔ ان کی پتلونیں گھٹنے تک بہت ڈھیلی ہوتیں اور گھٹنے سے نیچے ایکدم بالکل تنگ ہو جاتیں۔ گودی مزدوروں میں چند ٹھوس اور گٹھیلے ایرانی بھی تھے۔ ان کے بال اور ناخنوں میں سرخ گاجر کی سی مہندی رچی ہوئی تھی۔ دو مستولوں اور تین مستولوںوالے اطالوی جہاز برابر آتے جاتے رہتے۔ اطالوی جہازوں کے قطار اندر قطار بادبان کنواریوں کے سینوں کی طرح گول، سفید اور شفاف تھے۔ دور سے دیکھنے میں یہ جہاز بڑے خوبصورت معلوم ہوتے۔ یہ خوبصورت جہاز روشنی کے مینار کے قریب پہنچتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے سفید وہم و خیال ہوں۔ ایسے میں وہ پانی پر نہیں بلکہ افق کے اس پار ہوا میں تیرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ بہار کی جھلملاتی ہوئی صبحیں ان کے حسن کو چار چاند لگا دیتی تھیں۔ اناطولیا کے اونچے اونچے کاچیرما اور تریپیزوند کی رنگی برنگی کشتیاں، کوڑے کرکٹ، انڈوں اور تربوز کے چھلکوں اور سفید بحری بگلوں کے جھنڈوں کے درمیان بندرگاہ کے

ہرے ہرے گندے پانی میں مہینوں ہچکولے لیتی رہتیں۔ ترپیزوند کی رنگارنگ کشتیوں پر نقش و نگار بنے ہوئے ہوتے۔ کبھی کبھی سیاہ بادبان‌والا ایک عجیب و غریب اور تنگ سا جہاز داخل ہوتا۔ اس میں جھنڈے کی جگہ ایک مٹیالا سا چیتھڑا لٹکا ہوا نظر آتا۔ جہاز پل کا چکر کاٹ کر اس سے رگڑ کھاتا ہوا اور ایک طرف کو جھکا جھکا سا تیزی سے بندرگاہ میں داخل ہوتا اور گالیوں کوسنوں اور شور و پکار کے درمیان بےڈھنگے سے پل کے قریب پہنچ جاتا۔ پستہ قد، نیم برہنہ اور دھوپ میں جھلسے ہوئے ملاح غیرمعمولی پھرتی سے پھٹے پرانے بادبانوں کو لپیٹتے، اور یہ میلا کچیلا پراسرار جہاز پل بھر میں لاش کی طرح خاموش اور بےحس نظر آنے لگتا۔ یہ ملاح ہمیشہ حلق سے نکلی ہوئی آواز میں بڑبڑاتے رہتے تھے۔ اور پھر کسی تاریک رات میں یہ جہاز روشنیاں جلائے بنا اسی قدر پراسرار طریقے سے بندرگاہ سے رخصت ہو جاتا۔ رات کے وقت بندرگاہ پر چنگی چوروں کی ہلکی پھلکی کشتیوں کی بہار رہتی۔ مچھیرے دور اور نزدیک سے اپنا اپنا گٹھا لے کر آتے: بہار میں ننھی منی ہیرنگ مچھلیوں کا انبار لگ جاتا، یہ ننھی منی مچھلیاں لاکھوں کروڑوں ایک کشتی میں سما جاتیں، گرمی آتی تو بدھیئت چپٹی چپٹی مچھلیاں آتیں، خزاں میں ماکریل، موٹی موٹی خاکستری ملیٹ اور کستورا

مچھلیوں کا زور رھتا، اور جاڑے میں سفید استرجن مچھلی راج کرتی — استرجن مچھلیوں میں سے ایک ایک کچھ نہیں تو تین سے چھہ سو پاؤنڈ تک کی ھوتی، اور اکثر ساحل سے میلوں دور جان پر کھیل کر پکڑی جاتی تھی۔

یہ دیس دیس کے جہازی، مچھیرے، بھٹی جھونکنے والے، جہازوں کے منچلے لڑکے، بندرگاہ کے چور، انجنیر، مزدور، گودی مزدور، ملاح، غوطہ خور اور چنگی چور جوان اور طاقت‌ور تھے، سمندر اور مچھلیوں کی بو ان کی نس نس میں رچی ھوئی تھی۔ ان کے لئے زندگی نام تھا محنت و مشقت کا، ان سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا تھا زندگی کی کٹھنائیوں کو۔ روز نت نئے خطروں سے دو چار ھونے اور ان خطروں کے بھیانک اور ساتھ ھی دلکش روپ دیکھنے سے ان جیالوں کو عشق تھا۔ طاقت، شجاعت اور زبان کے نشتر یہ تھے ان کے خدا۔ ساحل پر پہنچتے ھی وہ پاگلوں کے سے جوش اور وحشت سے شراب کباب کے مزے لوٹتے، مارپیٹ کرتے اور رشک و حسد کی آگ میں جلتے۔ رات کا دھندلکا پھیلتا تو ساحل سے پہاڑ کی طرف ابھرتے ھوئے اس وسیع و عریض شہر کی روشنیاں کسی ساحرہ کی چمکیلی آنکھوں کی طرح انھیں مسحور کر دیتیں۔ ان روشنیوں میں انھیں ھمیشہ کسی نئی چیز کا — دھکتی اور مہکتی ھوئی چیز کا وعدہ نظر آتا۔ کس قدر انجانی تھی یہ شے ان کے

لئے۔ یہ روشنیاں ہمیشہ یونہی انہیں دھوکہ دیتی رہتیں۔

تنگ اور ڈھلوان پیچ در پیچ گلی کوچے شہر کو بندرگاہ سے ملاتے تھے، شریف اور عزت‌دار شہری رات کے وقت گلیوں میں گھومنے کی جرأت نہ کرتے۔ قدم قدم پر بھٹیارخانے نظر آتے۔ ان کی جالی‌دار گندی کھڑکیاں بڑی تاریک رہتیں۔ بھٹیارخانے میں صرف ایک لالٹین کی اداس لو ٹمٹماتی رہتی تھی۔ بھٹیارخانوں سے زیادہ تعداد ان دوکانوں کی تھی جہاں جہازی بنیان سے لے کر قیمتی سوٹ تک ہر چیز بیچ سکتے اور سمندری پوشاک خرید سکتے تھے۔ اس کے علاوہ یہاں ان گنت شراب خانے، بیئر خانے اور چائے خانے بکھرے ہوئے تھے، ان سب پر بھانت بھانت کی زبان میں انتہائی چلتے ہوئے کتبے آویزاں تھے۔ یہاں ڈھکے چھپے چکلے بھی تھے اور دن دھاڑے لوٹنے‌والے کوٹھے بھی۔ رات کے وقت گھٹیا قسم کے غازے سرخی میں لسی ہوئی عورتیں کوٹھوں کے دروازوں سے بیٹھی بیٹھی سی آواز میں جہازیوں کو بلاتیں۔ یونانی قہوہ‌خانوں میں گاھک ڈومینو یا تاش کھیلتے رہتے۔ ترکی قہوہ‌خانوں میں تو پانچ کوپک میں رات بسر کرنے کا ٹھکانا بھی مل جاتا اور چلم اور ناریل پینے کا انتظام بھی ہو جاتا۔ مشرقی طرز کے چھوٹے چھوٹے شراب خانے بھی عام تھے جہاں طرح طرح کے گھونگے، جھینگا مچھلی، سیپ کے کیڑے،

موٹے مسوں والی کٹل مچھلی اور دوسری سمندری چیزیں کھانے کو مل جاتی تھیں ۔ دوچھتیوں اور تہہ‌خانوں میں، کھٹکے کنڈیاں چڑھا کر جوئے کا اڈا جمتا، کھیل شروع ہوتا، فارو یا بکارا کی بازی سے اور ختم ہوتا پیٹ کٹنے یا سر پھٹنے پر ۔ یہاں کونے کھدرے بیٹھ کر یا برابروالے کسی کمرے میں چھپ کر ہر قسم کے چوری کے مال کا بٹوارا کیا جا سکتا تھا، ہاں ہیروں کے کنگن سے لے کر چاندی کی صلیب تک اور لیانی مخمل کی گانٹھ سے لے کر جہازی اورکوٹ تک، ہر چیز کا ۔

کوئلے کی سیاہ گرد میں اٹی ہوئی ڈھلواں اور تنگ گلیوں میں شام ہوتے ہوتے گھٹن اور بدبو کی انتہا نہ رہتی، جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ کر انھیں ٹھنڈا پسینہ آ گیا ہو ۔ وہ ان موریوں، ان گندے نالوں کی طرح تھیں جو اس وسیع و عریض بین‌الاقوامی شہر کا تمام کوڑا کرکٹ، تمام گندگی، تمام آخور اور وہ تمام برائیاں سمندر میں اگل دیتی تھیں جو طاقتور گٹھیلے جسموں اور سیدھی سادھی روحوں کو گندہ کرتی تھیں ۔

اس علاقے کے بدمست باسی بہت کم کبھی اپنی پستیوں سے بلند ہوکر، سجے سجائے اور جگمگاتے ہوئے اس شہر میں جاتے ہوں گے جہاں ہر طرف آئینے اور شیشے جھلملا رہے تھے، جہاں عظیم الشان مجسمے سر بلند تھے، جہاں بجلی کی روشنیاں جگمگا رہی

تھیں، جس کی سڑکیں پختہ تھیں، جہاں روشوں کے ساتھ ساتھ سفید ببول کی قطاریں دوڑتی چلی گئی تھیں۔ یہ لوگ یہاں کے ٹھسے والے سپاھیوں سے بھی واقف نہ تھے۔ شہر کیا تھا صفائی اور آرام کا نمونہ تھا۔ لیکن ان میں سے ہر شخص خون پسینے سے کمائے ہوئے روبل کے میلے کچیلے اور گندے نوٹ پھونکنے سے پہلے گمبرنس ضرور پہنچ جاتا۔ گمبرنس شہر کے دل میں تھا۔ یہاں تک پہنچنے کے لئے تاریکی کی چادر کا سہارا لینا پڑتا تھا لیکن پھر بھی اس کی شہرت قدیم زمانے سے چلی آ رھی تھی۔

بہت سے گاھک تو مشہور و معروف بیئر بادشاہ کا نام تک نہیں جانتے تھے مگر اچانک کوئی نہ کوئی کہہ اٹھتا: ”چلو ساشکا کے ھاں چلا جائے؟“

اور کوئی دوسرا جواب دیتا: ”ھاں، یہی کرنا چاھئے!“

اور پھر سب ایک آواز میں کہہ اٹھتے: ”لنگر اٹھا دو!“

ظاھر ہے بندرگاہ اور سمندر کے باسیوں میں ساشکا کو مقامی پادری یا گورنر سے بھی زیادہ عزت اور شہرت حاصل تھی۔ بحر اسود کی خلیجوں اور بندرگاھوں کے جیالے مچھیروں کی بڑی تعداد اس کے نام کی مالا جپتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ سڈنی، پلے ماؤتھ، نیویارک، ولادی‌وستوک، قسطنطنیہ اور لنکا میں بھی

اس کا نام بھلے ھی نہ لیا جاتا ھو مگر بندروں جیسی پھڑکتی ہوئی صورت اور وائیلن کی بات ضرور چھڑتی تھی۔

۳

عام طور پر ساشکا گمبرنس پہنچتا تو وھاں اکادکا گاھکوں کے سوا اور کوئی نہ ھوتا۔ نیم‌تاریک کمروں میں گذشتہ رات کی بیئر کی کھٹی اور دبی دبی سی بو بسی ہوئی ھوتی۔ دن میں گیس ذرا کم ھی کم استعمال ھوتی تھی۔ جولائی کے تپتے ہوئے دنوں میں پتھروں کا یہ شہر سورج کی تپش سے مرجھا جاتا اور گلی کے شور سے کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی۔ ایسے میں یہاں، زیر زمین بڑا سکون، بڑی خنکی محسوس ھوتی۔

ساشکا کاؤنٹر تک جاتا، مادام ایوانووا کو سلام کرتا اور بیئر کا پہلا جام چڑھا جاتا۔ کبھی کبھی وہ اس سے درخواست کرتیں: ”ساشکا، کچھ بجاؤ، بجاؤگے نا؟“

”حکم دیجئے، مادام ایوانووا، کہئے، کونسی دھن چاھتی ھیں آپ؟“ ساشکا کی آواز میں بڑی مٹھاس ھوتی۔ وہ ھمیشہ اس سے بہت نرمی اور محبت سے پیش آتا تھا۔

”اپنا راگ سناؤ...“

وہ پیانو کے بائیں طرف اپنی مخصوص جگہ

بیٹھ جاتا اور عجیب، اداس اداس سے راگ چھیڑ دیتا۔ تہہ خانے پر بڑی خمار آلود خاموشی چھا جاتی۔ البتہ کبھی کبھی اوپر سے شہر کی گہما گہمی کی آوازیں آنے لگتیں یا پردے کے اس طرف باورچی‌خانے میں پلیٹوں اور گلاسوں کی دبی دبی سی کھنک پیدا ہو جاتی۔ مغنی کے دکھی دل کی تڑپ وائیلن کے تاروں کو آنسوؤں میں ڈبو دیتی۔ ازل سے دکھی یہودیوں کے قومی راگوں کے گرد جیسے اداسیوں کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ یہ غم و اندوہ اتنا پرانا تھا جتنی خود دنیا تھی۔ شام کے اس دھندلکے میں ساشکا کے چہرے پر، سخت ٹھوڑی اور نیچے کو جھکی ہوئی پیشانی پر اور بوجھل بھوؤں کی چھاؤں سے آسمان کو تکتی ہوئی کٹھور نگاہوں پر نظر پڑتی تو ایسا لگتا کہ اس چہرے اور اس چہرے میں کوئی بات بھی تو یکساں نہیں ہے جس سے گمبرنس کے تمام گاہک واقف تھے، جو نقلیں اتارتا تھا اور آنکھ مارتا تھا، جس پر ہر وقت ناچ کی سی کیفیت طاری رہتی تھی۔ اس کی ننھی سی کتیا بیلچکا اس کے زانو پر بیٹھی رہتی۔ وہ آج سے نہیں برسوں سے جانتی تھی کہ موسیقی کی تانیں سن کر سر میں سر نہ ملائے لیکن درد و غم میں ڈوبے ہوئے اور کراہتے اور تڑپتے ہوئے یہ سر ننھے سے دل کے تاروں کو چھوتے، کتیا کانپ اٹھتی اور منہ کھول کر جمائیاں لینے لگتی۔ اس کی ننھی سی گلابی زبان اندر مڑ جاتی اور لمحہ بھر کے لئے منا

سا جسم اور سیاہ آنکھوں والا نازک چہرہ بے تابی سے کانپنے لگتا۔

اور پھر لوگ آنے شروع ہوتے، ساشکا کا ساتھی پیانونواز دن بھر درزی یا گھڑی‌ساز کی دوکان پر دیدہ ریزی کرنے کے بعد پہنچ جاتا، شراب خانے کے کاؤنٹر پر پنیر کے سینڈوچ اور گرم پانی میں پڑے ہوئے سوسیج سجا دئے جاتے، اور آخر گیس کے تمام ہنڈے جگمگا اٹھتے۔ ساشکا ایک جام اور پیتا اور اپنے ساتھی سے کہتا ''... مئی کی پریڈ، ایک، دو، تین!،، اور مارچ کی کوئی زوردار دھن چھیڑ دیتا۔ اور پھر وہ ہر نئے گاھک کو سلام کرتے کرتے اور جھکتے جھکتے تھک جاتا۔ ان میں سے ہر ایک کا دعوی تھا کہ میں ساشکا کا سب سے چہیتا دوست ہوں، دوسرے گاھکوں نے ساشکا کو اس کے سامنے جھکتے دیکھا یا نہیں، یہ دیکھنے کے لئے وہ بڑے فخر سے چاروں طرف نظر ڈالتا۔ ساشکا کا نغمہ ابھرتا، وہ کبھی ایک آنکھ بند کرتا کبھی دوسری، اس کی گنجی اور ڈھلواں کھوپڑی پر سلوٹیں پڑ جاتیں، اس کے ہونٹ عجیب مضحکہ‌خیز انداز میں پھیلتے اور سکڑتے اور وہ چاروں طرف مسکراھٹیں بکھیرنے لگتا۔

دس گیارہ بجے تک گمبرنس میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہتی، یہاں ایک ایک وقت میں کم سے کم دو دو سو لوگ سما جاتے تھے۔ بہت سے گاھک عورتوں کے ساتھ آتے، عورتوں کے سروں پر رومال

ضرور بندھے ہوئے ہوتے۔ کمرے میں ہجوم ہو یا گھٹن، کسی کا پاؤں کچل جائے یا دھکا لگ جائے، ہیٹ مڑ تڑ کر خراب ہو جائے، یا پتلون پر بیئر چھلک جائے، کبھی کسی کی تیوری پر بل نہ آتا۔ اگر کبھی کوئی بگڑتا بھی تو محض اس لئے کہ نشے میں ہوتا، اور اس کی طبیعت ''ایک گونہ بےخودی'' کے لئے مچل جاتی۔ تہہ‌خانے کی نمی میں مدھم سی چمک پیدا ہو جاتی اور روغنی تصویروں سے ڈھکی ہوئی دیواروں سے نمی کی ننھی ننھی بوندیں اور زیادہ تیزی سے ٹپکنے لگتیں۔ مجمع کا سانس منجمد ہو جاتا اور چھت سے بارش کی گرم گرم بوندوں کی طرح ٹپکتا رھتا۔ گمبرنس میں دل بھر کے شراب نوشی ہوتی۔ یہاں کی پرانی ریت تھی کہ دو چار گاھک ساتھ بیٹھ جاتے، شراب کا دور چلتا اور ان کی میز خالی بوتلوں سے اس طرح پٹ جاتی کہ وہ شیشے کے اس ھرے جنگل کی اوٹ سے ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکتے۔ ایسے میں ان کے سر فخر سے بلند ہو جاتے۔ جیسے جیسے شراب نوشی اپنے شباب پر پہنچتی ویسے ویسے گاھکوں کے چہرے سرخ، بھدے اور نم ہوتے چلے جاتے۔ تمباکو کا دھواں آنکھوں میں بھر جاتا، اس شور قیامت اور اس ھنگامے میں کسی کو کسی سے کچھ کہنا ہوتا تو اسے میز پر جھک کر پوری طاقت سے چیخنا پڑتا۔ لیکن ڈائس پر بیٹھے ہوئے ساشکا کا وائیلن کبھی نہ تھکتا۔ اس کی تھرتھراھٹ،

تمباکو کے دھوئیں، گیس، گھٹن، بیئر اور بدمست مجمع کی چیخوں پر تیرتی رھتی۔

ذرا سی دیر میں بیئر کی زیادتی، عورت کا قرب اور گرمی کی شدت ھر ایک گاھک کو مست کر دیتی۔ ھر ایک ترنگ میں آکر اپنا محبوب نغمہ سننے کو تڑپ اٹھتا۔ دو تین آدمی مستقل ساشکا کے گرد منڈلاتے نظر آتے۔ ان کی آنکھیں بڑی بے جان اور حرکتیں بڑی عجیب ھوتیں، وہ کبھی ساشکا کی آستین پکڑ کر کھینچتے کبھی اس کا راستہ روک لیتے۔

''ساشکا، کوئی او۔ و۔ داس۔ س سا راگ، خدا کے لئے — ھک — میری خاطر، ساشکا!''

''ابھی لو، پل بھر میں'' ساشکا سر ھلا ھلا کر کہتا۔ اور چاندی کا ایک سکہ اسی خاموشی اور آھستگی سے ساشکا کی جیب میں پہنچ جاتا جس پھرتی سے ڈاکٹر کی فیس اس کے بٹوے میں پہنچتی ھے۔

''بس ابھی لو۔''

''ساشکا، کتنی ذلالت ھے یہ۔ میں نے پیسہ دیا ھے تمھیں۔ بیسویں مرتبہ کہہ رھا ھوں، بجاؤ: 'سمندر کی لہریں مجھے لے گئیں اودیسہ کی جانب'!''

''بس ابھی لو۔''

''ساشکا 'بلبل' سناؤ!''

''ساشکا، ساشکا، یار، سناؤ 'ماروسیا'!''

'' 'زیتس، زیتس، ساشکا 'زیتس' سناؤ 'زیتس'!''

''بس ابھی لو۔''

''چر - و - ا - ا - ھا!،، کمرے کے دوسرے کونے سے کوئی چنگھاڑتا اور ایسا معلوم ھوتا جیسے بیل ڈکار رھا ھو۔

ھر طرف ھنسی قہقہوں کا طوفان بلند ھوتا اور اس میں ساشکا مرغے کی طرح بانگ دیتا: ''بس ابھی - ی - ی لو!،،

رک کر دم لئے بغیر وہ سب راگ بجاتا چلا جاتا جن کا اسے حکم ملا تھا۔ شاید اسے ھر گیت زبانی یاد تھا۔ ھر طرف سے اس کی جیب میں چاندی کے سکے گرتے رھتے اور ھر ھر میز سے بیئر کے جام آتے رھتے۔ وہ کاؤنٹر تک جانے کے لئے ڈائس سے نیچے قدم دھرتا تو لوگ باگ اس کی بوٹیاں نوچ لیتے۔

''ساشکا، میرے دوست! بس ایک جام۔،،

''ساشکا، آپ کا جام صحت۔ لعنت ھو تم پر، ھم بلا رھے ھیں اور آپ ھیں کہ آتے ھی نہیں؟،،

''سا - ا - شکا، آؤ تھوڑی سی - ی بیئر ھو جائے!،، بیل ڈکارا۔

عورتیں عورتیں سب ایک سی ھوتی ھیں، سو یہ سب بھی خوب بن ٹھن کر اور نازو انداز دکھا دکھا کر راگ منڈلی کے ایک ایک مرد کو رجھانے کی کوشش کرتیں، ان کے آگے پیچھے پھرتیں، فیں‌قیں کرتی ھوئی آوازوں میں ساشکا کو بلاتیں اور بڑے ٹھسے سے ضد کر کرکے اسے بلاتیں: ''ساشکا، میری جان، ایک جام تو پینا ھی ھوگا میرے ھاتھ سے،

خدا کے لئے انکار نہ کرنا اور ہاں، دیکھو، ذرا وہ راگ بجا دو، میری جان، 'کوئیل کوک، سناجا، پیاری۔''

ساشکا مسکراتا، منہ بناتا اور دائیں بائیں جھک جھک کر ہاں ہاں کہتا جاتا۔ وہ دل پر ہاتھ رکھ کر اشارے سے عورتوں کو پیار کرتا، ہر ہر میز پر بیئر پیتا اور پیانو پر واپس چلا جاتا، یہاں بھی ایک جام اس کا منتظر نظر آتا۔ اور وہ ''جدائی'' یا اسی قسم کا کوئی راگ چھیڑ دیتا۔ کبھی کبھی وہ بدمست مجمع کو خوش کرنے کے لئے وائیلن کو اس طرح دھونکتا کہ فضا میں کبھی کتے کے پلے کی پیں پیں گونجتی اور کبھی سور کے بچے کی غرغراھٹ۔ کبھی کبھی موقع کی مناسبت سے بڑی کرخت اور بھاری سی بھنبھناھٹ گونج اٹھتی۔ سامعین بڑے جوش و خروش سے داد دیتے: ''ھو۔ و۔ ھو۔ و۔ ھو۔ و۔ ھو۔ و!''

گرمی بڑھ گئی۔ امس اور گھٹن کی وجہ سے چھت بھی پسیج گئی۔ بعض گاھک سینہ کوٹ کوٹ کر رو رہے تھے، بعض آنکھیں لال کئے عورتوں کے کارن یا دقیانوس زمانے کے پرانے جھگڑوں کی وجہ سے دست و گریبان ہو رہے تھے اور بعض بعض ایک دوسرے پر چڑھ بیٹھے تھے۔ ادھر ادھر کے دوسرے شرابی جن پر ابھی اتنی نہیں چڑھی تھی انھیں روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان میں بڑی تعداد مفت‌خوروں کی تھی۔ تعجب ھے کہ ویٹر بیئر کے

جام سر سے اوپر اٹھائے، بڑے مزے میں ان چھوٹے بڑے پیپوں، ٹانگوں اور دھڑوں کے بیچ سے گزر رہے تھے، معجزہ تھا معجزہ۔ مادام ایوانووا پہلے سے بھی زیادہ زرد، بےحس، خاموش اور اداس نظر آ رہی تھی، وہ کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی کچھ اس انداز سے ویٹروں کو حکم احکام دے رہی تھی جیسے طوفان میں گھری ہوئی کشتی کی ناخدا ہوں۔

ہر شخص گانے کو بےقرار تھا۔ ساشکا تو یوں بھی بہت نرم‌دل تھا، اب بیئر کی گرمی سے اور اس وحشیانہ خوشی کو دیکھ کر جو اس کے راگ سے دوسروں کو حاصل ہو رہی تھی، اس کا دل بالکل ھی پسیج گیا تھا۔ وہ ہر نغمہ بجانے کو تیار تھا۔ لوگ باگ بڑی بھدی، گھٹی گھٹی اور بےجان آوازوں میں اس کے وائیلن کے سروں کےساتھ چیخ رہے تھے۔ ان کے ذہن بالکل خالی تھے، مگر چہرے بہت گمبھیر۔ وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے باربار ایک ھی سر دوھراتے رہے:

یہ جدائی، یہ صدمہ، مگر کیوں،
وصل کیوں، آگ کیوں، کسک کیوں،
آؤ ھم تم اب ایک ھو جائیں
عشق و عنایت کی دنیا میں کھو جائیں

قریب ھی بدمستوں کا دوسرا گروہ پہلے گروہ کی آواز دبانے کے جوش میں گلا پھاڑ پھاڑ کر کوئی

اور گیت گا رہا تھا۔ دونوں میں ضرور کچھ چلی ہوئی تھی۔

گمبرنس میں ایشیائے کوچک سے آئے ہوئے یونانیوں کا بہت زور رہتا، وہ مچھلی پکڑنے روسی بندرگاہوں پر آ جاتے تھے۔ آتے ہی ساشکا سے اپنے کسی قومی گانے کی فرمائش کرتے — گیت کیا بس اداس اور بےرنگ سا نوحہ سمجھ لو جس میں دوچار سر سے زیادہ نہ ہوتے، مگر وہ گھنٹوں انہیں کو گنگناتے رہتے تھے۔ ان کے چہروں پر سنجیدگی چھا جاتی اور آنکھوں سے شرارے نکلنے لگتے۔ ساشکا اطالوی لوک، گیتوں، یوکرینی دومکا، یہودی عروسی ناچ گیتوں اور بہت سی دوسری چیزوں کی دھنیں بجا لیتا تھا۔ ایک دن حبشی جہازیوں کا ایک گروہ آ نکلا۔ ہر شخص گا بجا رہا تھا چنانچہ ان کے دل بھی بےقرار ہو گئے۔ ساشکا نے پل بھر میں حبشیوں کے پھڑکتے ہوئے گیتوں کی روح کو پالیا، وہ اسی دھن پر پیانو بجانے لگا۔ اور پھر فضا افریقی گیتوں کی بھرپور اور زوردار دھنوں سے بھر گئی۔ گمبرنس کے باسیوں کی خوشی کا کیا ٹھکانہ۔

کسی مقامی اخبار کا رپورٹر ساشکا کا جاننے والا تھا، ایک مرتبہ اس نے سنگیت اسکول کے ایک پروفیسر سے کہا کہ ساشکا کا مشہور و معروف وائلن سننے کے لئے گمبرنس ضرور جائے۔ ساشکا بات تاڑ گیا، اس نے جان بوجھ کر وائلن سے میاؤں میاؤں اور

ڈھیچوں ڈھیچوں کی ایسی ایسی آوازیں نکالیں کہ گاھک مارے ھنسی کے دوھرے ھو گئے۔ پروفیسر نے بڑی حقارت سے کہا: ''بھانڈ،، اور بیئر کا جام ختم کئے بغیر وھاں سے نکل گیا۔

❚

دیواروں پر متمکن شاندار نواب، بدمست جرمن شکاری، گول مٹول کیوپڈ اور مینڈک اس بدمستی اور بدچلنی کا نظارہ کرتے جس کی مثال گمبرنس کے علاوہ اور کہیں نظر نہیں آتی۔

کبھی کبھی چوروں کا کوئی گروہ، لمبا ھاتھ مارنے کے بعد لڑکھڑاتا ھوا کچھ پینے پلانے کے لئے پہنچ جاتا۔ ان میں سے ھر ایک کے ساتھ ایک داشتہ ھوتی، سروں پر ترچھی ٹوپیاں اور پاؤں میں مخصوص چمڑے کے اونچے اونچے جوتے۔ چہروں سے کہنہ مشق رندوں کے آداب و اطوار نمایاں اور نگاھوں سے بے پرواھی چھلکتی ھوئی۔ ساشکا ان کے لئے ڈاکوؤں کے مخصوص راگ چھیڑ دیتا: ''سیاں بھئے کوتوال،،، ''آنسو نہ بہا، آنسو نہ بہا، اے ماروسیا،،، ''گزر گئے دن بہار کے،، اور ایسے ھی دوسرے گیت۔ چوروں کا یہ گروہ ناچنے کو کسر شان سمجھتا لیکن ان کی محبوبائیں ھو ھو کے نعرے لگاتیں اور ایڑیاں بجا بجا کر ''چرواھا،، ناچ ناچتیں،

وہ سب کی سب بڑی چنچل اور کم عمر تھیں - جانو، برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن! مرد عورتیں دونوں خوب خوب پیتے تھے - مگر مصیبت یہ تھی کہ ان ڈاکوؤں کی بہادری کا ہر کارنامہ روپے کے جھگڑے پر ختم ہوتا، وہ سب بل ادا کئے بغیر ہی کھسک جاتے -

مچھلیاں خوب ہاتھ لگتیں تو مچھیروں کے بڑے بڑے گروہ بھی پہنچ جاتے - وہ پچیس تیس آدمیوں پر مشتمل ہوتے - جاتی خزاں میں تو کبھی کبھی پورا ہفتہ بڑا شاندار گزرتا، روزانہ پینتیس چالیس ہزار بھوری مولیٹ اور میکریل ہاتھ لگ جاتیں - اس زمانے میں چھوٹے سے چھوٹا حصے دار بھی کچھ نہیں تو دو سو روبل بنا ہی لیتا - پر جاڑے میں بیلوگا کی بڑی سی کھیپ ہاتھ لگنے سے تو مچھیروں کے وارے نیارے ہو جاتے - مگر یہ کام تھا بہت جان جوکھوں کا - مچھیروں کو رات کے وقت ساحل سے بیس پچیس میل دور جان ہتیلی پر لے کر موت اور زندگی کا کھیل کھیلنا پڑتا تھا - کبھی کبھی تو موسم بڑا طوفانی ہو جاتا، لہریں کشتی کے اوپر سے بہتی ہوئی گزرتیں، اور پل بھر میں کپڑوں اور چپوؤں پر پانی جم جاتا - موسم کا یہی رنگ رہتا اور مچھیروں کو دو دو تین تین دن سمندر میں رہنا پڑتا - وہ ساحل سے دور ہوتے چلے جاتے - کبھی کبھی تو وہ دو دو سو میل دور اناپا یا تریبیزوند پہنچ جاتے - ہر سال جاڑے میں کچھ نہیں تو درجن بھر دومستولی

کشتیاں گم ہو جاتیں، اور بہار ہوتے ہوتے ان جیالے مچھیروں کی لاشیں کسی اجنبی ساحل تک پہنچ جاتیں۔

مچھیرے بہت سی مچھلیاں پکڑ کر سمندر سے لوٹتے تو رنگ رلیاں منانے اور مستی میں جیون بتانے کی گھٹیا تڑپ ان کے روح ودل پر چھا جاتی۔ نیچ حرکتیں ہوتیں، پینا پلانا اور عیاشی ہوتی اور شور ایسا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے، دو تین دن کے اندر اندر ہزاروں روبل پھنک جاتے۔ مچھیرے جوق در جوق شراب خانے جاتے، رنگ‌رلیوں کا اور کوئی ٹھکانہ ڈھونڈتے۔ وہ اور سب گاھکوں کو نکال دیتے، دروازے بند کرکے چٹخنیاں چڑھا لیتے اور چوبیس گھنٹے ان تھک پیتے، عشق بازی کرتے، گلا پھاڑ تھاڑ کر گیت گاتے، شیشے اور قابیں توڑتے، عورتوں کو مارتے اور اکثر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو جاتے، اور پھر نیند کا غلبہ ہوتا، اور مدھوش مچھیرے کوڑا کرکٹ کے ڈھیر سگریٹ کے ٹکڑوں، ٹوٹے ہوئے شیشوں، چھلکی ہوئی شراب اور خون کے دھبوں کے درمیان میز یا زمین پر یا کسی بستر پر آڑے ترچھے پڑکر سو جاتے۔ کئی کئی دن یہ ہنگامہ چلتا رہتا، کبھی کبھی ان کی محفل کسی دوسری جگہ منتقل ہو جاتی۔ وہ اپنا آخری دھیلا تک شراب کباب کی نذر کرنے کے بعد خاموش اور اداس اداس سے کشتیوں پر واپس چلے جاتے --- سردرد سے پھٹتے ہوئے چہروں

پر خراشیں اور زخم اور بدن سے نوشی کے بعد کمزور اور نڈھال۔ انھیں کپکپی سی چھٹنے لگتی اور وہ دوبارہ اپنے محبوب اور منحوس کام کی آغوش میں پہنچ جاتے۔ کتنا کٹھن مگر کتنا دلکش تھا یہ کام۔

وہ کبھی گمبرنس کو نہ بھولتے۔ لڑ جھگڑ کر زبردستی اندر گھس آتے، آوازیں بیٹھی ہوئی، چہروں پر شمال مشرقی ہواؤں کے سرد تھپیڑوں کے نشان اور لمبے چوڑے جسموں پر واٹرپروف کی صدریاں، چمڑے کی پتلونیں اور رانوں تک لمبے جوتے۔ بالکل وہی تھے یہ جوتے جیسے جوتوں میں ان کے ساتھی طوفانی رات کی تاریکی میں سمندر کی تہہ میں پہنچ گئے تھے۔

ان کے دل میں ساشکا کی بڑی عزت تھی، اس وجہ سے وہ اجنبیوں کو باھر نہ نکالتے، یوں وہ من‌مانی کرتے، حکم چلاتے اور بڑے بڑے ڈونگوں کو زمین پر دے مارتے۔ ساشکا ان کی خاطر مچھیروں کے گیت بجاتا، ان سیدھے سادھے اداس گیتوں میں بیکراں سمندر کی وسعتیں مچلتیں اور اتھاہ ساگر کی گرج اور تڑپ انگڑائیاں لیتی ہوئی محسوس ہوتی۔ وہ سب آواز میں آواز ملانے لگتے اور ان کے طاقتور سینے اور حلق تھک کر نڈھال ھو جاتے۔ ان کے حلق ھوا کے تھپیڑے کھا کھا کر فولاد بن چکے تھے۔ لہریں ارفیئس کی طرح ساشکا کے اشاروں پر ناچتی تھیں۔ کبھی کبھی مچھیروں کی کسی ناؤ کا چالیس سالہ ناخدا سنگ‌دل اور طوفان دیدہ ملاح باریک آواز میں کسی

گیت کے دردناک بول گاتا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا:

دکھیارا بیچارا چھوکرا ہوں میں
دکھوں کا مارا مچھیرا ہوں میں

اور کبھی کبھی وہ ناچنے لگتے۔ ان کے چہرے پتھر کی طرح سخت ہو جاتے اور وہ ایک ھی نقطے پر اپنے خوفناک جوتے پٹکتے رھتے۔ ان کے جسم اور ان کے کپڑے گھر بھر میں مچھلیوں کی تیز نمکین خوشبو پھیلا دیتے۔ وہ ساشکا کے لئے پانی کی طرح روپیہ بہانے کو تیار رھتے، اسے گھنٹوں اپنی میز سے نہ ھٹنے دیتے۔ ساشکا جانتا تھا کہ ان کی زندگی کتنی سخت، کتنی ناکام ھے۔ ان کی خاطر کوئی راگ بجاتے ھوئے اس کے روح و دل پر بڑی گھری اداسی چھا جاتی۔

اور تجارتی جہازوں کے برطانوی جہازیوں کے لئے ساز چھیڑنا تو اسے بہت ھی پسند تھا۔ ان کا جتھا ھاتھ میں ھاتھ ڈالے ساتھ ساتھ اندر آتا۔ وہ سب بڑے مہذب اور نوجوان تھے ــ کشادہ سینے، چوڑے چکلے شانے، موتی سے دانت، گلاب کی پتی جیسے رخسار اور بڑی دلیر، بے باک اور ھنستی ھوئی نیلی آنکھیں۔ ان کے پٹھے ایسا معلوم ھوتا تھا کہ قمیص پھاڑ کر نکل پڑیں گے، اور ان کی تنی ھوئی طاقتور گردنیں پتلے کالروں سے جھانکتی نظر آتیں۔ ان میں سے چند

ایک ساشکا کو جانتے تھے، یہ وہ لوگ تھے جو پہلے بھی اس بندرگاہ پر آچکے تھے۔ وہ اسے پہچان لیتے اور بڑے دوستانہ طریقے سے مسکرا کر روسی سلام کرتے: ”ازدرائست!“ اور ان کے دانت چمکنے لگتے۔

ساشکا حکم کا انتظار بھی نہ کرتا، فوراً ”رول برطانیہ“ بجانے لگتا۔ وہ اس وقت ایک ایسے ملک میں تھے جسے غلامی نے تباہ کر دیا تھا، شاید اسی وجہ سے برطانوی آزادی کا یہ گیت گاتے ہوئے ان کے سر فخر سے بلند ہوجاتے اور چہروں سے سنجیدگی ٹپکنے لگتی۔ آخری شعر گاتے ہوئے وہ ٹوپیاں اتار لیتے اور کھڑے ہوکر یہ بلند خیال پیش کرتے:

برطانوی کبھی کبھی کبھی
غلام نہیں ہوں گے!

وہ ایسا کرتے، تو ان کے بدمست سے بدمست ہمسائے تک بے اختیار ٹوپیاں اتار لیتے۔

گٹھیلے بدن کا ایک بڑا ملاح جس کی داڑھی حلق سے نکلتی چلی گئی تھی اور جس کے کان میں بالی جھول رہی تھی، بیئر کے دو جام اٹھائے ہوئے ساشکا کے پاس آتا اور مسکرا کر بڑی فراخدلی سے دوستانہ انداز میں اس کی کمر تھپکتا اور اس سے جیگا ناچ کی دھن بجانے کی درخواست کرتا۔ بدمست جہازیوں کے ناچ کی دھن بجتی اور اس کے پہلے ھی سر پر انگریز اپنی جگہوں سے اچھل پڑتے، چھوٹے بڑے پیپے

دیوار کے قریب کھسکا کر جگہ بنا لیتے۔ وہ دلکش مسکراہٹیں بکھیرتے اور اشارے کرکے دوسرے گاھکوں سے بھی اٹھنے کو کہتے۔ اگر کوئی سستی کرتا تو وہ لپک کر زور کی لات جماتے اور اس کے نیچے بچھے ہوئے چھوٹے چھوٹے پیپوں کو الٹ دیتے۔ لیکن اس کی نوبت ھی نہ آتی۔ گمبرنس کا ھر ھر رسیا ناچ کا شوقین تھا، اور انگریزی جیگا تو سب کی محبوب دھن تھی۔ یہاں تک کہ ساشکا بھی تار چھیڑتے چھیڑتے اپنی کرسی پر کھڑا ھو جاتا تا کہ اچھی طرح دیکھ سکے۔

جہازی گھیرا بنا لیتے اور تیز سروں کے ساتھ تالی بجاتے جاتے اور ناچتے جاتے۔ دو جہازی بیچ میں آ جاتے۔ اس ناچ میں سمندر پر جہازی کی زندگی کا نقشہ کھینچا گیا تھا۔ جہاز کوچ کرنے کو تیار ھے، موسم بہت خوشگوار ھے، ھر چیز کیل کانٹے سے درست ھے۔ رقاصوں نے اپنے اپنے بازو سینے پر باندھ لئے ھیں، ان کے سر پیچھے کو جھکے ھوئے ھیں اور جسم بے حس و حرکت ھیں لیکن پاؤں پوری شدت سے زمین پر پڑ رھے ھیں۔ اور پھر ھوا چلنے لگتی ھے اور جہاز آھستہ آھستہ ھچکولے کھانے لگتا ھے۔ جہازی اور بھی مست ھو جاتے ھیں اور رقاصوں کے جسم کی ایک ایک جنبش اور زیادہ پیچیدہ اور زیادہ مبہم ھوتی چلی جاتی ھے۔ اور پھر ھوا کا ایک نیا جھونکا آتا ھے — عرشے پر گھومنا مشکل ھو جاتا ھے — اور

31*

رقاصوں کے پاؤں ڈگمگانے لگتے ھیں۔ اور آخر تیز و تند ھوائیں چلنے لگتی ھیں — جہازی ادھر سے ادھر دھکے کھا رہے ھیں، حالات بد سے بدتر ھونے لگتے ھیں۔ ''سارے جہازی جمع ھو جائیں، بادبان باندھ دو!،، رقاصوں کے ھاتھ پاؤں کی تڑپتی ھوئی جیتی جاگتی جنبشوں سے صاف پتہ چلتا ھے کہ وہ مستولوں پر چڑھ رہے ھیں۔ بادبان کی حفاظت کی خاطر انھیں لپیٹ رہے ھیں، اور ھوائیں جہاز کو اور زیادہ شدت سے ھچکولے دے رھی ھیں۔ ''ٹھیرو — کشتی والو!،، لائف بوٹ اتاری جاتی ھے، ان کے سر جھکے ھوئے ھیں اور ان کی طاقتور ننگی گردنیں تنی ھوئی۔ رقاص آگے پیچھے جھوم جھوم کر آھستہ آھستہ کشتی کھے رہے ھیں۔ لیکن تند ھوائیں رک جاتی ھیں، آھستہ آھستہ لہریں ٹھنڈی پڑنے لگتی ھیں، آسمان صاف ھو جاتا ھے، اور جہاز پھر ھوا کو کاٹتا ھوا بڑھنے لگتا ھے۔ اور رقاص پھر قرنا کی تڑپتی ھوئی تال پر پاؤں مارنے لگتے ھیں۔ ان کے جسم پھر ساکت ھیں اور بازو سینے پر بندھے ھوئے۔

کبھی کبھار جورجیائی آبکاروں کی خاطر ساشکا کو لیزگینکا کی دھن بجانا پڑتی، یہ لوگ شہر کے قریب ھی رہتے تھے۔ دنیا میں ناچ کی ایسی کوئی دھن نہ تھی جو ساشکا کو نہ آتی ھو۔ ناچنے والا، بھیڑ کی کھال کی ٹوپی اور چرکیشیائی کوٹ زیب تن کئے پیچھے کو سر ڈھلکائے کبھی ایک کبھی دوسرا

ہاتھ سر کے پیچھے پھینکتا جاتا اور سبک روی سے پیپوں کے درمیان گھومتا جاتا۔ اس کے دوست تال کے ساتھ ساتھ تالیاں بجاتے اور چیخ چیخ کر اس کا دل بڑھاتے جاتے، ایسے میں ساشکا سے نہ رہا جاتا اور وہ بھی جھوم کر ان کے ساتھ چیخ اٹھتا: ’’خاص! خاص! خاص! خاص!،، کبھی کبھی وہ ملداویائی ژوک، اطالوی ترنتیل اور جرمن جہازیوں کا والز بھی بجاتا تھا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ گمبرنس میں دنگافساد ہو جاتا۔ بعض بعض لڑائیاں تو خاصی خوفناک صورت اختیار کرلیتیں۔ پرانے گاھکوں کو ایک مشہورو معروف جھگڑے کے واقعات سنانے کا بہت شوق تھا۔ یہ لڑائی روسی بحری فوج کے جہازیوں اور برطانوی جہازیوں کے درمیان ہوئی تھی۔ ان میں خوب خوب مکا بازی ہوئی، اور پنجوں اور بیئر کے ڈونگوں سے حریفوں پر حملے ہوئے۔ یہی نہیں بلکہ ایک دوسرے پر چھوٹے پیپے بھی برسائے گئے۔ مگر یہ ماننا پڑے گا کہ جھگڑے کا آغاز کرنے اور چاقوؤں کا استعمال کرنے میں پہل روسیوں نے کی، روسی جہازی تعداد میں انگریزوں سے تین گنے تھے لیکن آدھہ گھنٹے گھمسان کا رن پڑا تب کہیں انگریزوں کو شراب خانے سے نکالنے میں کامیابی ہوئی۔

اکثر ایسا ہوتا کہ خون خرابے کی نوبت آ جاتی مگر ساشکا بیچ بچاؤ کراتا اور بات آئی گئی ہو جاتی۔

وہ لڑنے والے گروہ کے پاس جاتا، مذاق کرتا، مسکراتا اور منہ بناتا اور فوراً چاروں طرف سے اسے جام پیش ہونے لگتے۔

''ساشکا، ایک جام ہو جائے! ساشکا، لعنت ہو تم پر، آؤ میرے ساتھ پیو!،،

یہ شاید اس کی ڈھلواں کھوپڑی کے سائے تلے چھپی ہوئی آنکھوں کی تھکی تھکی سی نرسی تھی، شاید ان آنکھوں کی انوکھی دیکھت تھی جو ان سیدھے سادھے لوگوں کے وحشیانہ جذبات کو ٹھنڈا کر دیتی تھی۔ یا کون جانے اس کی صلاحیتوں کے لئے احترام کا اور شکریے کا جذبہ کام کر جاتا ہو۔ اور پھر یہ بھی تھا کہ گمبرنس کے زیادہ تر باسی ہمیشہ اس کے قرضدار رہتے تھے۔ ان کٹھن دنوں میں جب ھاتھ بالکل خالی ہوتا (یعنی سمندر اور بندرگاہ کی زبان میں ''دیکوخت،، کے وقت میں) لوگ باگ بلا جھجک ساشکا سے چھوٹا موٹا قرضہ مانگتے یا اس سے شراب خانے کا بل ادا کرواتے۔ ساشکا کبھی کسی کو انکار نہ کرتا۔

ظاھر ھے اسے کبھی بھی پیسہ واپس نہ ملتا، ایسی بات نہیں ھے کہ لوگ اسے دکھ دینا چاھتے تھے۔ بس بھول ہو جاتی تھی۔ بدمستی اور شراب نوشی کے کسی لمحے میں وھی قرضدار اس کے گیتوں کے انعام میں اسے اس سے دس گنی رقم ادا کر دیتے۔

کبھی کبھی بار کی ملازمہ تنبیہ کرتی:

”حد ہے، تمھیں اپنے پیسے کی ذرا پرواہ نہیں۔ “

اور وہ بڑے یقین سے کہتا: ”مگر مادام ایوانووا جی، میں قبر میں تو ساتھ لیجانے سے رہا، جی! میرے اور بیلچکا کے لئے خدا کا دیا بہت ہے۔ ادھر آ، بیلچکا، ادھر آ، ننھی کتیا!“

۵

گمبرنس میں ہر دور کے چنیدہ چنیدہ گیتوں کا چرچا رہتا تھا۔

بوئیر جنگ کے زمانے میں سب سے زیادہ مقبول گیت تھا ”بوئیر مارچ“ (شاید روسی اور برطانوی جہازیوں کا مشہور و معروف جھگڑا اسی زمانے میں ہوا تھا)۔ ساشکا کو ہر شام جیالے سپاہیوں کے اس گیت کی دھن کوئی پندرہ بیس دفعہ تو بجانی ھی پڑتی۔ ساز خاموش ھوتا توھوا میں ٹوپیاں اچھلنے لگتیں، اور ھال تالیوں سے گونج اٹھتا۔ اگر کوئی شامت کا مارا زیادہ دلچسپی نہ لیتا تو بڑی غیردوستانہ نظریں اس کا تعاقب کرتیں۔ گمبرنس میں عام طور پر اسے بڑا برا شگون مانا جاتا تھا۔

اور پھر فرانکو — روسی اتحاد ھوا اور ملک میں رنگ‌رلیاں منائی جانے لگیں۔ ظاھر ہے گورنر مارسیلز بجانے کی اجازت دے دیتا، اس کی فرمائش بھی روز ھی ھوتی تھی مگر اس حد تک نہیں جس

حد تک ''بوئیر مارچ،، کی۔ تالیوں کا شور بھی نسبتاً کم ہوتا اور ٹوپیاں تو بالکل ہی نہ اچھلتیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اول تو دلی اور گہرے جذبات کے لئے کوئی جواز تھا نہیں، دوسرے گمبرنس والے اس اتحاد کی سیاسی اہمیت کو پوری طرح سمجھے بھی نہ تھے۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ بس مٹھی بھر لوگ تھے جو روزانہ مارسیلز مارسیلز چلاتے اور اس پر تالیاں بجاتے تھے۔

ایک دفعہ کچھ دن کے لئے کیک چال کا رواج عام ہوا۔ اور ایک دن تو یہاں تک نوبت پہنچی کہ جب کیک‌چال کے سر گونجے تو شراب کے نشے میں چور اجنبی سوداگر ریکون کا کوٹ، لمبے لمبے گولوش اور سمور کی ٹوپی اتارے بنا پیپوں کے درمیان ناچنے لگا۔ لیکن یہ حبشی ناچ جلد ہی بھلا دیا گیا۔

جاپانی جنگ نے گمبرنس والوں کے دلوں کی دھڑکن بھی تیز کر دی۔ پیپوں پر اخبار نظر آنے لگے۔ ہر شام جنگ کے موضوع پر بات‌چیت چھڑ جاتی۔ انتہائی سادہ دل اور امن پسند لوگ سیاست‌داں اور مدبر بن بیٹھے لیکن ان کی روح میں جھانکنے سے اندازہ ہوتا کہ اگر انھیں اپنی فکر نہیں ہوتی تھی تب وہ اپنے بھائی بندوں اور یاردوستوں کی فکر کرتے تھے۔ برسوں کی رفاقت نے انھیں محبت کے جن بندھنوں میں جکڑ رکھا تھا، کٹھنائیوں کے اس دور

نے انھیں اٹوٹ بنا دیا۔ ان لوگوں نے مدتوں ساتھ کام کیا تھا، ساتھ خطروں سے گزرے تھے اور روزانہ موت سے ٹکر لی تھی۔

شروع شروع میں تو ہر ایک کو یقین تھا کہ فتح روس کی ہوگی۔ ساشکا کو کہیں سے ''کروپاتکن مارچ،، ہاتھ لگ گیا۔ بیس شامیں بیتیں اور وہ مسلسل کامیابی سے اس گیت کی دھنیں بجاتا رہا۔ لیکن ایک شام ایک گیت نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس مارچ کو شکست دے دی۔ اور یہ تھا بالاکلاوا کے مچھیروں — ''نمکین یونانیوں،، یا ''پیندوسوں،، کا گیت:

وہ مجھے تیرے پاس سے لے گئے، اے پیاری ماں
اور مجھے بہت دور بھیج دیا —
کل تک جو نہالچوں میں کھیلا
آج گولی بارود سے کھیل رہا ہے۔

اس دن سے گمبرنس والے اور کوئی گیت سننے کو تیار ہی نہ ہوتے۔ پوری پوری شام اسی گیت کی درخواست ہوتی رہتی: ''ساشکا، وہ اداس سا نغمہ! بالاکلاوا والوں کا نغمہ! ارے بھائی، وہی سپاہی کا گیت!،،

وہ گاتے جاتے، روتے جاتے اور معمول سے دوگنی شراب پی لیتے، اور وہی کیا ان دنوں پورے روس میں شراب نوشی کا یہی عالم تھا۔ ہر شام کوئی نہ کوئی

•••

خدا حافظ کہنے آتا، جوان مرغے کی طرح اکڑتا ہوا آتا، ٹوپی زمین پر پھینک دیتا اور تنہا تمام جاپانیوں کو کچا چبا ڈالنے کی دھمکی دیتا۔ بات ختم ہوتے ہوتے آنکھیں بھر آتیں اور لبوں پر یہ دردانگیز گیت مچلنے لگتا۔

ایک دن ساشکا معمول سے پہلے آ گیا۔ بار کی ملازمہ نے اس کے لئے بیئر کا پہلا جام بھرا اور حسب معمول بولی: ''اپنی کوئی چیز سناؤ، ساشکا، اپنی...''

اس نے ہاتھ میں جام تھام لیا اور اچانک اس کے ہونٹ تھرتھرائے:

''آپ جانتی ہیں، مادام ایوانووا؟'' اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مجھے بھی بھرتی کر رہے ہیں، جنگ کی آگ میں جھونکنے کے لئے!''

مادام ایوانووا نے ہوا میں ہاتھ نچاتے ہوئے کہا:

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو، ساشا! ائے کہیں دل لگی تو نہیں کر رہے۔''

''نہیں، دل لگی نہیں۔'' ساشکا نے عاجزی اور اداسی سے سر ہلایا۔ ''سچ کہہ رہا ہوں۔''

''مگر ساشکا، تمہاری تو عمر نکل گئی؟ آئے کیا عمر ہے تمہاری؟''

عجیب بات ہے آج تک کبھی کسی نے اس طرف دھیان ہی نہ دیا تھا۔ ہر شخص کو جیسے یقین تھا کہ ساشکا کی عمر وہی ہوگی جو اس شراب خانے کی دیواروں کی ہے، جو ان فرضی نوابوں، یوکرینیوں اور

مینڈکوں کی ہے، جو خود شاہ گمبرنس کی ہے جس کی روغنی تصویر دروازے پر پہرہ دے رہی ہے۔
"چھیالیس،، ساشکا نے سوچتے ہوئے کہا۔
"کون جانے انچاس کا ہوں۔ میں یتیم ہوں،، اس نے اداسی سے کہا۔
"تو پھر تم جا کے حکام سے کہتے کیوں نہیں یہ سب کچھ؟،،
"گیا تو تھا، مادام ایوانووا۔ سب کچھ کہہ سن کر دیکھ لیا!،،
"پھر ؟،،
"پھر کیا، جواب میں بہت کچھ سننا پڑا 'گندے چوہے، اگر اب کے سڑی ہوئی تھوتھنی ہلائی، ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو تجھے برف خانے میں ڈال دیں گے۔' کھڑے کھڑے نکال باہر کیا۔،،
گمبرنس میں اسی شام یہ خبر پھیل گئی۔ یار لوگوں نے ساشکا کی ہمدردی میں ان گنت بیئر کی بوتلیں اس کے سامنے ڈھیر کر دیں، وہ نشے میں بالکل دھت ہو گیا۔ وہ خوش نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا، کبھی منہ چڑاتا کبھی آنکھ مارتا۔ لیکن اس کی نرم اور مزاحیہ آنکھیں اداس اور خوفزدہ نظر آرہی تھیں۔ اچانک بائیلر بنانے والے ایک سانولے مزدور نے ساشکا کے بجائے جنگ پر جانے کے لئے اپنی خدمات پیش کیں، ہر شخص جانتا تھا کہ یہ پیش کش بالکل احمقانہ ہے، لیکن پھر بھی ساشکا کے دل پر اسکا بڑا

اثر ہوا، اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں ۔ اس نے مزدور کو لپٹا لیا، کھڑے کھڑے اپنا وائیلن اس کی نذر کر دیا اور بیلچکا بار کی ملازمہ کو دے دی ۔

”مادام ایوانووا، میرے اس ننھے کتے کی دیکھ بھال کرنا ۔ کون جانے میں واپس نہ آسکوں ۔ اسے دیکھ دیکھ کر میری یاد تازہ ہو جایا کرےگی! بیلچکا، میری ننھی سی کتیا! دیکھو تو کس طرح گال چاٹ رہی ہے، اف میری غریب کتیا! مادام ایوانووا، ایک درخواست اور ہے میری ۔ پروپرائیٹر پر میرا کچھ روپیہ آتا ہے ، اس سے وصول کر لینا۔ اور میں تمھیں کچھ پتے دیتا ہوں، ان پر روانہ کر دینا، ایک چچازاد بھائی گومل میں ہے — بہت سے بال بچوں والا آدمی ہے بچارا ۔ اور پھر میرے بھانجے کی بیوہ ہے، وہ ژمیرینکا میں رہتی ہے ۔ میں انھیں ہر ماہ روپیہ بھیجتا تھا ۔ یہی تو بات ہے ہم یہودیوں میں... اپنے پیاروں سے بہت محبت کرتے ہیں ہم لوگ ۔ میں تو یتیم ہوں، نہ بال بچے نہ کوئی اپنا نہ پرایا ۔ خداحافظ، مادام ایوانووا ۔ “

”خدا حافظ، ساشکا! آؤ جدا ہوتے ہوئے تو ایک دوسرے کو رخصتی پیار کر لیں، کتنے برسوں ساتھ رہا، اور — دیکھو برا نہ ماننا — میں تمھارے اوپر صلیب کا نشان بناؤں گی تاکہ تمھاری قسمت یاوری کرے ۔ “

ساشکا کی آنکھوں سے بلا کی اداسی جھلک رہی تھی۔ لیکن چلتے چلتے بھی مسخرےپن سے باز نہ رہا:

"مادام ایوانووا، روسی صلیب میرا خاتمہ تو نہیں کر دے گی کہیں؟"

۶

اور اب گمبرنس پر بلا کی اداسی اور ویرانی چھا گئی جیسے ساشکا اور اس کے وائیلان کے بغیر شراب خانہ یتیم ہوگیا ہو۔ پروپرائیٹر نے ایک چوک سنگیت بلایا جو لوگوں کو خوش کرنے کے لئے گھوم گھوم کر سینڈولین بجاتا تھا۔ سنگیت منڈلی والوں میں سے ایک نے موسیقی ہال کے مسخرے کا سا لباس پہن رکھا تھا، لال لال مونچھیں اور مصنوعی ناک، چارخانےدار پتلون اور کانوں سے بھی اونچے کالروں کا قمیص، اس نے نہائت گھٹیا اشارے کرکے مزاحیہ گیت گائے لیکن چوک سنگیت بالکل ناکام رہا۔ بلکہ گاھکوں نے خوب خوب ھو ھو ھاھا کیا، اور گوشت کے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر گائیکوں پر پھینکے۔ تندروو کے مچھیروں نے تو ایک دفعہ مسخرے کی خوب دھر کے خبر لی، شامت کے مارے نے کہیں ساشکا کے بارے میں کوئی گھٹیا بات کہہ دی تھی۔

پھر بھی سمندر اور بندرگاہ کے وہ نوجوان جنھیں ابھی تک جنگ نے دکھ درد اور موت کی گود میں نہیں دھکیلا تھا، وہ حسب معمول یہاں آتے رہے۔ شروع شروع میں تو روز شام کو ساشکا کا ذکر نکل آتا:

''کاش ساشکا یہاں ہوتا! یہاں تو جانو الو بولنے لگا اس کے بنا۔''

''ہاں کہاں ہے تو، میرے پیارے، میرے ساشکا، کہاں ہے تو؟''

''دور، بہت دور منچوریائی محاذ پر''، کوئی منچلا اس دور کا سب سے زیادہ ہردلعزیز اور چلتا ہوا گیت چھیڑتا۔ پھر خود ہی کھسیا کر چپ ہو جاتا۔ اور پھر اچانک کوئی اور بول پڑتا:
''زخم تین قسم کے ہوتے ہیں۔ باریک باریک سوراخ دار، چھدے ہوئے اور پسے ہوئے۔ ہاں اور پاش پاش زخم بھی ہوتے ہیں...''

فتح بڑھ کر قدم چومے گی میرے
تیری قسمت، کٹے ہیں ہاتھ تیرے

''بھن بھن بند کرو۔ خاموش ہوتے ہو یا نہیں؟ مادام ایوانووا، ساشکا کی کوئی خیر خبر ملی؟ کوئی خط پتر، کوئی پوسٹ کارڈ؟''

مادام ایوانووا پوری پوری شام اخبار پڑھتی رہتی۔ اخبار ہاتھ بھر کے فاصلے پر ہوتا، سر پیچھے کو

ڈھلکا ھوا، وہ منہ ھی منہ میں بدبداتی جاتی اور اخبار پڑھتی جاتی۔ بیلچکا بڑے مزے میں ان کی آغوش میں لیٹ کر نیند کے مزے لوٹتی۔ بار کی ملازمہ اب کسی طرف سے بھی پل پر متمکن جہازی کپتان نہ لگتی اور اس کپتان کا دستہ جیسے گھبرایا گھبرایا اور نیند میں ڈوبا ھوا شراب خانے میں بھٹکتا رھتا۔

لوگ باگ ساشکا کی خیر خبر پوچھتے تو وہ آھستہ سے سر ھلاتی:

"کوئی خیر خبر نہیں ملی، بھائی۔ نہ خط پتر آیا نہ اخباروں سے کچھ پتہ چلا۔"

وہ دھیرے سے عینک اتارتی اور اخبار کے ساتھ بیلچکا کے نرم اور گرم پہلو میں رکھ دیتی۔ اور منہ پھیر کر چپکے چپکے آنسو بہانے لگتی۔

کبھی کبھی وہ کتیا کے اوپر جھک جاتی اور مدھم اور درد بھری آواز میں کہتی: "کیوں بیلچکا، میری ننھی سی کتیا، کیا ھے؟ بتا کہاں ھے ھمارا ساشکا؟ بول کہاں ھے ھمارا مالک؟"

بیلچکا ننھی سی نازک تھوتھنی اٹھاتی، بھیگی بھیگی سیاہ آنکھیں جھپکاتی اور بار کی ملازمہ کی آواز میں آواز ملا کر آھستہ آھستہ منمناتی:

"آ۔ و۔ و۔ ں، آو، فو۔ و۔ وں، آؤ۔ و۔ وں ..."

لیکن وقت بڑا مرھم ھے۔ مینڈولن نوازوں کے بعد بالالائیکا والے آئے اور پھر روسی — یوکرینی کورس

آیا۔ اس منڈلی میں لڑکیاں بھی تھیں۔ اور آخر اکورڈئین نواز لیوشکا نے گمبرنس میں پاؤں جما لئے۔ ایک زمانے میں وہ چور تھا، لیکن شادی کے بعد وہ سچا راستہ ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا۔ شراب خانوں اور ہوٹلوں میں مدت سے اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور اسی لئے گمبرنس والوں نے بھی اسے برداشت کر لیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اب اس کے سوا چارہ بھی نہ تھا، اس کے بغیر دھندا بہت ماند پڑ گیا تھا۔

مہینے گزرتے رہے اور پھر سال بھر بیت گیا۔ مادام ایوانووا کے سوا اب کبھی کسی کو ساشکا کی یاد نہ آتی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ بھی اب اس کے ذکر پر آنسو نہ بہاتی۔ اور پھر ایک سال اور گزرا۔ شاید ننھی سی سفید کتیا بھی ساشکا کو بھول چکی تھی۔

لیکن ساشکا کے اندیشوں کے باوجود روسی صلیب نے ساشکا کی جان نہیں لی۔ اس نے تین بڑی لڑائیوں میں حصہ لیا، وہ بینڈ میں بانسری بجاتا تھا، ایک دفعہ تو وہ دستے کے آگے آگے رہا۔ مگر پھر بھی اس کا بال بھی بیکا نہ ہوا، وہ وافانگ گاؤ میں قید ہوا۔ اور جنگ کے بعد ایک جرمن جہاز اسے اس بندرگاہ تک لے آیا جہاں آج بھی اس کے دوست کام کرتے تھے اور رنگ رلیاں مناتے تھے۔

اس کی آمد کی خبر جنگل کی آگ کی طرح بندرگاہوں، گھاٹوں اور جہاز بنانے کے ہر ہر مرکز میں پھیلتی چلی گئی۔ اس رات گمبرنس میں اس قدر

مجمع تھا کہ زیادہ تر لوگوں کو کھڑا رہنا پڑا۔ بیئر کے ڈونگرے سروں کے اوپر سے ہوتے ہوئے ہاتھوں ہاتھ ادھر سے ادھر جا رہے تھے۔ بہت سے شرابی پیسہ دئے بغیر ہی کھسک گئے پھر بھی دھندا آج ہمیشہ سے زیادہ اچھا رہا۔ بائیلرساز لپک کر ساشکا کا وائیلن لے آیا، وائیلن بڑی احتیاط سے اس کی بیوی کی چادر میں لپٹا ہوا تھا، اس نے چادر ہٹائی اور دیکھتے دیکھتے شراب کے چند جاموں کی خاطر بیچ ڈالی۔ یارلوگ ساشکا کے سر میں سر ملانےوالے پرانے موسیقار کو بھی کہیں نہ کہیں سے کھوج لائے۔ اکورڈئین نواز لیوشکا بڑا مغرور اور سرپھرا جوان تھا، وہ زبردستی ڈائس پر پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ ''مجھے اجرت ملتی ہے، مجھ سے معاهده ہو چکا ہے!،، وہ برابر ہٹ دھرمی کر رہا تھا۔ لیکن لوگوں نے اسے نکال باہر کیا، ساشکا بیچ بچاؤ نہ کراتا تو آج اس کی مرمت ہو گئی تھی۔

جنگ عظیم میں حصہ لینے والے کسی سورما کا اس قدر پرجوش اور پرخلوص سواگت نہ ہوا ہوگا جیسا ساشکا کا ہوا۔ کھردرے اور قوی ہاتھوں نے اسے تھام کر زمین سے اٹھایا اور اس قدر زور زور سے اچھالا کہ وہ چھت سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ شور اور ہنگامہ اس قیامت کا تھا کہ گیس کے ہنڈوں کی تھرتھراتی ہوئی لویں بجھ گئیں۔ گشت والا سپاہی کئی دفعہ آیا: ''ذرا سنبھل کے، بھائی، باہر بہت شور جا رہا ہے۔،،

اس رات ساشکا نے گمبرنس کے تمام مقبول گیت اور تمام ناچ دھنیں بجائیں۔ اس نے کچھ جاپانی گیتوں کی دھنیں بھی بجائیں جو اسیری کے زمانے میں سیکھ لئے تھے۔ لیکن سامعین کو یہ گیت زیادہ پسند نہیں آئے۔ مادام ایوانووا کے جسم میں تو جیسے اچانک جان پڑ گئی، وہ پھر خوشی خوشی کپتان کے پل پر براجمان ہو گئی۔ بیلچکا ساشکا کے زانو پر بیٹھا خوشی سے بھونک رہا تھا۔ کبھی کبھی پل بھر کو ساشکا کا ساز خاموش ہوتا اور کوئی سیدھا سادھا مچھیرا، جو اب جا کر ساشکا کی واپسی کے معجزے کا مطلب سمجھ سکا تھا، بڑے بھولپن، خوشی اور حیرت سے پکار اٹھتا: ''ارے یہ تو ہمارا ساشکا واپس آ گیا!،، بس نہ پوچھو، ہر طرف مگن شرابیوں کے قہقہوں اور گالیوں کا طوفان سا اٹھ کھڑا ہوتا۔ لوگ باگ پھر ساشکا کو کھینچ لاتے اور چھت تک اچھالنے لگتے، وہ چیختے چلاتے، پیتے پلاتے، ڈونگے ٹکراتے اور ایک دوسرے پر بیئر چھلکانے لگتے۔

پچھلے سالوں کے دوران ساشکا میں جیسے ذرا بھی تبدیلی نہ آئی۔ اس کی عمر بھی تو نہیں بڑھی تھی۔ حادثات زمانہ نے اس کے چہرے مہرے پر بس اتنا ھی اثر کیا تھا جتنا شراب خانے کے مربی اور محافظ گمبرنس کی روغنی تصویر پر۔ لیکن نیک دل اور حساس مادام ایوانووا کی نظروں نے دیکھ لیا کہ ساشکا کی آنکھوں میں آج بھی وھی خوف، وھی

پریشانی ہے جو جدائی کے وقت اس نے دیکھی تھی، یہی نہیں بلکہ یہ خوف اور پریشانی کی یہ کیفیت زیادہ گہری، زیادہ معنی‌خیز ہو گئی تھی۔ ساشکا ہمیشہ کی طرح نقلیں کر رہا تھا، تیوری چڑھا رہا تھا اور آنکھ مار رہا تھا، لیکن مادام ایوانووا کی نظروں نے تاڑ لیا کہ یہ سب حرکتیں وہ بن بن کے کر رہا ہے۔

۷

زندگی اسی پرانے ڈھچر پر چلنے لگی جیسے جنگ کبھی ہوئی ہی نہ ہو، جیسے ساشکا نے ناگاساکی کی قید جھیلی ہی نہ ہو۔ بڑے بڑے دیوہیکل جوتوں میں مچھیروں کو بیلوگا یا بھوری مالوت ہاتھ لگتی اور وہ پہلے کی طرح رنگ رلیاں منانے پہنچ جاتے، چوروں کی محبوبائیں ناچنے لگتیں، اور ساشکا دنیا کے کونے کونے سے آئے ہوئے جہازی گیتوں کی دھنیں بجانے لگتا۔

لیکن غیریقینی اور طوفان خیز وقت قریب آ رہا تھا۔ ایک شام پورے شہر میں طرح طرح کی افواہیں پھیلیں اور ہنگامہ کھڑا ہو گیا، جیسے کسی نے خطرے کی گھنٹی بجا دی ہو۔ گلی کوچوں میں بڑے بےوقت لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ چھوٹے چھوٹے سفید اشتہار ہاتھوں ہاتھ ادھر سے

ادھر پرواز کر رہے تھے، ''آزادی،، یہ جانفزا لفظ پھول بن کر اس شام ملک کے کونے کونے میں دیس کے تمام بھولے بھالے باسیوں کے منہ سے جھڑ رہے تھے۔

اور پھر وہ روشن اور پرمسرت زمانہ آیا جس کے نور نے گمبرنس کے تہہ خانے کو بھی منور کر دیا۔ اب وہاں جانےوالوں میں طالب‌علم اور مزدور بھی ہوتے اور نوجوان حسینائیں بھی۔ لوگ ان پیپوں پر چڑھ جاتے جنھوں نے زمانے کے بہت سے سرد و گرم دیکھے تھے، ان کی آنکھیں چمکنے لگتیں اور وہ تقریر کرتے۔ ان کی کہی ہوئی بعض بعض باتیں زیادہ صاف نہ تھیں، لیکن ان کی باتوں سے امید کا ایسا چشمہ پھوٹ رہا تھا، ان میں نغمۂ محبت کی ایسی گونج تھی کہ وہ سامعین کے پرخلوص اور جوشیلے دلوں میں گھر کرتی چلی گئیں۔

''ساشکا، مارسیلز! بجاؤ! مارسیلز!،،

یہ وہ مارسیلز نہ تھا جو فرانکو — روسی رنگ رلیوں کے ہفتے میں گورنر کے حکم پر زبردستی بجوایا گیا تھا۔ بڑا فرق تھا ان دونوں میں! گلی کوچوں میں انسانوں کا بیکراں سمندر ٹھاٹیں مارتا نظر آتا۔ جلوس کا سلسلہ ٹوٹنے ھی میں نہ آتا تھا۔ ان کے ھاتھوں میں لال جھنڈے لہراتے۔ عورتیں لال ربنوں اور لال پھولوں سے آراستہ نظر آتیں۔ اجنبی سے اجنبی قریب آتے، بڑے جوش سے مصافحہ کرتے

اور ان کے چہروں پر مسکراہٹ کے پھول کھل جاتے۔

اور اچانک یہ ساری خوشیاں خاک میں مل گئیں۔ خوشیوں کا یہ دور کچھ اس طرح غائب ہوا جیسے پانی کی لہر آتے ہی ساحل سمندر سے بچوں کے قدموں کے نشان دھل جاتے ہیں۔ ایک دن بونا موٹا اور تھل تھلا اسسٹنٹ پولیس کمشنر دراتا ہوا گمبرنس میں گھس آیا۔ اس کی آنکھیں نکلی پڑ رہی تھیں اور منہ پکے ہوئے ٹماٹر کی طرح لال بھبوکا ہو رہا تھا۔

''کیوں؟ کون ہے؟ یہاں کا پروپرائیٹر؟،، وہ بھاری آواز میں چیخا۔ ''پروپرائیٹر کو بلاؤ!،،

اس کی نظر ساشکا پر پڑی جو وائیلن تھامے کھڑا تھا۔

''تم ہی ہو پروپرائیٹر؟ خاموش، کیا بکتا ہے؟ اچھا تو یہ تو گاتا ہے قومی ترانے۔ خبردار آئندہ کبھی کوئی ترانہ نہ بجے!،،

''بہتر ہے، جناب عالی، اب کبھی قومی ترانہ نہیں گائیں گے،، ساشکا نے سکون سے جواب دیا۔

اسسٹنٹ کمشنر غصے سے لال بھبھوکا ہو گیا۔ وہ ساشکا کے منہ کے قریب انگلی ہلا ہلا کر دھمکا رہا تھا۔

''ہاں کا۔ بھی۔ ی۔ ی نہیں!،،

''بہتر ہے، جناب عالی، کبھی نہیں۔،،

"میں بتاؤں گا تمھیں انقلاب لانا! میں بتاؤں گا تمھیں!"

وہ پاؤں پٹکتا ہوا نکل گیا۔ اور ہر دل پر مایوسی اور نراس کے بادل چھا گئے۔

شہر تاریک ہو گیا۔ ہر طرف طرح طرح کی گھٹیا، پریشان کن اور خطرناک افواہیں پھیل رہی تھیں۔ لوگ سنبھل کر بات کرنے لگے۔ انھیں ڈر تھا کہ کہیں نظر دل کا راز فاش نہ کر دے، وہ خود اپنے سائے سے، اپنے خیالوں سے گھبرائے ہوئے تھے۔ آج یہ تاریخی شہر قدموں تلے پھیلے ہوئے اس بدبودار اور تاریک دلدل کے خیال سے کانپ اٹھا جس کا دامن سمندر کے قریب پھیلا ہوا تھا اور جس میں وہ برسوں سے اپنی گندگی اگل رہا تھا۔ شہر کی شاندار دوکانوں کی کھڑکیوں کے شیشوں پر تختے جڑوا دئے گئے۔ پروقار مجسموں پر پہرا بٹھا دیا گیا اور شاندار مکانوں کے احاطوں میں توپیں گاڑ دی گئیں — کبھی کل کلاں کو۔ شہر کے مضافات کے متعفن بلوں اور ٹپکتی ہوئی دو چھتیوں میں خدا کے چنیدہ چنیدہ بندے خوف و دہشت سے کانپتے، دعائیں مانگتے اور آنسو بہاتے رہتے۔ یہ لوگ وہ تھے جنھیں بائیبل کے خدا کے قہر نے برسوں سے پیس رکھا تھا لیکن جو آج بھی یہ سمجھتے تھے کہ ہم ابھی تک آزمائش میں پورے نہیں اترے۔

سمندر کے قریب، سڑی ہوئی انتڑیوں جیسی گندی اور تاریک جگہوں میں خفیہ کارروائیاں ہوتی رہیں۔ سراؤں، چائےخانوں اور قیام گاہوں کے دروازے پوری پوری رات کھلے رہتے۔

اگلی صبح کو قتل عام شروع ہو گیا۔ وہ، جو کل تک انسانیت کی خوشی و مسرت اور دوستی اور محبت کے نور سے سرشار ہوکر گاتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے تھے، جو جیتی ہوئی آزادی کو کلیجے سے لگائے مارچ کر رہے تھے، وہی آج قتل و غارت پر تلے ہوئے تھے۔ ایسی بات نہیں تھی کہ انہیں قتل کرنے کا حکم ملا تھا یا انہیں یہودیوں سے کوئی نفرت تھی، نہیں، ان کی تو یہودیوں سے دوستی تھی اور پھر اس میں ان کا کوئی بھلا بھی تو نہ تھا، نہیں، بات یہ نہیں تھی، کچھ اور تھی۔ ہر دل میں چھپا ہوا مکار شیطان ان سے سرگوشی کر رہا تھا:

''جاؤ آج تم آزاد ہو، کسی کے خون میں رنگو، عورتوں کے ساتھ زنا کرو، دوسروں کی دولت لوٹو، جاؤ آج تم آزاد ہو۔''

قتل و غارت گری کے اس دور میں ساشکا اپنے مضحکہ خیز نقوش اور مخصوص یہودی چہرے مہرے کے باوجود شہر میں گھومتا رہا لیکن اسے کسی نے تیز نظر سے نہ دیکھا۔ اس میں وہ اٹوٹ روحانی طاقت تھی، خوف سے خوفزدہ نہ ہونے کی وہ صلاحیت تھی جو کمزور سے کمزور آدمی کی

حفاظت کرتی ہے، جو دنیا کی بڑی سے بڑی توپ سے زیادہ طاقتور محافظ ہے۔ اور پھر ایک دن ایسا ہوا کہ وہ سڑک پر پھیلے ہوئے انسانوں کے بلاخیز طوفان سے بچنے کے لئے کسی گھر کی دیوار سے سٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اچانک سرخ قمیص اور سفید اپرن والا ایک راج‌مزدور چھینی گھما کر پھنکارا: ''ارے یہودی! مزا چکھاؤ اس یہودی کے بچے کو، کر دو خون!''

لیکن کسی نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

''ائے شیطان کے چیلے — دیکھتا نہیں، ابے ساشکا ہے یہ تو، ابے الو کے پٹھے۔ تیری ماں کے کلیجے میں لگے...''

راج‌مزدور رک گیا۔ مدھوشی، ہزیان اور پاگل پن کے اس لمحے میں جو کوئی بھی اس کے راستے میں آتا، ختم ہو جاتا، اس کا باپ، بہن، پادری اور خود ارتھوڈوکس خدا بھی اس کی زد سے بچ کر نہ نکل سکتا لیکن دوسری طرف اس کی حالت اس بچے کی سی تھی جو حاکمانہ لہجے میں کہی ہوئی کسی بات کو ٹال نہیں سکتا۔

اس نے احمقوں کی طرح دانت نکال دئے اور تھوک کر اپنی آستین سے ناک صاف کرنے لگا۔ لیکن اچانک اس کی نظر گھبرائے ہوئے ننھے سے سفید کتے پر پڑی جو کانپتا ہوا ساشکا سے لپٹ رہا تھا۔ وہ تیزی سے نیچے جھکا، اسے پچھلی ٹانگوں سے پکڑ کر

اوپر گھسیٹا، اور ہوا میں بلند کرکے اس کا سر چھجے کے پتھر پر دے مارا۔ اس کے بعد وہ تیزی سے بھاگ کھڑا ہوا۔ ساشکا خاموشی سے اسے تک رہا تھا۔ راج مزدور بھاگتا رہا، اس کا سر ننگا تھا، جسم آگے کو جھکا ہوا اور بازو ہوا میں پھیلے ہوئے۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور آنکھیں وحشت کے عالم میں گول اور سفید ہوگئی تھیں۔

ساشکا کے جوتوں تلے بیلچکا کا بھیجا بکھر گیا۔ ساشکا نے جھک کر رومال سے بھیجا پونچھ ڈالا۔

۸

اور پھر ایک عجیب دور آیا، مفلوج کی نیند سے ملتا ہوا سا دور۔ شام کا دھندلکا پھیلنے کے بعد شہر کی کسی کھڑکی میں روشنی نظر نہ آتی لیکن قہوہخانوں اور نائٹ کلبوں کے کتبے اور سرائے کی کھڑکیاں جھلملاتی رہتیں۔ فاتح اپنی طاقت آزما رہے تھے، حکومت کے اشارے پر اور حکومت کی سرپرستی میں جو ہنگامے ہوئے تھے، ان سے ان کا دل ابھی تک نہیں بھرا تھا۔ بدمست و بے لگام غنڈے منچوریائی سمور کی ٹوپیاں اوڑھے صدریوں کے کاجوں میں سینٹ جارج کے ربن لگائے ایک ریستوراں سے دوسرے ریستوراں میں گھومتے اور نہایت سختی سے حکم دیتے کہ ''عوامی ترانہ'' بجاؤ۔ ہر شخص

کو حکم ملتا کہ با اداب باملاحظہ کھڑے ہو جاؤ۔ اسی پر بس نہیں تھی وہ گھروں میں گھس جاتے، مسہریوں اور الماریوں کو تہہ و بالا کر دیتے اور ووڈکا، روپیہ اور ''قومی ترانہ،، طلب کرتے اور فضا ان کی بدمستی اور بکواس سے گندی ہو جاتی۔

ایک دفعہ دس غنڈوں کا ایک گروہ گمبرنس پہنچا اور دو میزوں پر ڈٹ گیا۔ ان کی ہر ہر حرکت سے گستاخی جھلک رہی تھی۔ ویٹروں کے ساتھ ان کا لہجہ بہت تحکمانہ تھا۔ وہ قریب بیٹھے ہوئے اجنبیوں کے کندھوں کے قریب منہ لیجا کر دوسری طرف تھوکتے، دوسرے لوگوں کی جگہ جوتے رکھ رکھ کر بیٹھتے اور بیئر کو سڑا ہوا کہہ کہہ کر زمین پر بہاتے رہے۔ ان کی حرکتوں پر کسی نے چوں بھی نہ کی، ہر شخص جانتا تھا کہ وہ پولیس کے دلال ہیں، ان کے لئے عام لوگوں کے دل میں وہی دبا دبا سا خوف، وہی مریضانہ تجسس تھا جو جلادوں کے لئے ہوتا ہے۔ ایک غنڈہ الگ سے الگ گروہ کا لیڈر معلوم ہو رہا تھا۔ یہ تھا منمنا موتکا۔ وہ یہودی تھا جو اب عیسائی ہو گیا تھا، لال بال، ٹوٹی ہوئی ناک اور جھنجھناتی ہوئی آواز۔ کہتے ہیں بڑا طاقتور تھا۔ شروع میں وہ چور تھا، پھر کسی قحبہ خانے میں دھکے دے کر شرابیوں کو نکالنے کا کام کرنے لگا اور پھر دلال اور پولیس کا گرگا بن بیٹھا۔

ساشکا ”طوفان،، کی دھن بجا رہا تھا۔ اچانک ”منمنا،، اس کے پاس پہنچا، اس کا سیدھا بازو پکڑا اور ہال کی طرف منہ کرکے چلایا: ”قومی ترانہ! عوامی قومی ترانہ! ہمارے قابل پرستش شہنشاہ کے اعزاز میں قومی ترانہ!،،

”قومی ترانہ! قومی ترانہ!،، سمور کی ٹوپیوں والے آوارہ گرد چلائے۔

”قومی ترانہ!،، دور کونے سے کسی نے سہمی ہوئی آواز نکالی۔

لیکن ساشکا نے بازو چھڑا لیا اور پرسکون لہجے میں کہا:

”یہاں کوئی قومی ترانہ نہیں ہوگا۔،،

”کیا کہا؟،، منمنا گرجا۔ ”تیری اتنی ہمت کہ انکار کرے؟ گندہ، سڑا ہوا یہود!،،

ساشکا آگے کو جھکا اور منمنا کے بالکل قریب آگیا، اس کے چہرے پر بل پڑ گئے اور وائیلن نیچے جھک گیا، اس نے کہا:

”اور تو کون ہے؟،،

”میں، میں کون ہوں؟،،

”میں تو سڑا ہوا یہود ہوں، مگر تو کون ہے؟،،

”میں ارتھوڈوکس عیسائی!،،

”عیسائی؟ کتنی دولت بٹوری ہے اس کے بدلے؟،،

قہقہوں سے گمبرنس کی دیواریں ہلنے لگیں، غصے سے سفید منمنا اپنے ساتھیوں کی طرف مڑا۔

''ساتھیو!،، اس نے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی اور کانپتی ہوئی آواز میں کسی اور کے الفاظ دوھرائے جو اسے زبانی یاد تھے۔ ''ہم تخت اور پاک چرچ کی طرف یہودیوں کے اس شرمناک رویے کو کب تک برداشت کریں گے؟،،

لیکن ساشکا نے ڈائس پر چڑھکر منمنے کو مخاطب کیا۔ گمبرنس والوں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا کہ مضحکہ خیز اور نقال ساشکا اس طرح مقرر کی شان سے ایسے تحکمانہ انداز میں بول سکتا ہے۔

''ائے!،، وہ چیخا۔ ''سور کے بچے! ذرا میری طرف منہ تو کر، قاتل، میری طرف دیکھ! ہاں!،،

اور پلک جھپکتے ھی ساشکا کا وائیلن اوپر اٹھکر شعلے کی طرح ھوا میں کوندا اور ٹکرا گیا! سمور کی ٹوپی والا لمبا شخص اس حملے سے لڑکھڑا گیا، اس کی کنپٹی پر چوٹ پڑی تھی۔ وائیلن چور چور ھو گیا، ساشکا کے ھاتھ میں اب اس کے دستے کے سوا کچھ نہ تھا جسکو وہ بڑے فاتحانہ انداز میں بلند کئے کھڑا تھا۔

''مد۔د۔د، ساتھیو، مدد!،، منمنا دھاڑا۔

لیکن چڑیا اڑ چکی تھی۔ انسانوں کی مضبوط دیوار نے ساشکا کو گھیرے میں لے کر محفوظ کر

لیا تھا۔ اسی دیوار نے سموری ٹوپیوں والوں کو دھکے دے دے کر نکال باھر کیا۔

بھرحال، گھنٹے بھر بعد ساشکا کام ختم کرکے شراب خانے سے باھر نکلا تو کئی آدمی اس پر جھپٹے۔ ان میں سے ایک نے بڑھ کر اس کی آنکھ پر ضرب لگائی اور سیٹی بجائی۔ سیٹی کی آواز سنتے ھی ایک پولیس کا آدمی دوڑا ھوا آیا اور غنڈے نے اس سے کہا: ''اسے بلوار اسٹیشن لے جاؤ، سیاسی الزام ھے۔ یہ رھا میرا بلا۔''

۹

ساشکا پھر ھاتھ سے جاتا رھا، اب کی دفعہ شاید ھمیشہ کے لئے۔ کسی شخص نے شراب خانے کے چھجے سے یہ حادثہ دیکھ لیا تھا۔ اس نے اور سب کو بھی اس کی اطلاع دے دی۔ گمبرنس میں ساشکا کے بہت سے مداح اور سرپرست تھے اور سب ھی تجربہ کار تھے، وہ جانتے تھے بلوار اسٹیشن کیا بلا ھے، وہ خوب سمجھتے تھے کہ پولیس کے گرگے کا انتقام کیسا ھوتا ھے۔

ابکی دفعہ کسی نے بھی اس سوال پر بہت دن سر نہ کھپایا کہ ساشکا پر کیا بیتی۔ بہت جلد لوگ اسے بھول بھال گئے۔ دو مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ ایک نئے وائیلن نواز نے اس کی

جگہ لے لی (اتفاق دیکھئے کہ وہ ساشکا کا شاگرد ہی تھا۔)

تین مہینے بیت گئے، شام خاموش اور پرسکون تھی، موسیقار ''انتظار،، والز بجا رہے تھے۔ اچانک کسی نے سہمی ہوئی سی باریک آواز میں کہا:
''یارو، ساشکا!،،

ہر شخص پلٹا اور چھوٹے پیپوں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہاں وہی تھا۔ مردہ زندہ ہو گیا، مگر اس دفعہ وہ بہت کمزور نظر رہا تھا، رنگ زرد اور داڑھی بڑھی ہوئی۔ لوگ اس کی طرف دوڑے اور اسے گھیر لیا، وہ اسے لپٹا رہے تھے اور بیئر کے ڈونگے پیش کر رہے تھے۔ اور اچانک پھر وہی آواز ابھری: ''بھائیو! ہاتھ تو...!،،

مجمع کو جیسے اچانک سانپ سونگھ گیا۔ ساشکا کے بائیں بازو کی کہنی مڑی تڑی اور بھنچی ہوئی سی اس کے پہلو سے چپکی ہوئی تھی۔ شاید اب اس کا بازو ہل جل بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی انگلیاں ٹھوڑی سے چپکی ہوئی تھیں۔

''یہ کیا ہوا، بھائی؟،، آخر روسی کمپنی کے جھبرے ملاح نے سکوت توڑا۔

''ایہہ بکواس...،، ساشکا نے بےپروائی سے جواب دیا۔ ''کوئی نس وس ٹوٹ گئی ہے شاید۔،،

''مک۔ گ۔ گر...،،

اور پھر ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

”ہوں، تو ’چرواھا، بھی ختم ہو گیا؟،،
ملاح نے ہمدردی سے پوچھا۔

” ’چرواھا،؟،، ساشکا کی آنکھیں ناچ اٹھیں۔

”ابے، یار!،، اس نے ہمیشہ کے سے یقین اور اعتماد کے ساتھ سر میں سر ملانےوالے کو آواز دی۔

” ’چرواھا، شروع کرو، ایک، دو، تین!،،

پیانو نواز نے طرب انگیز نغمہ چھیڑا اور کچھ بے یقینی سے مڑکر دیکھا۔ لیکن ساشکا نے ثابت ھاتھ بڑھا کر جیب سے لمبا پتلاسا سیاہ ساز نکالا — تقریباً بالشت بھر لمبا ساز جس میں ایک شاخ سی نکلی ہوئی تھی جو اس نے اپنے منہ میں پکڑ لی، اور پھر وہ بائیں طرف جھکا اور اس کے ٹوٹے ہوئے سخت بازو نے جہاں تک جھکنے کی اجازت دی جھکتا چلا گیا۔ پل بھر بعد وہ ’اوکارینا، پر ’چرواھے، کی خوش‌آھنگ اور بھرپور تانیں اڑانے لگا۔

”واہ، واہ سبحان اللہ!،، سامعین نے خوش ہوکر قہقہے لگائے اور اس کی داد دینے لگے۔

”بدمعاش!،، ملاح چلایا اور بےاختیار ناچنے لگا۔ اپنی اس حرکت پر وہ خود ھی حیران رہ گیا۔ پل بھر میں، کیا عورت اور کیا مرد، ہر شخص ناچ میں شریک ہو گیا۔ ویٹر ظاھری رکھ رکھاؤ برتنے کی پوری کوشش کر رہے تھے مگر خوشی تھی کہ چہروں سے پھوٹی پڑ رھی تھی۔ وہ ادھر سے ادھر دوڑتے رہے اور قدموں سے تھاپ دیتے

رہے۔ مادام ایوانووا تک پل پر کھڑے ہوئے جہاز کے کپتان کے فرائض بھول بھال کر اس تڑپتے پھڑکتے ناچ کی گت پر سر دھننے اور انگلیوں سے آہستہ آہستہ تال دینے لگی۔ اور پھر جیسے زمانے کے ستائے ہوئے بوڑھے گمبرنس کی بھویں پھڑک اٹھیں، وہ ہنستی ہوئی نظروں سے گلی میں گھور رہا تھا۔ لنجے کبڑے ساشکا کے ہاتھ میں تھمی ہوئی معمولی سی سیدھی سادھی بنسری سے جیسے اچانک ایسے سر نکلنے لگے جن تک بدقسمتی سے نہ گمبرنس کے دوستوں کی پہنچ تھی اور نہ خود ساشکا کی:

"کوئی بات نہیں! انسان کا ہاتھ کاٹا جا سکتا ہے لیکن فن کا سونا آگ میں جل کر کندن بنے گا، اس کی روشنی ہر چیز کو منور کریگی!"

۱۹۰۷ء

زمرد

بے نظیر اور چتکبرے گھوڑے
خولستومر کی یاد میں۔

۱

زمرد امریکی نسل کا چارسالہ گھوڑا تھا، چاندی کی طرح سفید اور گھوڑ دوڑ کا رسیا — آدھی رات ڈھلے ہمیشہ کی طرح اس کی آنکھ کھلی۔ اس کے دائیں بائیں اور تھان کے دوسری طرف دوسرے گھوڑے بڑے آہنگ کے ساتھ گھاس چبا رہے تھے۔ وہ بڑے مزے لے لے کر گھاس چباتے اور کبھی کبھی جب گرد ان کی ناک کو گدگدانے لگتی تو ہنہنا اٹھتے۔ نگراں سائیس ایک کونے میں پیال کے ڈھیر پر خراٹے لے رہا تھا۔ زمرد دن کے رد و بدل اور خراٹوں کی آواز سے سمجھ گیا کہ آج واسیلی کی ڈیوٹی تھی۔ اس نوجوان کو سب گھوڑے ناپسند کرتے تھے کیونکہ وہ اصطبل میں بودار تمباکو پیتا، اکثر نشے میں آتا اور گھوڑوں کے پیٹ میں گھٹنے مارتا۔ ان کی آنکھوں کے آگے مکے تانتا اور بڑی سختی سے ان کی رسیوں کو جھٹکے دیتا۔ وہ ہمیشہ نہایت غیر فطری اور بھنبھناتی ہوئی آواز میں ان پر چیختا اور انھیں دھمکاتا۔

زمرد تھان کے دروازے تک گیا۔ اس کے تھان کے ٹھیک سامنے سمارٹ اپنے تھان میں کھڑی تھی۔ یہ چھوٹی سی سیاہ گھوڑی ابھی تک پوری طرح جوان نہیں ہوئی تھی۔ زمرد اندھیرے میں اس کے جسم کو نہیں دیکھ سکا۔ لیکن جب وہ چارے سے منہ ہٹاتی اور سر گھما کر دیکھتی تو چند پل کے لئے اس کی بڑی سی آنکھ میں مخملیں روشنی جھلملا اٹھتی۔ زمرد نے اپنے نازک نتھنے پھلا کر لمبا سا سانس لیا اور اس کی کھال کی مدھم مدھم اور جذبات کو گرمانے والی بو اپنے سانس میں بسائی اور آہستہ سے ھنہنایا۔ سمارٹ تیزی سے مڑی اور بڑی محبت بھری اور لرزاں لرزاں سی ھنہناھٹ سے اسکا جواب دیا۔

فوراً زمرد کو قریب سے حاسدانہ اور خفا خفا سے سانس کی آواز آئی۔ یہ اونیگن تھا، بڑے دم خم والا بوڑھا گھوڑا جو اب بھی کبھی کبھی شہر کی گھوڑدوڑ میں دوڑا کرتا تھا۔ دونوں گھوڑے لکڑی کے ایک باریک پردے کے ذریعے ایک دوسرے سے جدا کر دئیے گئے تھے اس لئے ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ لیکن پردے کے کونے پر ناک رکھ کر زمرد نے اونیگن کے متحرک نتھنوں سے آتی ہوئی چبائی ہوئی گھاس کی گرم گرم بو سونگھ لی۔ ان دونوں کا غصہ بڑھتا گیا اور تھوڑی دیر تک اس تاریکی میں وہ ایک دوسرے کی طرف منہ کرکے سوں سوں کرتے رہے۔

ان کے کان ان کے سروں سے چپک گئے تھے اور گردنوں میں خم پڑے ہوئے تھے۔ اچانک دونوں چیخے، ھنھنائے اور غصے سے زمین کھرچنے لگے۔

''سیدھے کھڑے رھو کمبختو!،، سائیس نیند کے عالم میں بڑبڑایا۔ اس کی آواز میں حسب معمول بلا کی دھمکی تھی۔

دونوں گھوڑوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ اور وہ دروازوں سے دور ہٹ گئے۔ مدت سے دونوں ایک دوسرے کے دشمن تھے لیکن تین دن سے، جب سے حسین سیاہ گھوڑی بھی اسی اصطبل میں رکھ دی گئی تھی (عام طور پر ایسا نہیں کیا جاتا تھا لیکن گھوڑدوڑ سے پہلے بہت زیادہ ھجوم ہونے کی وجہ سے جگہ کی تنگی کے کارن ایسا ہو گیا تھا) کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا جب ان میں کئی بڑی بڑی لڑائیاں نہ ہوئی ہوں۔ گھوڑ دوڑ کے میدان اور تالاب کی طرح اصطبل میں بھی وہ دونوں ایک دوسرے کو لڑنے کے لئے للکارتے۔ لیکن دل ھی دل میں زمرد اس بڑے سے خود اعتماد گھوڑے سے، اسکے زور حس نتھنوں سے، اس کے اونٹ جیسے بڑے سے کنٹھے، اداس اور گہری آنکھوں اور سب سے زیادہ آھنی پیکر سے ڈرتا تھا، جسے زمانے کے سرد و گرم نے تپا دیا تھا اور گزشتہ دوڑوں اور لڑائیوں نے اور زیادہ مضبوط بنا دیا تھا۔

زمرد نے خود اپنے اوپر بھی یہ ظاھر کیا کہ وہ

بالکل خوف زدہ نہیں ہے اور گویا کوئی خاص بات نہیں ہوئی ، وہ مڑا اور ناند میں سر ڈال کر اپنے نرم اور پھرتیلے ہونٹوں سے چارے کا صفایا کرنے لگا۔ شروع میں تو وہ صرف گھاس کے تنکوں کو کاٹتا رہا لیکن تھوڑی ہی دیر میں پا گر کے ذائقے نے اسے اکسایا اور وہ تیزی سے کھانے میں جٹ گیا۔ اس دوران اس کے دماغ میں آہستہ آہستہ طرح طرح کے خیالات گزرتے رہے۔ مختلف شکلوں، خوشبوؤں اور آوازوں کی یہ یادیں کچھ دیر ذہن کے افق پر تیرتیں اور پھر ہمیشہ کے لئے تاریکی کے اس مہیب غار میں کھو جاتیں جو موجودہ لمحے کے آگے پیچھے پھیلا ہوا تھا۔

اسے ہیڈ سائیس نزار کا خیال آ گیا جس نے اسے کل رات چارہ دیا تھا۔

نزار لمبا تڑنگا بڈھا تھا۔ اس سے ہمیشہ سیاہ روٹی اور خفیف سی شراب کی دبی دبی خوشبو آتی رہتی، وہ بہت آہستگی اور نرمی سے کام کرتا تھا، اور جب اس کے کام کا وقت ہوتا تو گھاس اور جو کا مزہ ہی بدل جاتا۔ جب وہ گھوڑے کو گھاس کھلاتے ہوئے اس سے مدھم مدھم سروں میں باتیں کرتا اور بڑی محبت سے اسے برا بھلا کہتا تو اسکی باتیں سننے میں کتنا مزا آتا تھا۔ لیکن اس میں ایک ایسی چیز کی کمی تھی جو گھوڑوں کے لئے سب سے زیادہ اہم ہے۔ یعنی جب زمرد کو

کبھی چلایا جاتا تو وہ محسوس کر لیتا کہ نزار کے ہاتھوں میں اعتماد اور مہارت کی کتنی کمی تھی۔

واسیلی میں بھی یہ خصوصیت نہیں تھی۔ وہ گھوڑوں پر چیختا اور انہیں مارتا۔ وہ سب جانتے تھے کہ واسیلی بہت بزدل ہے اور وہ اس سے نہیں ڈرتے تھے۔ وہ ڈھنگ سے گھوڑسواری بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جھٹکے دیتا اور بےحد چلبلاپن کرتا۔ تیسرا سائیس، ایک آنکھ والا سائیس ان دونوں سے بہتر تھا لیکن اسے گھوڑے پسند نہیں تھے۔ وہ بہت بےصبر اور ظالم تھا اور اس کے ہاتھ لکڑی کی طرح سخت تھے۔ چوتھا سائیس اندریاشکا ابھی بچہ سا تھا۔ وہ دودھ پیتے بچھڑے کی طرح ان سے کھیلتا اور چپکے چپکے ان کے اوپر کے لب یا نتھنوں کے بیچ کی جگہ چوم لیتا، یہ کچھ عجیب ناخوشگوار اور احمقانہ سی حرکت تھی۔

لیکن وہ دبلا پتلا اور جھکا ہوا سا آدمی جسکی داڑھی سونچھ صاف تھی اور جو سنہری فریم کی عینک لگاتا تھا، وہ سب سے بالکل مختلف تھا۔ وہ تو ایک لاجواب گھوڑے کی طرح تھا — سمجھدار، قوی اور نڈر۔ وہ کبھی خفا نہ ہوتا، کبھی ہنٹر نہ چلاتا بلکہ کبھی ڈرانے کے لئے بھی ہنٹر نہ اٹھاتا۔ اور جب وہ ٹم ٹم ہانکتا تو اس کی سب کچھ جاننے اور سمجھنے والی قوی اور تیز انگلیوں کے ایک ایک اشارے پر ناچنا کس قدر فرحت بخش

ہوتا، اس سے کتنا جوش پیدا ہوتا، وہ کتنا لاجواب اور پرجلال معلوم ہوتا۔ صرف وہی ایک ایسا شخص تھا جو زمرد کے دل میں وہ خوشی اور ولولہ بھر سکتا تھا جس کی بدولت دوڑ میں تیزی سے تڑپتے ہوئے اسکے جسم کا ہر ہر پٹھا تن جاتا، دل خوشی سے جھوم اٹھتا اور اسے جسم ہوا کی طرح ہلکا محسوس ہونے لگتا۔

لمحے بھر کو زمرد کے تصور کی آنکھ نے اسے گھوڑ دوڑ کے میدان کی طرف جانے والی چھوٹی سی سڑک دکھائی اور اسکے کنارے کھڑا ہوا ہر گھر اور ہر ایک اسکے ذہن میں ابھر آیا۔ وہ راستے کی ریت، بڑا اسٹینڈ، دوڑتے ہوئے گھوڑے، سبز گھاس اور زرد ڈوری تک نظر آنے لگی۔ اچانک اسے وہ تین سالہ سیاہ گھوڑا یاد آگیا جسکے ٹخنے میں کل دوڑ کی مشق کرتے ہوئے سوچ آگئی تھی اور جو اب لنگڑا ہو گیا تھا۔ اسکے متعلق سوچتے سوچتے اس نے خیال ہی خیال میں خود بھی ذرا سا لنگڑانے کی کوشش کی۔

گھاس کا ایک ڈنٹھل جو اس وقت زمرد کے منہ میں گیا تھا، غیرمعمولی طور پر خوشبودار تھا۔ زمرد نے اسے خوب اچھی طرح چبایا اور نگلنے کے تھوڑی دیر بعد تک اسکے منہ میں مرجھائے ہوئے پھولوں اور خوشبودار سوکھی ہوئی گھاس کی خوشبو بسی رہی۔ اس کے ذہن میں ماضی کی ایک دھندلی

دھندلی سی یاد ابھری۔ یہ کچھ ایسی چیز تھی جیسی کبھی کبھی کوئی تمباکو نوش اسی وقت محسوس کرتا ہے جب گلی میں چلتے چلتے سگریٹ کا لمبا سا کش لے اور لمحے بھر کے لئے پرانے فیشن کے کاغذ کی دیواروں والی کوئی برساتی اور کسی الماری پر رکھی ہوئی کوئی بے یارو مددگار شمع نگاھوں کے سامنے ابھر آئے یا رات کے وقت گھنٹوں کی جھنکار اور نیند میں ڈوبا ہوا کوئی لمبا سفر یاد آ جائے، یا تھوڑے فاصلے پر کسی تاریک جنگل، جھلملاتے ہوئے برف یا شکاری ھنکوے کے ھنگامے یا کسی جوشیلی اور ولولہ‌انگیز بات کا خیال آ جائے جس سے ٹانگیں تھرتھرانے لگیں — اور لمحے بھر کے لئے کسی ایسے ھی موقع کے بھلائے ہوئے اتنے ھی ولولہ‌انگیز جذبات جو اب بےجان اور پرسکون تھے اس کے ذھن میں پیدا ہوئے۔ یہ جذبات کچھ دھندلے تھے۔ پیار بھرے مگر یاس‌انگیز۔

اس عرصے میں ناند کے اوپر بنی ہوئی ننھی سی سیاہ کھڑکی سے جو ابھی تک تاریکی کی آغوش میں چھپی ہوئی تھی مدھم مدھم سی روشنی آنے لگی۔ تاریکی میں اس کا دھندلا سا پیکر ابھر آیا۔ اب گھوڑے بہت تساھل اور آرام طلبی کے ساتھ گھاس چبا رہے تھے۔ وہ باری باری سے بہت ھی مدھم اور بھاری سانس لے رہے تھے۔ باھر کہیں کوئی مرغ اپنی جانی پہچانی آواز میں چیخا۔ اسکی

بانگ قمری کی للکار کی طرح خوش آئند اور بلند تھی۔ اس کے بعد بڑی دیر تک قریب اور دور ہر طرف بہت سے مرغے صدا لگاتے رہے۔

زمرد کا سر ناند میں جھکا ہوا تھا اور وہ اس نئے اور انوکھے مزے کو اپنے منہ میں باقی رکھنے اور بڑھانے کی کوشش کر رہا تھا جس نے اس کے دل میں ان لاجواب یادوں کی دھندلی مگر اس قدر زوردار گونج پیدا کردی تھی۔ لیکن اسکی کوششیں بیکار تھیں۔ آخر تھک کر وہ اونگھ گیا۔

۲

اس کی ٹانگوں اور جسم میں بلا کا تناسب تھا۔ اس لئے وہ ہمیشہ کھڑا کھڑا سوتا اور آهسته آهسته آگے پیچھے جھومتا رهتا۔ کبھی کبھی وہ چونک پڑتا اور پھر چند لمحوں کے لئے گھری نیند کے بجائے نیم غنودگی کے عالم میں رهتا۔ لیکن جن چند لمحوں میں وہ سوتا ان میں نیند اتنی گھری ہوتی کہ ان چند لمحوں ھی میں اسکے پٹھوں، نسوں اور کھال کا تناؤ کم ہو جاتا اور اسکے جسم میں تازگی آجاتی۔

وہ دن نکلنے سے ذرا سی دیر پہلے موسم بہار کی ایک صبح، زمین پر طلوع آفتاب کی سرخی کی چادر اور خوشبوؤں میں بسی ہوئی چراہ گاہ کے خواب

دیکھتا رہا۔ گھاس کس قدر گھنی اور رسیلی تھی، اس میں کیسی ولولہ‌انگیز چمک اور ہریالی اور نئے نویلے دن کی روشنی کی کتنی ہلکی سی گلابی گلابی جھلک تھی۔ پورے منظر پر اوس چمک دمک رہی تھی۔ ہلکی پھلکی اور تازگی بخش ہوا میں حیرت انگیز طور پر طرح طرح کی خوشبوئیں تیر رہی تھیں۔ صبح کی خنکی میں کسی گاؤں کی چمنی سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کے نیلے نیلے لہرئے نتھنوں سے ٹکرا رہے تھے۔ چراگاہ کے ہر ہر پھول کی اپنی ایک نرالی خوشبو تھی، اور باڑھ کے اس پار، لیکیں پڑی ہوئی نم نم سی سڑک پر طرح طرح کی خوشبوئیں یکجا ہوگئی تھیں — آدمیوں اور تارکول کی بو، گھوڑوں کی لید اور گرد و غبار کی بو، گزرتی ہوئی گایوں کے تازہ تازہ دودھ کی بو اور باڑھ کے فر کے ستونوں کی سکون بخش بو۔

سات مہینے کا زمرد بے مقصد کھیتوں میں کدکڑیاں بھرتا پھر رہا ہے۔ پچھلی ٹانگوں کو چلاتے ہوئے اس کا سر نیچے کو جھک جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ہوا کا بنا ہوا ہو اور اسے اپنے بدن کے بوجھ کا احساس ہی نہ ہو۔ بابونہ کے سفید خوشبودار پھول اسکے پیروں تلے پامال ہوتے ہوئے پیچھے کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ وہ سیدھا سورج کی طرف بھاگ رہا تھا۔ گیلی گیلی گھاس کے تھپڑ کھا کھاکے اسکے ٹخنے اور

گھٹنے سرد اور سیاہ پڑ گئے تھے۔ نیلا آسمان، ھری ھری گھاس، سونے کی طرح دمکتا ھوا سورج، لاجواب ھوا، جوانی کی گرمی اور ولولہ، طاقت اور سبک رفتاری!

اور اچانک اسے ھنھانے کی محبت بھری، بے چین اور مختصر آواز آئی — اس آواز سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ وہ اسے ھزاروں آوازوں کے درمیان دور ھی سے پہچان لیتا تھا۔ وہ اپنی جگہ رک گیا اور پل بھر کچھ سننے کی کوشش کرتا رھا۔ سر اوپر کو اٹھا ھوا، خوبصورت کان لرزاں اور چھوٹی سی جھبری دم مورچھل کی طرح ھوا میں ابھری ھوئی۔ پھر اس نے بڑی طویل اور سریلی ھنھناھٹ میں اس کا جواب دیا جس سے اس کا متناسب اور لمبی ٹانگوں والا جسم پورا کا پورا تھرا اٹھا۔ اور وہ اپنی ماں کی طرف بھاگا۔

سوکھی ماری سنجیدہ سی بوڑھی گھوڑی نے گھاس سے بھیگی ھوئی ناک اٹھائی اور اپنے بچھیڑے کو دیکھ کر ایکبار تیزی اور محبت سے ھنھنائی اور پھر جھک گئی جیسے اسے کسی ضروری کام پر جانا ھو۔ بچھیڑے نے لچکدار گردن اس کے پیٹ میں گھسا کر سر اٹھایا اور اپنے مخصوص انداز میں ھونٹوں کو اس کی پچھلی ٹانگوں کے بیچ میں گھسا دیا اور اس کا نیم گرم اور لچکدار تھن اپنے منہ میں لے لیا جس سے انتہائی لذیذ اور کچھ

کچھ کھٹا دودھ ٹپکا پڑ رہا تھا۔ پتلی پتلی اور گرم گرم دھاریں اس کے منہ میں جانے لگیں، وہ پیتا رہا، پیتا رہا۔ وہ ختم کرنے کا نام ھی نہیں لے رہا تھا یہاں تک کہ ماں نے ٹانگیں پرے ہٹالیں اور اپنے بچھیڑے کے چڈے میں جھوٹ موٹ سر مارنے کی کوشش کرنے لگی...

اصطبل میں خاصی روشنی پھیل چکی تھی۔ ایک لمبی داڑھی والا بدبودار بکرا جو گھوڑوں کا اصطبل کا ساتھی تھا، دروازے کے قریب پہنچا۔ دروازہ اندر کی طرف ایک سلاخ لگاکر بند کر دیا گیا تھا۔ بکرا مڑمڑ کر سائیس کو دیکھنے اور میں میں کرنے لگا۔ واسیلی ننگے پاؤں اپنے پریشان بال کھجاتے ہوئے دروازہ کھولنے کے لئے بڑھا۔ خزاں کی یہ نیلی نیلی سی صبح بہت تازگی‌بخش تھی۔ کھلا ہوا مستطیل دروازہ فوراً اصطبل سے اٹھتی ہوئی بھاپ سے بھر گیا۔ اور تھانوں کے اوپر سفید سفید پالے اور گلی سڑی پتیوں کی بو تیرنے لگی۔

گھوڑے جانتے تھے کہ اب انہیں جو ملنے‌والی ہے۔ وہ اپنے اپنے تھانوں کے دروازوں پر کھڑے بےصبری سے ھنھنا رہے تھے۔ لالچی اور طاقتور اونیگن لکڑی کے فرش کو کھرچ رہا تھا اور نانڈ کی آھنی کگر کو چبائے ڈال رہا تھا۔ وہ گردن بڑھا بڑھا کر ھوا پی رہا تھا اور ڈکار رہا تھا۔ زمرد سلاخوں سے اپنا چہرہ مل رہا تھا۔

دوسرے سائیس — (سب ملا کر چار تھے) — آئے اور کھانے کے پیپوں سے جو بانٹنے لگے۔ نزار زمرد کی ناند میں سرسراتے ہوئے بھاری بھرکم جو ڈال رہا تھا۔ اور وہ نہایت ہنگامہ خیز انداز میں بڑے میاں کی بغل کے اندر سے اور شانے کے اوپر سے ہو ہوکر چارے تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسکے گرم نتھنے پھڑک رہے تھے۔ سائیس کو اس نیک اور شریف گھوڑے کی یہ بےتابی بہت پسند تھی۔ وہ جان بوجھ کر دیر کرتا رہا اور اپنی کہنی سے ناند کا راستہ روکے رہا۔

''اے لالچی شیطان...،، وہ خوش دلی سے بڑبڑایا۔ ''ایسی کیا جلدی پڑی ہے؟ لعنت ہو تجھ پر! اب گھسا تو سہی اپنی تھوتھنی ایسا بتاؤں گا تجھے کہ...،،

چھوٹی سی کھڑکی سے سورج کی روشنی کا ایک منور ستون سا پھسلتا ہوا ناند پر پڑ رہا تھا۔ اور اس میں سنہری سنہری گرد کے کروڑوں ذرے ناچ رہے تھے۔ کھڑکی کے شیشے کے پٹ سے لمبے لمبے سایوں نے انھیں تقسیم کر دیا تھا۔

۳

زمرد نے جو ختم کی ہی تھی کہ اسے باہر نکالا گیا۔ اب موسم خاصا گرم ہو گیا تھا اور زمین ذرا نرم پڑ چلی تھی۔ لیکن اصطبل کی دیواریں ابھی

تک پالے کی وجہ سے سفید سفید سی ہو رہی تھیں۔ لید کے ڈھیر سے، جو ابھی ابھی اصطبل سے نکالا گیا تھا، بھاپ کے بادل اٹھ رہے تھے اور لید میں چونچیں مارتی ہوئی گوریاں خوشی اور بے تابی سے چہچہا رہی تھیں، جیسے آپس میں لڑ جھگڑ رہی ہوں۔ زمرد نے چوکھٹ سے نکلتے ہوئے سر جھکا لیا اور خوشبودار ہوا کو خوش خوش اپنے سانسوں میں بسانے لگا۔ پھر اس نے سر ہلایا اور پورا دھڑ تھرتھراتے ہوئے ایک بار زور سے ہنہنایا۔ ''خدا تجھے خوش رکھے!،، نزار نے خلوص سے کہا۔ زمرد کے لئے نچلا کھڑا ہونا ناممکن تھا۔ اسے تو زوردار قسم کی حرکت پسند تھی، اور آنکھوں اور نتھنوں میں چبھتے ہوئے ہوا کے تھپیڑوں کی گدگدی بہت بھاتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا دل انتہائی جوش اور گرمی کے ساتھ دھڑکے۔ وہ گہرے گہرے سانس لینے کو بے قرار تھا۔ وہ کھونٹے سے بندھا بندھا ہنہنا رہا تھا اور اپنی پچھلی ٹانگوں پر اچھل کود رہا تھا۔ وہ گردن موڑ موڑ کر ترچھی نظروں سے اپنے پیچھے کھڑی ہوئی سیاہ گھوڑی کو دیکھ رہا تھا جسکی آنکھیں گول اور سیاہ تھیں اور آنکھ کی سفیدی پر سرخ سرخ سی دھاریاں ابھری ہوئی تھیں۔

نزار نے محنت سے ہانپتے ہوئے پانی کی بالٹی سر سے اوپر اٹھائی اور شانوں سے دم تک گھوڑے

کی پوری کمر پر انڈیل دی۔ یہ احساس زمرد کے لئے نیا نہ تھا — بڑا جانفزا مگر بڑا خوفناک کیونکہ یہ سب ہمیشہ کتنا اچانک ہو جاتا تھا۔ نزار اور پانی لایا اور گھوڑے کے دھڑ، سینے، ٹانگوں اور دم کے نیچے بہا دیا۔ ہر دفعہ گیلا کرنے کے بعد وہ اپنے سوکھے مارے ہاتھ سے گھوڑے کی کھال سہلاتا اور اس سے پانی پونچھتا جاتا۔ زمرد نے پلٹ کر دیکھا تو اسے خود اپنے دھڑ کا اونچا اور ہلکا سا جھکا ہوا پچھلا حصہ نظر آیا جو دھوپ میں سیاہ سا ہو گیا تھا اور شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔

آج گھوڑدوڑ کا دن تھا۔ سائیسوں کی ایک خاص قسم کی بےچینی اور گھوڑوں کے اردگرد ہنگامہ‌سا ہونے سے زمرد یہ سمجھ جاتا تھا۔ سائیس بعض گھوڑوں کے ٹخنوں پر چمڑے کے موزے باندھتے جو ان کے چھوٹے دھڑوں کے لئے ذرا زیادہ لمبے ثابت ہوتے، بعض گھوڑوں کی ٹانگوں کے گرد ٹخنوں سے گھٹنوں تک کپڑے کی پٹیاں باندھی جاتیں، بعض کی اگلی ٹانگوں کے چڈوں میں سمور لگی ہوئی گدیاں سی باندھی جاتیں۔ دو پہیوں والی ہلکی پھلکی ٹم ٹمیں سائبان سے نکالی جاتیں، انکے دھات کے دھرے دھوپ میں چمچما اٹھتے۔ ان کے پہیوں کے لال گھیرے اور لال بم کھول دئے جاتے اور انکا نیا نیا روغن چمکنے لگتا۔

جب تک اصطبل کا سب سے بڑا انگریز جاکی وہاں پہنچے، زمرد کو اچھی طرح خشک کرکے گھسائی کر دی جاتی تھی اور اونی کپڑے سے اسکی مالش کردی جاتی تھی۔ گھوڑے اور آدمی دونوں ھی اس سوکھے مارے، ھلکے سے کبڑے اور دراز بازوؤں والے شخص کا احترام بھی کرتے تھے اور اس سے ڈرتے بھی تھے۔ اس کا دھوپ میں سنولایا ھوا چہرہ داڑھی مونچھ سے آزاد تھا اور اسکے سخت اور پتلے پتلے ھونٹ ھمیشه ایک طنزیه سے انداز میں مڑے رھتے تھے۔ اسکی ھلکی نیلی آنکھیں سنہری فریم کی عینک کے پیچھے سے بڑے سکون اور ٹھیراؤ کے ساتھ جھانکتی رھتیں۔ وہ اونچے اونچے جوتوں میں چھپی ھوئی لمبی لمبی ٹانگیں چیر کر کھڑا ھو جاتا اور صفائی ھوتے دیکھتا رھتا۔ اسکے ھاتھ پتلون کی جیبوں میں کھوئے رھتے۔ وہ سگار چباتا رھتا اور اسے منه کے ایک کونے سے دوسرے میں گھماتا رھتا۔ وہ سمور کا کالر لگی ھوئی بھوری صدری اور اونچی سی مستطیل چوٹی والی سیاہ ٹوپی میں ملبوس رھتا۔ کبھی کبھی وہ یونہی بےدلی سے جھٹکے دے دے کر نہایت نپے تلے جملوں میں کچھ اظہارخیال کرتا۔ فوراً سارے سائیس اور مزدور منه پھیر پھیر کر اسکو دیکھتے اور گھوڑے کان کھڑے کر لیتے۔

وہ زمرد کی دیکھ بھال پر بہت دھیان دیتا۔

اس نے سر سے پاؤں تک گھوڑے کے جسم کا معائنہ کیا اور اس کی چبھتی ہوئی نظروں کے سائے میں زمرد نے فخر سے سر اٹھا کر آہستہ سے اپنی لچکدار گردن گھمائی۔ اسکے پتلے اور نیم شفاف کان کھڑے ہو گئے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ زیر بند اچھی طرح کسا ہوا ہے یا نہیں، جاکی نے خود اس میں انگلیاں گھسا کر دیکھا، اور پھر سائیسوں نے گھوڑے پر لال گوٹ والی بھوری زین رکھ دی۔ یہ زین کپڑے کی تھی اور اس میں سرخ گولے، آنکھوں کے پاس اور پچھلی ٹانگوں کے پاس سرخ مونوگرام تھے۔ دو سائیس، نزار اور کانا شخص زمرد کی لگام تھام کر اسے جانے پہچانے راستے سے گھوڑدوڑ کے میدان کی طرف لے گئے۔ سڑک کے دونوں طرف پتھر کے بڑے بڑے مکان قطار باندھے کھڑے تھے۔ میدان یہاں سے پاؤ میل سے بھی کم فاصلے پر تھا۔

میدان میں بہت سے گھوڑے پہنچ چکے تھے۔ اور سائیس انھیں ایک دائیرے میں آہستہ گھما رہے تھے، ان کا رخ اسی سمت میں تھا جس سمت میں عام طور پر دوڑ کے وقت ہوتا تھا یعنی گھڑی کی سوئیوں کے الٹے رخ پر۔ میدان کے اندرونی گھیرے میں چھوٹے گھوڑوں کو گھمایا جا رہا تھا۔ ان کی ٹانگیں بہت مضبوط اور دم کٹی ہوئی تھی۔ زمرد نے فوراً چھوٹے سے سفید گھوڑے کو پہچان لیا

جو اسکے پہلو میں دوڑا کرتا تھا۔ دونوں گھوڑوں نے بڑے دوستانہ انداز میں ہنہنا کر ایک دوسرے کو سلام کیا۔

٤

گھوڑ دوڑ کے میدان میں گھنٹی بجی۔ سائیسوں نے زمرد کا کپڑا اتار دیا۔ انگریز بغل میں ہنٹر دبائے دستانے کے بند لگاتا ہوا آگے بڑھا۔ دھوپ کی تیزی سے عینک کے پیچھے اس کی آنکھیں جھپک رہی تھیں اور لمبے لمبے زرد اور گھوڑے جیسے دانت نظر آرہے تھے۔ ایک سائیس نے زمرد کی ٹخنوں تک لٹکتی ہوئی گھنی دم سمیٹی اور بڑے احتیاط سے اسے ٹم ٹم کی سیٹ پر رکھ دیا، دم کا ہلکے سے رنگ کا کونا اب بھی لٹک رہا تھا۔ آدمی کے بوجھ تلے بم جھوم اٹھے۔ زمرد نے ترچھی نظروں سے اپنے شانے کے اوپر دیکھا اور اسے اپنے بالکل پیچھے جاکی بیٹھا نظر آیا۔ جاکی کی ٹانگیں پھیلی ہوئی تھیں اور بموں سے ٹکرا رہی تھیں۔ اس نے بڑے اہتمام کے ساتھ لگام سنبھالی اور کچھ کہا، اور سائیسوں نے فوراً لگام چھوڑ دی۔ آنےوالی گھوڑ دوڑ کے خیال سے خوش ہوکر زمرد نے آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن مضبوط ہاتھوں نے اسے روک دیا، اور وہ اپنی پچھلی ٹانگوں پر ذرا سا آگے بڑھ کے رہ گیا۔ اس نے سر کو ایک جھٹکا دیا اور خراماں خراماں

گھیرے کے پھاٹک سے گھوڑ دوڑ کے میدان کی طرف چل دیا۔

لکڑی کی باڑھ کے ساتھ ساتھ ایک چوڑا سا راستہ دوڑتا چلا گیا تھا۔ اس کی شکل بیضوی سی تھی اور اس پر پیلی پیلی ریت پھیلی ہوئی تھی۔ ریت کچھ سیلی سیلی اور بڑی گچھی گچھی سی تھی اور پاؤں تلے بڑی لچکدار معلوم ہو رہی تھی۔ کھروں کے تیز نشانوں اور گاٹا پارچہ کے ٹائروں کے بتائے ہوئے سیدھے سیدھے نشانوں نے بڑے صاف ستھرے نقش و نگار بنا دئے تھے۔

اور یہ تھا گرینڈ اسٹینڈ جسکی لمبان تقریباً دو سو گھوڑوں کی لمبان کے برابر تھی اور جہاں چھت سے زمین تک انسانوں کے سیاہ دل کے دل امنڈے پڑ رہے تھے۔ اسٹینڈ کی چھت لمبے لمبے ستونوں پر ٹکی ہوئی تھی۔ لگام کی ہلکی سی جنبش سے زمرد سمجھ گیا کہ اب اسے اپنی رفتار ٹھیک کرنی چاہئے۔ وہ تشکرآمیز لہجے میں ھنھنایا۔

اب وہ نہائت سبک‌روی سے دلکی دوڑ رہا تھا۔ اس کی پشت میں برائے نام مدوجزر پیدا ہو رہے تھے اور اسکی آگے کو بڑھی ہوئی گردن ذرا سی بائیں ھاتھ کے بم کی طرف کو مڑی ہوئی تھی اور چہرہ ہوا میں بلند تھا۔ اسکے قدم غیر معمولی حد تک لمبے تھے۔ اس لئے تھوڑے سے فاصلے سے یہ اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ تیز بھاگ رہا

ہے، ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے دلکی چال والا یہ گھوڑا اطمینان سے اپنی اگلی ٹانگوں سے راستہ ناپ رہا ہے۔ اسکی اگلی ٹانگیں پرکار کی ٹانگوں کی طرح سیدھی تھیں اور اسکے کھر زمین کے بجائے ہوا پر پڑ رہے تھے۔ یہ اسریکی تربیت کا نتیجہ تھا جو اس طریقے پر دی جاتی ہے کہ گھوڑے کے لئے سانس لینا آسان ہو جائے، ہوا کا دباؤ کم سے کم ہو جائے، اور ایسی تمام جنبشیں ختم ہو جائیں جو دوڑ کے لئے غیر ضروری ہیں اور جو صرف گھوڑے کی طاقت برباد کرتی ہیں۔ اس تربیت سے رفتار کا حسن بھلے ہی ختم ہو جائے، لیکن اس میں بلا کا ہلکاپن، چھیریراپن، زیادہ دم اور تیزرفتاری آجاتی ہے، اور اس طرح گھوڑا انتھک مشین بن جاتا ہے۔

اور اب دو دوڑوں کے درمیانی وقفے میں دلکی چلنے والے گھوڑوں کو تازہ دم کیا جا رہا تھا۔ ان کا دم سدھانے کے لئے ہمیشہ انھیں گرم کیا جاتا تھا۔ ان میں سے بہت سے باھری حلقے میں اسی سمت میں دوڑ رہے تھے جس میں وہ دوڑ رہا تھا اور بہت سے اندرونی حلقے کے گرد اس سے مخالف سمت میں دوڑ رہے تھے۔ خالص اوریول نسل کا ایک اونچا سا چتکبرا گھوڑا زمرد کے قریب سے گزرا۔ کمانی جیسی گردن اور اڑتی ہوئی دم کی وجہ سے وہ عجیب چرخ چوں قسم کا گھوڑا معلوم ہو رہا

تھا۔ اسکا موٹا سا چوڑا چکلا سینہ ابھی سے پسینے کی وجہ سے سیاہ ہو گیا تھا، اور جب وہ بھاگتے ہوئے گھٹنے کے قریب سے اپنی اگلی ٹانگیں بڑھاتا تو اسکے چڈے ڈگمگانے لگتے اور ہر ہر قدم پر اسکی تلی بج اٹھتی۔

اور پھر ایک دبلی پتلی اور لمبے سے دھڑوالی بھوری اور دوغلی گھوڑی پیچھے سے برابر آ گئی۔ اسکے ایال چھدرے اور سیاہ تھے۔ اسکی تربیت بھی بہت اچھی تھی اور اسی امریکی طریقہ کے مطابق ہوئی تھی جسکے مطابق زمرد کی ہوئی تھی۔ اس کی پشت کی کسی کسائی کھال چمک رہی تھی اور متحرک پٹھوں کی وجہ سے کھال میں لہریں پیدا ہو رہی تھیں۔ دونوں گھوڑوں کے جاکی آپس میں کچھ بات کرتے رہے اور وہ دونوں تھوڑی دیر تک شانہ بشانہ دوڑتے رہے۔ زمرد گھوڑی کو دیکھ کر ہنہنایا اور دوڑتے دوڑتے کچھ دلکی کرنے والا تھا لیکن انگریز نے اسے اجازت نہیں دی اور اسے سر تسلیم خم کرنا ہی پڑا۔

ایک دیوھیکل سیاہ گھوڑا تیزی سے ان کے قریب سے نکل گیا۔ وہ مخالف سمت میں جا رہا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک پیٹیوں، گھٹنے پوشوں اور چڈوں کی گدیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اسکا بائیں ہاتھوالا بم دائیں ہاتھ والے بم سے چودہ انچ لمبا تھا، اس لئے آگے کو نکلا ہوا تھا۔ سر پر ایک

چھلے کے ذریعے آھنی روک کا فیتہ بندھا ھوا تھا جس نے گھوڑے کی بےتاب ناک کو بڑی بےدردی سے پکڑ رکھا تھا۔ زمرد اور گھوڑی دونوں نے بیک وقت اس کو دیکھا اور دونوں ھی نے اسکی دلکی چلنے کی بلا کی صلاحیت کو سراھا۔ اسکی طاقت، رفتار اور تگڑےپن کو سراھا لیکن ساتھ ھی انھوں نے دیکھا کہ وہ انتہائی سرپھرا، بدطینت اور تنک‌مزاج ھے۔ سیاہ گھوڑے کے پیچھے ایک چھوٹا سا چست و چالاک ھلکا بھورا گھوڑا تھا۔ ایک طرف سے دیکھنے سے خیال ھوتا تھا کہ وہ انتہائی تیز دوڑ رھا ھے کیونکہ وہ نہایت تیزی سے ٹانگیں چلا رھا تھا، اور ھر دفعہ پنڈلیاں بےحد اوپر اٹھاتا تھا اور پھر اسکی ھلال نما گردن، اور چھوٹے سے متناسب سر سے انتہائی کاروباری انداز ٹپک رھا تھا۔ زمرد نے حقارت‌بھری ترچھی نظر سے اسے دیکھا اور اس کی طرف‌والے کان کو ایک بار پھڑپھڑایا۔

دوسرے جاکی نے مختصر مگر اونچی سی آواز میں ھنہناھٹ سے ملتا ھوا سا قہقہہ لگایا اور بات چیت ختم کرکے گھوڑی کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی۔ وہ اس قدر سکون سے زمرد کے قریب سے نکلی گئی جیسے اس میں اسے کوئی کوشش ھی نہ کرنی پڑی ھو اور پھر نہایت اطمینان اور پھرتی سے اسکے آگے دوڑنے لگی۔ اسکی ھموار اور چمکدار پشت جس

کے کنارے پر برائےنام دھاری پڑی ہوئی تھی نہایت ہموار معلوم ہو رہی تھی۔

لیکن اسکے فوراً ہی بعد ایک شعلے کی طرح سرخ گھوڑا سرپٹ دوڑتا ہوا آیا اور زمرد اور گھوڑی دونوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا نکل گیا۔ اسکے اوپر بڑا سا سفید ستارہ آویزاں تھا۔ وہ بڑے بڑے ڈگ بھر رہا تھا۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ وہ زمین کھرچ رہا ھے اور کبھی ایسا لگتا جیسے مٹی دبا رہا ھے۔ پھر اچانک جیسے اسکی اگلی اور پچھلی ٹانگیں ہوا میں ایک دوسرے سے جڑ جاتیں۔ اس کا جاکی پیچھے کو اسقدر تنا ہوا تھا جیسے لیٹا ہو۔ اس کا پورا وزن لگام پر پڑا ہوا تھا۔ زمرد بھنا گیا اور لاتیں چلاکر ایک طرف کو ہٹا لیکن انگریز نے بہت ہی آہستہ سے اسکی لگام کھینچی۔ اور وہ نازک سے ھاتھ جو گھوڑے کی ایک ایک جنبش سے واقف تھے اچانک لوھے کی طرح سخت ہو گئے۔ بڑے اسٹینڈ کے قریب لال گھوڑا جو اب تک ایک چکر اور کر چکا تھا پھر زمرد کے قریب سے گزرا۔ وہ ابھی تک سرپٹ دوڑ رہا تھا لیکن پسینے سے شرابور تھا اور اسکی آنکھیں لال انگارہ ہو گئی تھیں، اور سانس اکھڑ سا رہا تھا۔ جاکی آگے کو جھکا ہوا اپنی پوری طاقت سے گھوڑے کی پشت پر ہنٹر جما رہا تھا۔ آخرکار پھاٹک کے قریب سائیسوں نے گھوڑے کو جا لیا اور اسکی لگام اور زین پکڑکر اسے روکا۔

وہ پسینے سے شرابور ھانپتا کانپتا باھر لے جایا گیا، منٹوں میں اسکا وزن گھٹ گیا تھا۔

زسرد تھوڑی دور سرپٹ دوڑا اور پھر کنارے والے راستے پر آگیا جو میدان کے ایک سرے سے دوسرے سرے کی طرف جاتا تھا۔ وہ پھر واپس میدان میں پہنچ گیا۔

۵

گھوڑ دوڑ کے میدان کی گھنٹی کئی دفعہ بجی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد دوڑ میں شریک گھوڑے شعلے کی طرح کھلے پھاٹک سے گزر جاتے، پل بھر کو بجلی سی کوندتی اور اسٹینڈ پر کھڑے ہوئے لوگ اچانک شور مچانے اور تالیاں بجانے لگتے۔ دوسرے گھوڑوں کے درمیان زسرد بھی نزار کے ساتھ ساتھ نہایت پھرتی سے گزر گیا۔ اسکا جھکا ھوا سر ھل رھا تھا اور کپڑے میں لپٹے ہوئے کان متحرک تھے۔ ورزش کی وجہ سے اسکی رگوں میں خون کا بدمست اور گرم گرم چشمہ سا موجزن تھا۔ اسکا جسم ھلکا اور سرد، سانس زیادہ گہرا اور زیادہ ھلکا ھوتا چلا گیا۔ اب اسکا ایک ایک پٹھا ایک اور دوڑ کے لئے بےقرار تھا۔

تقریباً آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ پھر گھنٹی بجی۔ اس دفعہ جاکی دستانے پہنے بغیر ھی ٹم‌ٹم میں سوار

ہو گیا۔ اسکے چوڑے چکلے اور سفید سفید ہاتھوں میں بلا کا جادو تھا۔ یہ ہاتھ زمرد کے دل میں عزت و احترام اور محبت کا جذبہ جگا دیتے تھے۔

انگریز مدھم مدھم چال سے میدان تک پہنچا جہاں سے وہ گھوڑے ایک ایک کرکے پیڈوک تک جا رہے تھے جنھوں نے ورزش ختم کرلی تھی۔ اب تو روش پر صرف دو گھوڑے باقی تھے — زمرد اور دیوھیکل سیاہ گھوڑا جو زمرد کو نمونے کی دوڑ میں ملا تھا۔ اسٹینڈوں پر اوپر سے نیچے تک لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ طرح طرح کے چمکتے اور دھکتے ہوئے چہروں اور ہاتھوں کا یہ سیاہ بادل جسکا تسلسل کہیں کہیں خواتین کی ٹوپیوں اور چھتریوں کی وجہ سے ٹوٹ سا جاتا تھا، مسلسل پروگرام کے چھوٹے چھوٹے سفید کاغذوں سے دست و گریبان ہو رہا تھا۔ زمرد نے اپنے قدم تیز کر دئیے اور دوڑتا ہوا بڑے اسٹینڈ کے پاس سے گزرا تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ہزاروں نظریں اسکا تعاقب کر رہی ہوں۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ نظریں اس سے اپنے خون کی ہر ہر بوند اور دل کی ہر ہر دھڑکن وارنے اور زیادہ تیز بھاگنے کی آس لگائے ہوئے ہیں — اور اس خیال نے اسے سرمست کر دیا، اسکے اعصاب میں زیادہ سکون، زیادہ پھرتی اور قوت پیدا ہو گئی۔ دائیں ہاتھ پر جانا پہچانا سفید گھوڑا اسکے

ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ اسکی پیٹھ پر ایک لڑکا سوار تھا اور اسکی رفتار میں بلا کی پھرتی تھی۔

زمرد نہایت سکون کے ساتھ ایک خاص رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ اسکا جسم بائیں طرف کو ذرا سا جھکا ہوا تھا۔ اس نے ایک چکر پورا کرلیا — جب وہ سرخ گھیرےوالے ستون کے قریب سے گزرا تو میدان میں گھنٹی کی مختصر سی آواز گونجی۔ انگریز اپنی جگہ پر ذرا سا کسمسایا، اور اچانک اسکی گرفت سخت ہوگئی۔ ''چلو، اب بڑھو، مگر ذرا طاقت بچاکے، ابھی بہت وقت پڑا ھے،، — اسکے ہاتھوں نے زمرد سے سرگوشی کی اور یہ ظاھر کرنے کے لئے کہ وہ سمجھ گیا ھے، زمرد نے اپنے باریک اور حساس کان پیچھے کو پھینکے اور پھر کھڑے کر لئے۔ سفید گھوڑا ثابت قدی سے اس کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا، اس سے بس ذرا سا پیچھے تھا۔ زمرد کو اپنے شانے کے قریب اس کا ھموار سانس محسوس ہو رہا تھا۔

سرخ ستون پیچھے رہ گیا۔ ایک اور گہرا سا موڑ آیا اور پھر راستہ ھموار ھو گیا۔ پھر دوسرا اسٹینڈ آ گیا جو بولتے چہکتے لوگوں کے ھجوم سے سیاہ ھو رہا تھا اور اسی سیاھی پر ھجوم کی رنگارنگی نے طرح طرح کے دھبے سے ڈال دئے تھے۔ ہر قدم پر یہ سیاھی بڑھتی ھی چلی جا رہی تھی۔ ''اور تیز،، جاکی نے اسے اجازت دی۔ ''تیز، اور

تیز!،، ہلکا سا اشارہ کافی تھا۔ زمرد کا دل چاہا کہ اپنی تمام طاقت صرف کر دے۔ ''کیوں ساری طاقت لگا دوں؟،، اس نے سوچا۔ ''نہیں، ابھی بہت باقی ہے، جذباتی نہ ہو،، ہاتھوں کے سکون‌خیز سحر نے جواب دیا۔ ''بعد میں۔،،

دونوں گھوڑے مقابلے کی حد سے ایک ہی پل میں گزرے لیکن دونوں دو مخالف سروں سے۔ تانت کی رسی کی ہلکی سی مزاحمت اور اچانک ہٹ جانے سے لمحے بھر کے لئے زمرد کے کان کھڑے ہو گئے۔ لیکن ان سحرانگیز ہاتھوں میں ہونے کی وجہ سے وہ فوراً ہی اسکے بارے میں بھول گیا۔ ''ذرا اور تیز، جذباتی نہ ہو! اطمینان سے!،، جاکی نے حکم دیا۔ اسٹینڈ کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سیاہ سمندر پیچھے رہ گیا۔ پچاس ساٹھ گز اور ہیں اور زمرد، چھوٹا سفید گھوڑا، انگریز اور چھوٹی رکاب میں کھڑا ہوا اصطبل کا لڑکا جو اپنے گھوڑے کی گردن میں لپٹا ہوا تھا ایک ہی پرمسرت جتھے میں ضم ہو گئے، ایک ہی خواہش تھی جو ان سب کو گرما رہی تھی، طاقت اور حرکت کا خوبصورت انداز اور ایک مخصوص نغمہ تھا جو ان سب کو بڑھاوا دے رہا تھا۔ ''ٹا۔ٹا۔ٹا۔ٹا!،، زمرد کی ٹاپوں کی مسلسل اور نپی تلی ٹھپ ٹھپ کی آواز آ رہی تھی۔ ''ٹرا۔ٹا۔ٹرا۔ٹا!،، لڑکے کا گھوڑا آواز میں آواز ملا رہا تھا۔ ایک اور موڑ، اور ایک اور

اسٹینڈ ان سے قریب تر ہوتا چلا گیا۔ ”کیا، اور تیز چلوں؟“ زمرد نے پوچھا۔ ”ہاں“ ہاتھوں نے جواب دیا۔ ”لیکن آپے سے باہر نہ ہونا۔“

دوسرا اسٹینڈ تیزی سے پیچھے رہ گیا۔ لوگ چیخ رہے تھے، اس سے زمرد کی توجہ بٹ گئی۔ وہ جذباتی ہو گیا اور لگام کا لمس بھول کر لمحے بھر کو اس خوش آہنگ موسیقی سے جدا ہو گیا۔ اس نے چار غیر معمولی چھلانگیں لگائیں اور وہ نپی تلی راہ سے کھسک گیا۔ لیکن دفعتاً لگام کھنچی اور اس کا منہ چرتا چلا گیا۔ اسکی گردن نیچی ہو گئی اور سر دائیں طرف کو مڑ گیا، اور اب اس انداز میں دوڑنا مشکل تھا جس میں وہ چاہتا تھا۔ وہ بگڑ گیا اور اس نے اپنی چال بدلنے سے انکار کر دیا۔ لیکن جاکی نے ٹھیک موقع پر قابو پا لیا اور پرسکون اور فیصلہ کن طریقے سے گھوڑے کو سرپٹ دوڑا دیا۔ اسٹینڈ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ زمرد پھر قدم سے قدم ملا کے چلنے لگا۔ اور پھر ہاتھ نرم اور گرم ہو گئے۔ زمرد کو اپنی غلطی کا احساس تھا اور وہ اپنی چال دوگنی کرنے کو تیار تھا۔ ”نہیں، نہیں، ابھی نہیں“ جاکی نے خوش دلی سے کہا۔ ”اس کمی کو پورا کرنے کا موقع مل جائیگا، گھبراؤ نہیں، سب ٹھیک ہے۔“

اور اس طرح، مزید غلطی کئے بغیر انہوں نے نہائت ہم آہنگی کے ساتھ ڈیڑھ لیپ اور پورا

کرلیا۔ لیکن اس دن سیاہ گھوڑا بھی زوروں پر تھا، جس وقت زمرد حماقت کر رہا تھا اس وقت سیاہ گھوڑا اس سے گھوڑوں کے چھہ جسموں کی لمبائی سے آگے نکل گیا، لیکن اب زمرد پھر آگے بڑھ رہا تھا اور جب وہ آخری ستون کے پہلے ستون کے پاس پہنچے تو زمرد سواتین سیکنڈ آگے تھا۔ ''اب چل سکتے ہو!،، جاکی نے حکم دیا۔ زمرد نے کان گرا لئے اور اس نے پل بھر کو مڑکر دیکھا۔ انگریز کا چہرہ جوش و خروش کی وجہ سے لال ہو رہا تھا۔ مونچھوں کے سایے سے بےنیاز ہونٹ بےصبری سے کھلے ہوئے تھے اور اسکے بڑے بڑے زرد اور بھنچے ہوئے دانت جھانک رہے تھے۔ ''اب اپنا پورا زور لگا دو!،، اٹھے ہوئے ہاتھوں میں تھمی ہوئی لگام نے سرگوشی کی۔ ''اور، اور!،، اور اچانک انگریز تھرتھراتی ہوئی آواز میں چیخا: ''او۔ ی۔ ی۔ ی۔ ئے!،، اور اسکی آواز سائرن کی طرح گونجتی گئی۔

''ہاں! ہاں! ہاں! ہاں!،، لڑکے نے دوڑ کی تال پر تان لگائی۔ اور اب جوش اپنی انتہا پر تھا اور کسی لمحے اس کے بےقابو ہو جانے کا امکان تھا۔ ''ٹرا۔ ٹا۔ ٹا۔ ٹا!،، زمرد کے قدم بڑے آھنگ کے ساتھ زمین پر پڑ رہے تھے۔ ''ٹرا۔ ٹرا۔ ٹرا!،، سفید گھوڑے کے قدموں کی آھٹ آگے سے آ رہی تھی۔ زمرد اس سے پیچھے تھا۔ لچکدار

ہم دوڑ کے ساتھ بڑے آہنگ سے جھوم رہے تھے اور لڑکا جو گھوڑے کی گردن پر تقریباً لیٹا ہوا سا تھا، گھوڑے کے ہر ہر قدم پر اوپر نیچے اچھل رہا تھا۔

مخالف ہوا سنسناتی ہوئی اسکے کانوں میں سیٹیاں بجا رہی تھی اور اسکے نتھنوں میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔ کبھی کبھی نتھنوں سے بھاپ کا فوارہ سا ابل پڑتا۔ اب سانس لینا مشکل ہو رہا تھا اور کھال گرم ہو چلی تھی۔ آخری موڑ کا چکر کاٹتے ہوئے زمرد کا تقریباً پورا جسم اندر کو مڑ گیا۔ اگلا اسٹینڈ جیتے جاگتے دل کی طرح آن پہنچا۔ ہزاروں گلوں سے نکلی ہوئی چیخ پکار نے، جو ہمت بڑھانے کے لئے ابھر رہی تھی، اسے خوفزدہ، جذباتی اور مست کر دیا۔ اب وہ دلکی نہیں چل سکتا تھا اور سرپٹ دوڑنے والا ہی تھا کہ اسکی پشت والے سحرخیز ہاتھوں نے اسکی منت کی، حکم اور دلاسا دیا۔ اور کہا: ''سرپٹ نہ دوڑ، بیٹے، خدا کے لئے سرپٹ نہ دوڑ! ہاں، یہ بات! ہاں، بس یوں!،، زمرد دوڑتا ہوا جیت کے ستون کے قریب سے گزرا اور رسی کو دیکھے بغیر اسے توڑتا ہوا نکل گیا۔ بڑے اسٹینڈ سے چیخوں، قہقہوں اور تعریفوں کا طوفان ابل پڑا۔ تیرتے ہوئے چہروں اور ہاتھوں میں چھتریاں، چھڑیاں، ٹوپیاں اور پروگرام کے سفید کاغذ تڑپے اور گھومنے لگے۔ انگریز نے

بہت محبت سے لگام چھوڑ دی گویا اس جنبش نے زمرد سے سرگوشی کی: ''چلو، ختم ہوئی۔ شکریہ، کلیجے کے ٹکڑے، شکریہ!'' — اور تب بڑی مشکل سے خود پر قابو پانے کے بعد وہ چھل قدمی کرنے لگا۔ اب میدان کے اس پار سیاہ گھوڑا آخری حد کو چھو رہا تھا — سات سیکنڈ بعد۔

انگریز نے بمشکل تمام اپنے جمے ہوئے پاؤں اٹھائے اور نہائت بھاری بھرکم انداز سے ٹم ٹم سے کود پڑا۔ اس نے مخملیں گدی اٹھائی اور ترازو کی طرف گیا۔ سائیس لپکے اور انھوں نے زمرد کی بھاپ نکلتی ہوئی پشت پر کپڑا ڈال دیا۔ اور پھر لگام تھام کر اسے پیڈوک میں لے گئے۔ ہجوم کا شور اور چیخیں ان کا تعاقب کر رہی تھیں اور پھر جدھر جج بیٹھے تھے وہاں سے لمبی گھنٹی کی آواز آئی۔ گھوڑے کے منہ سے ہلکا زرد زرد سا جھاگ نکل کر زمین پر اور سائیسوں کے ہاتھوں پر گر رہا تھا۔

چند منٹ بعد زمرد کی زین وغیرہ اتار دی گئی اور وہ پھر بڑے اسٹینڈ کی طرف واپس لایا گیا۔ لمبے سے اورکوٹ اور جھلملاتے ہوئے نئے ہیٹ میں ملبوس ایک لمبے سے صاحب نے اسکی گردن تھپکی اور شکر کا ایک ڈالا اپنی ہتیلی پر رکھ کر گھوڑے کے منہ کے آگے کر دیا۔ زمرد نے اس شخص کو اکثر اپنے اصطبل میں دیکھا

تھا۔ انگریز بھی وھیں اسی مجمع میں کھڑا تھا۔ وہ مسکرا رھا تھا۔ اس کے چہرے پر سلوٹیں ابھر آئی تھیں اور لمبے لمبے دانت نظر آ رہے تھے۔ زمرد کی پشت سے کپڑا اتار دیا گیا، اور اسے ایک تین ٹانگوں والے بکس کے برابر کھڑا کر دیا گیا۔ بکس پر سیاہ کپڑا بچھا ہوا تھا اور بھورے کپڑوں والا ایک شخص غڑاپ سے اسکے اندر گھسا اور وھاں نجانے کیا کرنے لگا۔

پھر لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ھوا سمندر جوق در جوق اسٹینڈ سے اترنے لگا۔ وہ گھوڑے کے گرد جمع ھو گئے۔ وہ ھاتھ چلا چلا کر کچھ کہہ رہے تھے۔ ان کے تمتماتے ھوئے چہرے بار بار ایک دوسرے کی طرف جھک رہے تھے اور آنکھیں چمک رھی تھیں۔ انھیں کسی بات پر اعتراض تھا اور وہ باربار زمرد کی ٹاپوں، سر اور کمر میں انگلیاں گھسا رہے تھے۔ انھوں نے دھڑ کے بائیں پچھلے حصے کے بال سرکائے جہاں اسکا داغ تھا، اور وہ سب ھم‌آواز ھوکر چیخ اٹھے: ''یہ گھوڑا نقلی ھے! دھوکے کا گھوڑا ھے! یہ سب فریب ھے! ھمارا روپیہ واپس کرو!،، زمرد نے یہ باتیں سنیں مگر سمجھیں نہیں۔ وہ بےچینی سے کان پھڑ پھڑا رھا تھا۔ ''یہ لوگ کیا باتیں کر رہے ھیں؟،، اس نے حیرانی سے سوچا۔ ''کیا، میں اچھی طرح نہیں دوڑا؟،، اور لمحے بھر کے لئے

اسکی نظریں انگریز کے چہرے پر جا ٹکیں۔ وہ سخت اور ایک حد تک طنزیہ چہرہ جو ہمیشہ اس قدر پرسکون رہتا تھا، اس وقت غصے سے انگارہ ہو رہا تھا۔ اچانک انگریز ہاتھ چلا چلا کر بہت ہی بیٹھی ہوئی سی آواز میں کچھ چیخا اور ایک تھپڑ کی آواز اس ہنگامے سے زیادہ بلند ہو گئی۔

٦

زمرد کو گھر لایا گیا۔ تین گھنٹے بعد اسے جو دی گئی۔ اور شام کے وقت، جب اسے کوئیں پر پانی پلایا جا رہا تھا تو اس نے باڑھ کے اس پار بڑے سے زرد زرد چاند کو ابھرتے دیکھا اور اس کا دل عجیب مبہم سے خوف سے کانپ اٹھا۔

پھر بے کیف دن آ گئے۔

اب وہ ورزش اور دوڑ کے لئے باھر نہ لے جایا جاتا۔ لیکن روزانہ اجنبی لوگ آتے رہے — بہت سے اجنبی۔ وہ اسے باھر نکلواتے اور وھاں اسکے پورے جسم کا معائنہ کرتے اور اسے چھو چھو کے دیکھتے۔ اسکے منہ میں انگلیاں گھساتے، جھانوے سے اسکی کھال کھرچتے اور ایک دوسرے پر چیخنے لگتے۔

•••

پھر اسے یاد آیا کہ ایک شام اسے اپنے اصطبل سے نکالا گیا اور پھر اسے لامتناھی اور سنسنان گلیوں سے گزارا گیا۔ راستے میں بہت سے مکان آئے جنکی کھڑکیاں روشن ھو رھی تھیں۔ اسکے بعد ریل کا اسٹیشن آیا۔ ریل کا ھچکولے کھاتا ھوا تاریک ڈبہ، تھکن، لمبے سفر کی وجہ سے تھرتھراتے ھوئے پاؤں، ریل کی سیٹیاں، کھڑکھڑاتی ھوئی پٹریاں، دھوئیں کے بادل اور جھولتی ھوئی لالٹینوں کی اداس روشنی۔ ایک اسٹیشن پر لوگوں نے اسے گاڑی سے نکالا اور اسے ایک لمبی اور اجنبی سڑک پر لے گئے۔ اسے خزاں رسیدہ اور ننگے کھیتوں اور گاؤوں سے گزرنا پڑا۔ یہاں تک کہ وہ اسے ایک اجنبی اصطبل میں لائے جہاں اسے دوسرے گھوڑوں سے دور مقفل کر دیا گیا۔

شروع شروع میں اسے ھر وقت گھوڑدوڑ کا خیال آتا رھتا، انگریز، نزار، واسیلی اور اونیگن کی یاد ستاتی رھتی۔ وہ اکثر خواب میں یہی سب دیکھتا۔ لیکن وقت گزرتا رھا اور وہ سب کچھ بھول گیا۔ اسے کسی شخص سے چھپایا جا رھا تھا اور اسکا نوجوان اور طاقتور جسم بیکار پڑے پڑے گھلتا رھا، سوکھتا رھا۔ وہ روزبروز نڈھال ھوتا چلا گیا۔ تھوڑے تھوڑے دن بعد نئے نئے اجنبی آتے، اسکے ارد گرد گھومتے، اسے چھو چھو کر دیکھتے اور آپس میں تو تو میں میں کرنے لگتے۔

کبھی کبھی زمرد کھلے ہوئے دروازے میں سے دوسرے گھوڑوں کو کھلی ہوا میں گھومتے یا دوڑتے دیکھتا، وہ خفا اور اداس ہوکر انھیں پکارتا، لیکن دروازہ فوراً بند ہو جاتا اور پھر اسی بے کیفی کے عالم میں زندگی بیتنے لگتی۔

اصطبل کا نگران ایک بڑے سے سر اور سوئی سوئی صورت والا آدمی تھا۔ اسکی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سیاہ تھیں اور اسکے موٹے سے چہرے پر ننھی ننھی سیاہ مونچھیں جڑی ہوئی تھیں۔ اس نے شاید ھی کبھی زمرد کی طرف توجہ کی ہو، لیکن پھر بھی نجانے کس وجہ سے گھوڑا اس سے خوفزدہ سا تھا۔

ایک دن صبح سویرے، جب سارے سائیس بےخبر سو رہے تھے، یہ شخص خاموشی سے پنجوں کے بل چلتا ہوا زمرد کے اصطبل میں آیا، اسکی ناند میں تھوڑی سی جو ڈالی اور باھر نکل گیا۔ زمرد ذرا حیران تو ہوا، لیکن نہائت منکسر مزاجی سے فوراً کھانے میں جٹ گیا۔ جو بہت میٹھی تھی مگر ھلکی سی تلخی بھی تھی۔ زبان کو ذرا ترش لگ رھی تھی۔ ”عجیب بات ھے،، زمرد نے سوچا۔ ”میں نے پہلے کبھی ایسی جو نہیں کھائی۔،،

اور اچانک اسے ھلکا سا درد محسوس ہوا۔ درد کی ٹیس سی اٹھی اور ختم ہو گئی، اور پھر ٹیس اٹھی، پہلی دفعہ سے زیادہ شدید ٹیس اور پھر

لمحہ بہ لمحہ درد کی شدت بڑھتی چلی گئی۔ اور آخر درد ناقابل برداشت ہوگیا۔ زمرد آہستہ سے کراہا۔ اسکی آنکھوں کے آگے آگ کے شعلے سے ناچنے لگے۔ اسکا جسم پسینے میں تر ہو گیا اور اچانک کمزور اور نڈھال سا ہو گیا۔ اسکی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اس جسم کا بوجھ اٹھانا ان ٹانگوں کے لئے دو بھر ہوگیا۔ وہ بے دم سا ہوکر زمین پر گر پڑا۔ اس نے پھر اٹھنے کی کوشش کی لیکن وہ اگلی ٹانگوں پر کشمکش کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ اور پھر وہ ایک کروٹ گر پڑا۔ اسکے سر میں نیم بےہوشی کی اور سرسراہٹ کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے انگریز کا چہرہ ابھر آیا، اسکے لمبے لمبے دانت نکلے ہوئے تھے۔ اونیگن بڑی زور سے ھنہناتا ہوا پاس سے گزر گیا، اسکا گھینگا باھر لٹکا ہوا تھا۔ کوئی انجانی قوت زمرد کو بڑی بےدردی سے کسی سرد اور تاریک گڑھے میں کھینچ رہی تھی۔ اب وہ ھل جل بھی نہیں سکتا تھا۔

اچانک اسکی ٹانگیں اور گردن اینٹھ کر لرز گئیں اور کمر مڑ گئی۔ اسکی کھال میں تھرتھراھٹ سی ہو رہی تھی اور اس سے انتہائی بدبودار جھاگ سا نکل رہا تھا۔

لمحے بھر کے لئے اسکی آنکھوں کے سامنے لالٹین کی جھولتی ہوئی زرد روشنی ابھری اور اسکی

بینائی کے ساتھ ساتھ غائب ہوگئی۔ اسکے کان میں کسی کی بےدرد چیخوں کی آواز آئی۔ لیکن اب اسے پہلو میں ٹھوکریں مارتی ہوئی ایڑی کا احساس بھی نہ رہا۔ پھر ہر چیز مٹ گئی — ہمیشہ ہمیشہ کو ختم ہو گئی۔

۱۹۰۷ء

یاقوتی کنگن

L. van Beethoven.
2. Son. (op. 2, №2).
Largo Appassionato

۱

وسط اگست میں نئے چاند سے کچھ پہلے، اچانک موسم خراب ہو گیا۔ اس نے بحیرۂ اسود کے شمالی ساحل کا مخصوص رنگ اختیار کر لیا۔ سمندر اور خشکی پر گہری اور بھاری دھند چھائی ہوئی تھی۔ روشنی کے بڑے مینار کا بھونپو دن رات کسی پاگل بیل کی طرح چنگھاڑنے لگا۔ اور پھر کئی کئی دن پھوار جیسی باریک بونداباندی ہونے لگی۔ کچی سڑکیں اور پگڈنڈیاں کیچڑ کی دبیز تہہ میں چھپ گئیں جس میں گاڑیاں اور ٹھیلے بڑی دیر تک پھنسے رہتے۔ اور پھر شمال مغرب کے اسٹیپی کی طرف سے انتہائی تیزوتند ہواؤں کا طوفان اٹھنے لگا۔ درختوں کی چوٹیاں طوفان کی لہروں کی طرح جھومتیں اور چنگھاڑتیں اور رات میں گھروں کی فولادی چھتیں ایسے بجنے لگتیں جیسے کوئی

بھاری بھاری جوتے پہنے ہوئے ان پر دوڑ رہا ہو۔ کھڑکیوں کے چوکھٹے ہلنے لگتے۔ دروازے دھڑ دھڑاتے اور چمنیوں میں بڑی وحشیانہ بھاگ دوڑ سی مچ جاتی۔ کئی شکاری کشتیاں سمندر میں اپنا نشان راہ کھو بیٹھیں اور ان میں سے دو کبھی واپس نہ آئیں، ہفتے بھر بعد سمندر کی لہروں نے مچھیروں کی لاشوں کو کنارے پر لا پھینکا۔

سمندری ساحل کی صحت‌گاہوں کے زیادہ تر باسی یونانی اور یہودی تھے۔ تمام جنوبی باشندوں کی طرح انھیں بھی زندگی سے بڑی والہانہ محبت تھی۔ لیکن وہ کچھ کچ دلے تھے۔ ان میں سے بہت سے شہر کی طرف بھاگنے لگے۔ کیچڑ سے بھری ہوئی سڑک پر ٹھیلوں کی قطاریں گھسٹنے لگیں، ان میں گدے، صوفے، الماریاں، کرسیاں، سلفچی، آفتابے اور سماوار لدے ہوئے نظر آتے۔ بارش کی پھواروں کی دھندلی دھندلی سی ململ کے نیچے سے یہ منظر — یہ ٹوٹے پھوٹے ٹرنک صندوق، جو بالکل بدحال، بدرنگ اور فقیرانہ معلوم ہوتے، ٹھیلوں کے اوپر، بھیگے ہوئے ربڑ پر بیٹھی ہوئی خادمائیں اور باورچی، جن کے ہاتھوں میں استریاں، ڈونگے یا ٹوکریاں نظر آتیں، تھکے ماندے اور ہانپتے ہوئے گھوڑے، جو ہر تھوڑی تھوڑی دیر بعد رک جاتے اور جن کی ٹانگیں کانپنے لگتیں، اور بدن سے بھاپ اٹھنے لگتی۔ ٹھیلے‌بان بارش سے بچاؤ کے لئے بوریوں میں

لپٹے ہوئے تھے اور بھاری آوازوں میں گالیاں کوسنے دے رہے تھے۔ غرض ہر چیز بہت دردناک اور غمناک معلوم ہوتی۔ ان سے بھی زیادہ دردناک منظر وہ مکان پیش کرتے تھے جن کے مکین جا چکے تھے اور جن کے وسیع کمرے خالی اور سنسان پڑے تھے۔ ان کی کیاریاں مسلی ہوئی تھیں، اور ٹوٹے پھوٹے شیشے، آوارہ کتے، کوڑا کرکٹ، سگریٹ کے ٹکڑے، کاغذوں کی دھجیاں، ٹوٹے ہوئے برتن، دفتی کے ڈبے اور دواؤں کی شیشیاں بکھری ہوئی تھیں۔

لیکن آخر اگست میں موسم اچانک پھر بدل گیا۔ دن پرسکون اور روشن ہو گئے، جولائی کی نسبت آج‌کل دن کہیں زیادہ روشن، کہیں زیادہ رسیلے تھے۔ خشک کھیتوں میں کھڑے ہوئے زرد زرد اور روئیں‌دار ٹھنٹوں پر خزاں کے جالے ابرق کی طرح چمکنے لگے۔ درخت اپنے ڈھرے پر آ گئے اور ان کی پتیاں بڑی نقاہت کے ساتھ جھڑنے لگیں۔

امرا کے مارشل کی بیوی شہزادی ویرا نیکولائیونا شائینا ابھی تک اپنے بنگلے سے نہیں جا سکی تھی کیونکہ شہر کے مکان میں مرمت کا سلسلہ ابھی تک چل رہا تھا۔ اور اب وہ ان متوالے اور دلکش دنوں کو دیکھ‌کر جھوم اٹھی، اس کنج‌عافیت کے سکون نے، اس پاک‌وصاف ہوا نے، سمندر سے اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے ہوا کے نمکین جھونکوں نے اور جنوب

کے لئے پرواز کرنے کو تیار ابابیلوں نے اس کو مدھوش کر دیا۔ یہ ابابیلیں بجلی کے تاروں پر بیٹھی چہکتی رہتی تھیں۔

۲

اس کے علاوہ، آج — یعنی سترہ ستمبر کو — اس کی نام رکھائی کی سالگرہ تھی۔ اسے ہمیشہ سے نام رکھائی کی سالگرہ بہت پسند تھی کیونکہ بچپن کے بیتے دنوں کی پیاری پیاری یادیں اس دن سے وابستہ تھیں۔ اسے ہمیشہ یہ امید رہتی کہ یہ دن اس کی زندگی میں کوئی بہت ہی پرمسرت شے لائے گا۔ اس کے شوہر نے سرکاری کام سے شہر جاتے جاتے صبح کو اس کی رات کی میز پر ایک ڈبہ رکھ دیا تھا جس میں ناخ کی شکل کے موتیوں کی حسین بالیاں رکھی تھیں، اس تحفے نے اس کی خوش‌دلی کو چارچاند لگا دئیے۔

وہ گھر میں بالکل تنہا تھی۔ اس کا کنوارا بھائی نیکولائی اسسٹنٹ وکیل سرکار تھا، اور عام طور پر ان کے ساتھ ہی رہتا تھا، مگر آج وہ بھی مقدمے کی پیروی کے لئے شہر گیا ہوا تھا۔ اس کے شوہر نے کہا تھا کہ وہ کھانے پر اپنے عزیزترین دوستوں کے سوا کسی کو نہیں لائینگے۔ اچھا ہی تھا کہ اس کی سالگرہ موسم گرما میں ہوتی تھی، شہر میں تو انھیں نہائت

شاندار دعوت پر یا کیا عجب ہے کسی بال پر کافی روپیہ خرچ کرنا پڑتا۔ مگر یہاں دیہات میں اخراجات کو کم سے کم کرنا ممکن تھا۔ سوسائٹی میں اتنا اہم رتبہ ہونے کے باوجود، شاید اسی وجہ سے، شہزادہ شائین کا خرچ بمشکل چلتا تھا۔ ان کے بزرگوں نے وسیع خاندانی جاگیر کو تقریباً برباد کر دیا تھا، اور اپنے رتبے کی وجہ سے ان کو اپنی چادر سے زیادہ پاؤں پھیلا کر رہنا پڑتا تھا: دعوتیں کرنا، چندے دینا، قیمتی لباس پہننا، گھوڑے رکھنا، غرض سب ہی کچھ ضروری تھا۔ شہزادی ویرا کے شوہر کا والہانہ عشق کب کا آگ میں تپ کر ایک سچی اور اٹوٹ رفاقت میں بدل چکا تھا، وہ اسے مکمل بربادی سے بچانے کے سلسلے میں ہر طرح اس کی مدد کرتی۔ اس پر ظاہر کئے بنا اپنی بہت سی ضروریات اور خواہشات کی تکمیل کے بغیر ہی گزارا کرلیتی، اور انتہائی کفائت شعاری سے گھرکا خرچ چلاتی۔

اب وہ باغ میں ٹہل ٹہل کر بڑی نزاکت اور نفاست سے کھانے کی میز کے لئے پھول چن رہی تھی، کیاریاں خاصی اجڑی سی پڑی تھیں، ان سے ایک عجیب لاچاری ٹپک رہی تھی۔ رنگ برنگے دوہرے کارنیشن اپنے شباب کے دور سے گزر چکے تھے، اسٹاک کا بھی یہی حال تھا۔ نیم کھلے اور نیم ہری پھلیوں سے لدے ہوئے، جن سے گوبھی

جیسی خوشبو آ رہی تھی۔ گلاب کی جھاڑیوں پر اس موسم گرما میں تیسری بار بہار آئی تھی، ان میں ابھی تک چند ننھی ننھی کلیاں اور ادھہ کھلے گلاب مہک رہے تھے۔ لیکن ڈالیا، پیونی اور تاراپھول اپنی دھکتی ہوئی سندرتا سے سرشار جھوم رہے تھے، اور خاموش ھوا میں گھاس کی سی اداس اور خزاں رسیدہ خوشبو بسا رہے تھے۔ دوسرے پھولوں کے شباب کا، عشق کا اور نت نئی تخلیق کا دور ختم ہو چکا تھا، وہ اب خاموشی سے آنےوالی زندگی کے لئے ان گنت بیج برسا رہے تھے۔

قریب کی سڑک پر ایک موٹر کے ھارن کی تیز آواز نے گونج گونج کر اعلان کیا کہ شہزادی ویرا کی بہن آننا نیکولائیونا فریسی آرہی ھے۔ اس نے صبح ھی ٹیلی‌فون کرکے کہہ دیا تھا کہ وہ آجائیگی اور گھر کو ٹھیک ٹھاک کرنے اور مہمانوں کا سواگت کرنے میں بہن کی مدد کریگی۔

ویرا کے تیز کانوں نے اسے دھوکا نہیں دیا۔ وہ آنےوالی سے ملنے گئی۔ چند لمحے بعد ایک شاندار سیڈان موٹر دروازے میں داخل ھوئی۔ ڈرائیور نہائت پھرتی سے نیچے کودا اور دروازہ کھول کر کھڑا ھوگیا۔

دونوں بہنوں نے خوشی خوشی ایک دوسرے کو پیار کیا۔ بچپن ھی سے ان دونوں کو ایک دوسرے سے دلی محبت تھی۔ صورت شکل میں وہ

ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھیں، بڑی بہن ویرا اپنی خوبصورت انگریز ماں سے ملتی تھی، اس کا قد لمبا اور جسم لچکدار تھا، چہرہ بہت نازک، مگر سرد اور مغرور۔ ہاتھ ذرا بڑے مگر خوبصورت اور بےحد دلکش انداز کے ڈھلواں شانے جیسے قدیم تصویروں میں نظر پڑتے ہیں، چھوٹی بہن آننا کا اپنے باپ کی طرح مغل ناک نقشہ تھا۔ اس کا باپ تاتاری شہزادہ تھا، جس کے دادا نے انیسویں صدی کے اوائل تک عیسائی مذہب اختیار نہیں کیا تھا۔ اور جس کے آباواجداد کا شجرہ خود تیمورلین یا بقول شخصے تیمورلنگ سے ملتا تھا۔ اس کا باپ انتہائی فخر کے ساتھ اس قاتل کو ہمیشہ اسی تاتاری نام سے پکارتا۔ وہ قد میں اپنی بہن سے آدھے بالشت چھوٹی تھی۔ اس کے شانے خاصے چوڑے تھے اور وہ بہت زندہ دل اور چنچل عورت تھی۔ اور اسے لوگوں کو چھیڑنے میں بہت مزہ آتا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل مغل نسل والوں کا سا تھا۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ اور آنکھیں تنگ تھیں جنھیں وہ نگاہ کمزور ہونے کی وجہ سے اکثر جھپکاتی رہتی تھی۔ چھوٹے سے حساس دھن اور بھرے بھرے اور ابھرے ہوئے نچلے ہونٹ سے خود پسندی ٹپکتی تھی۔ لیکن اس سب کے باوجود اس میں بلا کی دلربائی اور کشش، بلا کا سحر تھا جس کا راز شاید اس کی مسکراہٹ، اس کے تمام نقوش کی گہری نسوانیت،

یا اس کی تیکھی اور عشوہ خیز چھیڑچھاڑ میں پنہاں تھا۔ وہ حسین نہیں تھی، لیکن اس کی اس ادا میں بھی ایسا سجیلاپن تھا کہ اپنی بہن کے شاہانہ حسن کے مقابلے میں وہ زیادہ‌تر موقعوں پر بڑی شدت سے مردوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی تھی۔

اس کی شادی ایک بہت امیر اور بہت احمق آدمی سے ہوئی تھی، وہ بالکل کوئی کام نہ کرتا تھا اگرچہ وہ کسی امدادی ادارے کی مرکزی کمیٹی کا ممبر تھا اور اس کو کامرجنکر کا لقب مل چکا تھا۔ وہ اپنے شوہر سے نفرت کرتی تھی لیکن ایک لڑکے اور ایک لڑکی کو جنم دے چکی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اور بچے پیدا نہیں کریگی۔ ویرا کو بچوں کی انتہائی خواہش تھی، زیادہ سے زیادہ بچوں کی، لیکن کسی وجہ سے اس کے ایک بھی بال بچہ پیدا نہ ہوا۔ اور وہ اپنی چھوٹی بہن کے پیارے پیارے زرد رو بچوں سے بڑی مریضانہ سی مگر شدید محبت کرتی تھی۔ بہن کے بچے بہت سعادت مند تھے۔ ان کے چہرے زرد اور میدے کی طرح نرم نرم تھے اور بال گھنگھریالے اور سن کے رنگ کے تھے۔

آننا تمام‌تر مسرت، تمام‌تر انتشار، تمام‌تر لطافت تھی اور کبھی کبھی اس کی فطرت میں بلا کا غیرفطری تضاد جھلکتا تھا۔ وہ یورپ کی تمام راجدھانیوں اور تمام قابل‌دید مقامات میں انتہائی

من‌چلے انداز میں عشق‌بازی شروع کر دیتی، لیکن اس نے کبھی اپنے شوہر سے بےوفائی نہیں کی حالانکہ وہ شوہر کی موجودگی میں اور اس کے پیٹھ پیچھے ہمیشہ انتہائی نفرت سے اس کا مذاق اڑاتی تھی۔ وہ بہت فضول خرچ تھی اور جوئے، ناچ گانے، نت نئے ہنگاموں اور سنسنی خیز قصوں پر جان دیتی تھی۔ جب وہ کسی دوسرے ملک میں ہوتی تو بدنام قسم کے کیفوں میں جانے آنے سے بھی گریز نہ کرتی۔ لیکن ساتھ ھی بہت سخی، ہمدرد اور پرخلوص حد تک مذہبی تھی۔ اس قدر مذہبی کہ وہ پوشیدہ طور پر کیتھولک بن گئی تھی۔ اس کی پشت، سینہ اور اس کے شانے، اپنے حسن میں اپنی مثال آپ تھے۔ جب وہ کسی شاندار بال میں جاتی تو فیشن اور مرتبت نے جتنی حدود عائد کی تھیں ان سب سے کہیں آگے نکل کر اپنا جسم عریاں کر دیتی، لیکن اس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ کھلے گلے کے لباس کے نیچے ہمیشہ رویں دار کرتا پہنتی تھی۔

دوسری طرف ویرا بےانتہا سادگی پسند تھی۔ اس کے برتاؤ اور رکھ رکھاؤ میں سرد مہری، اونچائی، مگر ساتھ ھی لطف و کرم کا رنگ تھا، وہ ملکاؤں کی طرح سنجیدہ اور الگ‌تھلگ رہتی۔

۳

''اوہ، کتنی اچھی فضا ہے! کتنی پیاری!،،
آننا نے کہا۔ وہ اپنی بہن کے ساتھ تیزتیز قدموں سے روش پر چل رہی تھی۔ ''آؤ ذرا دیر اس چٹان پر پڑے ہوئے بنچ پر بیٹھ جائیں، تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں، میں نے مدتوں سے سمندر کی جھلک بھی نہیں دیکھی۔ کیسی دل فریب ہوا ہے — سانس لینے سے دل کی کلی کھل اٹھتی ہے۔ پچھلی گرمی میں کرائمیا گئی تھی نا، ہاں تو میسخور میں میں نے ایک بڑی اچھی بات معلوم کی۔ جانتی ہو سمندر کے جھاگ کی خوشبو کیسی ہوتی ہے؟ ذرا سوچو۔ اس کی خوشبو سیگنونیتی* سے ملتی ہوئی ہوتی ہے۔،،

ویرا محبت سے مسکرائی:

''تم ہمیشہ خیالی باتیں کرتی ہو۔،،

''نہیں، واقعی ویسی ہی خوشبو ہے۔ ارے مجھے خوب یاد ہے ایک دفعہ جب میں نے کہا تھا کہ چاندنی میں ہلکی سی گلابی جھلک ہوتی ہے تو سب مجھ پر ہنستے تھے۔ لیکن چند دن پہلے بوریتسکی نے — ارے وہی مصور جو میری تصویر بنا رہا ہے — ہاں تو، اس نے کہا کہ میں ٹھیک

---

* خوشبودار پھولوں‌والا ایک پودا۔ (ایڈیٹر)

کہتی تھی۔ ارے مصور تو مدتوں سے اس حقیقت کو جانتے ہیں۔ ،،

”کیا آج کل اس مصور کے پیچھے دیوانی ہو؟،،

”تمھیں ہمیشہ عجیب باتیں سوجھتی ہیں!،،

آننا ہنسی اور پھر تیزی سے چٹان کے کونے پر ٹھیر گئی۔ یہ چٹان ایک اونچی دیوار کی طرح سمندر میں جا ملتی تھی۔ اس نے جھک کر دیکھا اور اچانک دہشت کے مارے چیخی اور گھبرا کر پیچھے کو ہٹ گئی، اس کا رنگ فق تھا۔

”اف کیا بلندی ہے!،، اس کی آواز میں بڑی نقاہت اور تھرتھراہٹ تھی۔

”میں اتنی بلندی سے نیچے دیکھتی ہوں تو میرے بدن میں بڑی پرلطف مگر تکلیف‌دہ سنسنی پھیل جاتی ہے، میری ایڑیاں دکھنے لگتی ہیں۔ لیکن پھر بھی میں اس کی طرف کھنچتی چلی جاتی ہوں!،،

وہ پھر جھک کر دیکھنے‌والی تھی مگر اس کی بہن نے اسے پکڑ کر کھینچ لیا۔

”خدا کے لئے، آننا پیاری! تم اس طرح جھکتی ہو تو مجھے چکر آنے لگتا ہے۔ خدا کے لئے بیٹھ جاؤ۔ ،،

”اچھا، اچھا بیٹھی جاتی ہوں۔ لیکن دیکھو تو کتنا حسین منظر ہے۔ کس قدر فرحت بخش۔ آدمی دل بھر کے دیکھ بھی تو نہیں سکتا۔ کاش

تم سمجھ سکتیں کہ میں خدا کی کتنی شکرگزار ہوں کہ اس نے ہمارے لئے ایسے عجائبات پیدا کئے!،،

لمحے بھر کے لئے دونوں کسی خیال میں کھو گئیں۔ نیچے بہت نیچے سمندر خاموش تھا۔ بنچ سے ساحل نظر نہیں آ رہا تھا اور اس طرح سمندر کی وسعت اور شان و شوکت کچھ اور بھی زیادہ نمایاں ہو گئی تھی۔ سمندر کا پانی خاموش اور مسرور تھا۔ اس کا رنگ شوخ نیلا تھا لیکن لہروں پر ترچھی ترچھی ہلکی نیلی لکیریں ابھر رہی تھیں، اور افق کی طرف جا کر پانی گہرا نیلا ہو گیا تھا۔

شکاری کشتیاں بالکل دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھیں، وہ سب ساحل کے قریب ہی پرسکون پانی پر ساکت کھڑی تھیں جیسے ان پر غنودگی طاری ہو۔ ساحل سے ذرا دور پر ایک تین مستولوں والا جہاز نظر آ رہا تھا۔ سر سے پاؤں تک سفید بادبانوں میں لپٹا ہوا، ہوا کی وجہ سے اس کے حسین بادبان پھولے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جہاز ہوا میں ساکت ہو کر رہ گیا ہے، آگے نہیں بڑھ رہا۔

"میں سمجھتی ہوں تم کیا کہنا چاہتی ہو،، بڑی بہن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن میرے احساسات اس بارے میں وہ نہیں ہیں جو تمہارے ہیں، جب میں بہت دن بعد پہلی دفعہ سمندر کو

دیکھتی ہوں تو میرے دل میں خوشی کا طوفان ابل پڑتا ہے، میرا رواں رواں ناچ اٹھتا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں کسی بہت بڑے عظیم اور انوکھے منظر کو دیکھ رہی ہوں، جسے آج سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ لیکن کچھ دن بعد، جب میں سمندر کی عادی ہو جاتی ہوں تو اس کی بےجان اور خالی خولی وسعت سے میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ میں اسے دیکھتی ہوں تو بےزار ہو جاتی ہوں اور پھر میں حتی‌الامکان اسے دیکھتی ہی نہیں۔"

آننا مسکرائی۔

"کیوں، مسکرائیں کیوں؟" اس کی بہن نے پوچھا۔

"پچھلی گرمیوں میں"، آننا نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا "ہم گھوڑسواروں کا ایک بہت بڑا قافلہ یالتا سے اچکوش جا رہا تھا۔ یعنی جھرنے کے اوپر، جنگل کے رکھوالے کی کٹیا سے آگے۔ شروع میں ہم دھند میں بھٹکتے رہے، انتہائی سیلن تھی اور ہمیں کوئی چیز صاف نظر نہیں آ رہی تھی۔ لیکن ہم چیڑ کے جھنڈوں کے درمیان ایک ڈھلوان راستے سے اوپر چڑھتے چلے گئے۔ اور پھر جیسے اچانک جنگل ختم ہو گیا اور ہم دھند سے نکل آئے۔ ذرا سوچو ایک اونچی سی چٹان پر ایک چھوٹی سی جگہ اور نیچے ایک بہت گہرا

کھڈ۔ گاؤں ماچس کے بکس سے زیادہ معلوم نہیں ہو رہے تھے۔ اور جنگل اور باغ گھاس کے تختوں کی طرح۔ لگتا ہے کہ سارا علاقہ سمندر کی طرف بڑھ رہا ہے، بالکل جغرافیائی نقشے کی طرح۔ اور آگے سمندر ہی سمندر، دور تک پچاس میل، سو میل تک۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں ہوا میں معلق ہوں اور بس ابھی پرواز کیا چاہتی ہوں۔ اس قدر حسن تھا، کتنا ہلکاپن پیدا ہو گیا تھا میرے سراپے میں! میں مڑی اور میں نے خوش دلی سے اپنے رہنما سے کہا: 'کیوں سید اوغلی، کس قدر حسن ہے؟ ' لیکن اس نے زبان چٹخائی اور کہنے لگا: 'آہ خاتون، آپ نہیں جانتیں، میں تو ان سب چیزوں کو روز روز دیکھتے دیکھتے بالکل عاجز ہو گیا ہوں۔ ''

''اس مقابلے کا شکریہ!'' ویرا نے ہنسکر کہا۔ ''لیکن میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ ہم شمال کے باسی سمندر کے حسن کو نہیں سمجھ سکتے۔ مجھے تو جنگلوں سے عشق ہے۔ یگورووسکوئے کا جنگل یاد ہے؟ بھلا اس سے آدمی کبھی کس طرح بیزار ہو سکتا ہے؟ چیڑ کے درخت! اور کائی! اور 'جام موت، دیکھتے ہوئے، جیسے کسی نے سرخ ساٹن پر سفید موتی ٹانک دئے ہوں۔ اس قدر پرسکون، اس قدر خنک ہیں ہمارے جنگل۔ ''

''میرے لئے تو ہر چیز برابر ہے۔ مجھے تو ہر چیز سے عشق ہے!'' آننا نے جواب دیا۔

"لیکن سب سے زیادہ مجھے اپنی ننھی سی بہن، اپنی پیاری اور سمجھدار ویرا سے پیار ہے۔ جانتی ہو اس دنیا میں صرف ہم دو ہیں۔"

اس نے اپنی بہن کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور اس کے گال پر گال رکھ کر اس سے لپٹ گئی۔ اور اچانک وہ چونک گئی۔

"ارے، میں کیسی احمق ہوں! ہم کسی ناول کے کرداروں کی طرح یہاں بیٹھے فطرت کے متعلق باتیں کر رہے ہیں اور میں اپنے تحفے کے بارے میں بھول ہی گئی۔ لو، دیکھو، لیکن مجھے ڈر ہے تمھیں پسند بھی آئیگا یا نہیں۔"

اس نے اپنے بٹوے میں سے غیرمعمولی جلدوالی ایک چھوٹی نوٹ‌بک نکالی جس کے پرانے نیلے مخمل کو حادثات زمانہ نے تار تار اور بےرنگ کر دیا تھا، اور اس نیلے پس منظر میں گھری سنہری زردوزی سے ایک انوکھا، پیچیدہ اور حسین سا نمونہ بنا ہوا تھا۔ یہ نمونہ شاید کسی ماہر اور محنتی مصور کی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ نوٹ بک میں بال برابر باریک اور سنہری زنجیر لگی ہوئی تھی۔ اور اس کے اندر کاغذ کے ورقوں کے بجائے ہاتھی دانت کے ٹکڑے لگا دئے گئے تھے۔

"کتنی پیاری ہے! کتنی رنگارنگ اور مرصع!"
ویرا نے کہا اور اپنی بہن کو پیار کر لیا۔

"شکریہ، تمھیں یہ انمول چیز کہاں سے مل گئی؟"

"قیمتی پرانی چیزوں کی دکان سے، تم جانتی ہو مجھے قدیم چیزوں کو چھان مارنے کا کتنا شوق ہے۔ عبادت کی یہ کتاب مجھے اسی سلسلے میں ہاتھ لگ گئی۔ دیکھو، یہاں جواہرات کس طرح صلیب کی شکل میں جڑے ہوئے ہیں۔ مجھے صرف یہ جلد ملی تھی۔ باقی سب چیزیں — صفحے، ڈوری اور پنسل — خود میری زور طبع کا نتیجہ ہیں۔ میں نے بمشکل اپنا خیال مولی نیت کو سمجھانے کی کوشش کی، مگر اس نے یہ سننے اور سمجھنے سے انکار کر دیا کہ میں چاہتی کیا ہوں۔ ڈوری بھی اسی قسم کا پورا نمونہ ہے — مدھم مدھم، پرانے سونے کی اور نقش و نگار بنی ہوئی۔ لیکن خدا جانے اس نے کیا کرکے رکھ دیا۔ بہرحال زنجیر واقعی وینسیائی فن کا نمونہ ہے، بہت قدیم۔"

ویرا تعریفاً اس لاجواب جلد کو تھپکنے لگی۔

"کس قدر قابل احترام اور قدیم یادگار ہے! نجانے یہ نوٹ بک کتنی پرانی ہوگی"، اس نے کہا۔

"اندازاً، میرے خیال میں سترھویں صدی کے آخری زمانے کی یا اٹھارویں صدی کے وسط کی یادگار ہے۔"

"کتنی عجیب بات ہے"، ویرا نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "اس وقت میرے ہاتھ میں ایک ایسی چیز ہے جسے ہو سکتا ہے مارکوز دی پمپاڈور یا خود ملکہ ماری انتوئی‌نیتے کے ہاتھوں

کا لمس مل چکا ہو ۔ اوہ، آنتا یہ کام صرف تم کر سکتی ہو کہ عبادت کی کتاب کو کسی جاتون کی *carnet بنا دو۔ چلو بھئی، اب چل کے دیکھیں اندر کیا ہو رہا ہے ۔ ''

وہ پتھر کے وسیع چبوترے سے ہوکر گھر کے اندر چلی گئیں، چبوترے کے چاروں طرف ازابیلا انگور کی جالی لگی ہوئی تھی ۔ گہرے ہرے رنگ کے درمیان بڑے بڑے سیاہ خوشے لٹک رہے تھے جن سے اسٹروبیری کی بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی ۔ کہیں کہیں سورج کی روشنی نے پتوں کو جھلملا دیا تھا ۔ چبوترے پر مدھم مدھم سی سبز روشنی پھیلی ہوئی تھی، روشنی کا ہلکا سا سایہ دونوں عورتوں کے چہروں پر جھلملانے لگا ۔

''کھانا یہاں کھلاؤگی کیا؟'' آنتا نے پوچھا ۔

''سوچ تو یہی رہی تھی، لیکن شامیں بہت سرد ہو گئی ہیں ۔ میرے خیال میں کھانے کا کمرہ بہتر رہے گا ۔ مردوں کا دل چاہے تو سگریٹ پینے کو باہر آجائیں ۔ ''

''کوئی ڈھنگ کا مہمان آ رہا ہے؟''

''ابھی کچھ معلوم نہیں، بس اتنا جانتی ہوں کہ ہمارے دادا جان آ رہے ہیں ۔ ''

''آہ، میرے پیارے دادا جان! کتنی عمدہ

---

*نوٹ بک (فرانسیسی) ۔

بات ہے!،، آننا اپنے ہاتھ پر ہاتھ مار کر چلائی۔ ”انھیں دیکھے تو مدتیں ہو گئیں۔،،

”واسیا کی بہن بھی آ رہی ہیں اور میرے خیال میں پروفیسر سپیشنیکوف ہونگے۔ کل مجھے بڑی کوفت ہوئی۔ تم تو جانتی ہو دادا جان اور پروفیسر چٹخارےدار کھانے کے شوقین ہیں۔ لیکن نہ یہاں کوئی چیز ملتی ہے، نہ شہر میں، نہ جان کے بدلے ملے نہ مال کے۔ لوکا کہیں سے بٹیر لے آیا۔ کسی شکاری سے کہہ کر حاصل کئے ہیں۔ سو اب ان پر ہاتھ کی صفائی آزما رہا ہے۔ گائے کا گوشت کچھ ایسا برا بھی نہیں ہے۔ اف بس وہی لے دے کے گائے کا بھنا ہوا گوشت بنا ہے! اس کے علاوہ اچھی قسم کی جھینگا مچھلی ہے۔،،

”تو کیا ہوا، یہ تو کچھ ایسا برا نہیں ہے، ارے گھبراؤ نہیں۔ ہمارے آپس کی بات ہے تم خود بھی تو چٹخارےدار کھانے پر جان دیتی ہو!،،

”اس کے علاوہ ایک خاص چیز اور ہوگی۔ آج صبح ایک مچھیرا گرنارڈ مچھلی دے گیا ہے۔ میں نے خود دیکھی۔ واقعی پوری دیو کی دیو ہے۔ دیکھ کے ڈر لگے۔،،

آننا کو دنیا کی ہر چیز کے متعلق تجسس رہتا تھا، چاہے اس چیز کا خود اس سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ وہ فوراً مچھلی دیکھنے کو بے تاب ہو گئی۔

لوکا ایک لمبوترا سفید تھال اٹھائے ہوئے اندر آیا۔ لوکا کا قد لمبا تھا اور داڑھی مونچھوں سے مبرا چہرہ بالکل بےرنگ تھا۔ اس نے تھال کے کنڈے پکڑکر اسے بمشکل بڑی احتیاط سے تھام رکھا تھا تاکہ چوبی فرش پر پانی نہ گرنے پائے۔

''ساڑھے بارہ پاؤنڈ، جناب‌عالی،، اس نے باورچیوں کے مخصوص فخر اور غرور کے ساتھ کہا۔ ''ذرا سی دیر پہلے تول کے دیکھا ہے۔ ،،

مچھلی تھال کے مقابلے میں بہت بڑی تھی، اور اسے دم موڑکر اس میں رکھا گیا تھا۔ اس کے کھپرے سونے کی طرح دمک رہے تھے۔ اس کے پنکھ چمکدار سرخ اور بڑے بڑے پنکھوں جیسے ہلکے نیلے پر بڑے سے خوفناک سر کے قریب اٹھے ہوئے تھے۔ وہ ابھی تک زندہ تھی اور بےحد زور زور سے گلپھڑے چلا رہی تھی۔

چھوٹی بہن نے بڑی احتیاط سے اپنی ننھی انگلی سے مچھلی کا سر چھوا۔ لیکن گرنارڈ نے دم اچھالی اور آننا نے چیخ مارکر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

''آپ بھروسہ رکھئے، جناب عالی، ہم سب کام بہت اچھی طرح کر لینگے۔ ،، باورچی نے ویرا کی گھبراہٹ کو بھانپ لیا تھا۔ ''ابھی ابھی ایک بلغاریائی دو خربوزے دے گیا ہے، اناس جیسے ہیں، لیکن خوشبو ان سے بھی اچھی۔ بیگم‌صاحب،

گرنارڈ کے ساتھ آپ کس قسم کا شوربہ پسند کرینگی—
تارتار، پولونیز یا صرف سوکھی روٹی مکھن میں؟،،
”جیسے چاہو پکاؤ، جاؤ اب تم جا سکتے
ہو،، شہزادی نے کہا۔

٤

پانچ بجے کے بعد مہمان آنے شروع ہو گئے۔
شہزادہ واسیلی لوووچ اپنی بیوہ بہن لودملا لووونا
دوراسووا کو اپنے ساتھ لائے تھے۔ وہ ایک فربہ
سی کم گو اور شریف طبیعت عورت تھیں۔ ان کے
علاوہ ان کے ساتھ ایک امیر لاابالی اور عیاش نوجوان
واسیوچوک آیا جسے شہر میں ہر شخص اس
بے تکلف نام سے پکارتا تھا اور جس کی صحبت بہت
دلچسپ تھی کیونکہ وہ گا سکتا تھا، شاعری سنا
سکتا تھا، اور ساتھ ھی خاموش ڈرامے، تماشے اور
امدادی بازار منظم کرنے میں ماہر تھا۔ مشہور
پیانونواز جینی ریتر شہزادی ویرا کی سمولنی
انسٹی ٹیوٹ کی ایک دوست تھی اور شہزادی کا بھائی
نیکولائی نیکولائیوچ تھا۔ ان کے بعد موٹر سے آننا
کا شوہر آیا۔ اس کے ساتھ موٹے اور بے ڈول پروفیسر
سپیشنیکوف اور وائس گورنر فون سیک بھی تھے۔
سب سے آخر میں جنرل آنوسوف پہنچے۔ وہ ایک
خوبصورت سی کرائے کی لینڈو میں آئے تھے، اور

ان کے ساتھ دو افسر اور تھے، ان میں سے ایک اسٹاف کے کرنل پوناماریوف تھے، دبلے پتلے اور چڑچڑے۔ انھیں کلرکی کی محنت نے تباہ کر دیا تھا اور وہ اپنی عمر سے بڑے معلوم ہو رہے تھے۔ ان کے علاوہ گارڈ دستے کے لیفٹیننٹ باختینسکی تھے جنھیں پیٹرسبرگ کا بہترین رقاص اور محفل کی جان سمجھا جاتا تھا۔

چاندی جیسے سفید بالوں‌والے لحیم‌شحیم بڑے میاں، جنرل آنوسوف ایک، ہاتھ سے لینڈو کا دستہ اور دوسرے سے پشت پکڑکر بڑے بھاری بھرکم انداز میں پائیدان سے اترے۔ ان کے بائیں ہاتھ میں سننے کا آلہ اور دائیں ہاتھ میں ربڑ کی نوک کی چھڑی تھی۔ ان کا چہرہ بڑا سا، کھردرا اور سرخ تھا اور ناک موٹی تھی۔ ان کی تنگ آنکھوں میں ان بہادر اور سیدھے سادھے آدمیوں جیسا وقار، نرمی اور تضحیک کا رنگ تھا، جو متعدد بار خطروں اور موت کا سامنا کر چکے ہوں۔

دونوں بہنوں نے دور ہی سے انھیں پہچان لیا۔ وہ عین وقت پر بھاگ کر لینڈو تک پہنچیں اور نیم مذاق میں ان کے پہلوؤں کو ہاتھ سے سہارا دےکر اتارنے لگیں۔

”تم تو ایسا بھاگیں جیسے میں بڑا پادری ہوں،، جنرل نے دوستانہ بھاری اور گرجدار آواز میں کہا۔

”دادا جان، پیارے دادا جان!،، ویرا نے ذرا خفگی سے کہا۔ ”ہم نجانے کتنے دن سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں، اور آپ نے ایک جھلک تک نہیں دکھائی۔،،

”یہاں جنوب میں آکے ہمارے دادا جان نے شرم بیچ کھائی،، آننا نے ہنس کر کہا۔ ”ذرا دیکھئے تو سہی آپ کو اپنی دینی اولاد کا خیال ہی نہیں آیا۔ بڑے بےشرم بوڑھے چھیلوں کی سی حرکت ہے یہ، جناب۔ ہمیں بالکل ہی بھلا دیا۔،،

جنرل نے اپنا شاندار سر ننگا کرکے دونوں بہنوں کے ہاتھوں کو پیار کیا، گال چومے اور پھر ہاتھوں کو پیار کیا۔

”ٹھیرو، لڑکیو... مجھے ڈانٹو نہیں،، دمے کے پرانے مرض کی وجہ سے انھوں نے ہر لفظ کے بعد ٹھیرٹھیر کر سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”بخدا یہ کمبخت ڈاکٹر... گرمی بھر میری گٹھیا کا علاج کرتے رہے... بڑا عجیب بودار مرہم تھا۔ کمبخت... بےحد خوفناک بو ہے اس کی... ڈاکٹر کسی طرح میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑتے تھے... لڑکیو، آج سب سے پہلے تمھارے یہاں آیا ہوں... تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی... کیسی گزر رہی ہے؟.. ویرا، تم تو خاصی لیڈی بن گئیں... تم اپنی مرحوم ماں سے... بہت مشابہ ہو... کہو

مجھے تم اپنے بچے کی پیدایش پر نام رکھنے کی رسم پر کب بلا رہی ہو؟،،

''میرے خیال میں کبھی نہیں، دادا جان۔،،

''ہیں بہت جلد بالکل ناامید ہو گئیں تم... ابھی تو سب آگے ہے... خدا سے دعا کرو... اور آننا تم، تم تو ذرا بھی نہیں بدلیں... ساٹھ سال کی عمر میں بھی ایسی ہی شیطان رہوگی... لیکن ٹھیرو۔ میں ان حضرات کا تعارف تو کرا دوں تم لوگوں سے۔،،

''مجھے تو بہت عرصہ ہوا یہ شرف حاصل ہو چکا ہے،، کرنل پوناماریوف نے جھک کر کہا۔

''میں پیٹرسبرگ میں شہزادی سے ملا تھا،، ہوسار نے مزید کہا۔

''اچھا تو، آننا، سین لیفٹیننٹ بختینسکی سے تمھارا تعارف کرا دوں۔ رقاص ہیں، دنگا فساد کرنے میں ماہر ہیں ساتھ ہی اچھے گھوڑسوار بھی ہیں۔ ہاں، میرے پیارے بختینسکی، ذرا گاڑی سے وہ چیز تو نکال لانا... آؤ لڑکیو... ویرا پیاری، ہمیں کیا کھلا رہی ہو؟ ڈاکٹروں کی کرائی ہوئی فاقہ کشی کے بعد تو... میری بھوک اس چھوٹے لیفٹیننٹ کی سی ہو گئی ہے جس نے ابھی تعلیم مکمل کی ہو۔،،

جنرل آنوسوف، مرحوم شہزادے مرزا بولات توگانووسکی کے دلی دوست اور فوجی ساتھی تھے۔ شہزادے کے انتقال کے بعد انھوں نے اپنی پیار محبت کی دھارا کا رخ ان کی بیٹیوں کی طرف موڑ دیا۔

انھوں نے اس وقت ان لڑکیوں کو دیکھا تھا جب وہ بہت چھوٹی چھوٹی تھیں۔ وہ آننا کے دینی باپ بھی تھے۔ آج کی طرح اس زمانے میں بھی وہ شہر "ک"، میں ایک بہت بڑے مگر اجاڑ قلعے کے گورنر تھے اور تقریباً روز توگانووسکی کے ہاں آتے تھے۔ بچے ان پر جان چھڑکتے تھے کیونکہ وہ ان کو لاڈ پیار کرتے، انھیں تحفے دیتے، ان کے لئے سرکس اور تھیٹر کے ٹکٹ خریدتے، اور بچوں کے ساتھ اتنی اچھی طرح کھیلتے تھے کہ کوئی دوسرا نہیں کھیل سکتا۔ لیکن بچیوں کو جو بات سب سے زیادہ پسند تھی اور جو آج تک یاد تھی وہ تھیں وہ داستانیں جو بڑے میاں نے اپنی فوجی مہموں، لڑائیوں اور پڑاؤ، فتح اور شکست، زخم اور موت اور سخت سردیوں کے بارے میں سنائی تھیں۔ یہ بےرنگ اور مدھم مدھم سی داستانیں کسی رزمیہ نظم کی طرح پرسکون تھیں اور شام کی چائے کے وقت اور اس قابل نفرت وقت میں سنائی گئی تھیں جب بچوں کو سونے کے لئے جانے کا حکم مل جاتا تھا۔

پرانے وقتوں کے یہ یادگار بےحد دیوھیکل اور انتہائی انوکھے اور رنگین مزاج آدمی تھے۔ ان کے مزاج میں ایسی سادگی، گہرائی اور نرمی تھی جو خود ان کے زمانے میں بھی افسروں کے مقابلے میں عام آدمیوں میں زیادہ نظر آتی تھی۔

ان میں صحیح معنوں میں روسی، کسانوں کی سی خصوصیات تھیں، جو دوسری خصوصیات کے ساتھ ملکر ایسے عظیم کردار کو جنم دیتی ھیں جو بعض دفعہ ھمارے سپاھیوں کو نہ صرف اجیت بنا دیتا ھے بلکہ اس میں شہید اور پیغمبر کی شان پیدا کر دیتا ھے۔ اس کے دل میں ایک بھولا بھالا، اور بے ریا اعتقاد، زندگی کے متعلق بہت صاف اور شگفتہ رویہ، کام کی لگن اور ھمت، موت کے سامنے عاجزی، تباہ شدہ کے لئے جذبۂ رحم، لامحدود صبرواستقلال، اور حیرت‌انگیز جسمانی اور روحانی طاقت پیدا ھو جاتی ھے۔

پولینڈ کی جنگ کے بعد سے آنوسوف نے جاپانی لڑائی کے سوا تمام مہموں میں شرکت کی، وہ تو اس جنگ پر جانے میں بھی نہ ھچکچاتے، مگر انھیں بلایا ھی نہیں گیا۔ اور ان کا ایک اصول تھا، انتہائی خاکساری کا اصول — ”جب تک تم بلائے نہ جاؤ اس وقت تک موت کو نہ للکارو“۔ ملازمت کے دوران اپنے کسی آدمی کو قمچی سے مارنے کا تو سوال ھی کیا انھوں نے کبھی کسی کو پھولوں کی چھڑی بھی نہیں چھوائی۔ پولینڈ کی بغاوت کے دوران میں، رجمنٹ کے کمانڈر کے ذاتی حکم کے باوجود انھوں نے قیدیوں کے ایک گروہ پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ ”جاسوس کی بات دوسری ھے“، انھوں نے کہا ”اسے تو میں نہ صرف گولی

کا نشانہ بناؤں گا بلکہ اگر آپ حکم دینگے تو خود اپنے ہاتھوں سے اس کا کام تمام کروں گا۔ لیکن یہ لوگ قیدی ہیں، میں ان پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا،،۔ اور یہ بات انھوں نے بڑی سادگی اور احترام کے ساتھ کہی، کسی قسم کی بہادری یا سرکشی کا انداز پیدا نہیں ہونے دیا، یہ کہتے ہوئے وہ صاف شفاف اور پرعزم آنکھوں سے اپنے حاکم کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ اسی لئے حکم کی خلاف ورزی کرنے پر ان کے حکام نے انھیں قتل نہیں کیا بلکہ تنہا چھوڑ دیا۔

ان کی تعلیم بہت اعلی نہیں تھی، بقول خود انھوں نے صرف ''ریچھ کی اکادمی،، کا امتحان پاس کیا تھا، لیکن ۱۸۷۷ء سے ۱۸۷۹ء کی لڑائی کے دوران میں وہ بہت تیزی سے کرنل کے رتبے پر پہنچ گئے۔ انھوں نے بلقان پہاڑ اور دریائے ڈنیوب پار کرنے کی مہم میں شرکت کی، اور جاڑے بھر شیپکا میں پڑاؤ ڈالے پڑے رہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ایک تھے جنھوں نے پلیونا پر فیصلہ کن حملہ کیا۔ وہ پانچ دفعہ زخمی ہوئے۔ ایک زخم تو بہت کاری تھا۔ بم پھٹنے سے بھی انھیں متعدد صدمے پہنچے تھے۔ جنرل رادیتسکی اور سکوبیےلیف انھیں ذاتی طور پر جانتے اور ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ سکوبیےلیف نے انھیں کے متعلق کہا تھا کہ ''میں ایک ایسے افسر کو جانتا ہوں جو مجھ

سے کہیں زیادہ بہادر ہے، اور وہ افسر میجر آنوسوف ہے۔ ،،

وہ جنگ سے واپس آئے تو بم پھٹنے کی وجہ سے تقریباً بالکل بہرے ہو چکے تھے۔ بلقان مارچ کے زمانے میں پاؤں کی تین انگلیاں سردی کی وجہ سے ٹھٹر گئی تھیں اس لئے انہیں کاٹ دیا گیا تھا۔ شیپکا میں انہیں سخت گنٹھیا کا تحفہ ملا تھا۔ امن کے زمانے میں دو سال کام کرنے کے بعد مناسب یہ سمجھا گیا کہ انہیں پنشن دے دی جائے مگر وہ بگڑ گئے۔ اس علاقے کا گورنر، ڈنیوب پار کرنے کے زمانے میں ان کی خاموش بہادری کو دیکھ اور آزما چکا تھا، اس آڑے وقت میں اس نے اپنے تمام‌تر اثر اور رسوخ کا زور لگا دیا۔ پیٹرسبرگ کے حکام نے فیصلہ کیا کہ اس قابل احترام کرنل کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچائی جائے، چنانچہ زندگی بھر کے لئے انہیں شہر ''ک،، کا گورنر بنا دیا گیا۔ یہ عہدہ ملک کی دفاع کے لئے کوئی ایسا ضروری نہیں تھا، بس ایک اعزازی عہدے کی حیثیت رکھتا تھا۔

شہر کا ہر شخص انہیں جانتا تھا اور ہر شخص ان کی اخلاقی کمزوریوں اور ان کی عادتوں کا اور ان کے لباس اور رہن‌سہن کا مذاق اڑاتا تھا۔ وہ کبھی ہتیار باندھ کر نہ چلتے، ہمیشہ پرانی وضع کے لمبے سے کوٹ، بڑی سی چھجے‌والی

ٹوپی میں ملبوس رہتے، ان کے دائیں ہاتھ میں چھڑی اور بائیں میں کان کا آلہ ہوتا۔ موٹے بھدے، کاہل اور چپٹی ناک والے دو بھیانک کتے بند منہ سے زبانیں لٹکائے ہمیشہ ان کے ساتھ رہتے۔ اگر صبح کی چہل قدمی کے دوران انہیں کوئی جاننے والا مل جاتا تو کافی دور دور تک راہ گیر ان کی چیخیں سنتے اور کتے بھی سر میں سر ملا کر بھونکنے لگتے۔

بہت سے بہرے لوگوں کی طرح انہیں بھی اوپیرا سے عشق تھا۔ اور کبھی کبھی کسی عشقیہ منظر کے دوران اچانک ہال میں ان کی حاکمانہ اور گرجدار آواز گونج جاتی: ''ارے، یہ تو بڑا زوردار حصہ تھا، لعنت ہو! اخروٹ کی طرح کچل کر رکھ دیا۔ ''، ہال میں دبی دبی ہنسی پھیل جاتی لیکن جنرل کو ذرا بھی شبہ نہ ہوتا کیونکہ وہ تو اس خیال میں رہتے تھے کہ انہوں نے اپنے برابر والے ساتھی کے کان میں آہستہ سے کوئی بات کہی ہے۔

وہ اپنے غراتے ہوئے کتوں کو لیکر اکثر فرض کے طور پر گارڈ ہاؤس کا چکر لگایا کرتے جہاں زیرحراست افسر قید تھے اور یہ افسر اپنی فوجی زندگی کی سختیوں سے سبکدوش ہو کر چائے اور تاش کا دور چلاتے اور گپیں ہانکتے رہتے تھے۔ وہ ان سب سے بہت تفصیل سے بات کرتے: ''تمھارا نام؟ تمھیں کس نے حراست میں لیا؟ کتنے

عرصے کے لئے؟ کس وجہ سے؟،، کبھی کبھی وہ بالکل غیرمتوقع طریقے پر کسی افسر کو کوئی غیرقانونی سا، مگر بہادرانہ کام کرنے کی تعریف کرتے، یا اس قدر باآواز بلند اس کی خبر لیتے کہ باہر تک آواز جاتی۔ لیکن جب وہ دل بھر کے چیخ چکتے تو تقریباً اسی سانس میں افسر سے پوچھتے کہ وہ کھانا کہاں کھاتا ہے اور اس پر اسے کتنا خرچ کرنا پڑتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ بعض دفعہ ان کا مخاطب کوئی ایسا لیفٹیننٹ ہوتا جو کسی جرم کی سزا میں کافی مدت کے لئے قید ہوا تھا اور جسے کسی ایسے دوردراز علاقے سے بھیجا تھا جہاں اپنا گارڈخانہ نہیں تھا، تو وہ افسر کہہ بیٹھتا کہ روپے کی کمی کی وجہ سے اسے معمولی سپاہیوں کے ساتھ کھانا پینا پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں آنوسوف فوراً حکم دیتے کہ اس غریب کو ان کے گھر سے کھانا دیا جائے۔ ان کا مکان گارڈخانے سے تقریباً سوگز کی دوری پر تھا۔

شہر ''ک،، میں قیام کے دوران ان کی دوستی توگانووسکی خاندان سے اتنی بڑھ گئی کہ وہ بچوں پر جان دینے لگے۔ یہاں تک کہ ہر روز ان سب کو دیکھنا جنرل کے لئے ضروری ہو گیا۔ اگر کبھی ایسا ہوتا کہ نوجوان خواتین کہیں باہر چلی جاتیں یا خود انھیں سرکاری کاموں میں مصروف رہنا پڑتا تو وہ گورنر گھر کے بڑے بڑے کمروں

میں بڑی تنہائی اور اداسی محسوس کرتے۔ ہر سال گرمی میں وہ مہینے بھر کی چھٹی لیتے اور یہ زمانہ توگانووسکی جاگیر میں گزارتے یعنی یگوروُوسکوئے میں جو شہر ''ک'' سے تقریباً چالیس میل کے فاصلے پر تھا۔

ان کی محبت کی دبی ہوئی چنگاریوں اور محبت کی تمام‌تر خواہش اور آرزوؤں کا مرکز اب یہ بچے تھے، خاص طور پر لڑکیاں۔ ان کی خود کی شادی ہوئی تو ضرور تھی لیکن مدت پہلے، اب تو انھیں یاد بھی نہیں تھا۔ جنگ سے پہلے ان کی بیوی ایک آوارہ گرد ایکٹر کی مخملی صدری اور جھالردار کفوں پر فریفتہ ہوکر اس کے ساتھ بھاگ گئی۔ جب تک وہ زندہ رہی تب تک آنوسوف اسے وظیفہ دیتے رہے لیکن بیوی کی تمام‌تر منت سماجت اور ان‌گنت درد بھرے خطوں کے باوجود انھوں نے اسے واپس آنے کی اجازت نہیں دی۔ ان کے کبھی کوئی اولاد بھی نہ ہوئی۔

٥

شام غیرمتوقع طور پر پرسکون اور گرم تھی، چبوترے اور کھانے کے کمرے میں جلتی ہوئی شمعوں کی لو میں بڑا ٹھیراؤ تھا۔ کھانے پر شہزادہ واسیلی لووُوچ نے محفل میں جان ڈال دی۔ داستان

گوئی میں ان کا جواب نہ تھا۔ وہ کوئی ایسا واقعہ لے لیتے جو کبھی محفل کے کسی ایک رکن یا کسی جاننےوالے کے ساتھ پیش آیا ہو، مگر اس میں اس قدر نمک مرچ لگاکر بیان کرتے، اور ایسا سوکھا سا منہ بناکر قصہ سناتے کہ سننےوالوں کے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔ اس رات وہ نیکولائی نیکولائیوچ کے ناکام عشق کی داستان سنا رہے تھے، ان کی محبوبہ بہت حسین اور دولت‌مند خاتون تھی۔ اس واقعے میں صرف اس حد تک صداقت تھی کہ اس خاتون کے شوہر نے اس کو طلاق دینے سے انکار کر دیا تھا، لیکن شہزادے نے بڑی چابکدستی سے حقیقت اور تصور کو یکجاکر دیا۔ انھوں نے تو یہاں تک کہہ ڈالا کہ سنجیدہ اور خوددار نیکولائی آدھی رات کے وقت جرابیں پہنے، جوتے بغل میں دبائے گلی میں دوڑتا ہوا پایا گیا۔ کسی نکڑ پر پولیس‌والا نوجوان کو پکڑ لیتا ہے، اور نیکولائی بڑی طویل اور گرماگرم بحث کے بعد کسی نہ کسی طرح اسے یقین دلانے میں کامیاب ہوتے ہیں کہ وہ چور اچکے نہیں اسسٹنٹ وکیل سرکار ہیں۔ بہرحال شادی ہو ہی گئی، کم سے کم داستان‌گو کا بیان تو یہی تھا۔ لیکن بڑے فیصلہ‌کن اور نازک لمحے میں جھوٹے گواہوں کا ایک گروہ اچانک بگڑ بیٹھا۔ اس گروہ کا اس پورے قصے میں بڑا ہاتھ تھا۔ انھوں نے تنخواہ میں اضافے کا مطالبہ کرکے

ھڑتال کر دی۔ لیکن نیکولائی اس بلا کے کنجوس ھیں (واقعی وہ ایک حد تک کنجوس تو ھیں) اور اصولی طور پر ھر قسم کی ھڑتال کے اس قدر خلاف ھیں کہ انھوں نے قانون کی ایک خاص دفعہ کا حوالہ دے کر مزید پیسے دینے سے صاف انکار کر دیا اور عدالت اپیل نے بھی ان کی تصدیق کردی۔ اور پھر عدالت میں یہ مخصوص سوال گونجا: ''ان دونوں کو قانونی طور پر شادی کے بندھوں میں باندھا جا رھا ھے۔ کیا حاضرین میں سے کسی کو اس سلسلے میں کسی رکاوٹ کا کوئی علم ھے؟،، غصے میں بھرے ھوئے جھوٹے گواھوں نے ھم‌آواز ھوکر کہا: ''ھاں ھاں، ھمیں علم ھے۔ ھم نے عدالت میں حلف لےکر جو کچھ بیان دیا تھا وہ جھوٹ ھے، پیروکار موصوف نے دھمکیاں دے کر اور جبر کرکے ھمیں ایسا کہنے پر مجبور کیا تھا۔ ان خاتون کے شوھر کے بارے میں ھم اپنی ذاتی واقفیت کی بنا پر کہہ سکتے ھیں کہ وہ دنیا کا سب سے زیادہ شریف آدمی ھے۔ یوسف کی طرح پاک‌وصاف اور فرشتے کی طرح نیک‌دل اور مہربان۔ ،،

اور شادی‌بیاہ کے قصے چھوڑئے تو شہزادہ واسیلی نے آنناؔ کے شوھر گستاو ایوانووچ فریسی کو بھی نہ چھوڑا۔ انھوں نے کہا کہ ان حضرت نے اپنی نوجوان دلہن کو میکے سے لانا چاھا تو انھیں

شادی کے دوسرے ہی دن پولیس کو بلانا پڑا تھا کیونکہ دلہن کے پاس پاسپورٹ نہ تھا اور اسے اس کے قانونی شوہر کے گھر میں لانا ضروری تھا۔ اس کہانی میں صرف اتنی صداقت تھی کہ شادی ہونے کے فوراً بعد آننا کو مستقل اپنی بیمار ماں کے پاس رہنا پڑا تھا کیونکہ ویرا جنوب گئی ہوئی تھی اور غریب گستاو ایوانووچ کافی عرصے تک ہجر کی آگ میں تپا تھا۔

یہ قصہ سن کر ہر شخص ہنسنے لگا۔ آننا آنکھیں بھینچ کر مسکرائی۔ گستاو ایوانووچ مست ہوکر قہقہے اگانے لگا۔ اس کا کسی ہوئی چمکدار کھال کا سوکھا مارا چہرہ، بڑے اہتمام سے جمے ہوئے چھدرے بال اور گہری نظریں دیکھ کر ایک ایسے ڈھانچے کا خیال آتا تھا جس نے مذاقاً اپنی انتہائی گندی بتیسی کو ننگا کر دیا ہو۔ وہ آج بھی آننا پر اسی طرح فدا تھا جیسے شادی کے پہلے دن تھا۔ ہمیشہ اس کے برابر بیٹھنے کی کوشش کرتا، چوری چھپے اسے چھوتا رہتا اور اس قدر فرماں برداری اور گھٹیا محبت سے اس کے اشاروں پر ناچتا کہ اکثر اس پر رحم آ جاتا اور اس کی وجہ سے کچھ شرمندگی سی محسوس ہونے لگتی۔

میز سے اٹھنے سے پہلے ویرا نیکولائیونا نے یونہی مہمانوں کی گنتی کر ڈالی۔ وہ تیرہ تھے۔

ویرا کافی توہم‌پرست تھی، اس نے دل ھی دل میں سوچا: ’’اف کس قدر برا شگن ھے! یہ میں نے پہلے ھی کیوں نہیں گن لیا تھا؟ واسیا کی غلطی ھے۔ اس نے ٹیلی‌فون پر مجھے کچھ بتایا ھی نہیں۔‘‘

شائین یا فریسی کے ھاں جب کبھی محفل جمتی تو اکثر کھانے کے بعد تاش کا دور چلتا، خاص کر پوکر کا، کیوں‌کہ دونوں بہنیں ایسے جوئے کے کھیلوں کی انتہائی دیوانی تھیں۔ دونوں کے گھر میں خاص اصول مقرر ھو گئے تھے۔ کھلاڑیوں کو ھاتھی دانت کے ایک خاص قیمت کے نشان برابر برابر بانٹ دئے جاتے اور اس وقت تک کھیل جاری رھتا تھا جب تک کہ تمام نشان ایک کھلاڑی کے پاس نہ پہنچ جائیں۔ اور پھر چاھے باقی سب لوگ کھیل جاری رکھنے پر کتنا ھی اصرار کیوں نہ کرتے لیکن اس شام مزید کھیل نہ ھوتا۔ کیش بکس سے نئے نشان نکالنے کی سخت ممانعت تھی۔ تجربے نے دکھا دیا تھا کہ ویرا اور آننا کو قابو میں رکھنے کے لئے یہ سخت اصول لازمی تھا کیونکہ وہ دونوں کھیل کے دوران میں اس قدر بدمست اور بدحواس ھو جاتیں کہ پھر ان کو روکنا ناممکن تھا۔ کل نقصان شاذونادر ھی کبھی دو سو روبل سے زیادہ ھوا ھوگا۔

اس دفعہ بھی پوکر کی بازی شروع ھو گئی۔ ویرا کھیل میں شریک نہیں تھی، وہ چائے کی میز

کی دیکھ بھال کرنے چبوترے پر جانےوالی تھی کہ اچانک ملازمہ نے بڑا پراسرار سا انداز بنا کر اسے کھانے کے کمرے میں بلایا۔

”کیا ہے، داشا؟“ شہزادی ویرا نے اپنے مطالعے کے چھوٹے سے کمرے میں جو سونے کے کمرے کے نزدیک تھا جاتے ہوئے ذرا خفا ہوکر پوچھا۔ ”اس قدر حماقت سے مجھے کیوں تکے جارہی ہو؟ اور تمھارے ہاتھ میں یہ کیا ہے؟“

داشا نے چھوٹی سی چوکور چیز میز پر رکھ دی۔ وہ بڑے سلیقے سے سفید کاغذ میں لپٹی ہوئی تھی، اوپر سے گلابی فیتہ بندھا تھا۔

”خدا قسم، اس میں میری غلطی نہیں ہے، بی‌بی،“ وہ برا مان کر شرم سے سرخ ہو گئی اور ہکلانے لگی۔ ”وہ اندر آیا اور کہنے لگا... “

”وہ کون ہے؟“

”ایک ملازم لڑکا، سرکار۔“

”ہوں؟“

”وہ باورچی‌خانے میں آیا اور یہ ڈبہ میز پر رکھ دیا۔ کہنے لگا: ’اپنی بیگم‌صاحب کو دے دینا، لیکن، کہنے لگا ’ذرا خیال سے خود انھیں کے ہاتھ میں دینا‘۔ سو بی‌بی، میں نے پوچھا کہ ’کس نے بھیجا ہے‘، تو بولا: ’اس میں لکھا ہوا ہے‘۔ بس یہ کہکر بھاگ گیا۔“

”جاؤ جا کر اسے واپس بلاؤ۔“

"مگر بیگم صاحب، میں کیسے بلاؤں، وہ تو اس وقت آیا تھا جب آپ کھانے میں مشغول تھیں، اس وقت میں نے آپ کو پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ تقریباً کچھ نہیں تو گھنٹہ ہو گیا ہوگا۔"

"اچھا، جاؤ، اب تم جا سکتی ہو۔"

اس نے قینچی سے فیتہ کاٹا اور اسے کوڑے کی ٹوکری میں پھینک دیا جس پر اس کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ کاغذ کے اندر سے لال مخمل کا ایک چھوٹا سا زیور کا ڈبہ نکلا جو غالباً اسی وقت دوکان سے خریدا گیا تھا۔ اس نے ڈھکنا اٹھایا جس پر ہلکا نیلا ریشم منڈھا ہوا تھا۔ ڈبے کے سیاہ مخمل پر سونے کا ایک بیضوی کنگن جگمگا رہا تھا۔ اس کے نیچے ایک پرچہ رکھا تھا۔ کسی نے پرچے کو بڑی جاں‌فشانی سے ہشت پہلو تہہ کیا تھا۔ اس نے تیزی سے پرچہ کھولا، اسے ایسا لگا کہ وہ اس رسم الخط سے واقف ہے۔ لیکن تھی تو وہ عورت ہی۔ وہ پرچہ ایک طرف رکھ کر کنگن دیکھنے لگی۔

معمولی قسم کے سونے کا کنگن تھا، بہت موٹا سا مگر کھوکھلا۔ دونوں کناروں کے اوپر سے چھوٹے چھوٹے، جلا کئے ہوئے یاقوت جڑے ہوئے تھے۔ لیکن بیچ میں ایک چھوٹا سا انوکھی قسم کا ہرا پتھر تھا جس کے گرد بہترین قسم کے پانچ پالش شدہ یاقوت دمک رہے تھے، سب کے سب مٹر برابر بڑے تھے۔ اتفاق سے ویرا نے بجلی کی روشنی میں

کنگن کو ایک خاص زاوئیے سے گھمایا۔ اچانک پتھروں کی بیضوی سطح کے بہت اندر سے بے حد حسین ارغوانی روشنیاں دمک اٹھیں۔

"اف بالکل خون ہیں"، ویرا یہ سوچ کر گھبرا گئی۔

پھر اسے خط کا خیال آ گیا۔ خط بڑی دلکش زبان میں لکھا ہوا تھا، اس کی عبارت یہ تھی:

"جناب شہزادی ویرا نیکولائیونا صاحبہ!

"میں نہائت عزت و احترام کے ساتھ آپ کی پرمسرت اور شاندار سالگرہ پر مبارکباد دیتا ہوں اور ایک حقیر تحفہ آپکی خدمت میں بھیجنے کی جرأت کرتا ہوں۔"

"اوہو، یہ حضرت ہیں"، ویرا نے خفگی سے سوچا۔ لیکن آخر تک خط پڑھتی چلی گئی۔

"میں شائد کبھی یہ جرأت نہ کر سکتا کہ آپ کو اپنی پسند کا تحفہ دوں کیونکہ نہ مجھے اس کا حق، نہ میرا مذاق اتنا نکھرا ہوا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میرے پاس اس کے قابل روپیہ بھی نہیں ہے۔ یہی نہیں بلکہ میرے خیال میں دنیا کی کوئی دولت اس قابل نہیں ہے کہ آپ کے حسن کو چارچاند لگا سکے۔

"لیکن یہ کنگن میری پرنانی کا تھا، ان سب کے آخر میں میری مرحوم ماں نے اسے پہنا ہے۔

بڑے پتھروں کے درمیان آپ کو ایک سبز پتھر نظر آئیگا۔ یہ ایک بہت ہی نایاب پتھر ہے ــ سبز یاقوت۔ ہمارے خاندان میں یہ روایت چلی آرہی ہے کہ اس کنگن کو پہن کر عورت اپنے مستقبل کا راز پالیتی ہے۔ برے خیالات اس سے دور رہتے ہیں اور انسان کسی وحشتناک موت کا شکار ہونے سے بچ جاتا ہے۔

"ان تمام پتھروں کو بڑی احتیاط کے ساتھ چاندی کے پرانے کنگن سے یہاں منتقل کر دیا گیا ہے، آپ یقین رکھئے کہ آپ سے پہلے یہ کنگن کسی ہاتھ کی زینت نہیں بنا۔

"آپ چاہیں تو اس حقیر سے زیور کو پھینک دیجئے، چاہیں کسی اور کو دے دیجئے۔ میں یہ سوچ سوچ کر خوش ہو لونگا کہ آپ کے ہاتھوں نے اسے چھوا ہے۔

"میں استدعا کرتا ہوں مجھ سے خفا نہ ہوں، مجھے سات سال پہلے والی حماقت یاد آتی ہے اور میں یہ سوچ کر شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہوں کہ میں نے آپ جیسی دوشیزہ کو احمقانہ اور والہانہ خط لکھنے کی جرأت کی۔ یہی نہیں بلکہ دل کو یہ یقین دلایا کہ مجھے ان خطوں کا جواب بھی ضرور ملے گا۔ آج میرے دل میں آپ کے لئے رعب داب، قدر و منزلت اور لامحدود اور زندہ و پائندہ تحسین اور پرانکسار اور غلامانہ محبت کے سوا کچھ

نہیں ہے۔ میں ہمیشہ ہمیشہ آپکی خوشی و مسرت کا خواهاں رهوں گا اور آپ کی خوشی میں خوش هوں گا۔ میں دل هی دل میں اس کرسی کے سامنے دوزانو هو جاتا هوں جس پر آپ بیٹھتی هونگی، اس زمین کو سجدہ کرتا هوں جو آپ کے قدموں تلے هوگی، اور ان درختوں کو چومتا هوں جن کو آپ نے گزرتے گزرتے چھو لیا هوگا، میں ان ملازموں کو سلام کرتا هوں جن سے آپ بات کرتی هونگی۔ اب مجھے ان لوگوں اور ان چیزوں پر بھی رشک نہیں آتا، میں ان سے حسد نہیں کرتا۔

”ایک دفعہ پھر میں آپ سے معافی مانگتا هوں کہ اتنا طویل اور بیکار خط لکھ کر آپ کو پریشان کیا۔

”مرتے دم تک اور موت کے بعد بھی آپ کا خاکسار خادم —

”گ۔ س۔ ژ۔ “

”سمجھ میں نہیں آتا واسیا کو دکھاؤں یا نہیں؟ دکھاؤں تو کب دکھاؤں؟ ابھی یا مہمانوں کے جانے کے بعد؟ نہیں، میرے خیال میں بعد هی میں دکھاؤں گی۔ اب تو میں اس بےچارے کی طرح احمق بن جاؤنگی۔ “

شہزادی دیر تک اس طرح دل هی دل میں سوچ بچار کر رهی تھی۔ اس کی نظر لمحے بھر

کو بھی خون کی طرح دھکتی ہوئی ان پانچ سرخ روشنیوں سے نہ ہٹ سکی جو پانچ یاقوتوں کے اندر چمک رہی تھیں۔

٦

کرنل پوناماریوف بڑی مشکل سے پوکر کھیلنے پر راضی ہوئے۔ انھوں نے بہت کہا کہ میں اس کھیل کی الف ب بھی نہیں جانتا، میں تو کبھی مذاق میں بھی جوا نہیں کھیلتا، مجھے تو صرف وینٹ کھیل کچھ ذرا پسند ہے اور تھوڑا بہت آتا بھی ہے۔ مگر ان کی ایک نہ چلی اور آخر وہ مان گئے۔

شروع شروع میں انھیں سمجھانا اور بتانا پڑا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں وہ کھیل کے اصولوں میں استاد ہوگئے۔ اور آدھے گھنٹے کے اندر اندر انھوں نے تمام مہرے اپنے سامنے جمع کرلئے۔

''یہ بات غلط ہے!،، آننا مذاقاً انھیں برا بھلا کہنے لگی۔ ''تھوڑی دیر تو ہمیں اور پریشان ہو لینے دیا ہوتا۔،،

ویرا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنے تین مہمانوں یعنی سپیشنیکوف، کرنل اور قابل احترام مگر کندذہن اور بھدے جرمن وائس گورنر کی خاطر مدارات کیسے کرے۔ اس نے ان تینوں کے لئے وینٹ کی بازی جمائی اور گستاو ایوانووچ سے کہا کہ

چوتھے آدمی کی کمی وہ پوری کر دے۔ آننا نے نظریں جھکا کر گویا اس کا شکریہ ادا کیا، اور ویرا اپنی بہن کے اس اشارے کو فوراً سمجھ گئی۔ ہر شخص جانتا تھا کہ اگر گستاو ایوانووچ کو تاش میں نہ پھنسا دیا جائے تو وہ پوری شام اپنی بیوی کے ارد گرد منڈلاتا رہیگا۔ ڈھانچے نما چہرے پر سڑے ہوئے دانت نکلے رہینگے اور اس کی موجودگی ناقابل برداشت بن جائیگی۔

اب محفل رنگ پر آ گئی تھی، فضا بہت جان دار اور پرلطف ہوگئی۔ واسیوچوک جینی ریتر کے ساتھ ملکر مدھم مدھم سروں میں چھوٹے چھوٹے اطالوی لوک گیت یا روبینشٹین کے لکھے ہوئے مشرقی گیت گنگنا رہا تھا۔ اس کا گلا زیادہ اونچا نہ تھا پر بڑا ھی دلکش، سریلا اور فرمانبردار تھا۔ جینی ریتر موسیقی کا ریاض بہت سختی سے چاھتی تھی۔ وہ بڑی خوشی سے اس کو کمپنی دیتی۔ اس کے علاوہ، کہتے ھیں کہ واسیوچوک اسے پیار کرتا ھے۔

آننا صوفے کے سرے پر ٹکی ہوئی نہایت بے باکی سے ھوسار سے نخرا کر رھی تھی۔ ویرا قریب سے گزری اور مسکرا کر سنتی ہوئی چلی گئی۔

''اوہ، دیکھو، ھنسو نہیں،، آننا نے اپنی تنگ، دلربا اور شرارت بھری تاتار نظروں سے افسر کو دیکھتے ہوئے خوش‌دلی سے کہا۔ ''ظاھر ھے تم سمجھتے ھو کہ کسی دستے کے آگے آگے گھوڑے

کو سرپٹ دوڑانا یا ریس میں ٹٹیاں پار کر جانا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ لیکن ہمارے کارناموں کو بھی تو دیکھو۔ ہم نے حال ہی میں ایک لاٹری ختم کی ہے۔ تم اسے کوئی آسان کام سمجھتے ہو؟ فو! افوہ وہ جگہ اس قدر کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ اور تمباکو کی ایسی بو تھی کہ کیا بتاؤں۔ ہر طرف گاڑی بان، ڈیوڑھی‌دار اور خدا جانے کون کون بھرا ہوا تھا۔ اور ان سب نے مجھ سے اپنی اپنی شکایتوں اور تکلیفوں کا رونا رویا۔ دن بھر میں پل بھر کو بھی آرام نہیں کر سکی۔ اور جناب، اسی پر بس نہیں، اب شریف خاندان کی ضرورت‌مند عورتوں کی مدد کے لئے ایک محفل موسیقی ہوگی۔ اور پھر امدادی بال ہوگا۔"

"مجھے امید ہے، اس بال میں آپ میرے ساتھ مزورکا ناچنے سے انکار نہیں کریں‌گی؟" باختینسکی نے فوراً بیچ میں کہا اور ذرا سا آگے کو جھک‌کر آرام‌کرسی کے نیچے ایڑیاں بجائیں۔

"شکریہ، لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز بالک گھر ہے۔ تم سمجھتے ہو نا میرا کیا مطلب ہے۔ شریر اور بدتمیز بچوں کا گھر۔"

"اوہ، سمجھا، وہ تو بہت دلچسپ جگہ ہوگی۔"

"چپ رہو، اس قسم کی چیزوں پر ہنستے شرم آنی چاہئے تمہیں۔ لیکن جانتے ہو مشکل کیا ہے؟ ہم ان بدقسمت بچوں کو ٹھکانہ دینا چاہتے

ھیں جن کی روحیں پیدائشی بدیوں اور بری مثالوں کی وجہ سے گندی ھو گئی ھیں۔ ھم انھیں محبت اور آرام دینا چاھتے ھیں...،،

”پھر!،،

”...تاکہ ان کا اخلاق بہتر ھو سکے اور ان میں احساس فرض پیدا ھو جائے۔ تم میرا مطلب سمجھتے ھو نا؟ اور روزانہ لاکھوں کروڑوں بچے ھمارے پاس لائے جاتے ھیں لیکن ان میں سے ایک بچہ بھی بدتمیز نہیں ھے! اگر ھم ماں باپ سے پوچھیں کہ تمھارا بچہ بدتمیز ھے تو وہ خفا ھو جاتے ھیں — بھلا سوچو تو سہی۔ چنانچہ بالک گھر کھولا جا چکا ھے، پاک کیا جا چکا ھے، غرض ھر چیز تیار ھے، لیکن اس میں ایک بھی باسی نہیں آیا! اب تو یہ نوبت آگئی ھے کہ ھم بدتمیز بچے لانے کے عوض میں انعام کا اعلان کرنے والے ھیں۔ ،،

”آننا نیکولائیونا،، ھوسار نے معنی‌خیز بے‌تابی کے ساتھ اسے ٹوکا۔ ”انعام کا اعلان کرنے کی کیا؟ مجھے مفت ھی لے لیجئے، سچ کہتا ھوں، آپ کو مجھ سے زیادہ بدتمیز بچہ نہیں مل سکتا۔ ،،

”خاموش رھو! تم سے تو سنجیدگی سے بات کرنا ناممکن ھے،، وہ قہقہہ مارکر ھنس پڑی۔ اور صوفے کی پشت سے لگ کر بیٹھ گئی، اس کی آنکھیں چمک رھی تھیں۔

شہزادہ واسیلی ایک بڑی سی گول میز کے قریب بیٹھے اپنی بہن، آنوسوف اور اپنے بہنوئی کو ایک خاندانی کارٹون البم دکھ رہے تھے۔ یہ کارٹون خود ان کے بنائے ہوئے تھے۔ چاروں کے چاروں دل کھول کر ہنس رہے تھے، اور رفتہ رفتہ وہ سب سہمان بھی ان کے گرد جمع ہو گئے جو تاش میں مصروف نہیں تھے۔

یہ البم، شہزادہ واسیلی کی طنزیہ داستانوں کا ضمیمہ تھا۔ وہ انتہائی سکون کے ساتھ ''ترکی، بلغاریہ اور دوسری جگہوں میں بہادر جنرل آنوسوف کے عاشقانہ کارناموں،، کی تصویریں دکھا رہے تھے اور ''مونٹ کارلووالے شیخی خور شہزادے نیکولائی بولات توگانووسکی کے کارنامے،، وغیرہ دکھا رہے تھے۔

''حضرات اور خواتین، اب میں آپ کو اپنی پیاری بہن لودملا لووونا کی مختصر داستان حیات سے متعارف کراؤں گا،، انھوں نے کہا اور آہستہ سے اپنی بہن کو چھیڑنے کے انداز میں مسکرایا۔ ''پہلا حصہ، بچپن۔ بچی بڑھ رہی ہے۔ اس کا نام لیما تھا۔،،

البم کے صفحے پر ایک چھوٹی سی بچی کا جسم نظر آیا جو جان بوجھ کر بہت ہی بچکانے انداز میں بنایا گیا تھا۔ اس کے چہرے کا ایک رخ دکھایا گیا تھا لیکن کچھ اس طرح کہ دونوں آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ اسکرٹ کے اندر سے دو

ٹوٹی پھوٹی لکیریں نکل کر اس کی ٹانگیں ہونے کا دعوی کر رہی تھیں، دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

"مجھے کبھی کسی نے لیما نہیں کہا"، لودملا لووونا نے ہنس کر کہا۔

"دوسرا حصہ، پہلی محبت۔ سوار دستے کا ایک کیڈٹ، سنگ دل اور قاتل لیما کے سامنے دوزانو ہے اور اس کو اپنی لکھی ہوئی نظم سنا رہا ہے۔ نظم میں یہ نادرالوجود اشعار بھی موجود ہیں:

"تمہاری شاندار ٹانگ،
کہنا چاہتا ہوں،
آسمانی محبت کے قابل ہے!"

"اس میں ٹانگ کی انوکھی تعریف نظر آتی ہے۔

"اور اب کیڈٹ لیما سے درخواست کر رہا ہے کہ اپنے ماں باپ کے گھر سے بھاگ چلو۔ یہاں آپ ان دونوں کو بھاگتے دیکھ رہے ہیں۔ اور یہ ایک انتہائی نازک موقع ہے: غصے میں آگ بگولہ باپ مجرموں کو پکڑ لیتا ہے۔ ڈرپوک کیڈٹ لیما کو مشکل میں چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

تم نے اس قدر بھدی طرح
اپنی ناک پر پاؤڈر لگایا
کہ اب ہمارا تعاقب کرنے والے

ہماری سیدھ میں بڑھ رہے ہیں،
چنانچہ فوراً ان سے بچنے کے لئے
اپنی پوری کوشش کرو۔
اور میں جھاڑیوں میں بھاگ جاؤنگا۔

"قاتل اور ساحر لیما" کی کہانی کے بعد "شہزادی ویرا اور عاشق ناکام تاروالا" نام کی کہانی شروع ہوتی تھی۔

"ابھی اس دل گداز نظم کا صرف خاکہ تیار ہوا ہے " واسیلی لووچ نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "کہانی ابھی تیار ہو رہی ہے۔"

"یہ تو کوئی نئی چیز ہے، بھئی" آنوسوف نے کہا "میں نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔"

"یہ آخری شمارہ ہے، کتابوں کی دنیا کی یہ سب سے تازہ خبر ہے۔"

ویرا نے آہستہ سے اس کا شانہ چھوا۔

"چھوڑو، واسیا۔"

لیکن واسیلی لووچ نے سنا ہی نہیں یا شاید اسے سنجیدگی سے نہیں لیا۔

"ارے بھئی، بڑا دقیانوسی واقعہ ہے۔ ایک دن مئی کے مہینے میں ویرا نامی لڑکی کو ایک خط ملا، پہلے ہی صفحے پر دو فاختائیں مصروف بوس و کنار تھیں۔ لیجئے یہ رہا خط اور یہ رہیں فاختائیں۔

''خط میں انتہائی شدومد سے اظہار عشق کیا گیا ہے۔ عبارت میں ہجوں سے بالکل بغاوت کردی گئی ہے۔ خط اس طرح شروع ہوتا ہے:
'اے خوبصورت حسینے، تم میرے سینے میں مچلتا ہوا شعلوں کا ایک طوفانی سمندر ہو۔ تمھاری نظریں زہریلی ناگن کی طرح میری مصیبت زدہ روح کو ڈس رہی ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ خط کا اختتام اس انکساری کے ساتھ ہوتا ہے: 'میں ایک غریب تار والا ہوں لیکن میرے جذبات میلارڈ گیورگ سے کم نہیں ہیں۔ میں اپنا نام بتانے کی جرأت نہیں کر سکتا — یہ بہت بدتمیزی ہوگی۔ میں صرف اپنے نام کے پہلے حروف لکھونگا: پ۔ پ۔ ژ۔ مہربانی سے اپنا جواب ڈاک سے بھیجئے، ڈاکخانہ ریستانتے'۔
اور حضرات و خواتین، لیجئے یہ تار والے کی تصویر ملاحظہ فرمائیے جو بہت ہی مہارت سے رنگین کھریا سے بنائی گئی ہے۔
''ویرا کا دل چھلنی ہو گیا (یہ دل ہے اور یہ تیر) لیکن ایک تہذیب‌یافتہ اور تمیزدار حسینہ ہونے کی وجہ سے اس نے یہ خط اپنے قابل احترام والدین کو دکھایا اور اپنے بچپن کے ساتھی اور منگیتر واسیا شائین کو دکھایا جو ایک وجیہ نوجوان تھا۔ یہ لیجئے تصویر دیکھئے۔ تھوڑے دن بعد ان تصاویر کے نیچے شعروں میں ان کی تفصیل درج کر دی جائیگی۔

”واسیا شائین نے رو رو کر ویرا کو منگنی کی انگوٹھی واپس کی۔ ’میں تمھاری خوشیوں میں رکاوٹ نہیں ڈالونگا، اس نے کہا۔ ’لیکن میں منت کرتا ہوں، جلدبازی سے کام نہ لینا۔ آخری قدم اٹھانے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا۔ پہلے اس کے اور اپنے جذبات کا استحان لےلو۔ ننھی، تم نے زندگی میں کچھ نہیں دیکھا اور تم پروانے کی طرح شعلے کے گرد اڑ رہی ہو۔ لیکن میں — آہ! میں اس بےمہر اور دھوکےباز دنیا کو جانتا ہوں۔ تمھیں سمجھنا چاھئے کہ تار والے بہت دلکش مگر بہت دھوکےباز ہوتے ھیں، ان کی دلی خواھش ھوتی ھے کہ وہ اپنے مغرور حسن اور جھوٹے جذبات سے کسی معصوم کو دھوکا دیں اور پھر اسے بےرحمی سے ٹھکرا دیں۔ ‘

”چھہ مہینے بیت گئے۔ رقص زندگی کی لہروں میں ویرا اپنے عاشق کو بھول گئی اور اس نے نوجوان اور خوبرو واسیا سے شادی کرلی لیکن تار والا اسے نہ بھلا سکا۔ ایک دن اس نے چمنی صاف کرنے والے کا بھیس بھرا اور منہ پر کالک کے دھبے وغیرہ لگا کر شہزادی ویرا کی خلوت‌گاہ میں پہنچ گیا۔ آپ دیکھ سکتے ھیں کہ وہ ھر ھر جگہ — قالینوں، تکیوں اور دیواروں پر بلکہ چوبی فرش تک پر اپنی پانچوں انگلیوں اور اپنے لبوں کے نشان چھوڑ گیا۔

”اور پھر وہ ایک دیہاتی عورت کا بھیس بدل کر ہمارے باورچی‌خانے میں برتن دھونے کا کام کرنے لگا۔ لیکن ہمارا باورچی لوکا اس پر اس قدر مہربان ہو گیا کہ اسے بھاگتے ہی بنی۔

”وہ بچارا پاگل خانے پہنچ گیا۔ اور یہ دیکھئے اب وہ راہب بن بیٹھا۔ لیکن روزانہ بلاناغہ وہ ویرا کو عاشقانہ خط بھیجتا رہا۔ جہاں جہاں کاغذ پر اس کے آنسو گرتے تھے وہاں روشنائی پھیل جاتی تھی۔

”آخرکار وہ مر گیا۔ لیکن مرنے سے پہلے اس نے اپنی وصیت میں ویرا کو تارگھر کے دو بٹن اور عطر کی ایک شیشی دی جو اس کے آنسوؤں سے لبریز تھی...“

”تھوڑی سی چائے ہو جائے، کہئے حضرات و خواتین، کیا خیال ہے؟“ ویرا نیکولائیونا نے پوچھا۔

۷

خزاں کے غروب آفتاب کا منظر دم توڑ رہا تھا۔ ہلکے نیلے بادل اور افق کے کنارے پر چمکتی ہوئی پتلی سی ارغوانی دھاری مدھم ہوتے ہوتے ختم ہو گئی۔ اور اب زمین، درخت اور آکاش نظر نہیں آرہے تھے۔ رات کی تاریکی میں بڑے بڑے ستارے پلکیں جھپکا کر جھلملا رہے تھے۔ روشنی

کے مینار سے نیلی نیلی روشنی کا ایک باریک سا غبار آسمان کی طرف بلند ہو رہا تھا۔ وہ آکاش سے ٹکراتا اور روشنی کے ایک رقیق اور دھندلے دائیرے کی شکل میں بکھر جاتا۔ شمعوں پر آویزاں شیڈوں کے چاروں طرف پروانے منڈلا رہے تھے۔ سامنے والے باغ میں تمباکو کے ستارے نما پھول سرد تاریکی میں اور بھی زیادہ تیز خوشبو بکھیر رہے تھے۔

سپیشنیکوف، وائس گورنر اور کرنل پوناماریوف بہت دیر ہوئی جا چکے تھے۔ انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ٹرام کے اسٹیشن سے جنرل کے لئے گھوڑے واپس بھیج دینگے۔ باقی مہمان چبوترے پر بیٹھے تھے۔ جنرل آنوسوف کے احتجاج کے باوجود بہنوں نے انھیں اورکوٹ پہنا دیا اور ان کے پاؤں گرم نمدے میں لپٹا دیئے۔ وہ دونوں بہنوں کے بیچ میں بیٹھے تھے اور ان کی محبوب ارغوانی پومارڈ کی بوتل ان کے سامنے رکھی تھی۔ دونوں حسینائیں بڑے اصرار سے ان کی خاطر تواضع کر رہی تھیں، کبھی ان کے نازک گلاس کو گاڑھی شراب سے بھرتیں اور کبھی ان کے لئے پنیر کاٹتیں، جنرل لطف و محبت کی بارش سے چندھیائے بیٹھے تھے۔

''ہاں، خزاں آ رہی ہے،، بڑے میاں نے شمع کی روشنی کو گھورتے ہوئے کہا اور کچھ سوچ کر سر ہلایا۔ ''خزاں، اور مجھے اب بوریا بستر باندھنا ہے۔ کیا غضب ہے! موسم اتنا پیارا ہو

گیا ہے، ایسے میں یہاں سمندر کے کنارے سکون اور آرام کی زندگی گزارنا کیسا اچھا لگتا...،،

''تو ٹھیر کیوں نہیں جاتے، دادا جان؟،، ویرا نے کہا۔

''نہیں ٹھیر سکتا، بیٹی، نہیں ٹھیر سکتا۔ میرا فرض پکار رہا ہے۔ میری چھٹیاں ختم ہو چکیں۔ ویسے ظاہر ہے دل تو یہی چاہتا ہے کہ ٹھیر سکتا۔ کیا خوشبو ہے گلاب میں! یہاں تک مہک آرہی ہے۔ نجانے کیا بات ہے گرمی میں تو سفید ببول کے سوا کسی پھول میں خوشبو رہتی ہی نہیں، ببول سے بھی جانو میٹھی میٹھی سی بو آتی ہے۔،،

ویرا نے ایک چھوٹے سے گلدان سے دو چھوٹے چھوٹے گلاب نکالے — گلابی اور گہرا سرخ — اور انہیں جنرل کے کوٹ کے کاج میں لگا دیا۔

''شکریہ، ویرا پیاری،، انھوں نے گلاب کی خوشبو سونگھنے کو سر جھکایا اور نیک دل بوڑھے آدمیوں کی طرح بڑے دوستانہ انداز میں مسکرائے۔

''مجھے یاد ہے، ہم نے بخاریست میں پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ ایک دن میں سڑک پر جا رہا تھا تو گلاب کی بڑی تیز خوشبو آئی۔ میں رکا، دیکھتا کیا ہوں کہ دو سپاہی عطر کی بہت خوبصورت سی بلوری بوتل لئے بیٹھے ہیں۔ وہ گلاب کے عرق سے اپنے جوتے اور بندوق کے گھوڑے چمکا رہے

تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ 'یہ کیا چیز ہے تمھارے پاس؟، کہنے لگے 'کسی قسم کا تیل ہے، جناب۔ ہم نے تھوڑا سا اپنے دلیئے میں بھی ڈالا، مگر اچھا نہیں ہے— زبان پر کڑوا لگتا ہے۔ البتہ خوشبو اچھی خاصی ہے۔'، میں نے انھیں ایک روبل دیا اور انھوں نے مجھے خوشی خوشی تیل دے دیا۔ بوتل آدھی سے بھی کم رہ گئی تھی۔ مگر آدھی بوتل بھی کم‌ازکم دو سو روبل میں آتی۔ سپاھی خوش تھے، کہنے لگے: 'ایک چیز اور ہے، جناب، کسی قسم کے ترکی مٹر ھیں، ہم نے انھیں ابالنے کی لاکھ کوشش کی لیکن کمبخت کسی طرح نرم ھی نہیں ھوتے۔'، تو بھائی، وہ قہوے کے بیج تھے، چنانچہ میں نے ان سے کہا کہ یہ تو ترکوں کے کام کی چیز ہے— سپاھیوں کے کسی کام کی نہیں۔ اجی وہ تو شکر کرو کہ کمبختوں نے افیم نہیں کھا لی، زمین پر کہیں کہیں افیم کی گولیاں بھی پڑی تھیں۔،،

''دادا جان، سچ سچ بتائیے،، آننا نے پوچھا۔ ''جنگ کے دنوں میں آپ کو ڈر لگا تھا کبھی؟ کبھی خوفزدہ ھوئے تھے آپ؟،،

''کیسی عجیب باتیں کرتی ھو، بیٹی، ارے بھئی ظاھر ہے ڈرا تھا۔ ان لوگوں کی بات کا یقین نہ کرو جو کہتے ھیں کہ ہم تو بالکل خوفزدہ نہیں ھوتے، ھمیں تو گولیوں کی سنسناھٹ دنیا کا

سب سے زیادہ لطیف نغمہ معلوم ہوتی ہے۔ ایسی باتیں صرف بودے اور شیخی‌باز لوگ کرتے ہیں۔ ہر شخص ڈرتا ہے، فرق یہ ہے کہ بعض خوف کے مارے تھرتھر کانپنے لگتے ہیں اور بعض اپنے اوپر قابو رکھتے ہیں، خوف اور اندیشہ تو اپنی جگہ رہتا ہی ہے البتہ تجربے کے ساتھ ساتھ اپنے اوپر قابو پانے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ اور اس طرح بہادر اور سورما پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ہے کل اصلیت۔ لیکن ایک دفعہ تو ڈر کے مارے میرا دم نکلتے نکلتے بچا۔"

"سچ، کیا ہوا تھا، دادا جان، ہمیں سنائیے"، دونوں بہنیں ہم‌آواز ہوکر گڑگڑائیں۔

وہ آنوسوف کی داستانوں کو آج تک اسی جوش‌وخروش کے ساتھ سنتی تھیں جس طرح بچپن میں۔ آننا نے بچوں کی طرح میز پر کہنیاں رکھ لی تھیں اور دونوں ہتیلیوں میں زنخدان لیئے بیٹھی تھی۔ ان کی پرسکون اور سیدھی سادھی داستانوں میں بڑی دلکشی اور سکون تھا۔ جنگ کے قصے سناتے ہوئے وہ کچھ کتابی سے الفاظ اور محاورے استعمال کرتے تھے جو بہت عجیب اور بےموقع معلوم ہوتے۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ کسی مشہور قدیم داستان‌گو کی نقل کر رہے ہوں۔

"بہت چھوٹی سی کہانی ہے"، انھوں نے کہا۔ "یہ واقعہ جاڑوں کے زمانے میں شیپکا میں

پیش آیا تھا۔ دماغ پر اندرونی چوٹ پہنچنے کے بعد کی بات ہے جب ہم چار ساتھی ایک خندق میں رہتے تھے، کہ کوئی خوفناک سی چیز مجھ پر چھا گئی۔ ایک دن صبح بستر سے اٹھا تو مجھے خیال ہونے لگا کہ میں یاکوف نہیں ہوں نیکولائی ہوں۔ میں نے بہت کوشش کی مگر اس وہم کو دل سے نہ نکال سکا۔ میں سمجھ گیا کہ میرا دماغ اپنی جگہ سے کھسک رہا ہے چنانچہ میں نے چلاکر پانی مانگا۔ سر بھگویا اور ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ ''

''یاکوف میخائیلوچ، واللہ'' پیانونواز جینی ریتر نے کہا۔ ''آپ اپنی جوانی کے زمانے میں بڑے خوبرو ہوں گے، آپ نے تو نجانے کتنی عورتوں کا دل جیتا ہوگا۔ ''

''اوہ، ہمارے دادا جان تو آج تک خوبصورت ہیں!'' آننا چلائی۔

''نہیں، خوبصورت تو نہیں تھا میں'' آنوسوف نے خاموش مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''البتہ راھب بھی نہیں تھا۔ بخاریست میں ایک ذرا رنگین واقعہ پیش آیا تھا۔ ہم شہر میں داخل ہوئے تو بڑے چوک میں لوگوں نے گولہ بارود سے ہمارا سواگت کیا۔ شہر کی بہت سی کھڑکیاں ٹوٹ گئیں لیکن جہاں جہاں گلاسوں میں پانی رکھا ہوا تھا وہاں کھڑکیاں محفوظ رہیں۔ مجھے اس طرح اس

بات کا پتہ چلا جب میں اس مکان میں پہنچا جو میرے حصے میں آیا تھا۔ مکان کی کھڑکی پر ایک نیچا سا پنجرا نظر آیا۔ پنجرے پر ایک بڑی سی بلوری بوتل رکھی تھی۔ اس میں صاف ستھرا پانی بھرا تھا اور سنہری مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ بوتل میں ایک ڈنڈے پر بلبل زرد بھی نظر آ رہی تھی۔ بلبل زرد اور پانی میں! میں حیران رہ گیا۔ لیکن غور سے دیکھنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ بوتل کا تلا بہت چوڑا ہے اور اس میں گہری سی کھوکھلی جگہ ہے جہاں بلبل زرد آسانی سے اڑ سکتی تھی اور بیٹھ سکتی تھی۔

"میں گھر میں داخل ہوا، اور مجھے ایک بےحد حسین بلغاریائی لڑکی نظر آئی۔ میں نے اسے اپنا پروانہ دکھایا اور موقع سے فائدہ اٹھا کر اس سے پوچھ ھی لیا کہ گولیاں چلنے کے باوجود گھر کی کھڑکیاں کیوں کر سلامت ھیں تو اس نے مجھے بتایا کہ یہ سب کرامات پانی کی ھیں۔ اس نے مجھے بلبل زرد کے بارے میں بھی بتایا۔ کس قدر احمق تھا میں! باتیں کرتے کرتے ھماری نظریں ملیں، ھم دونوں کے درمیان بجلی کی لہر سی دوڑ گئی، ایک شعلہ سا لپکا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں عشق میں گرفتار ھو گیا ھوں — انتہائی والہانہ طریقے پر اور اب اس کا کوئی علاج نہیں ھو سکتا۔"

بڑے میاں رکے اور آهسته آهسته سیاه شراب کے گھونٹ پینے لگے۔

''تو پھر بعد میں اس سے اظہار محبت کیا تھا آپ نے، کیوں؟،، پیانونواز نے پوچھا۔

''ھاں، ظاھر ہے کیا، لیکن میں نے خاموش اظہار محبت کیا، ھوا یوں...،،

''دادا جان، دیکھئے کہیں شرم سے ھماری نظریں نه جھک جائیں؟،، آننا نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بالکل نہیں، جو کچھ ھوا، نہایت باعزت طریقے پر ھوا۔ بھئی ھمیں دوسری جگه کے شہریوں سے اس قسم کا سواگت نہیں ملا تھا۔ لیکن بخاریست کے لوگ تو ھمارے ساتھ ایسے گھل مل گئے که کیا بتاؤں۔ ایک دن تو جیسے ھی میں نے وائلن بجانا شروع کیا، ویسے ھی لڑکیاں اتوار کا لباس پہنے آ پہنچیں اور ناچنے لگیں، پھر تو یه روز کا معمول ھو گیا۔

''اسی قسم کی ایک شام تھی۔ چاند چمک رھا تھا۔ میں اس گلیارے میں چلا گیا جہاں میری بلغاریائی حسینه نظروں سے اوجھل ھوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ایسی بن گئی جیسے گلاب کی سوکھی پتیوں کی چھانٹ کر رھی ھو، ارے بھئی، وھاں تو بوریاں بھربھر کر گلاب کی پتیاں جمع کی جاتی ھیں۔

مگر میں نے اسے آغوش میں لیا اور سینے سے لگاکر کئی دفعہ چوما۔

''اس کے بعد سے، جیسے ھی آکاش پر چاند اور تارے جھلملاتے میں اپنی محبوبہ کے پاس پہنچ جاتا اور جب تک اس کی آغوش میں رھتا، اس وقت تک گویا دن بھر کی تمام پریشانیاں بھولے رھتا۔ اور پھر ھمارے کوچ کا وقت آگیا، ھم نے ھمیشہ ھمیشہ ایک دوسرے سے محبت کرنے کا وعدہ کیا اور ھمیشہ ھمیشہ کے لئے جدا ھو گئے۔''

''بس؟''، لودملا لوو ونا نے ناامید ھو کر پوچھا۔

''اور کیا چاھتی ھو تم؟''، جنرل نے جواب دیا۔

''صاف گوئی معاف، یا کوف میخائیلووچ، مگر سچی بات یہ ھے کہ یہ محبت نہیں ھے۔ یہ تو فوجی افسر کے کیمپ کا ایک کارنامہ ھے اور بس۔''

''سچ تو یہ ھے کہ، بھئی، مجھے معلوم نہیں وہ محبت تھی یا کوئی اور جذبہ...''

''کیا مطلب، آپ نے کبھی سچی محبت دیکھی ھی نہیں، کیا؟ ایسی محبت جس میں... میرا مطلب یہ ھے کہ اس قسم کی محبت جو پاک، پاکیزہ اور روحانی ھو... آسمانی... کیا، آپ کو کبھی ایسی محبت کا تجربہ نہیں ھوا؟''

''سچی بات ھے، بھئی، میں کہہ نہیں سکتا۔'' بڑے میاں کرسی سے اٹھتے شش وپنج میں پڑے ھوئے ھکلائے۔ ''میرے خیال میں مجھے تو کبھی ھوا

نہیں ایسا تجربہ۔ جوانی میں تو مجھے تاش، رنگ رلیوں اور جنگ سے فرصت ھی نہیں تھی، ایسا محسوس ہوتا جیسے زندگی اور شباب اور صحت و تندرستی لافانی ھے۔ اور پھر مڑکر دیکھا تو میں بوڑھا اور بیکار ھو چکا تھا... اور اب، ویرا پیاری، مجھے اور نہ روکو۔ اب میں تم سب سے رخصت ھوتا ھوں... ھوسار،، انھوں نے بختینسکی سے کہا۔ ''رات گرم ھے، آؤ ھماری گاڑی تک پیدل چلیں۔،،

''میں آپ کے ساتھ جاؤنگی، دادا جان،، ویرا نے کہا۔

''اور میں بھی،، آننا نے بیچ میں ھی ٹوکا۔

جانے سے پہلے ویرا اپنے شوھر کے پاس گئی۔

''میری دراز میں ایک سرخ ڈبہ رکھا ھے،، اس نے آھستہ سے اپنے شوھر سے کہا۔ ''اس میں ایک خط نظر آئیگا۔ پڑھ لینا۔،،

۸

آننا اور بختینسکی آگے آگے جا رھے تھے۔ ان سے تقریباً بیس قدم پیچھے ویرا اور جنرل ھاتھ میں ھاتھ ڈالے ھوئے آ رھے تھے۔ رات اتنی تاریک تھی کہ ان کی نظریں کئی منٹ تک اس تاریکی کی عادی نہ ھو سکیں اور انھیں ٹٹول ٹٹول کر چلنا پڑا۔ آنوسوف اس عمر میں بھی یہ رعب جماتے تھے کہ ان کی بینائی بے حد

تیز ہے چنانچہ انھیں اپنی ساتھی کی رہنمائی کرنی پڑی۔ تھوڑی دیر بعد ان کا بڑا سا سرد ہاتھ ویرا کے ہاتھ کو سہلاتا جو آہستہ سے ان کی آستین پر رکھا ہوا تھا۔

"عجیب عورت ہے یہ لودملا لووونا،، اچانک انھوں نے کچھ اس طرح کہا جیسے وہ ان خیالات کا اظہار کر رہے ہوں جو بہت دیر سے ان کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے۔ "اپنی زندگی میں نجانے کتنی بار میں نے دیکھا کہ جیسے ہی عورت پچاس سے اوپر ہوتی ہے، اسے دوسروں کی داستان محبت سننے کی بےقراری رہنے لگتی ہے اور اگر کہیں وہ بیوہ یا کنواری ہو تب کیا کہنا۔ یا تو تاک جھانک کرےگی، یا افواہیں پھیلائےگی یا دوسروں کی خوشیوں کی نگہبان بن بیٹھےگی، اور والہانہ محبت کے سلسلے میں بہت سی خالی خولی اور بےجان باتیں بنانے لگےگی۔ لیکن اتنا میں ضرور کہوں‌گا کہ آج‌کل کے لوگ جانتے ہی نہیں کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ مجھے کہیں سچی محبت نظر نہیں آتی۔ اپنے زمانے میں بھی مجھے کبھی سچی محبت نظر نہیں آئی!،،

"یہ کیسے ہو سکتا ہے، دادا جان،، ویرا نے آہستہ سے اس کا بازو دباتے ہوئے اعتراض کیا۔ "کیسا الزام دے رہے ہیں آپ دنیا کو! آپ کی تو خود شادی ہوئی تھی، کیوں؟ اس وقت خود آپ نے محبت کی ہوگی!،،

"شادی سے کیا فرق پڑتا ہے، ویرا؟ جانتی ہو میری شادی کس طرح ہوئی تھی؟ دیکھوں کہ ایک نوجوان اور شگفتہ لڑکی میرے قریب بیٹھی ہے، اس کے سینے میں مدوجزر پیدا ہو رہے ہیں۔ وہ اپنی حسین پلکیں جھکا لیتی، اور اچانک شرم سے گلنار ہو جاتی۔ اس کے رخساروں کی کھال اس قدر نازک تھی، اس کی گردن اس قدر سفید اور معصوم تھی، اور اس کے ہاتھ — اف کس قدر نرم اور گرم تھے وہ ہاتھ۔ اف خدا! اس کے ماں‌باپ ہمارے چاروں طرف گھومتے رہتے، دروازوں میں کان لگا لگا کر باتیں سنتے اور اس قدر حسرت سے میری طرف دیکھتے جیسے فرماں بردار کتے ہوں۔ اور جب میں جانے لگتا تو دروازے کی آڑ میں عجلتی بوس‌وکنار، چائے کے وقت اس کے پاؤں میرے پاؤں سے ٹکرا جاتے، بظاہر بالکل اتفاقاً۔ ہوں، تو اس سے پہلے کہ میں سمجھتا میں کتنے پانی میں ہوں، انھوں نے مجھے دھر لیا۔ 'عزیز نکیتا انتونووچ، میں آپ کی بیٹی مانگنے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یقین کیجئے، یہ فرشتہ...، میں نے بات بھی ختم نہ کی تھی کہ پاپا کی آنکھیں نم ہو گئیں، اور وہ مجھے پیار کرنے لگے۔ 'پیارے بیٹے! میں تو مدت ہوئی سمجھ گیا تھا۔ خدا تمھیں سلامت رکھے۔ مگر ہماری دولت کی پوری پوری حفاظت کرنا، بیٹا!'، تین ماہ بعد یہ آسمانی دولت، ایک گھٹیا سا ڈریسنگ گاؤن پہنے اور ننگے پاؤں میں سلیپر اٹکائے گھر میں گھومتی

نظر آنے لگی۔ اس کے چھدرے بالوں میں کنگھی بھی نہ ہوتی، ان میں تو گھونگر بنانےوالے کاغذ لٹکتے رہتے۔ وہ مچھیرنوں کی طرح اردلیوں سے جھگڑتی اور نوجوان افسروں کی موجودگی میں تتلانے لگتی، کھی کھی کرتی اور آنکھیں مٹکا مٹکا کر اپنی حماقت کا ثبوت دیتی۔ نجانے کیوں دوسروں کی موجودگی میں وہ مجھے جیکوس کہتی تھی، اور وہ بھی بہت ھی مریل اور ناک سے نکلی ہوئی سی آواز میں: 'اوہ جے - ے - ے کوس'۔ بلا کی فضول‌خرچ، اداکار، پھوھڑ اور لالچی تھی اور اس کی آنکھوں سے ھمیشه بیوفائی ٹپکتی رهتی۔ اب تو یه قصه بیت چکا، یه کہانی ھمیشه ھمیشه کےلئے ختم ھو چکی۔ بلکه میں تو اس بدمعاش ایکٹر کا بہت بہت شکرگذار ھوں۔ اچھا ھوا ھمارے کوئی بچه نہیں تھا...،،

''آپ نے انھیں معاف کر دیا تھا، داداجان؟،،

''ویرا پیاری، ان کےلئے لفظ معافی مناسب نہیں ھے۔ شروع میں تو میں پاگل سا ھو گیا تھا۔ اگر میں انھیں دیکھتا تو ضرور مار ڈالتا۔ اور پھر آهسته آهسته طوفان دب گیا اور نفرت کے سوا کوئی جذبه باقی نه رھا۔ اچھا ھی ھوا۔ خدا کا شکر ھے که بےوجه خون خرابے کی نوبت نہیں آئی۔ اور پھر مجھے زیاده تر شوھروں‌والی بدبختی سے نجات مل گئی۔ اگر یه نفرت‌خیز واقعه پیش نه آتا تو نجانے میرا کیا حشر ھوتا؟ بھاڑے کا ٹٹو، ذلیل اور حقیر محافظ‌وسعین،

دودھاری گائے اور کچھ ضروری گھریلو برتن... نہیں، ویرا، جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا۔ ،،

’’نہیں، داداجان۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بیتے دنوں کا یہ دکھ آج بھی آپ کا دل مسوس رہا ہے، اور آپ اپنے ناکام تجربے کو پوری انسانیت کےلئے اصول بنا رہے ہیں۔ مجھے اور واسیا ہی کو دیکھ لیجئے۔ آپ ہماری شادی کو ناکام شادی نہیں کہہ سکتے نا؟ کیوں؟،،

تھوڑی دیر تک آنوسوف کچھ نہیں بولے۔

’’اچھا چلو، مان لیا کہ تمھارا واقعہ ذرا غیرمعمولی واقعہ ہے ،، آخر انھوں نے ھچکچاتے ہوئے کہا۔ ’’لیکن میں پوچھتا ہوں کہ عام طور پر لوگ شادی کیوں کرتے ہیں؟ عورتوں کو کنوارا رھنے سے شرم آتی ہے۔ اور اگر کہیں ان کی تمام سہیلیوں کی شادی ہو جائے اور وہ کنواری رہ جائیں تب تو وہ شرم سے سر نہیں اٹھا سکتیں۔ خاندان پر بوجھ بن جانا ان کےلئے ناقابل برداشت ہے، وہ گھر کی مالکہ اور خاندان کی ماں بننا چاھتی ہیں، آزادی کی فضا میں سانس لینے کو بےتاب ہو جاتی ہیں۔ اور پھر دل میں خواھش سر اٹھاتی ہے۔ محض جسمانی خواھش — ماں بننے کی اور اپنا آشیانہ بنانے کی خواھش۔ مرد کا مقصد مختلف ہوتا ہے۔ وہ کنوارپن کی زندگی، کمروں کے انتشار، ہوٹل کے کھانے، گندگی، سگریٹ کے ٹکڑوں، پھٹے پرانے

بےجوڑ کپڑوں کے انبار، قرضے اور بے تکلف اور من چلے دوستوں سے تنگ آ جاتے ھیں اور پھر سوچتے ھیں کہ خاندانی زندگی گزارنا زیادہ صحت مند اور معاشی نقطۂ نظر سے زیادہ بہتر ہے۔ وہ سوچتے ھیں کہ ان کے مرنے کے بعد ان کے بچوں کی شکل میں ان کا ایک حصہ باقی رہ جائیگا۔ امرتا کا سپنا۔ چوتھی بات یہ کہ معصومیت کا جذبہ انہیں اکساتا ہے۔ میرے ساتھ یہی ھوا۔ اور بھئی، کبھی کبھی جہیز کا لالچ بھی شامل ھو جاتا ہے۔ لیکن محبت کا سوال کہاں پیدا ھوتا ہے؟ میرا مطلب ہے اس قسم کی محبت سے جس کی خاطر کوئی کارنامہ کر دکھانے، اپنی زندگی قربان کر دینے اور شہادت کو اپنا لینے کے لئے انسان کو جدوجہد نہیں کرنی پڑتی بلکہ اس میں انتہائی خوشی و آھنگ محسوس ھوتا ہے۔ ٹھیرو، ویرا، ٹھیرو، کہیں تم پھر مجھے اپنے واسیا کا حوالہ تو نہیں دے رھیں؟ یقین جانو، مجھے وہ پسند ہے۔ اچھا آدمی ہے، ھو سکتا ہے کبھی اس کی محبت میں امر سندرتا کی روشنی جگمگا اٹھے۔ لیکن میری بات سمجھنے کی کوشش کرو کہ میں کس قسم کی محبت کا ذکر کر رھا ھوں۔ محبت کو المیہ ھونا چاھئے۔ دنیا کا سب سے بڑا اسرار! کسی قسم کی راحت وسکون، سوچ بچار یا معاھدہ اس پر اثرانداز نہ ھو۔''

''داداجان، آپ نے کبھی اس قسم کی محبت دیکھی ہے؟'' ویرا نے آھستہ سے پوچھا۔

''نہیں،، بڑے میاں نے یقین کے ساتھ جواب دیا۔
''میں دو واقعے جانتا ہوں جو کچھ کچھ اس قسم کے تھے۔ لیکن ایک میں حماقت کا جذبہ کام کر رہا تھا اور دوسرا... دوسرا قصہ، بھئی، کچھ عجیب کڑوا سا ہے... انتہائی احمقانہ۔ تم چاہو تو میں تمھیں سنا سکتا ہوں۔ زیادہ وقت نہیں لگے گا۔،،

''ضرور، داداجان۔،،

''اچھا تو سنو۔ ہماری ڈویژن کے ایک رجمنٹ کمانڈر (ہماری رجمنٹ کے نہیں) کی ایک بیوی تھی۔ انتہائی بدشکل — سوکھا مارا ہڈیل جسم، لال بال، لمبی لمبی ٹانگیں اور بڑا سا منھ۔ اس کے چہرے سے سرخی پاوڈر کی تہیں اس طرح گرتی تھیں جیسے ماسکو کے کسی پرانے گھر کا پلاسٹر گر رہا ہو۔ لیکن اس سب کے باوجود رجمنٹ میں اس کی حیثیت مسالینا سے کسی طرح کم نہ تھی، اس میں بلا کی زندہ دلی اور بلا کا گھمنڈ تھا، وہ لوگوں سے انتہائی نفرت کرتی اور رنگارنگ ہنگاموں پر جان دیتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ افیم کی انتہائی رسیا تھی۔

''خزاں کے موسم میں ایک دن ہماری رجمنٹ میں ایک نیا چھوٹا لیفٹیننٹ بھیجا گیا، انتہائی نوخیز جوان، بچارا فوجی اسکول سے سیدھا چلا آ رہا تھا۔ مہینے بھر کے اندر اندر اس بوڑھی گھوڑی نے اسے اپنے قابو میں کر لیا۔ وہ اس کا مصاحب بھی تھا، غلام بھی اور ناچ کا ساتھی بھی۔ وہ اس کا پنکھا اور رومال لے کر

چلتا اور برف‌باری ہو یا پالا اپنا وردی کوٹ پہن کر اس کے گھوڑے لانے کو دوڑ پڑتا۔ جب میں دیکھتا کہ کوئی معصوم نوجوان اپنی پہلی محبت کے پھول کسی دنیا دیکھی ہوئی، تجربہ‌کار، لالچی اور بدکار عورت کے قدموں پر نچھاور کر رہا ہے تو مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ اگر وہ اس آگ سے بچ کر نکل بھی آئے تب بھی اس سے ہاتھ دھو لینے چاہئیں۔ زندگی بھر کے لئے تباد ہو جاتا ہے۔

''کرسمس ہوتے ہوتے وہ اس سے عاجز آگئی۔ وہ اپنے ایک سابقہ اور آزمودہ عاشق کی طرف پلٹ گئی۔ لیکن نوجوان کےلئے اس کے بغیر زندہ رہنا ناممکن تھا۔ وہ سائے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے پھرتا رہا۔ بچارے کی حالت خراب تھی۔ اس کا وزن گھٹ گیا اور رنگ اڑتا چلا گیا، شاعرانہ زبان میں یوں کہہ لو کہ 'اس کے چہرے پر موت کا سایہ رہنے لگا'۔ وہ اس سے بےحد بری طرح رشک کرتا، کہتے ہیں رات رات بھر اس کی کھڑکی کے نیچے کھڑا رہتا تھا۔

''موسم بہار میں ایک دن رجمنٹ میں انھوں نے پکنک سی منائی۔ میں ان دونوں سے ذاتی طور پر واقف تھا، مگر جن دنوں یہ واقعہ ہوا ان دنوں میں وہاں نہیں تھا۔ ہاں تو ایسے تمام موقعوں کی‌طرح، اس دن بھی لوگ بہت سی شراب پی پی کر بدمست ہو گئے۔ لوگ بڑی رات گئے ریل کی پٹری کے ساتھ

ساتھ واپس پلٹے۔ اچانک انھیں ایک مال گاڑی آتی نظر آئی۔ گاڑی ایک خاصی ڈھلوان چٹان پر چڑھ رہی تھی۔ انھیں سیٹیوں کی آواز آئی اور پھر انجن کی اوپروالی روشنیاں نظر آئیں، ہاں تو روشنیاں دیکھتے ہی اس حرافہ نے آہستہ سے چھوٹے لیفٹیننٹ کے کان میں کہا کہ 'تم ہر وقت ڈینگیں مارتے ہو کہ تمھیں مجھ سے محبت ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ اگر میں تم سے کہوں کہ اس ریل کے نیچے آجاؤ تو تم انکار کر دوگے۔' اس نے جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہا، سیدھا ریل کی طرف بھاگا۔ سنا ہے اس نے خوب سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھایا تھا۔ وہ اگلے اور پچھلے پہیوں کے بیچ میں گرنا چاہتا تھا تاکہ اس کے جسم کے بہت صفائی سے دو ٹکڑے ہو جائیں۔ لیکن کسی احمق نے اسے روکنے کی کوشش کی اور اسے کھینچنے لگا۔ مگر وہ زیادہ مضبوط نہیں تھا، لیفٹیننٹ نے دونوں ہاتھوں سے ریل کی پٹری کو پکڑ لیا اور اس کے دونوں ہاتھ کٹ کر الگ جا پڑے۔''

''اف کس قدر خوفناک قصہ ہے!'' ویرا چیخ پڑی۔

''اسے فوجی ملازمت سے استعفا دینا پڑا۔ اس کے ساتھیوں نے سفر کے لئے کچھ پیسہ جمع کر دیا۔ ظاہر ہے اب وہ اس شہر میں کیسے رہتا جہاں وہ اس عورت کے لئے اور خود پوری رجمنٹ کےلئے ایک جیتی جاگتی لعنت تھا۔ تو یہ انجام ہوا اس غریب لڑکے

کا — وہ بھکاری بن گیا اور پھر پیٹرسبرگ میں کسی گھاٹ کے قریب سردی سے ٹھٹھر کر مر گیا۔

''دوسرا قصہ خاصہ دردناک ہے۔ عورت بالکل پہلی عورت جیسی تھی لیکن جوان اور خوبصورت۔ اس کا انداز قابل نفرت تھا۔ اس قسم کے قصے تو آگ کی طرح پھیلتے ہی ہیں، ہم سب بھونچکا رہ گئے، لیکن اس کے شوہر کی تیوری پر بل بھی نہ آیا۔ وہ سب کچھ دیکھتا، سب کچھ جانتا مگر اسے روکنے کی کوئی کوشش نہ کرتا۔ اس کے دوست اشاروں اشاروں میں اسے سمجھاتے مگر وہ ان کی بات پر کان نہ دھرتا۔ 'بند کرو یہ باتیں، یہ میرا درد سر نہیں ہے، میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ لینا خوش رہے!..' احمق!

''آخر میں اس کے اور کمپنی کے ایک معمولی افسر لیفٹیننٹ وشنیاکوف کے درمیان بہت گہرے تعلقات قائم ہو گئے۔ اور یہ سمجھو کہ وہ تینوں، دو شوہر اور ایک بیوی کی طرح زندگی بسر کرنے لگے۔ کچھ اس انداز سے گویا یہ شادی نہایت ہی قانونی قسم کی شادی ہو۔ اور پھر ہماری رجمنٹ کو محاذ پر جانے کا حکم ملا۔ ہماری خواتین نے ہمیں رخصت کیا، وہ بھی اپنوں کو رخصت کرنے آئی۔ بھئی، واقعہ یہ ہے کہ اس کی حرکت دیکھ کر طبیعت متلانے لگی! اس نے نظر اٹھا کر شوہر کی طرف دیکھا بھی نہیں اور کسی وجہ سے نہیں تو دنیا دکھاوے ہی کو دیکھ

لیتی کمبخت۔ مگر نہیں، وہ تو اپنے لیفٹیننٹ سے اس طرح چپکی رہی جیسے دیوار پر عشق پیچاں لپٹ جائے۔ اور لمحے بھر کو بھی اسے نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ ہم ریل میں سوار ہو گئے اور ریل آہستہ آہستہ کھسکنے لگی تو اس حرافہ نے چیخ کر اپنے شوہر سے کہا: 'ولودیا کی اچھی طرح دیکھبھال کرنا! اگر اس کا بال بھی بیکا ہوا تو یاد رکھو میں گھر چھوڑ کر چلی جاؤنگی اور پھر کبھی واپس نہیں آونگی۔ اور میں بچوں کو بھی اپنے ساتھ لیتی جاؤنگی'۔

''مجھے یقین ہے کہ تم سوچ رہی ہو کہ کپتان بالکل بدھو تھا؟ بدھو، بےجان اور ڈرپوک؟ بیٹی، ایسی بات نہیں تھی۔ وہ بہت بہادر سپاہی تھا۔ زیلونیئے گوری میں اس نے چھ دفعہ ترکی فوج پر حملہ کیا۔ اور اس کے دو سو آدمیوں میں سے صرف چودہ آدمی بچے۔ دو دفعہ زخمی ہوا لیکن دونوں دفعہ طبی اسٹیشن جانے سے انکار کر دیا۔ اس قسم کا آدمی تھا۔ سپاہی تو پوجتے تھے اس کو۔

''لیکن اس نے... اس کی لینا نے کپتان کو یہ بتایا تھا کہ اسے کیا کیا کرنا ہوگا!

''وہ، ماں یا انا کی طرح اس کاهل الوجود، سست اور بزدل وشنیاکوف کی دیکھبھال کرتا رہا۔ رات کے وقت خیمے میں ہو یا بارش اور کیچڑ میں ٹھنڈ کھا رہا ہو وہ فوراً اسے اپنے اورکوٹ میں لپیٹ دیتا۔

اس کی جگہ ڈیوٹی دیتا، اور وشنیا کوف کسی خندق میں مزے کرتا رھتا یا جوا کھیلتا رھتا۔ رات کے وقت وہ وشنیا کوف کے بجائے پہرے کی دیکھبھال کرتا۔ اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ھے۔ ان دنوں ترک اس آسانی سے ھمارے گشتی پہرہ داروں کو کاٹ دیتے تھے جس آسانی سے کوئی دیہاتن کرم کلا کاٹتی ھے۔ بیٹی، ایسی بات منہ سے نکالنا گناہ ھے، مگر میں سچ کہتا ھوں جب لوگوں نے سنا کہ وشنیا کوف ٹائیفائڈ کی وجہ سے اسپتال میں مر گیا، تو دستے کے ھر شخص کو بےحد خوشی ھوئی۔ ،،

”تو دادا، عورتوں کے بارے میں کیا رائے ھے آپ کی؟ کیا آپ کو کبھی محبت کرنےوالی کوئی عورت نظر نہیں آئی؟،،

”یقیناً آئی ھیں، ویرا! میں ابھی اور قصے سناؤنگا۔ مجھے تو یقین ھے کہ عورت محبت میں گرفتار ھوکر بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی ھے۔ جس لمحے عورت پیار کرتی ھے، محبوب کو گلے لگاتی ھے اور اپنی پوری ھستی سونپ دیتی ھے اس لمحے عورت ماں بن جاتی ھے۔ عورت جب محبت کرتی ھے تو اس کےلئے محبت اور زندگی ھم‌معنی لفظ بن جاتے ھیں — محبت اور زندگی — محبت اور کائنات! لیکن محبت نے اس قدر گھٹیا شکل اختیار کر لی ھے اور محبت کی قیمت اتنی گر گئی ھے تو اس میں اس کا کیا قصور۔ آج کل تو، بیٹی، محبت روزمرہ کے آرام کا سودا بن گئی ھے۔ اور اس

کی ذمےداری مردوں کے کندھوں پر ہے جو بیس سال کی عمر ہی میں سیر ہو جاتے ہیں، جن کا جسم چوزے کا سا اور دل خرگوش کا سا ہوتا ہے۔ جن کے دل میں محبت کے گہرے جذبات، قربانی کا جذبہ اور محبت کی نزاکت اور تڑپ ہوتی ہی نہیں۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں سچی محبت نظر آتی تھی۔ اگر ایسا نہیں ہے تو تب بھی کیا یہ سچ نہیں ہے کہ یہ سچی محبت دنیا کے بہترین دماغوں — شاعروں، ادیبوں، گائیکوں اور فن‌کاروں — کا خواب ہے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے، میں مانون لیسکو اور کاویلیئر ڈی گرئیو کی کہانی پڑھ رہا تھا۔ پڑھتے پڑھتے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ واقعی سچ کہتا ہوں۔ سچ بتاؤ — کیا، ہر عورت کے دل میں ایسی محبت کی خواہش نہیں ہوتی ہے، کیا ہر عورت ایسی ہی محبت کے خواب نہیں دیکھتی ہے جو تن من ذہن سے کی جائے، ایسی محبت جو سب کچھ معاف کر سکے، جو بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہو؟"

"بالکل، داداجان، ایسی محبت کا خواب ہر عورت دیکھتی ہے۔"

"اور جب انہیں ایسی محبت نہیں ملتی تو وہ بدلہ لینے لگتی ہیں۔ میں کہتا ہوں آج سے تیس چالیس سال بعد — ویرا پیاری، خیر میں تو اس وقت زندہ نہیں ہونگا لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اسے یاد رکھنا — ہاں تو آج سے تیس سال بعد دنیا پر عورت کی حکمرانی

ہوگی۔ وہ ہندستانی مورتیوں جیسے لباس زیب تن کریگی اور ہم مردوں کو نہائت حقیر اور ذلیل غلاموں کی طرح اپنے پاؤں تلے روندیگی۔ اس کی لامحدود خواہشات اور باتیں ہمارے لئے تکلیف دہ اصولوں سے زیادہ اہم ہو جائینگی۔ اور یہ سب اس لئے ہوگا کہ مدت ہا مدت سے ہم اس قابل نہیں ہیں کہ محبت کو پوج سکیں اور اس کا احترام کر سکیں۔ تو یہ ہوگا اس کا انتقام۔ تم قانون قدرت سے واقف ہو، عمل اور ردعمل برابر ہوتے ہیں۔"

وہ لمحے بھر کو رکے پھر اچانک بولے: "ویرا، ایک بات پوچھوں۔ اگر تم مجھے بتاتے شرماؤ نہیں تو یہ بتاؤ کہ اس تاروالے کی کہانی کی کیا اصلیت ہے جو آج رات شہزادہ واسیلی نے ہمیں سنائی ہے۔ یہ کہانی کس حد تک حقیقت پر مبنی ہے اور کس حد تک واسیلی کی داستان گوئی کو دخل ہے۔"

"داداجان، کیا واقعی آپ یہ داستان سننا چاہتے ہیں؟"

"تم بتاؤ تو ضرور سنوں گا لیکن اگر کسی وجہ سے تم بتانا نہ..."

"نہیں نہیں، میں بڑی خوشی سے آپ کو بتاؤنگی۔"

اور اس نے پوری تفصیل سے جنرل کو ایک پاگل شخص کی کہانی سنائی جو اس کی شادی سے دو سال پہلے سے اسے عاشقانہ خط لکھ رہا تھا۔

اس نے کہا کہ میں نے ایک بار بھی اس شخص کو نہیں دیکھا، میں تو اس کے نام سے بھی واقف نہیں ہوں۔ وہ خط کے آخر میں دستخط کے بجائے صرف گ۔ س۔ ژ۔ لکھتا ہے۔ ایک خط میں اس نے کہیں ذکر کیا ہے کہ وہ کسی دفتر میں کلرک ہے۔ البتہ تارگھر کے متعلق اس نے کبھی کچھ نہیں لکھا۔ ویرا نے کہا کہ شاید وہ میری ہر ایک حرکت کو نظر میں رکھتا تھا کیونکہ وہ اپنے خطوں میں ہمیشہ نہایت تفصیل سے یہ سب باتیں لکھتا تھا کہ میں نے کونسی شام کہاں اور کس محفل میں گزاری اور میں کس لباس میں تھی۔ شروع شروع میں اس کے خط بہت ھی بازاری اور مضحکہ‌خیز حد تک جوشیلے ہوتے تھے۔ ویسے وہ ہمیشہ بڑے شریفانہ خط لکھتا تھا۔ لیکن ایک دفعہ میں نے اسے لکھا (اچھے داداجان، کسی سے اس کا ذکر نہ کیجئے گا۔ اس کا علم میرے سوا کسی کو نہیں ہے۔) کہ مجھے اس طرح اظہار عشق کر کرکے اور داستان محبت سنا سنا کے تنگ نہ کیا کرو۔ اس دن کے بعد سے اس نے کبھی اپنی محبت کے بارے میں ایک حرف بھی نہیں لکھا۔ البتہ خاص خاص موقعوں مثلاً ایسٹر، نئے سال اور میری سالگرہ کے موقعوں پر مجھے خط لکھتا رہا۔ شہزادی ویرا نے جنرل سے اس دن‌والے پارسل کا ذکر بھی کیا اور اپنے اس پراسرار عاشق کے خط کا ایک ایک لفظ اسے سنایا۔

''ھا ۔ ا ۔ ان،، آخر جنرل بولے تو سہی ۔ ''ھو سکتا ھے کوئی احمق من چلا اور خبطی ھو ۔ یا کون جانے؟ شاید تمھاری زندگی کی راہ سے ایک ایسی محبت گزر رھی ھو جس کا خواب عورت صدیوں سے دیکھ رھی ھے اور مرد جس محبت کے اھل نہیں ھیں ۔ ایک منٹ ٹھیرو ۔ تمھیں روشنیاں نظر آئیں، ادھر؟ میری گاڑی ھوگی ۔،،

ٹھیک اسی لمحے انھیں پیچھے سے موٹر کی گھڑگھڑ سنائی دی اور گیس کی سی سفید روشنی میں پہیوں کے نیچے روندی ھوئی سڑک چمک اٹھی ۔ گستاو ایوانووچ کی موٹر قریب آ گئی ۔

''آننا، میں نے تمھارا سامان لے لیا ھے، آؤ اندر آ جاؤ ،، اس نے کہا ۔ ''کہئے میں آپ کو گھر تک پہنچا دوں، جناب عالی؟،،

''نہیں، شکریہ، میرے دوست ،، جنرل نے جواب دیا ۔ ''مجھے یہ انجن پسند نہیں ھے ۔ شور مچانے اور جھٹکے دینے کے سوا اسے آتا ھی کیا ھے ۔ اس میں کوئی لطف نہیں آتا ۔ اچھا، ویرا پیاری، خداحافظ ۔ میں اکثر آتا رھونگا ،، انھوں نے ویرا کی پیشانی اور ھاتھوں کو چوم کر کہا ۔

چاروں طرف آداب سلام ھونے لگا ۔ فریسی نے ویرا کو اس کے بنگلے کے دروازے تک چھوڑا اور تیزی سے چکر کاٹتا ھوا اپنی گرجتی مچلتی موٹر سمیت تاریکی میں غائب ھو گیا ۔

ویرا کچھ آزردہ‌خاطر سی چبوترے پر چڑھی اور گھر میں چلی گئی۔ اس نے دور ہی سے اپنے بھائی نیکولائی کی تیز آواز سنی۔ اس کا دیو ہیکل بھائی کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ واسیلی لووووچ تاش کی میز پر بیٹھے تھے۔ ان کا چھوٹے چھوٹے بالوں بھرا بڑا سا سر جھکا ہوا تھا اور وہ چاک کے ٹکڑے سے ہرے کپڑے پر لکیریں کھینچ رہے تھے۔

"یہ سب تو آج سے بہت پہلے کرنا چاہئے تھا!" نیکولائی نے جھنجھلا کر کہا اور اپنے ہاتھ سے کچھ اس قسم کا اشارہ کیا جیسے وہ کوئی ان دیکھا بوجھ اتار کر پھینک رہا ہو۔ "میں بہت پہلے سے سمجھتا ہوں کہ ان احمقانہ خطوں کا سلسلہ ختم کرنا چاہئے تھا۔ جب ویرا تمہاری بیوی بھی نہیں تھی اسی وقت میں نے کہا تھا کہ تم اور ویرا ان خطوں کا صرف مزاقیہ پہلو دیکھتے ہو، بچوں کی طرح ان کا مذاق اڑانا غلط ہے۔ لو یہ لو ویرا بھی آ گئی۔ واسیلی لووووچ اور میں تمہارے اس پگلے پ۔ پ۔ ژ۔ کی بات کر رہے تھے۔ میں اس خط و کتابت کو ذلیل اور گھٹیا سمجھتا ہوں۔"

"خط و کتابت نہیں تھی،" شائین نے سردمہری سے اسے ٹوکا۔ "صرف وہ لکھتا تھا..."

یہ سن کر ویرا کا رنگ سرخ ہو گیا۔ وہ بڑے سے پنکھے نما پام کے سائے میں صوفے پر بیٹھ گئی۔

"معاف کرنا،" نیکولائی نیکولائیوچ نے کہا اور پھر وہ ان‌دیکھا بھاری بوجھ پھینکنے لگا جیسے سینے سے کوئی بوجھ نوچ کر پھینک رہا ہو۔

"میں سمجھ نہیں سکی کہ تم اسے میرا کیوں کہہ رہے ہو،" شوہر کی حمایت ملی تو ویرا کو بھی جرأت ہوئی۔ "جتنا میرا ہے وہ اتنا ہی تمھارا ہے..."

"اچھا اچھا، میں دوبارہ معافی مانگتا ہوں۔ بہر حال میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں اس کی حماقتوں کو ختم کرنا چاہئے۔ میرے خیال میں یہ قصہ اس دور سے گزر چکا ہے جب ہم اس پر ہنس سکتے ہیں اور احمقانہ تصویریں بنا سکتے ہیں۔ یقین جانو، واسیلی لووچ، مجھے تو تمھاری اور ویرا کی عزت کا خیال ہے۔"

"میرے خیال میں، نیکولائی، تم بات کو بہت بڑھا رہے ہو،" شائین نے جواب دیا۔

"ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر تم نے کچھ نہ کیا تو تم نہایت آسانی سے مضحکہ‌خیز حالات کا شکار ہو جاؤ گے۔"

"میں سمجھا نہیں کس طرح۔"

"فرض کرو، یہ احمقانہ کنگن،" نیکولائی نے میز سے لال ڈبہ اٹھایا اور فوراً نہایت نفرت سے اسے

پھینک دیا ... ”یہ خوفناک چیز ہمارے گھر میں رہتی ہے یا ہم اسے پھینک دیتے ہیں یا داشا کو دے دیتے ہیں - تو پہلی بات تو یہ کہ پ- پ- ژ- اپنے جاننے والوں اور دوستوں کے سامنے شیخیاں بگھارتا پھرےگا کہ شہزادی ویرا نیکولائیونا شائینا اس کے تحفے قبول کرتی ہے، نمبر دو یہ کہ موقع ملتے ہی وہ اور زیادہ پر پرزے نکالیگا- کل وہ اسے ہیرے کی انگوٹھی بھیجیگا اور پرسوں موتیوں کا نکلس- اور پھر گول‌مال یا چار سو بیسی کے جرم میں عدالت کے سامنے پیش کیا جائیگا اور شہزادہ اور شہزادی شائین کو گواہوں کی حیثیت سے بلایا جائیگا- بہت اچھے امکانات ہیں، کیوں؟،،

”کنگن کو ہر صورت میں واپس کر دینا چاہئے!،، واسیلی لوووچ نے کہا-

”میرا بھی یہی خیال ہے،، ویرا نے رائے دی - ”جتنی جلدی واپس کر دیں اتنا ہی اچھا ہے - لیکن کس طرح واپس کریں؟ ہمیں تو اس کا نام پتہ بھی نہیں معلوم - ،،

”اوہ، یہ تو بچوں کا کھیل ہے،، نیکولائی نیکولائیوچ نے لاپروائی سے جواب دیا - ”ہم اس پ- پ- ژ - کے نام کے پہلے حروف تو جانتے ہی ہیں، کیوں، یہی حرف ہیں نا، ویرا؟،،

”گ- س- ژ- ،،

”بہت اچھا۔ پھر ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ وہ کہیں ملازم ہے۔ بس یہ کافی ہے۔ کل میں شہر کی ڈائریکٹری اٹھا کر ان حروف والے افسر یا کلرک کا نام ڈھونڈ نکالونگا۔ اور اگر کسی وجہ سے معلوم نہ ہو سکا تو میں پولیس جاسوس چھوڑ دونگا جو اس کا پتہ نشان معلوم کر دیگا۔ کوئی دقت ہوئی تو میں اس کا لکھا ہوا یہ کاغذ اپنے ساتھ رکھونگا۔ مختصر یہ کہ کل دو بجے تک میں نہ صرف اس شخص کا نام اور پتہ معلوم کر لونگا بلکہ یہ بھی جان لونگا کہ وہ کس وقت گھر پر ملتا ہے۔ اور پھر کل نہ صرف ہم اسے اس کا زیور واپس کر دینگے بلکہ اسے یہ بھی بتا دینگے کہ وہ آئیندہ ہمیں اپنے وجود کا احساس بھی نہ ہونے دینے پائے۔“

”تم آخر کرنا کیا چاہتے ہو؟“ شہزادہ واسیلی نے سوال کیا۔

”کیا؟ ظاہر ہے میں گورنر سے بات کرونگا۔“

”خدا کے لئے — گورنر سے بات نہ کرنا! تم جانتے ہو ہمارے اس کے کیسے تعلقات ہیں۔ اس طرح تو ہماری ذلت ہوگی۔“

”اچھا، اچھا۔ میں پولیس کے افسر کے پاس جاؤنگا۔ وہ میرا کلب کا ساتھی ہے۔ اچھا ہے وہ ذرا ان رومیو صاحب کو بلوا کر اس کی ناک کے نیچے انگلی ہلائے۔ جانتے ہو وہ کیا کرتا ہے؟ وہ آدمی کی ناک کے پاس انگلی لاتا ہے لیکن ہاتھ نہیں

ھلاتا — بس انگلی کو ذرا سا ھلائیگا اور چنگھاڑیگا: 'میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا، جناب!'،،

''پھو، پولیس کو پھنسائینگے!،، ویرا نے عاجز آ کر کہا۔

''تم ٹھیک کہتی ھو، ویرا،، شہزادے نے کہا۔ ''اس سلسلہ میں کسی باھر کے آدمی کو بیچ میں نہیں گھسیٹنا چاھئے۔ طرح طرح کی افواھیں اور چہ‌میگوییاں شروع ھو جائینگی۔ کون نہیں جانتا کہ ھمارے شہروالے کس قسم کے لوگ ھیں۔ یہاں تو آدمی گویا شیشہ کے گھر میں رھتا ھے۔ میرا خیال ھے کہ میں اس... اس نوجوان... کے پاس خود جاؤنگا۔ کون جانے بچارہ کوئی ساٹھ ستر سالہ آدمی ھو۔ میں اسے کنگن واپس کر دونگا اور اس کی خبر لے لونگا۔،،

''تو پھر میں تمھارے ساتھ چلونگا،، نیکولائی نیکولائیوچ نے فیصلہ‌کن انداز میں کہا۔ ''تم بہت نرم ھو۔ اس سے بات کرنے کا کام مجھ پر چھوڑ دو۔ اور اب، میرے دوستو،، اس نے گھڑی نکال کر اس پر ایک نظر ڈالی۔ ''معاف کیجئیگا میں اپنے کمرے میں چلا۔ اب تو پاؤوں پر کھڑا ھونا بھی مشکل ھے۔ اور پھر مجھے دو فائیل بھی دیکھنے ھیں۔،،

''نجانے کیوں مجھے بچارے کی حالت پر رحم آ رھا ھے،، ویرا نے جھجکتے جھجکتے کہا۔

"اس کی حالت پر رحم کھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے،، نیکولائی نے دروازے سے پلٹتے ہوئے ترکی به ترکی جواب دیا۔ "اگر ہمارے طبقے کا کوئی آدمی کنگن اور خطوالی چال چلتا تو شہزادہ واسیلی اس سے دوئل کے لئے للکارتے۔ اور اگر واسیلی نہ کرتے تو میں کرتا۔ پرانا زمانہ ہوتا تو میں اس کو سزا کے طور پر اصطبل میں کوڑوں سے پیٹتا۔ واسیلی لووویچ، کل اپنے دفتر میں میرا انتظار کرنا، میں ٹیلیفون کروں گا تمھیں۔ ،،

۱۰

تاریک اور گندے زینے میں چوہوں، بلیوں، پیرافین کے تیل اور دھلائی کی بدبو بسی ہوئی تھی۔ پانچویں منزل پر پہنچنے سے پہلے شہزادہ واسیلی لووویچ ٹھٹھکا۔

"ذرا ٹھیرو ،، انھوں نے اپنے سالے سے کہا۔ "ذرا میں سانس قابو میں کرلوں۔ اوہ نیکولائی، ہم یہاں نہ آتے تو اچھا تھا۔ ،،

وہ دو زینے اور چڑھ گئے۔ زینے میں اتنی تاریکی تھی کہ نیکولائی نیکولائیوچ نے دو دیاسلائیاں جلائیں تب جاکر فلیٹ کا نمبر نظر آیا۔

اس نے گھنٹی بجائی اور جواب میں سفید بالوں اور بھوری آنکھوں والی ایک تنومند عورت

عینک لگائے ہوئے باہر نکلی۔ شاید کسی بیماری کی وجہ سے وہ ذرا سا آگے کو جھکی ہوئی تھی۔

''کیا، ژیلتکوف صاحب گھر پر ہیں؟''، نیکولائی نیکولائیوچ نے پوچھا۔

عورت نے گھبرا کر کبھی ایک کو دیکھا کبھی دوسرے کو۔ مگر ان دونوں کی شریفانہ صورتیں اور وضع قطع دیکھ کر اسے ذرا ڈھارس ہوئی۔

''جی ہاں، آئیے آئیے، تشریف لائیے''، اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ ''بائیں ھاتھ کا پہلا دروازہ ہے۔''

بولات توگانووسکی نے مختصراً مگر سختی سے تین دفعہ دستک دی۔

''تشریف لائیے''، ایک کمزور سی آواز آئی۔

کمرے کی چھت بہت نیچی تھی مگر تھا بہت چوڑا — تقریباً چوکور تھا۔ اس کی دو گول کھڑکیاں جہاز کے روشن دانوں سے مشابہ تھیں اور ان سے برائےنام روشنی اندر آرہی تھی۔ کمرہ مال جہازوں کے وارڈروم سے بہت ملتا تھا۔ دیوار کے قریب ایک تنگ سا پلنگ بچھا ہوا تھا۔ دوسری دیوار کے پاس ایک بڑا صوفہ تھا جس پر بہت اچھی قسم کا مگر پھٹا پرانا قالین بچھا تھا۔ درمیان میں ایک میز پڑی تھی جس پر رنگین یوکرینی کپڑا بچھا ہوا تھا۔

چند لمحے تو مہمانوں کو مکین کا چہرہ نظر ہی نہ آیا کیونکہ وہ روشنی کی طرف پیٹھ کئے کھڑا

تھا اور گھبراہٹ اور پریشانی کے عالم میں ہاتھ مل رہا تھا۔ وہ درازقد اور دبلا تھا اور اس کے ریشمی بال کافی لمبے تھے۔

"آپ ہی مسٹر ژیلتکوف ہیں نا؟ میں نے سمجھنے میں غلطی تو نہیں کی؟" نیکولائی نیکولائیوچ نے کرختگی سے پوچھا۔

"جی ہاں، میرا ہی نام ژیلتکوف ہے، آپ سے ملکر بہت خوشی ہوئی۔"

اس نے مصافحے کےلئے ہاتھ بڑھایا اور توگانووسکی کی طرف دو قدم بڑھا۔ لیکن نیکولائی نیکولائیوچ اس طرح شائین کی طرف مڑ گیا جیسے اس نے ژیلتکوف کے استقبالیہ مظاہرے کو دیکھا ہی نہ ہو۔

"میں نے تم سے کہا تھا نہ کہ ہمارا اندازہ درست ہے۔"

ژیلتکوف کی نازک اور لرزاں انگلیاں تیزی سے اس کی بھوری صدری کے اگلے حصے پر دوڑ رہی تھیں۔ کبھی بٹن کھلتے اور کبھی بند ہو جاتے۔ آخرکار اس نے بڑے بےڈھنگے سے انداز میں آگے کو جھک کر صوفے کی طرف اشارہ کیا اور بمشکل کہا: "براہ کرم تشریف رکھیئے۔"

اب وہ پوری طرح نظر آ رہا تھا۔ بلا کا زرد، نازک اور نسوانی چہرہ، نیلی آنکھیں اور کسی سرکش بچے کی سی دراز ٹھوڑی۔ غالباً تیس پینتیس کی عمر ہوگی۔

”شکریہ،، شہزادہ شائین نے کہا۔ وہ بڑی دلچسپی سے سر سے پاؤں تک اپنے میزبان کا جائزہ لے رہا تھا۔

«Merci» نیکولائی نیکولائیوچ نے مختصراً جواب دیا اور دونوں کھڑے رہے۔ ”ھمیں صرف چند منٹ بات کرنی ھے۔ یہ شہزادہ واسیلی لووِوچ شائین ھیں، اس صوبے میں امرا کے مارشل۔ میرا نام مرزا بولات توگانووسکی ھے۔ میں اسسٹنٹ وکیل سرکار ھوں۔ ھم جس سلسلے میں آپ سے بات کرنے کا شرف حاصل کرینگے وہ میرے اور شہزادے دونوں کے لئے برابر اھم ھے، یا یہ کہنا زیادہ صحیح ھوگا کہ اس کا تعلق شہزادے کی بیوی سے ھے جو میری بہن ھے۔،،

ژیلتکوف انتہائی گھبراھٹ اور بدحواسی کے عالم میں صوفے پر گر پڑا، خوف و دھشت سے اس کے ھونٹ زرد پڑ گئے تھے۔ وہ گھبرا کر ھکلایا: ”حضرات، مہربانی کرکے تشریف رکھیئے،،۔ لیکن شاید اسے یاد آ گیا کہ وہ پہلے بھی یہ درخواست کر چکا ھے۔ وہ اچھل کر کھڑا ھوا، بال جھٹکتا ھوا گھبرا کر تیزی سے کھڑکی کی طرف لپکا مگر لوٹ آیا۔ اس کے لرزاں ھاتھ ایک دفعہ پھر ادھر سے ادھر دوڑنے لگے، کبھی بٹنوں سے اٹھکھیلیاں کرتے، کبھی ھلکی سرخ مونچھوں سے الجھلتے اور کبھی چہرے پر دوڑنے لگتے۔

”میں سن رہا ھوں، جناب عالی، کہیئے کیا حکم

ہے،، اس نے رحم‌طلب نظروں سے واسیلی لووونچ کی طرف دیکھتے ہوئے کھوکھلی سی آواز میں کہا۔

لیکن شائین نے ابھی کوئی جواب بھی نہیں دیا تھا کہ نیکولائی نیکولائیوچ بول پڑا:

''سب سے پہلے تو میں آپ کو ایک چیز واپس کرنا چاہتا ہوں جو آپ کی ملکیت ہے،، اس نے کہا اور جیب سے لال ڈبہ نکال کر احتیاط سے میز پر رکھ دیا۔ ''یہ سچ ہے کہ یہ کنگن آپ کی خوش‌مذاقی کا ثبوت ہے لیکن ہم پورے خلوص سے آپ سے استدعا کرتے ہیں کہ آئیندہ ہمیں اس قسم کی سنسنی‌خیز چیزوں سے نوازنے کی کوشش نہ کیجئے۔،،

''میں معافی کا خواستگار ہوں، میں خود بھی سمجھتا ہوں کہ میں نے بہت بڑی غلطی کی ہے،، ژیلتکوف نے سرگوشی کی۔ اس کی نظریں زمین پر گڑی ہوئی تھیں اور منہ دھک رہا تھا۔ ''ایک گلاس چائے تو پیئں گے آپ؟،،

''آپ جانتے ہیں، مسٹر ژیلتکوف،، نیکولائی نیکولائیوچ اس طرح بولتا رہا جیسے اس نے چائے کی پیش‌کش سنی ہی نہ ہو۔ ''مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ شریف آدمی ہیں، اور آپ کے لئے ہلکا سا اشارہ کافی ہے۔ مجھے یقین ہے ہم فوراً کسی سمجھوتے پر پہنچ جائیں‌گے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے آپ پچھلے سات آٹھ سال سے شہزادی ویرا نیکولائیونا کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔،،

''جی ہاں،، ژیلتکوف نے آہستہ سے جواب دیا اور خوفزدہ اور مرعوب ہوکر نظریں جھکا لیں۔

''لیکن ہم نے آج تک آپ کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا حالانکہ آپ جانتے ہی ہیں کہ ہم تو کوئی نہ کوئی کارروائی کر سکتے تھے اور واقعہ تو یہ ہے کہ یہ بہت ضروری تھا۔ کہئے ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟،،

''جی ہاں۔،،

''ہاں، لیکن اس آخری حرکت یعنی یاقوتی کنگن کے تحفے کے بعد ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا، آپ سمجھ رہے ہیں نا؟ بس اب حد ہو گئی۔ میں آپ سے صاف کہہ رہا ہوں کہ شروع میں تو ہم نے سوچا کہ اس واقعہ کو حکام تک لے جائیں لیکن خیر پھر ایسا نہیں کیا، اور مجھے خوشی ہے کہ ہم نے حکام کو اطلاع نہیں کی کیونکہ — میں ایک دفعہ پھر کہونگا — آپ کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا آپ شریف اور باعزت آدمی ہیں۔،،

''معاف کیجیئے گا، میں نے سنا نہیں آپ نے کیا کہا؟،، اچانک ژیلتکوف نے پوچھا اور ہنسا۔ ''آپ حکام کو اس قصے کی اطلاع دینے والے تھے؟ آپ نے یہی کہا تھا نا؟،،

وہ جیب میں ہاتھ ڈال کر اطمینان سے صوفے کے کونے پر بیٹھ گیا اور سگریٹ کیس اور دیاسلائی نکال کر سگریٹ جلائی۔

''تو آپ نے کہا کہ ہم حکام کو اس واقعے کی اطلاع دینے والے تھے؟.. مجھے امید ہے، شہزادے، آپ کو میرے بیٹھنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟'' اس نے شائین سے کہا۔ ''ہوں تو کہئے...''

شہزادہ شائین بھی میز کے قریب کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ وہ بڑے جوش اور خلوص سے اس انوکھے شخص کے چہرے کو تک رہے تھے۔

''جی ہاں، ہم جب چاہیں یہ قدم اٹھا سکتے ہیں'' نیکولائی نیکولائیوچ خفگی سے کہہ رہا تھا۔ ''دوسروں کے خاندانی معاملات میں ٹانگ اڑانا...''

''معاف کیجیئے گا، مجھے بھی کچھ کہنے کی اجازت دیجئے...''

''نہیں، ابھی میں اور کچھ کہنا چاہتا ہوں'' اسسٹنٹ وکیل سرکار تقریباً چیخ اٹھا۔

''جیسی آپ کی مرضی، کہئے۔ میں سن رہا ہوں۔ لیکن میں شہزادہ واسیلی لووچ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

اور اس نے توگانووسکی کی موجودگی کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا:

''یہ لمحہ میری زندگی کا سب سے زیادہ سخت لمحہ ہے۔ اس وقت میں رسم ورواج اور مرتبے کو بھول کر بات کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میری بات سننا پسند کرینگے؟''

”کہئیے، میں سن رہا ہوں،، شائین نے کہا۔ ”نیکولائی، مہربانی سے تم چپ رہو!،، انھوں نے توگانووسکی کو غصے سے اشارہ کرتے دیکھ کر جلدی سے کہا۔ ”ہاں...،،

ژیلتکوف کا دل بھر آیا اور کئی لمحے تک سانس پھولا رہا، اور اچانک طوفان پھٹا، اور وہ بولتا چلا گیا۔ وہ صرف اپنے جبڑوں سے بول رہا تھا، اس کے ہونٹ تو کسی مردے کے ہونٹوں کی طرح سفید اور سخت ہو گئے تھے۔

”یہ بات منہ سے نکالنا آسان نہیں ہے... یہ کہنا آسان نہیں ہے کہ مجھے آپ کی بیوی سے محبت ہے۔ لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا—سات سال میں ایک دفعہ بھی امید کی ہلکی سی جھلک تک نظر نہ آئی، سات سال تک میں نے بھول کر بھی جذبات کا اظہار نہیں کیا مگر سات سال تک میرے دل میں محبت کا دیا جلتا رہا، اب اس کے بعد میرا کچھ حق تو ضرور ہے۔ میں مانتا ہوں کہ شروع شروع، یعنی اس وقت جب ویرا نیکولائیونا کنواری تھیں، میں نے انھیں احمقانہ خط لکھے، یہی نہیں بلکہ جواب کی امید بھی کی۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ یہ آخری قدم اٹھا کر یعنی کنگن بھیج کر میں نے اس سے بھی زیادہ احمقانہ بات کی ہے لیکن... میں آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا ہوں، مجھے امید ہے کہ آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کرینگے۔ میں جانتا ہوں، میں

ان کی محبت کے اس چراغ کو کبھی نہیں بجھا سکتا، یہ میرے بس سے باھر ھے۔ بتائیے، شہزادے... ھو سکتا ھے آپ کو اس واقعہ سے کوفت ھوتی ھو۔ مگر مجھے بتائیے، ان جذبات کا گلا گھونٹنے کےلئے خود آپ کیا کرینگے؟ نیکولائی نیکولائیوچ کے مشورے کے مطابق مجھے شہر بدر کرا دینگے؟ لیکن میں جہاں بھی رھوں‌گا اسی طرح ان سے محبت کرتا رھونگا جس طرح یہاں کرتا ھوں۔ شاید آپ مجھے جیل بھجوا دیں؟ لیکن وھاں بھی میں ان کو اپنے وجود کی یاد دلانے کی کوئی نہ کوئی ترکیب نکال ھی لونگا۔ اس کا تنہا حل ھے موت... آپ جس قسم کی موت چاھیں میں مرنے کو تیار ھوں۔ "

"کام کی بات کرنے کے بجائے ھم یہاں بیٹھے ناٹک کھیل رھے ھیں" نیکولائی نیکولائیوچ نے ھیٹ اوڑھتے ھوئے کہا۔ "بات بالکل صاف ھے: آپ شہزادی ویرا نیکولائیونا کا پیچھا چھوڑ دیں، ورنہ ھم اس قسم کے قدم اٹھائینگے جو ھم جیسے بااثر لوگوں کے مرتبے کے شایان شان ھیں۔ "

ژیلتکوف نے اس کی بات سن لی لیکن نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا بھی نہیں، شہزادہ واسیلی لووِوچ سے پوچھنے لگا:

"اگر میں دس منٹ کے لئے آپ کے پاس سے چلا جاؤں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ھوگا؟ میں چھپاتا نہیں، اس وقت میں ٹیلی‌فون پر شہزادی ویرا

نیکولائیونا سے بات کروں گا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، حتی‌الامکان اپنی بات‌چیت کا زیادہ سے زیادہ حصہ آپ کو بتا دونگا۔،،

''ٹھیک ہے، جائیے،، شاتین نے کہا۔

نیکولائی نیکولائیوچ تنہائی ہوتے ہی بہنوئی پر برسنے لگا۔

''اس طرح کام نہیں چلیگا!،، وہ چلایا۔ اس کا دایاں ہاتھ حسب‌معمول سینے سے کوئی ان‌دیکھا بوجھ اتارکر پھینکنے میں مصروف تھا۔ ''اس طرح کام نہیں چلیگا، بالکل نہیں، میں نے تم سے کہا تھا کہ اس قصے کو میں نبٹ لونگا۔ لیکن تم پھسل گئے اور اسے موقع دے رہے ہو کہ وہ اپنے جذبات بڑھا چڑھا کر بیان کرے۔ میں دو لفظوں میں بات ختم کر دیتا۔،،

''تم ٹھیرو تو سہی،، شہزادہ واسیلی لووَوچ نے کہا۔ ''پل بھر میں سب معاملہ ٹھیک ہو جائیگا۔ اہم بات یہ ہے کہ اس شخص کے چہرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر جھوٹ بولنے اور دھوکا دینے والا آدمی نہیں ہے۔ وہ عشق میں گرفتار ہے تو اس میں اس کا کیا قصور؟ اور پھر یوں بھی ہم محبت جیسے جذبات پر پابندی لگا سکتے ہیں؟ بھلا یہ جذبات تو وہ ہیں جنھیں آج تک انسان سمجھا ہی نہیں،، وہ نجانے کیا سوچنے لگا پھر بولا: ''مجھے تو اس کی حالت پر رحم آرہا ہے۔ اور ایسا لگ رہا ہے جیسے میں روح کے انتہائی کربناک المیے کو دیکھ

رہا ہوں، بھئی، ایسے میں بالکل بھانڈپن تو کرنے سے رہا میں۔ ،،

’’میں اسے دیوالیہ پن سمجھتا ہوں،، نیکولائی نیکولائیوچ نے کہا۔

دس منٹ بعد ژیلتکوف واپس آگیا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور ان میں سمندر کی گہرائی پیدا ہو گئی تھی جیسے ان بہے آنسوؤں سے لبریز ہوں۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اس وقت ظاہری تمیز و تہذیب سب بھول چکا تھا، وہ بھول چکا تھا کہ کون کہاں بیٹھے، اب مہذب انسان کی طرح بات کرنا اس کے بس میں نہ تھا۔ اور ایک دفعہ پھر شائین نے بھرپور جذبات اور احساسات کے ساتھ اس کا مطلب، اس کا سبب سمجھ لیا۔

’’میں تیار ہوں،، اس نے کہا۔ ’’کل سے آپ کبھی میرے بارے میں کچھ نہیں سنینگے۔ آپ کے لئے اب میں مرے برابر ہوں۔ لیکن ایک شرط ہے — یہ میں آپ سے کہہ رہا ہوں، شہزادے واسیلی لووِوچ، — میں نے کچھ روپیہ غبن کیا ہے اور مجھے ہر حالت میں اس شہر سے بھاگنا ہے۔ مجھے اتنی اجازت تو دینگے آپ کہ میں شہزادی ویرا نیکولائیونا کو آخری خط لکھ سکوں؟،،

’’نہیں، جب ایک دفعہ قصہ ختم ہو گیا تو ہو گیا، اب خط وط کچھ نہیں!،، نیکولائی نیکولائیوچ چلایا۔

''ھاں، ھاں، لکھ سکتے ھو،، شائین نے کہا۔
''ٹھیک ھے،، ژیلتکوف بڑی شان سے مسکرایا۔
''مجھے دیکھنے کا تو سوال ھی کیا، آپ اب کبھی میرے بارے میں سنینگے بھی نہیں۔ شہزادی ویرا نیکولائیونا مجھ سے بات کرنے کو بالکل تیار نہیں تھیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ میں اس شہر میں رہ سکتا ھوں، کہ میں ان کی نظروں سے اوجھل رہ کر کم سے کم کبھی کبھی انھیں دیکھ سکتا ھوں یا نہیں۔ یہ سن کر انھوں نے جواب دیا کہ 'کاش تمھیں اندازہ ھوتا میں اس پورے قصے سے کتنی عاجز ھو چکی ھوں۔ میرے حال پر رحم کرکے جلدازجلد یہ قصہ ختم کر دو۔' اور میں اس قصے کو ختم کر رھا ھوں۔ میں سمجھتا ھوں کہ میں وہ سب کر چکا جو مجھے کرنا چاھئے تھا۔ کیوں، ٹھیک ھے نا؟،،

اس شام گھر پہنچ کر واسیلی لوووچ نے بیوی کو ژیلتکوف سے ملاقات کی ساری تفصیلات سنائیں، شاید انھوں نے سوچا ھوگا کہ یہ ان کا فرض ھے۔

ویرا پریشان ضرور ھوئی لیکن حیران یا ششدر نہیں ھوئی۔ تھوڑی دیر بعد رات کو اس کا شوھر اس کی خوابگاہ میں آئے لیکن اس نے اچانک دیوار کی طرف منہ کر لیا اور بولی ''مجھے تنہا چھوڑ دو — میں جانتی ھوں وہ شخص خودکشی کر لےگا۔،،

۱۱

شہزادی ویرا نیکولائیونا کبھی اخبار نہ پڑھتی۔ ایک تو اخبار سے اس کے ہاتھ گندے ہو جاتے، دوسرے آجکل کے اخباروں کی زبان کا سر پیر ہی اس کی سمجھ میں نہ آتا۔

لیکن اس فلک‌پیر کو یہی منظور تھا کہ اس دن وہ اخبار کا پہلا صفحہ کھولے اور اس حصے پر پہنچے جہاں یہ خبر چھپی تھی:

''پراسرار موت۔ کل رات سات بجے کے قریب بورڈ اف کنٹرول کے ایک ملازم گ۔ س۔ ژیلتکوف نے خودکشی کرلی۔ تفتیش کرنے پر بہت سے ثبوت ملے جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی موت کا سبب غبن ہے۔ اس نے اس مضمون کا خط بھی چھوڑا ہے۔ گواہوں کے بیانات سے ثابت ہوا ہے کہ وہ خود اپنے ہاتھوں ختم ہوا ہے، اس لئے فیصلہ کیا گیا ہے کہ لاش کا پوسٹ‌مارٹم نہ کیا جائے۔''

ویرا نے سوچا: ''میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ ہونے والا ہے مگر کیوں؟ یہی المیہ انجام کیوں؟ اف یہ کیا تھا — محبت یا پاگل پن؟''

وہ تمام دن باغیچے اور پھولوں کے باغ میں بھٹکتی رہی۔ دل کی بےچینی اور بےتابی لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی، وہ بہت پریشان تھی۔ اس کے تمام تر خیالات اور احساسات اس اجنبی ہستی کے گرد گردش

کر رہے تھے جسے اس نے نہ پہلے کبھی دیکھا تھا نہ آئندہ دیکھنے کی امید تھی — کس قدر مضحکہ‌خیز تھا وہ ''پ۔ پ۔ ژ''۔

''کون جانے، تمھاری زندگی کی شاہراہ سے ایک سچی، بےغرض اور پرخلوص محبت گزر رہی ہو؟'' اسے آنوسوف کے الفاظ یاد آ رہے تھے۔

چھہ بجے کے قریب ڈاکیہ آیا۔ اس دفعہ ویرا نیکولائیونا نے ژیلتکوف کا رسم الخط پہچان لیا۔ اس نے بڑی بےقراری اور محبت سے خط کھولا۔ اسے دور دور خیال نہ تھا کہ ژیلتکوف کا خط دیکھ کر اس کی یہ حالت ہو سکتی ہے۔

ژیلتکوف نے لکھا تھا:

''ویرا نیکولائیونا، خدا نے میرے دل میں تمھاری محبت کو جنم دیا اور مجھے اس وسیع اور بےپایاں مسرت سے مالامال کر دیا تو اس میں میرا کیا قصور۔ مجھے نہ ہی سیاست اور سائنس سے دلچسپی تھی، نہ فلسفہ سے اور نہ انسان کی آئندہ خوشی‌ومسرت سے، میرے لئے تو زندگی صرف آپ کے دم سے ہے۔ لیکن آج مجھے اندازہ ہوا کہ میں آپ کی زندگی میں ایک خوفناک کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہوں۔ معاف کر سکیں تو کر دیجئے گا۔ میں آج جا رہا ہوں، اب کبھی واپس نہیں آؤنگا، اب دنیا کی کوئی چیز آپ کو میری موجودگی کا احساس نہیں دلائے گی۔

''میرا رواں رواں آپ کا شکرگزار ہے، اس لئے

کہ آپ کا وجود اس دنیا میں ہے۔ میں نے اپنا تجزیہ کرکے دیکھا، میں جانتا ہوں یہ کوئی بیماری نہیں ہے، یہ کسی سنکی کا پاگل پن بھی نہیں ہے — یہ ایک ایسی محبت ہے جس کا تحفہ نجانے کیوں خدا نے مجھے دیا ہے۔

"ہو سکتا ہے آپ کی اور آپ کے بھائی نیکولائی نیکولائیوچ کی نظروں میں میری حیثیت ایک مضحکہ خیز ہستی کی سی ہو۔ رخصت ہوتے ہوئے میں پورے وجد کے ساتھ کہتا ہوں: 'تیری ہستی کا سورج دمکتا رہے'۔

"آٹھ سال پہلے میں نے سرکس میں آپ کو دیکھا۔ اور دیکھتے ہی دل نے مجھ سے سرگوشی کی: 'تجھے اس سے محبت ہے، اس سرزمین پر کوئی ہستی اس جیسی نہیں ہے، کوئی چیز اس سے بہتر نہیں ہے، دنیا کی کوئی مخلوق، کوئی درخت، کوئی ستارہ اس کے مقابلے کا نہیں ہے کیونکہ دنیا میں آج تک اس جیسے حسین اور نازک انسان نے جنم نہیں لیا۔ دنیا کے سارے حسن، ساری نزاکت نے مجسم ہوکر آپ کا روپ دھار لیا ہے۔

"کیا کروں؟ کسی اور شہر بھاگ جاؤں؟ لیکن میرا دل تو ہمیشہ آپ کے ساتھ، آپ کے قدموں میں رہتا ہے، میرے دل میں ہر لمحے آپ ہی آپ ہیں، آپ کا خیال، آپ کا خواب اور ایک لطیف سا جنون دل میں ہلکورے لیتا رہتا ہے۔ میں کنگن والی حماقت پر بہت شرمندہ ہوں، بے حد، شرم سے پانی پانی ہوا جا رہا ہوں — بہرحال، جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اف

میں نے کتنی بڑی غلطی کر دی۔ میں سمجھتا ہوں آپ کے مہمانوں پر اس کا کیا اثر پڑا ہوگا۔

''دس منٹ میں رخصت ہو جاؤنگا۔ اب میرے پاس صرف اتنا وقت اور ہے کہ اس خط پر ڈاک کا ٹکٹ لگا کر اسے لیٹربکس میں ڈال سکوں۔ اس طرح کسی اور سے یہ کام کرنے کی درخواست نہیں کرنی پڑے گی۔ مہربانی کرکے اس خط کو جلا دیجئے گا۔ میں نے ابھی چولھا جلایا ہے اور ان سب چیزوں کو نذرآتش کر رہا ہوں جو میری زندگی کی تمام‌تر دولت تھیں۔ میں آپ کا رومال جلا رہا ہوں جو میں نے چرایا تھا۔ یہ رومال آپ امرأ کی اسمبلی کے بال میں کرسی پر چھوڑ گئی تھیں، آپ کا پرچہ بھی نذرآتش کر رہا ہوں۔ اور میں نے اسے کس کس طرح چوما ہے! اس پرچے میں آپ نے مجھے حکم دیا ہے کہ آپ کو خط نہ لکھا کروں۔ میری دولت میں مصوری کی ایک نمائش کا پروگرام بھی شامل ہے۔ یہ کاغذ کبھی آپ نے اپنے ہاتھوں میں لیا تھا اور دروازے کے قریب ایک کرسی پر بھول گئی تھیں۔ بس سب ختم ہو چکا۔ میں نے سب بندھن توڑ ڈالے۔ پھر بھی مجھے خیال ہے، مجھے امید ہے آپ ضرور میرے بارے میں سوچیں گی۔ اگر کبھی میرا خیال آئے — میں جانتا ہوں آپ موسیقی کی دلدادہ ہیں۔ میں نے آپ کو نجانے کتنی بار بیتھوون کی چہارآھنگ سنگیت کے موقعوں پر دیکھا ہے — ہاں تو اگر کبھی میرا خیال آئے تو سناٹا

D-dur №2, op. 2 بجالیں یا کسی اور سے بجوا کر سن لیں!
''سمجھ میں نہیں آتا، یہ خط کیسے ختم کروں ۔ میں دل کی تمام‌تر گہرائیوں سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کیونکہ آپ میری زندگی کی اکلوتی خوشی تھیں، میرے دل کا سکون تھیں اور میرے ذہن کا واحد خیال تھیں ۔ خدا کرے آپ خوش رہیں، خدا کرے دنیا کی کوئی معمولی اور ناپائیدار چیز آپ کی بےمثل روح کے سکون میں خلل‌انداز نہ ہو ۔ مجھے اجازت دیں کہ میں آپ کے ہاتھ چوم لوں!

گ ۔ س ۔ ژ ۔ ''

وہ خط لے کر شوہر کے پاس گئی، روتے روتے اس کی آنکھیں لال ہو گئی تھیں اور ہونٹ سوجے ہوئے تھے ۔ اس نے شوہر کو خط دکھا کر کہا:
''میں نہیں چاہتی تم سے کوئی بات چھپاؤں ۔ لیکن مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ آج ہماری زندگی میں کوئی خوفناک بات ہو گئی ہے ۔ شاید تم نے اور نیکولائی نیکولائیوچ نے اس سلسلے میں مناسب قدم نہیں اٹھایا ۔ ''
شہزادہ شائین نے بڑی توجہ سے خط پڑھا، بہت احتیاط سے تہہ کیا اور بڑی دیر کی خاموشی کے بعد بولا:
''اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ مجسم خلوص تھا ۔ میں سمجھتا ہوں، مجھے اس کا کوئی حق نہیں ہے کہ میں اس کے جذبات محبت کا تجزیہ کروں ۔ ''

41*

''وہ ختم ہو چکا؟''

''ہاں، ختم ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں، اسے تم سے عشق تھا، نہیں، وہ پاگل نہیں تھا۔ میں مستقل اسے دیکھتا رہا، میں نے اس کی ایک ایک حرکت کو، اس کے چہرے کے یک ایک اتار چڑھاؤ کو دیکھا۔ تمھارے بغیر اس کی زندگی بےمعنی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں بڑے عبرتناک روحانی کرب کا منظر دیکھ رہا ہوں۔ اور میں تقریباً سمجھ گیا کہ میں ایک مردہ شخص سے بات کر رہا ہوں۔ ویرا، تم جانتی ہو، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں، کس طرح بات کروں اس سے۔''

''واسیا''، ویرا نے ٹوکا۔ ''اگر میں اسے ایک نظر دیکھنے شہر چلی جاؤں تو تمھیں دکھ تو نہیں ہوگا؟''

''نہیں، نہیں، ویرا، ضرور جاؤ۔ میں خود بھی جاتا۔ لیکن نیکولائی نے سارا معاملہ چوپٹ کر دیا۔ سوچتا ہوں وہاں جا کر مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوگا۔''

۱۲

ویرا نیکولائیونا سڑک لوتیرانسکایا سے دو تین مکان پہلے ہی اپنی گاڑی سے اتر پڑی۔ اسے ژیلتکوف کا فلیٹ ڈھونڈنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ اس کا استقبال بھی اسی بھوری آنکھوں والی بوڑھی عورت نے کیا، اس بہت موٹی سی عورت کی آنکھوں پر چاندی

کے فریم کی عینک تھی۔ گزشتہ دن کی طرح آج بھی اس نے پوچھا:

"کس سے ملنا چاہتی ہیں آپ؟"

"ژیلتکوف صاحب سے" شہزادی نے کہا۔

شہزادی کے لباس، ہیٹ اور دستانوں نے اور اس کے ہلکے سے تحکمانہ انداز بیان نے مالکن کو مرعوب کر دیا۔ وہ کہنے لگی:

"تشریف لائیے۔ وہ بائیں ہاتھوالے پہلے کمرے میں ہے — اس نے بہت جلد ہمیں چھوڑ دیا۔ ارے روپیہ غبن بھی کر لیا تھا تو کیا تھا، مجھ سے تو اس کا ذکر کیا ہوتا۔ آپ جانتی ہی ہیں، کنوارے مردوں کو کرائیے پر مکان دینے سے کچھ خاص فائدہ نہیں ہوتا۔ لیکن اگر چھ سات سو روبل کا قصہ تھا تو میں کھینچاتانی کرکے کسی نہ کسی طرح اس کی طرف سے ادا کر دیتی۔ مادام، کاش آپ سمجھ سکتیں وہ کتنا اچھا آدمی تھا۔ آٹھ سال سے میرا کرائےدار تھا۔ مگر وہ بیٹوں سے بڑھ کر تھا میرے لئے۔"

ویرا گیلری میں پڑی ہوئی کرسی میں دھنس گئی۔

"میں تمھارے مرحوم کرائےدار کی دوست ہوں" اس نے سوچ سوچ کر کہا۔ "مجھے اس کے آخری لمحوں کے بارے میں کچھ بتاؤ، بڑی بی۔ اس نے کیا کہا، کیا کیا۔"

"مادام، کل دو حضرات اس سے ملنے آئے۔ وہ

بڑی دیر تک اس سے بات‌چیت کرتے رہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ ان لوگوں نے اسے کسی جاگیر کے اہلکار کی ملازمت پیش کی ہے۔ اس کے بعد گیورگی صاحب ٹیلی‌فون کرنے بھاگ گیا، وہ بہت خوش خوش واپس آیا۔ اور پھر وہ دونوں حضرات چلے گئے، اور گیورگی خط لکھنے لگا اور پھر خط ڈالنے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ہمیں کھلونے کے سے پستول سے گولی چلنے کی سی آواز آئی۔ ہم نے کوئی خاص توجہ بھی نہیں دی۔ وہ سات بجے چائے پینے کا عادی تھا۔ ہماری ملازمہ لوکیریا نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ملازمہ نے باربار دروازہ دھڑدھڑایا۔ ہم نے بڑی مشکل سے دروازہ کھولا، وہ بےجان پڑا تھا۔ ،،

،،کنگن کے بارے میں بھی کچھ معلوم ہے تمھیں؟،، ویرا نیکولائیونا نے پوچھا۔

،،اوہ، کنگن — میں تو بھول ہی گئی تھی۔ آپ کو اس کے متعلق کیسے پتہ چلا؟ خط لکھنے سے پہلے وہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا ’کیا آپ کیتھولیک ہیں؟، ’ہاں، میں نے کہا۔ تو بولا ’آپ کا ایک رواج مجھے بہت پسند ہے، — اس نے کچھ یوں کہا — ’آپ لوگ پاک کنواری کی شبیہ پر انگوٹھیاں، ہار اور تحفے لٹکاتے ہیں، کتنا حسین ہے یہ رواج۔ آپ پاک کنواری کی شبیہ پر یہ کنگن لٹکانے سے انکار تو نہیں کریں‌گی نا؟، اور میں نے وعدہ کر لیا۔ ،،

''کیا میں جا سکتی ہوں اس تک؟''، ویرا نے پوچھا۔

''ضرور، مادام۔ یہ ہے اس کا بائیں ہاتھ کا پہلا دروازہ۔ لوگ اسے چیر پھاڑ کے لئے لے جارہے تھے لیکن اس کا ایک بھائی ہے، اس نے درخواست کی کہ اسے عیسائی انداز میں دفن کیا جائے۔ تشریف لائیے۔''

ویرا نے دل کڑا کرکے دروازہ کھولا۔ کمرے میں لوبان کی بو بسی ہوئی تھی اور تین موم‌بتیاں جل رہی تھیں۔ ژیلتکوف میز پر اڑا اڑا لیٹا تھا۔ اس کا سر ایک چھوٹے اور نرم گدیلے پر ٹکا ہوا تھا جو شاید کسی نے جان کر اس کے سر کے نیچے رکھ دیا تھا، اس طرح لاش کے لئے کوئی فرق بھی نہیں پڑ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ان سے انتہائی سنجیدگی اور خاموشی ٹپک رہی تھی، اور ہونٹوں پر پرسکون اور بےپایاں مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ شاید زندگی سے جدا ہونے سے پہلے اس نے کوئی گہرا اور لطیف اسرار پا لیا تھا، شاید اس راز نے اس کی زندگی کے تمام کرب، تمام تکلیفوں کو حل کر دیا تھا۔ ویرا کو یاد آیا کہ اس نے دو عظیم شہیدوں، پوشکن اور نپولین کے وفات کے ماسک میں اسی سکون کی جھلک دیکھی تھی۔

''مادام، شاید آپ تنہا رہنا چاہینگی؟''، بڑھیا نے پوچھا، اس کی آواز سے اپنائیت جھلک رہی تھی۔

”ھاں، تھوڑی دیر میں تمھیں بلا لونگی ،،
ویرا نے کہا اور فوراً اپنی صدری کی چھوٹی جیب سے ایک بڑا سا سرخ گلاب نکالا، آھستہ سے بائیں ھاتھ سے لاش کا سر اٹھایا اور سیدھے ھاتھ سے اس کی گردن کے نیچے پھول رکھ دیا ۔ اس لمحے اسے احساس ھوا کہ اس کے قریب سے ایک ایسی محبت گزری ھے جو ھر عورت کے خوابوں میں بسی رھتی ھے ۔ اسے وہ الفاظ یاد آ گئے جو جنرل آنوسوف نے امر اور وجدانی محبت کےلئے بڑی پیغمبرانہ شان سے کہے تھے ۔ اس نے بےجان ژیلتکوف کی پیشانی پر بکھرے ھوئے بال سمیٹے اور اس کی کنپٹیوں کو ھاتھوں میں لے کر سرد اور نم پیشانی پر ھونٹ رکھ دئیے ۔ اور ایک طویل اور محبت سے پر بوسے نے جنم لیا ۔

وہ جانے لگی تو مالکن نے بڑے خلوص اور محبت سے کہا :

”میں دیکھ رھی ھوں، مادام، آپ دوسرے لوگوں کی طرح نہیں ھیں جو محض تجسس کی وجہ سے یہاں آ رھے ھیں ۔ مرنے سے پہلے ژیلتکوف صاحب نے مجھ سے کہا تھا ’اگر میں کبھی مرجاؤں اور کوئی خاتون مجھے دیکھنے آئیں تو ان سے کہہ دینا کہ بیتھوون کا سب سے اچھا شاہ کار ھے...، اس نے لکھ کر مجھے دے دیا تھا ۔ لیجئے یہ رھا...،،

”لاؤ دکھاؤ،، ویرا نیکولائیونا نے کہا ۔ اور اچانک اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے ۔ ”معاف

کیجئے گا، اس کی موت سے مجھے اتنا صدمہ ہوا ہے کہ میرا دل بےقابو ہوا جارہا ہے۔ ،،

اس نے جانی بوجھی لکھائی میں لکھی ہوئی عبارت پڑھی:

L. van Beethoven. Son. №2, op. 2.

Largo Appassionato.

۱۳

ویرا نیکولائیونا بڑی شام گئے گھر واپس آئی۔ شوہر اور بھائی کو گھر پر نہ پا کر اسے گونہ سکون ہوا۔

گھر پر جینی ریتر اس کی منتظر تھی۔ ویرا نے ذرا سی دیر پہلے جو کچھ دیکھا اور سنا تھا اس سے وہ انتہائی پریشان اور افسردہ تھی۔ وہ جینی کی طرف بھاگی اور اس کے بڑے بڑے خوبصورت ہاتھوں کو پیار کرتے ہوئے چلائی: ’’جینی پیاری، مہربانی سے مجھے کچھ بجا کر سنا دو۔ ،، وہ فوراً کمرے سے باہر نکل گئی اور باغ کے ایک بنچ پر جا بیٹھی۔

اسے یقین تھا کہ جینی دوسرے سناٹا کا وہی ٹکڑا بجائےگی جو اس شخص نے تجویز کیا ہے، ہاں اس شخص نے جس کا انوکھا نام ژیلتکوف تھا۔

اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ پیانو کی پہلی ہی جھنکار پر ویرا اس غیرمعمولی شہ‌پارے کو پہچان گئی۔ اف کتنی گہرائی ہے اس موسیقی میں! اس کی

روح ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اس کے قریب سے ایک ایسی محبت گزری ھے جس کی چنگاری ہزاروں سال میں صرف ایک دفعہ سلگتی ھے۔ اسے آنوسوف کی بات یاد آ رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ آخر ژیلتکوف نے بیتھوون کے تمام شہہ پاروں میں سے یہی حصہ کیوں چنا۔ اس کے دماغ میں خودبخود الفاظ گونجتے چلے گئے۔ ان الفاظ میں اور موسیقی میں اتنا آھنگ تھا کہ لگ رہا تھا وہ کسی غزل کے مصرعے ھیں، ہر شعر کے بعد یہ الفاظ گونجتے:
”تیری ہستی کا سورج دمکتا رہے،،۔

”اب میں درد بھری آواز میں تم کو ایک ایسی ہستی کی داستان سناؤں‌گا جو بڑے انکسار، بڑی خوشی کے ساتھ دکھ، درد، کرب اور موت کا شکار ہو گئی۔ محبت کا دکھ، شکوہ اور آہ وزاری کیسی ہوتی ھے۔ میں تمہارے لئے دست بدعا ہوں: ’تیری ہستی کا سورج دمکتا رہے،۔

”ھاں، میں نے تو دکھ و درد سے دل کے خون ہونے کے اور موت کے امکانات پہلے ھی دیکھ لئے تھے۔ میں جانتا ہوں روح‌وجسم کی جدائی بڑی جان لیوا ہوتی ھے۔ لیکن میں تیری شان میں قصیدے گاؤنگا، اے حسینہ، میں دل‌وجان سے تیرے قدموں پر خلوص اور دبی دبی اور سلگتی ہوئی محبت کے پھول نچھاور کرونگا: ’تیری ہستی کا سورج دمکتا رہے،۔

”مجھے تیرا ہر قدم، تیری ہر مسکراہٹ، تیری

ہر نظر اور تیرے قدموں کی ہر آہٹ یاد آ رہی ہے۔
میری آخری یادیں میٹھے میٹھے سے درد کی کسک میں لپٹی ہوئی ہیں۔ میری یادیں لطیف اور حسین اداسی کے پردے میں چھپی ہوئی ہیں۔ لیکن میں تجھ پر آنچ نہیں آنے دونگا۔ میں تنہا چلا جاؤنگا خاموشی سے کیونکہ اس فلک پیر کی اور خدا کی یہی مرضی ہے۔ 'تیری ہستی کا سورج دمکتا رہے'۔

''موت کے اداس لمحے میں، میں صرف تجھے یاد کر رہا ہوں۔ میری زندگی بھی حسین ہو سکتی تھی، اے میرے دل، تو نہ گنگنا، نہ گنگنا۔ میری روح موت کو بلا رہی ہے لیکن میرے دل کا پیمانہ تیرے قصیدے کی مے سے لبریز ہے: 'تیری ہستی کا سورج دمکتا رہے'۔

''تم نہیں جانتیں — نہ تم جان سکتی ہو، نہ تمھارے اردگرد کے لوگ — کہ تم کتنی خوبصورت، کتنی حسین ہو۔ گھڑیال بج رہا ہے، وقت ہو گیا۔ زندگی سے جدا ہوتے ہوئے اس اداس اور دردناک لمحے میں مرتے مرتے میں گا رہا ہوں — اللہ کرے زور شباب اور زیادہ۔

''وہ آ رہی ہے، سب کچھ فنا کر دینے والی موت۔ لیکن میں گا رہا ہوں — اللہ کرے زور شباب اور زیادہ!''

شہزادی ویرا ببول کے نازک تنے کے گرد بازو ڈالے اس سے لپٹی ہوئی سسک رہی تھی۔ درخت آہستہ

آهستہ ھلکورے کھا رہا تھا۔ ہوا اپنے ھلکے ھلکے پروں پر اڑتی ہوئی آئی اور پتیاں سرسرانے لگیں، شاید اس کی ہمدردی میں۔ تمباکو کے پودے کی خوشبو اور تیز ہو گئی اور یہ لاجواب موسیقی گونجتی رہی، اس کے درد و غم کی ہم نوائی کرتی رہی:

''دل کو ڈھارس دے، میری محبوبہ، آنسو نہ بہا۔ تو مجھے یاد کرتی ہے نا؟ بول؟ تو میری آخری، میری واحد محبت ہے۔ آنسو نہ بہا۔ میں تیرے ساتھ ہوں۔ میرے متعلق سوچ اور میں تیرے پاس پہنچ جاؤنگا۔ میں نے اور تم نے ایک دوسرے سے صرف ایک پل محبت کی مگر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ میں یاد ہوں نا تجھے؟ یاد ہوں؟ اف میں تیرے آنسو دیکھ رہا ہوں، نہ بہا، آنسو نہ بہا، اف یہ نیند کتنی لطیف ہے، کتنی لطیف!''

جینی ریتر یہ حصہ ختم کرنے کے بعد کمرے سے باہر آئی، شہزادی ویرا آنسوؤں میں نہائی ہوئی بنچ پر بیٹھی تھی۔

''کیا ہوا، ویرا؟'' پیانونواز نے پوچھا۔

بےتاب اور بےقرار ویرا نے جینی کے چہرے، ہونٹوں اور آنکھوں کو چومتے ہوئے کہا: ''سب ٹھیک ہے، اس نے مجھے معاف کر دیا، سب ٹھیک ہے۔'' ویرا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

۱۹۱۱ء

تشریحی نوٹ

''مولخ'' (۱۸۹۶ء)

۱۸۹۶ء میں کوپرین کیئف کے اخباروں کے نامہ‌نگار کی حیثیت سے دونباس گئے۔ انھوں نے روسی بلجیم کمپنی کے کارخانوں کا دورہ کیا اور چند مہینوں تک شہر والینتسیف کے فولاد بنانے اور ریلیں ڈھالنے‌والے کارخانوں کے لوہار خانے اور بڑھئی‌خانے کے کنٹرول مینیجر بھی رہے۔ ''مولخ'' نامی کہانی انھوں نے اسی‌دورے سے متاثر ہوکر لکھی۔ یہ کہانی پہلی بار رسالہ ''روسکوئے بوگاتستوا'' میں شائع ہوئی اور پھر کچھ تبدیلیوں کے بعد کہانیوں کے مجموعے میں ''زنانیا'' نامی اشاعت گھر نے اس کو ۱۹۰۳ء میں شائع کیا۔ ۱۸۹۹ء میں گورکی نے کوپرین سے کہا: ''میں نے ''مولخ'' پڑھی اور مجھے بہت پسند آئی۔''

اس کہانی میں کوپرین نے بڑی تیزفہمی سے اس بڑھتے ہوئے جمہوری جوش و خروش کی پہلی گرج سن لی اور اس کی عکاسی کی جو ۱۹ ویں صدی کے آخر میں شروع ہو گئی تھی۔ اگرچہ وہ روسی ادب میں پہلے نہ تھے لیکن کوپرین نے پرجوش جدوجہد

کے لئے عوام‌الناس کی بیداری کو دکھایا چاہے وہ کسی اچانک بغاوت ھی کی شکل میں کیوں نہ ھو اور ھزاروں مزدوروں کی فوج اور مشینوں سے لیس زبردست کارخانے کی زندگی کی تصویرکشی کی۔

یہ کہانی پرجوش جذبات کے ساتھ سرمایہ‌داری کو براہ‌راست قصوروار ٹھہراتی ھے۔

''اولیسیا،، (۱۸۹۸ء)

''اولیسیا،، پہلی بار اخبار ''کیئف‌لیانین،، میں ''والین کے بارے میں یادوں،، کے عنوان سے شائع ھوئی اور ۱۹۰۵ء میں ''روسی اور غیرملکی ادیبوں کے کتب‌خانے،، میں شامل کرلی گئی۔

تنقید کرنے والوں کی توجہ کہانی کی طرف فوراً ھی نہیں کی گئی اور ان کا رویہ بھی اس کی طرف بین‌بین رھا۔ بارخین نے ۱۹۱۴ء میں اخبار ''اودیسکی نووستی،، میں لکھا: ''... جنگل کی فضا کے بارے میں تصانیف کا ذکر کرتے ھوئے نقادوں کے لئے ''اولیسیا،، اور ''سنسان جنگل،، کا ذکر کرنا ضروری ھے۔ ''اولیسیا،، جنگل سے ڈھکے ھوئے سنسان دیس پولیسئے کے بارے میں حیرت انگیز کہانی ھے جس کا راز ابھی تک، اچھوتا تھا۔ یہ راز ''جادوگر لڑکی،، تھی جو محبت سے بھری اور کشادہ دل تھی۔ اس ''جادوگرنی،، کی باتیں ایسی نزاکت و محبت سے لبریز

تھیں کہ کہانی کے کئی صفحے جنگل کی موسیقی جیسا تاثر پیدا کرتے ھیں۔ ،، دوسرے ناقدوں نے اس کہانی کو کم دلچسپ کہا ھے جیسے اس میں کوپرین عوام کی روحانی زندگی کا تصور کرتے وقت حقیقت سے ھٹ گئے ھوں۔

خود کوپرین کو ''اولیسیا،، سے محبت تھی، اگرچہ انھوں نے اس کی خامیاں بھی دیکھیں اور انتون پاولووچ چیخوف سے اس بات پر اتفاق بھی کیا کہ یہ کہانی ''نوجوانی کے جذبات اور رومان سے بھری ھوئی تصنیف ھے۔ ،، کوپرین نے اس کا اعتراف کرتے ھوئے اپنی بیوی سے کہا: ''انتون پاولووچ ٹھیک کہتے ھیں کہ میری یہ تصنیف کمزور ھے۔ انھوں نے مجھے دکھایا کہ بوڑھی جادوگرنی کا سربستہ ماضی اور ''اولیسیا،، کی پراسرار اصلیت بازاری کہانی کی حیثیت رکھتے ھیں (''گودی مولودوستی،،)۔ پھر جب کچھ سال بعد کوپرین سے پوچھا گیا کہ ان کو اپنی کہانیوں میں سے کون زیادہ اچھی معلوم ھوتی ھیں تو انھوں نے جواب دیا کہ ''یہ دو — ''اولیسیا،، اور ''زندگی کا دریا،،۔ یہاں زندگی اور تازگی ھے، پرانے اور فرسودہ سے جدو جہد اور نئے کے لئے جوش وخروش ھے۔ ان دو کہانیوں میں، بمقابلہ میری دوسری کہانیوں کے، میری روح زیادہ سے زیادہ ھے،،۔
(ب۔ کیسیلیف ''کوپرین کے بارے میں،، ۱۹۶۴ء۔)

گورکی نے اس کہانی کی تعریف کرتے ھوئے کہا:

''مجھے یہ پسند ہے کیونکہ ساری کہانی نوجوانی کی فضا سے بھرپور ہے۔ اگر آپ نے اس کو اب لکھا ہوتا تو اور بھی بہتر لکھتے لیکن یہ سادگی اس میں نہ ہوتی۔ (''گودی مولودوستی،،۔)

''سفید پوڈل،، (۱۹۰۴ء)

یہ کہانی ۱۹۰۴ء میں رسالہ ''یونی چیتاتیل،، میں شایع ہوئی۔ ۱۹۰۳ء میں کوپرین کا معہ بیوی اور چھوٹی بیٹی کے کرائمیا میں قیام تھا۔ اس وقت کو یاد کرتے ہوئے کوپرین کی بیوی نے لکھا ہے:
''کھانے کے بعد تقریباً دو بجے ہمارے یہاں بنگلے پر اکثر ایک بوڑھا شرمانکا (باجا) لیکر آتا تھا۔ اس کے ساتھ تیرہ سال کا قلاباز لڑکا سرگئی اور ایک سدھا ہوا کتا سفید پوڈل...

''تماشہ دکھانے کے بعد بوڑھے کو پیسے ملتے تھے اور الیکساندر ایوانووچ ان کو باورچی‌خانے کے قریب برآمدے میں کھانا کھانے کےلئے بلاتے تھے لیکن وہ اپنی رکابیوں میں کھانا لیکر چلے جاتے تھے اور سالگیرکا کے کنارے درختوں کے سائے میں بیٹھ کر کھاتے تھے۔ بوڑھا باتونی نہ تھا اور اپنے بارے میں بہت کم بتاتا تھا۔ لیکن سرگئی بڑی خوشی سے اپنے منصوبے بیان کرتا تھا۔ اپنے طویل سیروسفر میں وہ اودیسہ تک پہنچ گئے۔ ایک بار وہاں سرگئی

کو سرکس جانا نصیب ہو گیا اور اس دن سے وہ کرتب سیکھ کر اصلی قلاباز بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ اس نے الیکساندر ایوانووچ کو بتایا کہ کیسے ایک امیر خاتون برابر یہ تقاضہ کرتی تھی کہ سفید پوڈل کو اس کے ہاتھ فروخت کر دیا جائے کیونکہ اس کا بیٹا اس کتے سے بہت محبت کرتا تھا۔

''لیکن ہم پوڈل کے بغیر کیسے رہ سکتے تھے؟ دادا نے کتے کو دینے سے انکار کر دیا۔ خاتون ہم سے ناراض ہوئی۔ ہم کو یہ خوف پیدا ہو گیا کہ وہ پولیس میں جاکر رپورٹ کر دےگی کہ ہم نے اس کے یہاں کوئی چیز چرالی ہے، لڑکے نے بتایا 'اسی لئے ہم اس شہر سے جلدی بھاگ نکلے'۔ ''

اسی قصے کی بنیاد پر کوپرین نے اپنی کہانی ''سفید پوڈل'' لکھی۔

''میں ایکٹر کیسے بنا'' (۱۹۰۶ء)

یہ کہانی رسالہ ''تھیٹر اور آرٹ'' میں شائع ہوئی۔

اس کہانی میں شہر ''س'' — پولتاوا صوبے کے شہر سومی کو پیش کیا گیا ہے جہاں ۱۸۹۸ء میں بہار و خزاں کے دوران کوپرین نے مقامی تھیٹر میں بطور ''ایکسٹرا'' کے کام کیا تھا۔ بعد میں انھوں نے لکھا: ''میں جس ماحول میں اداکاری کرتا تھا وہ

ناقابل یقین طور پر غیر مہذب تھا۔ اور ان سب باتوں نے مجموعی طور سے بلاشبہ مجھ پر تھیٹر کے بارے میں اپنا نقش چھوڑا ہے۔ ''

شہر ولادی‌قفقاز کے کچھ ایکٹروں کے نام ایک خط میں جو کوپرین سے اس بات پر ناراض ہو گئے تھے کہ وہ ایکٹروں کے پیشے کے بارے میں عزت و احترام نہیں رکھتے تھے کوپرین نے ۱۹ ویں صدی کے آخر کے صوبائی تھیٹروں کے رسم و رواج کی سخت مذمت کی۔ انھوں نے لکھا: ''اداکارانہ ماحول اور وہ بھی دوردراز صوبوں میں واقعی گندہ، مضحکہ‌خیز، عجیب و غریب اور شرمناک ہے۔ '' اسٹیج کے ان اہل حرفت کے مقابلے میں کوپرین نے ''اسٹیج کے سچے آرٹسٹ، اصلی فن‌کار، غور و فکر کرنے‌والے گھرے کارکن اور فن کی پرایثار خدمت کرنے والے'' پیش کئے۔

چیخوف نے کوپرین کی ایکٹرانہ خوبیوں کی قدر کی اور ان کو مشورہ دیا کہ وہ آرٹ تھیٹر کے گروپ میں شامل ہو جائیں۔

''گمبرنس'' (۱۹۰۷ء)

کوپرین نے یہ کہانی دسمبر ۱۹۰۶ء میں گیت‌چین میں لکھی تھی جو پہلی بار رسالہ ''سووریمینی میر'' (آج کی دنیا) میں ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی۔ اس میں تقریباً کوئی ترمیم نہیں کی گئی۔ لیف تالستائی

کو اس کہانی کی زبان ''خوبصورت،، لگی اور انھوں نے اس کو اپنے سارے خاندان کو پڑھ کر سنایا۔

''زمرد،، (۱۹۰۷ء)

کوپرین کی یہ کہانی اگست — ستمبر ۱۹۰۷ء میں لکھی گئی اور اسی سال پہلی بار ''شیپوونیک،، نامی رسالے میں شائع ہوئی۔

کہانی کی بنیاد سچے واقعہ پر ہے جو ۱۹۰۰ء کے ابتدائی برسوں میں ماسکو میں ''رس‌سویت،، نامی گھڑدوڑ کے گھوڑے سے متعلق ہے۔ اس کو اس کے مقابل گھوڑے کے مالک نے جو گھوڑوں کے اصطبل کا مالک تھا زہر دے دیا تھا۔

میکسم گورکی نے روسی مصنف پیریگودوف کو لکھا کہ اس کہانی کے ہیرو کی ابتدائی اور سادہ نفسیات کو الفاظ میں نہیں بلکہ خاکوں میں پیش کرنا چاہئے اور انھوں نے اس سلسلے میں کوپرین کی کہانی ''زمرد،، کے مقابلے میں لیف تالستائی کی کہانی ''خولستومر،، کی مثال پیش کی۔

''یاقوتی کنگن،، (۱۹۱۱ء)

کوپرین نے ۱۹۱۰ء کی خزاں میں یہ کہانی لکھی۔ مصنف نے دسمبر ۱۹۱۰ء میں باتیوشکوف کو لکھا کہ وہ ''کنگن،، میں جلدبازی سے کام نہیں لینا

چاہتے کیونکہ یہ ان کےلئے ''بہت ہی عزیز'' ہے۔
یہ کہانی پہلی بار ۱۹۱۱ء میں ''زیملیا'' نامی تالیف میں شائع ہوئی اور اس کے پہلے ورق پر پیش لفظ کے بجائے بیتھوون کے دوسرے سناٹا کی موسیقی کے نوٹ تھے جو مصنف کو بہت مرغوب تھا۔

اس کہانی کے کردار کوپرین کے مراسلات اور یادداشتوں سے لئے گئے ہیں اور حقیقی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔

پڑھنے والوں سے

دارالاشاعت ترقی آپ کا بہت شکرگذار ہوگا اگر آپ ہمیں اس کتاب، اس کے ترجمے، ڈیزائن اور طباعت کے بارے میں اپنی رائے لکھیں۔ اس کے علاوہ بھی اگر آپ کوئی مشورہ دے سکیں تو ہم ممنون ہوں گے۔

ہمارا پتہ: زوبوفسکی بلوار، نمبر ۲۱

ماسکو، سوویت یونین

21, Zubovsky Boulevard, Moscow, USSR